خَیْرُ اُمَّتِیْ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ (بخاری ومسلم)

سلسلۂ دار المصنّفین

(نمبر ۸۷)

تبع تابعین

حصّہ اوّل

اس میں ۱۹ تبع تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ کے سوانحِ زندگی اور اُن کے مذہبی، اخلاقی، علمی اور مجاہدانہ کارناموں کی تفصیل بیان کی گئی ہے، شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں اس دور کی خوبیوں اور خرابیوں کی نشاندہی کی گئی ہے"

مرتّبہ

مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی

باہتمام

مولوی مسعود علی صاحب ندوی

در مطبع معارف اعظم گڑھ طبع گردید

۱۳۷۵ھ
۱۹۵۵ء

کتبہ اقبال احمد

فہرست اسماء

تبع تابعین حصہ اول

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ

خیر امتی قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم (بخاری و مسلم)

میرے بہترین امتی میرے زمانہ کے لوگ ہیں، (صحابہ) پھر وہ لوگ ہیں جنھوں نے ان کا زمانہ پایا (تابعین) پھر وہ لوگ ہیں جنھوں نے ان کا زمانہ پایا (تبع تابعین)

عام[1] علمائے امت نے ارشاد نبوی کے پہلے ٹکڑے کا مصداق صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی مقدس جماعت کو اور دوسرے اور تیسرے ٹکڑے کا مصداق تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ کے برگزیدہ گروہ کو قرار دیا ہے۔

اس مشہود بالخیر قرون ثلثہ میں صرف خلافت راشدہ کا تیس سالہ مبارک عہد ایسا گذرا ہے جس میں عہد نبوی کی تمام سعادتیں اور برکتیں یا یوں کہیے کہ اسلام کی تمام اخلاقی و قانونی خوبیاں ایک تسلسل کے ساتھ حکومت و معاشرہ دونوں میں مشاہد طور پر موجود تھیں۔ جن کو ہر آیندہ و روندہ ایک سرسری نگاہ میں دیکھ سکتا تھا، چنانچہ اس عہد سعید میں جتنی کم سیاسی اور معاشرتی برائیاں پیدا ہوئیں۔ دنیا کی سیاسی و مذہبی تاریخ میں اس کی کوئی دوسری مثال

---

[1] شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے غالباً بعض اعتراضات سے بچنے کے لیے پہلے ٹکڑے سے عہد نبوی اور دوسرے سے عہد صدیقی اور تیسرے سے عہد فاروقی مراد لیا ہے۔

نہیں ملتی، لیکن اس عہد سعید کے بعد سوءِ اتفاق سے حکومت کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی جو اپنی بہت سی انفرادی و اسلامی خصوصیات کے باوجود سیاسی میدان اور حکومت کے ایوان میں اپنی اجتماعی، اخلاقی اور قانونی ذمہ داریوں کو کماحقہٗ ادا نہ کرسکے، جس کے نتیجہ میں بہت جلد اسلامی خلافت شخصی حکومت میں تبدیل ہوگئی، گو نام ابھی خلافت ہی تھا، مگر اس میں خلافت کی روح باقی نہیں تھی، عہد راشدہ میں، سیاست مذہب و اخلاق کے تابع تھی، اور اب مذہب و اخلاق پر سیاست کو ترجیح دی جانے لگی تھی، اس سے پہلے خلافت کسی خاندان کی میراث نہیں تھی، اور اب یہ کسی نہ کسی خاندان کے لیے مخصوص ہوگئی تھی، حضرات خلفاے راشدین معاشرہ کی صلاح وفلاح کو حکومت کی سب سے بڑی بلکہ ذاتی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ اور اب حکومت کا قیام اور اس کی بقا کے لیے سیاسی جوڑ توڑ خلفاء کا سب سے بڑا کام رہ گیا تھا۔

غرض یہ کہ اس تبدیلی کا اثر یہ ہوا کہ معاشرہ میں بعض نئی نئی اور بعض دبی ہوئی پرانی برائیاں پھر ابھرنے لگیں، اور بہت سے سوئے ہوئے فتنے نئے نئے قالب میں پھر سر اٹھانے لگے۔ لیکن ایوان حکومت سے باہر ابھی ممتاز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بڑی تعداد اور حضرات تابعین رحمہم اللہ کی پوری جماعت موجود تھی، جو عہد نبوی اور عہد راشدہ کی تمام سعادتوں، برکتوں اور اسلام کی انفرادی و اجتماعی خصوصیتوں کو ابھی تک اپنے سینوں سے لگائے ہوئے تھی، جن کے دل میں جہاد کی تڑپ اور اقامت دین کا جذبہ موجود تھا، جو امر بالمعروف ہی کو نہیں بلکہ نہی عن المنکر کو بھی اپنی سب سے بڑی ذمہ داری اور سعادت سمجھتی تھی، چنانچہ اس مبارک جماعت کے افراد انفرادی اور اجتماعی دونوں طریقہ پر اس صورت حال کو بدلنے اور برائیوں اور فتنوں کو مٹانے کے لیے آگے بڑھے، اور اس راہ میں انھوں نے وہ سب کچھ جھیلا جو اس راہ حق کے راہ رُوں کو جھیلنا اور سہنا پڑتا رہا ہے، یعنی کتنے اس مقابلہ میں شہید ہوکر خدا کے حضور سرخ رو ہوئے کتنوں نے

دار ورسن کو لبیک کہا اور اپنے مولیٰ کی مرضی پائی، اور کتنے قید و بند کی کڑیاں جھیلتے جھیلتے جان بحق ہو گئے اور کچھ موقع کی تلاش میں تھے۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَنْ يَّنْتَظِرُ (احزاب)

اہل ایمان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جنھوں نے خدا سے جو معاہدہ کیا تھا اسے پورا کر دکھایا، پھر بعض ان میں ایسے ہیں جنھوں نے اپنی نذر پوری کر لی، کچھ اس کے پورا کرنے کے آرزومند ہیں۔

گو اس برگزیدہ جماعت کی یہ کوششیں شخصی حکومت کو دوبارہ اسلامی خلافت میں تبدیل کر دینے میں مکمل طور پر تو کامیاب نہیں ہوئیں،[1] مگر ایوان حکومت سے باہر معاشرہ کی اکثریت کو دین مبین پر قائم و استوار رکھنے، ان کو نئے نئے فتنوں سے بچانے اور علمی و عملی طور پر دین کی حفاظت میں ان کی جد و جہد اور قربانی کا غیر معمولی اثر ہوا، اور ان کی یہ سعی اس لحاظ سے سعیِ مشکور ثابت ہوئی، اور در اصل ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے۔

حضرات تابعین کے بعد اس مبارک کام کو ان کی فیض یافتہ جماعت یعنی تبع تابعین رحمہم اللہ نے اپنے ہاتھ میں لیا، اور اپنے زمانہ کے حالات و ضروریات کے مطابق اسے پورا کرنے کی کوشش کی، اس راہ میں ان کو بھی وہ تمام مصیبتیں اور صعوبتیں اٹھانی پڑیں جو ان کے پیش رووں کو اٹھانی پڑی تھیں، صحابۂ کرام اور تابعین و تبع تابعین کی کوششوں کے دائرۂ عمل میں اتنا فرق

---

[1] اس کے بہت سے اسباب تھے، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، "مکمل طور پر" کی قید اس لیے لگائی گئی ہو کہ ان کوششوں کا کچھ نہ کچھ اثر نظام حکومت اور ان کے چلانے والوں پر بھی ضرور پڑتا تھا مگر زیادہ تر اسکا اثر محدود اور وقتی ہوتا تھا۔ انہی کوششوں کا ایک ظہور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی خلافت تھی۔

ضرور ہے کہ حضرات صحابہؓ نے انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح سے اصلاح حال کی سعی کی اور حضرات تابعین و تبع تابعین نے حالات اور پچھلے تجربات کی بناپر بھی اور اس لیے بھی کہ امت مزید جنگ و جدال اور فتنہ وفساد سے محفوظ رہے، اپنا دائرۂ عمل انفرادی جد وجہد ہی تک محدود رکھا گو کہیں کہیں اجتماعی جد وجہد کی جھلک بھی ملتی ہے۔

قرآن مجید اور سیرۃ نبوی کا ایک اعجاز

قرآن مجید اور سیرت نبویؐ کا ایک بڑا اعجاز یہ بھی ہے کہ ان کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ دنیا کے علم وفن میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا بلکہ ان کے ذریعہ اس کا دامن ایک ایسی متحرک علمی و اخلاقی زندگی سے بھی مالامال ہوا جو ایک خاص وقت میں پیدا ہو کر ختم نہیں ہو گئی، بلکہ صدہا سیاسی اور تمدنی انقلابات کے باوجود دوام و تسلسل کے ساتھ آج تک باقی ہے، اور انشاء اللہ قیامت تک باقی رہے گی، اس نئی متحرک اخلاقی و علمی زندگی کا اولین نمونہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ تھے یہی وجہ ہے کہ امت نے قرآن و سیرت کی حفاظت کے بعد ان بزرگوں کی سوانح حیات اور سیرت کے معنوی خط و خال کو تحریری طور پر محفوظ و منقوش کر لینے میں سب سے زیادہ کوشش کی، گو ان نقوش کے ذریعہ ان قدسی صفات بزرگوں کی زندگی کی پوری کیفیتیں اور معنویتیں ہم تک نہیں پہنچ سکیں، مگر پھر بھی ان کی زندگی کا جتنا حصہ بھی بذریعہ تحریر ہم تک پہنچا ہے، اس کے پڑھنے سے آج بھی مردہ دلوں میں زندگی اور بجھی طبیعتوں میں سوز و گداز اور حرارت پیدا ہوتی ہے، ان کی سادہ سادہ باتوں سے دل میں خدا کی محبت کا جوش اور رضائے الٰہی کی طلب اور آخرت کا یقین بلکہ ذوق و مشاہدہ پیدا ہوتا ہے، ان کی زندگی کے عام واقعات کے سننے اور پڑھنے سے اقامت دین کا جذبہ، احیائے سنت کا ولولہ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی تڑپ پیدا ہوتی ہے، ان کے زہد و اتقا، استغنا و بے نیازی اور

خلفاو امرا و سے ان کی بے تعلقی اور اظہار حق کے واقعات پڑھ کر دنیا کی بے حقیقتی اور اس کو ایمان کی راہ میں نثار کر دینے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اگر ایک طرف اموی اور عباسی دور کی تاریخ پڑھ کر مایوسی اور شرمندگی پیدا ہوتی ہے، تو ان کے حالات کا مطالعہ کر کے شرمندگی اور مایوسی دور ہو جاتی ہے۔

اسی اہم ضرورت کے پیش نظر دار المصنفین نے اپنے ابتدائے قیام ہی سے سیاسی و تمدنی تاریخ کی تدوین و ترتیب کے ساتھ اس مشہود بالخیر قرون ثلاثہ کے ممتاز بزرگوں کے سوانح حیات اردو زبان میں منتقل کرنے کا بھی پروگرام بنایا تھا۔ چنانچہ اس پروگرام کے مطابق قرن اول اور قرن ثانی کے بزرگوں کے اسوے اور سوانح حیات پر تقریباً ایک درجن کتابیں آج سے کئی برس پہلے شایع ہو چکی ہیں، اب یہ قرن ثالث یعنی تبع تابعین کے سوانح حیات کا مرقع ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے، اور یہ اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی ہے۔

تبع تابعین کے عہد کی تعیین

عہد صحابہ کی ابتدا بعثت نبوی کے ساتھ ہوئی، اور اس کا اختتام اس وقت ہوا جب کہ دیدار نبوی سے شرف اندوز ہونے والے آخری صحابی حضرت انسؓ بن مالک کا پہلی صدی کے اختتام پر انتقال ہوا۔

عہد صحابہ کی طرح عہد تابعین کے بارے میں تاریخ و سنہ کی تعیین کے ساتھ یہ بتانا مشکل ہے، کہ وہ کب سے شروع ہوا، اور کب ختم ہوا، مگر بعض واقعات اور قوی قرائن کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس عہد کی ابتدا عہد نبوی میں ہو گئی تھی، کیونکہ اس عہد میں متعدد ایسے سلیم الفطرت لوگ موجود تھے، جنھوں نے اپنے سر کی آنکھوں سے تو روئے نبوی کی زیارت نہیں کی تھی، لیکن جوں ہی دعوت حق کی آواز ان کے کانوں تک پہنچی انھوں نے اس پر لبیک کہا اور اس کو اپنے سویدائے دل میں جگہ دی، مثلاً حضرت اویس قرنی، حضرت اصحمہ

شاہ حبشہ وغیرہ، اس طرح تقریباً ایک صدی تک عہد صحابہ اور عہد تابعین ساتھ ساتھ چلتا رہا، لیکن پہلی صدی (سنہ ھ) کے اختتام پر صحابہ کا عہد سعید ختم ہوگیا، اور اب حضرات تابعین کے ساتھ ان کی تربیت یافتہ جماعت اتباع تابعین کا عہد رشید اس میں منسلک ہوگیا، اور تابعین کے ساتھ تبع تابعین کا دور قریب قریب پون صدی تک ساتھ ساتھ گذرا،

عہد تابعین کی طرح، اتباع تابعین کے بارے میں بھی سنہ و تاریخ کی تعیین کے ساتھ نہیں بتایا جاسکتا کہ وہ کب سے شروع ہوا، اور کب ختم ہوا، مگر بعض اتباع تابعین کے سنہ ولادت اور بعض تابعین کے سنہ وفات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ پہلی صدی کے آخر سے اس عہد کی ابتدا ہوگئی تھی، مثال کے لیے امام شعبہ رحمہ اللہ کی ولادت سنہ۸۰ھ میں ہوئی اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی ولادت بھی سنہ۸۰ھ میں ہوئی، لیکن عام ارباب تذکرہ امام شعبہ کا شمار اتباع تابعین میں کرتے ہیں، امام صاحب کا تابعین میں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اتباع تابعین کا اصلی دور دوسری صدی کے ربع اوّل سے شروع ہوکر تیسری صدی کے ربع اوّل تک ختم ہوجاتا ہے، اس لیے کہ بعض تابعین کی وفات سنہ۱۶۴ھ اور بعض کی سنہ۱۶۲ھ میں ہوئی، اس اعتبار سے جن ائمۂ فقہ و حدیث کی ولادت سنہ۱۵۰ھ اور سنہ۱۶۴ھ کے درمیان ہوئی، ان کو بھی معاصرت کی وجہ سے اسی زمرہ میں شامل کرلیا گیا ہے، اگرچہ تابعین سے ان کے کسب فیض کرنے کا کوئی ظاہری ثبوت موجود نہیں ہے، مثلاً امام شافعی، امام احمد بن حنبل، اسحاق ابن راہویہ، علی بن المدینی وغیرہ، دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اموی خلیفہ ولید ثانی کے عہد سے لیکر عباسی عہد کے دسویں خلیفہ متوکل علی اللہ کے عہد تک اتباع تابعین کا خالص عہد رہا ہے۔

(بقیہ

تبع تابعین سے کون لوگ مراد ہیں | اس عہد میں گو بڑے بڑے صاحب سطوت خلفاء، لائق ترین امرا

اور سپہ سالار کامل ترین فلاسفہ و متکلمین اور بڑے بڑے زبان آور خطباؔ ادبا و شعراء پیدا ہوئے، جن میں سے ہر ایک نے بواسطہ یا بلاواسطہ ملک و ملت اور اسلامی علوم کی کوئی نہ کوئی خدمت انجام پائی۔ اور اس لحاظ سے ان کی خدمات کا اعتراف نہ کرنا بڑی احسان ناشناسی ہوگی، لیکن ان کو ہم زمرۂ تبع تابعین میں اس لئے شامل نہیں کرتے کہ صحابہ اور تابعین کی طرح تبع تابعین کا لقب بھی امت میں ان حضرات کے لیے مخصوص ہوگیا ہے، جن کے علم و عمل میں یکسانیت اور ہم رنگی رہی ہو، جن کے ذریعہ دین یا علم دین کی حفاظت کا براہ راست کوئی نہ کوئی کام انجام پایا ہو، جن کی زندگی میں سنت نبویؐ اور صحابہ وتابعین کی سیرت کا رنگ غالب رہا ہو، جن کے علم وفضل، زہد و ورع اور دیانت و تقوی پر ایک مخلوق کو اعتماد رہا ہو اور یہ اعتماد اب تک باقی ہو اس لیے جن خلفاؒ، وزراء، شعراء، ادباء اور اہل علم کی زندگی اس معیار پر پوری نہیں اترتی ان کا ذکر مستقلاً اس کتاب میں نہیں آئے گا، یوں جس طرح اس عہد کی سیاسی تاریخ کے ضمن میں حضرات تبع تابعین کا ذکر ضمناً آجاتا ہے، اسی طرح اس مرقع میں بھی ان کا ذکر ضمناً موقع بہ موقع آگیا ہے۔

اس عہد کی خوبیاں اور خرابیاں | تبع تابعین رحمہم اللہ کے عہد کی عکاسی اگر مختصر لفظوں میں کیجائے، تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ "عہد تضاد" تھا یعنی اگر آپ اس عہد کی سیاسی اور ادبی تاریخ، فکری آزادی اور بعض معاشرتی خرابیوں کی داستان پڑھیں گے تو آپ کے دل و دماغ پر تھوڑی دیر کے لیے یہ احساس ضرور طاری ہو جائے گا کہ یہ عہد ظلم و جور، عیش و عشرت، قبائلی عصبیت اور مختلف مذہبی و سیاسی فتنوں اور فلسفیانہ موشگافیوں سے بھرا ہوا تھا، لیکن اسی آن اگر آپ کو اس عہد کے قابل اعتماد محدثین، فقہا، علما اور صلحاء کے تذکرے دے دئے جائیں اور ان کے ذریعہ آپ کو کچھ دیر کے لیے ان برگزیدہ نفوس حضرات کی صحبت و مجلس میں پہنچا دیا جائے تو یہی نہیں کہ منفی طور پر آپ کے پہلے احساس میں کمی آجائے گی،

بلکہ مثبت طور پر آپ یہ محسوس کرنے لگیں گے کہ آپ کے کانوں میں ہر گوشہ سے قال اللہ اور قال الرسول ہی کی آواز آرہی ہے، ہر گھر اور ہر مجلس میں دین اور علم دین ہی کا چرچا ہے فقرو فاقہ کے باوجود دنیا اور اہل دنیا سے استغنا و بے نیازی زہد و اتقار حق گوئی و بے باکی اور ان کی سادگی و تواضع کے واقعات پڑھکر آپ کچھ دیر کے لیے اپنے آپ کو عہد صحابہ سے قریب تر محسوس کرنے لگیں گے۔ ان کی علمی کاوشوں اور تفقہ و اجتہاد اور قانونی و نظری دقت کی اتنی کثرت سے مثالیں ملیں گی کہ اس عہد کی فلسفیانہ موشگافیوں کی آپ کے دل میں کوئی وقعت نہیں رہ جائے گی۔

جیسا کہ ذکر آچکا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں یہ تضاد گو عہد راشدہ کے بعد ہی سے شروع ہوگیا تھا، لیکن اس عہد میں بعض سیاسی اسباب اور بعض نئے فتنوں کی وجہ سے اسمیں اضافہ ہوگیا تھا، عہد تابعین یعنی اموی دور میں معاشرہ مین عام طور پر عربی اور بدوی رنگ غالب تھا، اس لیے اس عہد کی برائیوں میں ملمع سازی نہیں سادگی تھی، لیکن عہد تبع تابعین یعنی عباسی دور میں جو سیاسی، علمی، مذہبی، معاشرتی برائیاں پیدا ہوئیں، ان میں عجمیت، اباحیت پسندی اور فلسفیانہ موشگافی کا رنگ غالب تھا، جاحظ کا یہ مشہور مقولہ ہے کہ

دولة بنی العباس اعجمية	عباسی حکومت میں عجمی اور خراسانی
خراسانية ودولة مروان	رنگ غالب تھا اور بنو امیہ کی حکومت مین
عربية اعرابية[1]	عربی اور بدوی رنگ غالب تھا۔

یہ تضاد دوسرے عناصر کے ساتھ یونانی، سریانی اور ہندی علوم خاص طور پر فلسفہ اور نجوم کی کتابوں کو عربی میں منتقل ہونے اور مدح خوان شعراء، ادباء اور مغنیوں کی حکومت کی طرف سے ہمت افزائی

---

[1] البیان والتبیین ج ۳ ص ۲۰۶۔

بھی پیدا ہوا اور اس کے بڑھانے میں قبائلی عصبیت اور ایرانی قومی حمیت نے بھی حصہ لیا، چنانچہ اس کے اثرات نہ صرف عملی زندگی میں پڑنے لگے، بلکہ اس کا اثر اسلامی علوم اور اسلامی عقائد پر بھی پڑا، اسلامی مملکت کے اکثر مقامات اور خاص طور پر کوفہ و بصرہ پایہ تخت ہونے کی وجہ سے نئے نئے مسائل اور نئے نئے مباحث کے آماجگاہ بن گئے تھے شیعیت، خارجیت، اور عربی عصبیت کے قدیم فتنے کیا کم تھے کہ ان میں قبائلی اور قومی عصبیت، شعوبیت، اعتزال، مرجیئت، قدریت اور جہمیت وغیرہ جیسے نئے نئے فتنوں کا اضافہ ہوگیا تھا۔

اس پُرفتن اور پرشور دور میں جس میں آدمی کا اپنے ایمان کو سلامت رکھنا مشکل تھا۔ حضرات تبع تابعین نے نہ صرف یہ کہ ان تمام فتنوں کا سلبی طور پر مقابلہ کیا۔ بلکہ ایجابی طور پر علوم دینیہ کی حفاظت اور تدوین و ترتیب کا غیر معمولی کام بھی انجام دیا، اگر یہ برگزیدہ جماعت اس کام کی طرف متوجہ نہ ہوتی تو امت اسلامی علوم کے نہ جانے کتنے بڑے حصہ سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتی اور ان کی جگہ نہ جانے کتنے غیر اسلامی علوم نے لے لی ہوتی آئندہ صفحات میں ان کے سلبی اور ایجابی دونوں طرح کے کارناموں کی قدرے تفصیل کی جاتی ہے لیکن ان کے ان کارناموں کی تفصیل سے پہلے ضرورت ہے کہ اس عہد کے فتنوں کا مختصر تذکرہ کر دیا جائے، ان کا تذکرہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ کتاب میں بار بار ان کا نام آئے گا اور اس لئے بھی کہ انکی حقیقت جانے بغیر نہ تو تبع تابعین کے کارناموں کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے اور نہ یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے۔ کہ بعض ائمہ نے ان کے مقابلہ میں اپنے جسم و جان کا پورا سرمایہ کیوں لگا دیا۔

قبائلی عصبیت | ظہور اسلام سے قبل عربوں میں قبائلی عصبیت اور ایرانیوں اور عیسائیوں میں قومی اور طبقاتی عصبیت اپنے شباب پر تھی، اسلام نے ان تمام عصبیتوں کی

شدید ضرب لگائی اور اس کے بجائے اس نے شرف و امتیاز کا صرف ایک معیار قرار دیا،

اناجعلناکم شعوبا وقبائل	ہم نے تم کو مختلف قوموں اور مختلف
لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ	خاندانوں میں تقسیم کر دیا ہے تاکہ تم ایک
اتقاکم ۔	دوسرے کو پہچان سکو اور خدا کے نزدیک
	سب سے شریف اور معزز وہ ہے جو سب سے پرہیز گار ہو

قرآن کی اس ہدایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار اور خاص طور پر اپنے آخری حج کے موقع پر، اعلان فرمایا کہ لافضل لعربی علی عجمی ولا فضل لعجمی علیٰ عربی ولا اسود علی الاحمر ولا لاحمر علی الاسود الاّ بالتقوی

اس تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ عربی، عجمی، رومی ایرانی، کالے گورے، غلام اور آقا ہر طبقہ دگروہ کے لوگ اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے، اور ان میں سے ہر ایک گروہ اور طبقہ کے لوگوں نے اپنی اپنی ذاتی صلاحیت و تقوی کی بنیاد پر بڑے سے بڑا شرف و امتیاز حاصل کیا لیکن اموی حکومت نے جب اسلامی خلافت کی جگہ شخصی حکومت کی بنیاد ڈالی، تو انھوں نے اپنی سیاسی مصلحت کی بنا پر اپنے گرد ایسے ہی لوگوں کو جمع کرنا شروع کیا اور انہی کی زیادہ ہمت افزائی کی جو ہر حال میں ان کی حمایت کریں، چونکہ یہ خود عربی النسل تھے اور شام کے عربوں کی حمایت پر ان کی حکومت قائم ہوئی تھی اس لیے انھوں نے عربی عصبیت کو ہوا دی اور خاص طور پر عرب قبائل کو حکومت اور فوج میں زیادہ سے زیادہ دخیل کیا، اس دور کے عربی ادب و شاعری میں یہ چیز عام طور پر نظر آتی ہے، اس عصبیت سے اموی حکومت کو کچھ سیاسی فائدے ضرور ہوئے لیکن اس ذہنیت نے عربوں میں بھی یمنی مضری اور عدنانی و قحطانی عصبیت کو پھر سے زندہ کر دیا، اور یہ کہنا بالکل مبالغہ نہ ہوگا کہ اسی عصبیت نے مشرق

بھی اموی حکومت کا بیڑا غرق کیا، اور مغرب یعنی اندلس میں بھی ایک مدت تک ان کو چین لینے نہیں دیا، یہ داستان بڑی لمبی اور دل دوز ہے، اموی خلفاء میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رضؓ کی ایک ذات ایسی تھی، جو نہ صرف اس عصبیت سے دور تھے، بلکہ انھوں نے اس کے مٹانے کی بھی کوشش کی۔

غیر عربوں کی قومی عصبیت ایران و روم کی سیاسی شکست کے بعد وہاں کی دبی اور کچلی ہوئی عام آبادی نے تو اسلام کو بطیب خاطر قبول کر لیا، اور اس کو اپنے لیے ایک نعمت و رحمت تصور کیا، مگر وہاں کے باقتدار اور اونچے طبقہ نے گو ظاہری طور پر اسلامی حکومت کی اطاعت قبول کر لی تھی، مگر ابھی تک اس کے دل سے طبقہ واریت اور قومی عصبیت کا ناپاک جذبہ نہیں نکلا تھا۔ اور جب بھی ان کو موقع ملتا تھا وہ اس جذبہ کو ظاہر کرتے رہتے تھے الا ماشاء اللہ جس طرح امویوں نے اپنی سیاسی مصلحت کے تحت عربی عصبیت کو ہوا دی اسی طرح عباسیوں نے اپنی حکومت کے قیام اور پھر اس کے بقا کے لیے عجمی عصبیت کو ابھارا جس کی وجہ سے انکے پیر پورے طور پر جم گئے۔ چنانچہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ عربوں یا مسلمانوں کے خلاف جتنی سیاسی بغاوتیں یا اسلامی ممالک میں جتنے مذہبی اور معاشرتی فتنے پیدا ہوئے ان کی ابتدا یا تو کسی عجمی کے ذریعہ ہوئی، یا کم از کم ان کی پشت پر ان کی مدد ضرور رہی، عباسی حکومت انہی کی مدد سے قائم ہوئی جس کا خود منصور کو اعتراف تھا، اور بار بار اعلان کرتا رہا کہ

یا اھل خراسان انتم شیعتنا و انصارنا واھل دعوتنا (مسعودی ج ۲ ص ۱۲۰)	اے اہل خراسان تم ہمارے مددگار اور انصار اور ہماری حکومت کے داعی ہو

مگر اس کے باوجود منصور کے زمانہ سے لے کر ہارون کے زمانہ تک جتنی بغاوتیں اور مذہبی فتنے پیدا ہوئے، ان میں ایرانیوں کا ہاتھ ضرور تھا، مثال کے طور پر ۱۳۷ھ میں سنباد کی بغاوت

سنہ ۱۴۱ھ میں فرقہ راوندیہ کی شورش میں انہی کا ہاتھ تھا۔ سنہ ۱۵۰ھ میں استاذسیس نامی ایک خراسانی نے دعوائے نبوت کیا، جس کی دعوت کو سب سے زیادہ فروغ انہی میں ہوا، اسی ذہنیت کے نتیجہ میں منصور کو اپنے سب سے بڑے حامی ابومسلم خراسانی کو قتل کرانا پڑا۔ عجمیت نوازی کے نتائج عباسی حکومت کے سامنے برابر آتے رہے، لیکن ایرانی اور غیرعربی عنصر عباسی حکومت میں اتنا دخیل ہوچکا تھا کہ اس کو بالکل نظرانداز کردینا اس کے بس میں نہیں تھا۔

اس عجمیت نوازی سے گو عربوں کی اہمیت سیاسی طور پر قدرے کم ہوگئی تھی، لیکن پھر بھی جو عربی عناصر حکومت کے اندر اور باہر موجود تھے۔ انھوں نے شکست نہیں کھائی تھی، بلکہ وہ ہمیشہ اس ذہنیت کا مقابلہ کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ امین مامون کی جنگ گو بظاہر دو بھائیوں کی جنگ تھی، لیکن حقیقۃً عربوں اور عجمیوں کی جنگ تھی، اگر امین فاتح ہوتا تو اس سے عربوں کی فتح ہوتی (کیونکہ اسکی ماں عربی النسل تھی جس کی وجہ سے عربی عصبیت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور یہی وجہ تھی اسکی پشت پناہی زیادہ تر عربوں نے کی) اور مامون کی جیت ہوتی تو اس سے عجمیوں اور غلاموں کی فتح ہوتی، کیونکہ وہ خود کنیز زادہ تھا اس لئے عجمیت نوازی اس کو ورثہ میں ملی تھی اور اہل عجم ہی اس کے پشت پناہ تھے، ان عجمیوں کی فتنہ پرور ذہنیت کا اندازہ نعیم بن خازم عربی کی اس گفتگو سے لگائیے جو اس نے مامون کے عجمی وزیر فضل بن سہیل سے کی تھی، نعیم اور فضل میں مامون کے سامنے کسی بات پر سخت گفتگو ہوئی، نعیم نے فضل سے صاف صاف کہا کہ تم یہ چاہتے ہو کہ بنو عباس سے حکومت نکال کر آل علی میں پہنچادو، اور پھر آل علی سے چھین کر آل کسریٰ کی حکومت دوبارہ قائم کردو[1]

شعوبیت | اسی عجمی ذہنیت نے شعوبیت کا فتنہ پیدا کیا، بظاہر اس کا مقصد تو عربوں اور

---

[1] کتاب الوزراء ص ۳۵۷،

غیر عربوں میں مساوات پیدا کرنا تھا مگر اس کے اندر عرب دشمنی کے ساتھ کسی قدر اسلام دشمنی بھی پوشیدہ تھی، صاحب لسان العرب نے شعوبی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے۔

والشعوبی ھوالذی یصغر شان العرب ولایری فضلا علی غیرھم — شعوبی اس کو کہتے ہیں جو عربوں کی اہمیت کو گھٹائے اور دوسروں پر ان کی فضیلت کو تسلیم نہ کرے۔

یہ لوگ اپنے استدلال میں قرآن کی ان . . . آیات اور احادیث نبوی کو پیش کرتے تھے، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فی نفسہ کسی خاص طبقہ کو کسی خاص طبقہ پر یا کسی خاص قوم کو کسی خاص قوم پر کوئی فوقیت نہیں ہے، جو کچھ فضیلت، فوقیت ہے وہ علم و تقوی کی بنا پر ہے، اس میں بہت سے لوگ خلوص سے اس مساویانہ ذہنیت کو فروغ دینا چاہتے تھے لیکن اکثریت کے دماغ میں عجمی عصبیت اور عرب دشمنی بھری ہوئی تھی، اس تحریک کی بساط ایوان حکومت سے لے کر بزم علم تک پھیلی ہوئی تھی، یہ ایک مذہب اور مسلک بن گیا تھا، مامون کے مشہور وزیر فضل کے بارے میں ابن ندیم نے لکھا ہو کہ

کان فارسی الاصل شعوبی المذھب، شدید العصبیۃ علی العرب ولہ فی ذالک کتب کثیرۃ (ص ۳۰۰) — یہ ایرانی النسل اور شعوبی المذہب تھا، اس کو عربوں سے سخت دشمنی تھی اس موضوع پر اس نے بہت سی کتابیں بھی لکھی ہیں۔

اس طرح اس موضوع پر دوسرے بہت سے عجمیوں نے کتابیں لکھیں، جن میں علان الشعوبی، سعید بن حمید، ہشیم اور ابو عبیدہ کی کتابیں بہت مشہور ہوئیں، ابن ندیم نے ان سب کا تذکرہ کیا ہے، خاص طور پر ابو عبیدہ تو ان کا سرخیل تھا۔ ابن خلکان نے اس کے بارے میں لکھا ہے۔

کان یبغض العرب والف فی مثالبھا کتبا کثیرۃ (ج ۲ ص ۵۵۴) — یہ عربوں سے نفرت کرتا تھا اور اس کے معائب میں بہت سی کتابیں لکھی تھیں۔

یہ قرآن کی تفسیر میں بڑا اثر انداز مسترب تھا، جس پر اصمعی سخت تنقید کرتا تھا۔

اس تحریک نے صرف سیاسی طور پر عربوں کو کمزور نہیں کیا بلکہ اس کے ذریعہ اسلامی علوم کو بھی کافی نقصان پہنچا، انھوں نے ادب و تاریخ اور تفسیر میں ایران کے شاہی زمانہ کے کتنے وضعی قصے اور نہ جانے کتنی بے سروپا روایتیں داخل کر دیں، گو تبع تابعین اور ان کے بعد کے محدثین اور مفسرین نے ان قصوں اور روایتوں کی بڑی حد تک پردہ دری کی، لیکن اس کے باوجود تفسیر و حدیث کے ذخیرہ میں بہت سی روایتیں اہل عجم کی فضیلت کے سلسلہ میں اب بھی ایسی ملتی ہیں جن کو درایۃً تسلیم نہیں کیا جا سکتا،

عربی عصبیت اور عجمی عصبیت کے ساتھ اسلامی مملکت میں ایک اور عنصر نے معاشرہ کے بگاڑنے میں حصہ لیا، وہ موالی یعنی غلاموں کا طبقہ تھا، طوالت کے خیال سے اس کی تفصیل کو نظر انداز کیا جاتا ہے،

لیکن اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ خواص و عوام پر انہی کا اثر تھا، اور معاشرہ میں اس وقت اسلامی ذہنیت کا بالکل ہی فقدان ہو چکا تھا، اور اس کا مظاہرہ کرنے والے موجود نہیں تھے، بلکہ مقصود یہ دکھانا ہے کہ حضرات تبع تابعین کے عہد میں مسلمانوں کے حکمران اور غالب عجمی عنصر کا رجحان کیا تھا اور معاشرہ میں کیا خرابیاں پیدا ہو رہی تھیں ورنہ اب بھی معاشرہ میں انہی لوگوں کی حقیقی عزت و عظمت تھی اور خواص اور عوام پر انہی کا اثر تھا۔ جو علم و تقویٰ کے لحاظ سے ممتاز تھے۔ خواہ عربی ہوں یا عجمی، کالے ہوں یا گورے، اس ذہنیت کے پیدا کرنے اور پھر اس کے باقی رکھنے میں حضرات تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ نے سب سے زیادہ حصہ لیا، ان کی مجلسوں کا دروازہ جس طرح ایک عجمی کے لیے کھلا ہوا تھا، اسی طرح ایک عربی کے لیے بھی جس طرح ان کا چشمۂ فیض ہاشمیوں اور قریشیوں کے لیے جاری تھا، اسی طرح غلاموں کے لیے بھی، یہاں محمود و ایاز ایک ہی صف میں نظر آتے تھے، یہاں امام شافعی امام احمد بن حنبل، امام ابو یوسف، امام زفر، سفیان ثوری جیسے عربی النسل حضرات کی جو عظمت

وعزت تھی، وہی عظمت و جلالت امام محمد، یحییٰ بن معین، امام اوزاعی، سعید القطان، ابن جریج، علی بن المدینی، عبد الرحمٰن مہدی، اور عبد اللہ بن مبارک جیسے غلامان اسلام کی تھی، ان حضرات کو جب بھی موقع ملا اس ذہنیت کو مٹانے اور اس پر ضرب لگانے کی کوشش کی، امام سفیان ثوری کا انتقال غربت و مسافرت میں ہوا تھا، انتقال کے وقت آپ نے پوچھا کہ میرے وطن کا کوئی آدمی ہے، لوگوں نے عبد الرحمٰن بن عبد الملک اور حسن بن عیاش کا نام لیا، آپ نے عبد الرحمٰن کو نماز جنازہ اور حسن کو ترکہ کی وصیت کی، انتقال کے بعد جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ عبد الرحمٰن نماز جنازہ پڑھائیں گے، تو بنو تمیم کے لوگ یہ کہہ کر مانع ہوئے۔

یمانی یصلی علی مصری — ایک یمنی مضری کی نماز جنازہ پڑھائے گا،

یعنی امام سفیان مضری تھے، اور عبد الرحمٰن کندی یمنی تھے، اس لیے یہ شرف کسی مضری ہی کو ملنا چاہیئے، جب لوگوں نے بنو تمیم سے یہ کہا کہ یہ امام کی وصیت ہے، تو پھر انھوں نے نماز جنازہ پڑھانے کی اجازت دی[1]، اس سے اندازہ لگانا چاہیئے کہ سیاسی بازی گروں نے اس ذہنیت کو کہاں تک پہنچا دیا تھا۔

حضرت فضیل بن عیاض اور امام اوزاعی کے حالات میں پڑھیں گے کہ انھوں نے منصور اور ہارون جیسے باجبروت خلفا کے سامنے کس طرح اس ذہنیت پر ضرب لگائی۔

مذہبی فتنے حضرات تبع تابعین میں سے آپ جن بزرگ کا بھی تذکرہ کتاب میں پڑھیں گے، ان میں چند فرقوں کا کسی نہ کسی حیثیت سے ذکر ضرور آئے گا۔ جس طرح بعض سیاسی اسباب کی بنا پر بعض فتنے پیدا ہوگیے تھے، اسی طرح سیاسی انتشار اور نئی نئی قوموں کے اسلام میں داخلے اور پھر یونانی اور ہندی فلسفہ کے اثر سے بعض دینی فرقے پیدا ہوئے، جن میں سے بعض نے

---

[1] تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۶۰

تبع تابعین کے زمانہ میں بڑا اثر و رسوخ پیدا کر لیا تھا، اور انکی وجہ سے اسلامی معاشرہ میں روزانہ نئے نئے مسئلے اور قضیئے پیدا ہونے لگے تھے، حضرات اتباع تابعین گو ان فرقوں اور ان کے پیدا کیے ہوئے مسائل سے صرف نظر کر کے شریعت کی اساوہ اور اعلیٰ تعلیم کی حفاظت اور اس کی ترویج میں لگے ہوئے تھے، مگر پھر بھی ان کو کبھی کبھی ان کے خلاف زبان کھولنی پڑتی تھی، ان کا ذکر کتاب میں بار بار آئے گا، اس لیے قدرے ان کی تفصیل کر دی جاتی ہے،

ان میں سب سے زیادہ طاقت ور فرقے شیعہ، خوارج، مرجیہ، جبریہ جہمیہ، قدریہ یا معتزلہ تھے۔

شیعیت | شیعیت گو ایک سیاسی تحریک ہے جو حضرت عثمانؓ کے عہد میں ظاہر ہوئی، اور حضرت علیؓ کے عہد میں اس نے زور پکڑا اور بنو امیہ کے عہد میں جوں جوں ہاشمیوں پر ظلم ہوتا رہا اس کا حلقہ اثر بڑھتا رہا، بعد میں اس نے ایک مذہبی فرقہ کی حیثیت اختیار کر لی، اس فرقہ کی تاریخ اسلامی حکومت کی مخالفت سے پر ہے، جب تک بنو امیہ کی حکومت رہی اس وقت تک یہ بنو ہاشم کے نام پر بغاوتیں اور سازشیں کرتا رہا، اور جب بنو امیہ کا خاتمہ ہو گیا تو پھر یہ بنو عباس کے درپے آزار ہو گیا، یہ اسی فرقہ کی سیاسی غلطی تھی کہ خانوادۂ نبوت کے نہ جانے کتنے معصوموں کو خاک و خون میں تڑپنے پر مجبور ہونا پڑا، اس فرقہ کو سب سے زیادہ عروج عراق اور پھر ایران میں ہوا اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ عراق مشرق و مغرب کا دروازہ ہے، جہاں اسلام سے پہلے دوسری قوموں کی آمد و رفت تھی، حضرت علیؓ نے اپنا دار الخلافہ یہیں بنایا تھا، پھر بنو عباس نے بھی اسی کو اپنا مرکز حکومت بنایا، جس کی وجہ سے یہ ... یہود و نصاریٰ اور ہندی، مزدکی اور مانی فرقوں کی آماج گاہ بن گیا، ان فرقوں کے جو افراد مسلمان ہو جاتے تھے ان کو شیعے یہ کہہ کر بہت آسانی سے اپنا ہم نوا بنا لیتے تھے کہ خلافت کے حق دار وہی لوگ زیادہ ہیں جو رشتہ و نسب کے لحاظ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قریب رکھتے ہیں، ان نومسلموں کے ذہن میں یہ

آسانی سے اس لیے بیٹھ جاتی کہ یہ نسبی و خاندانی بادشاہت ہی کے پروردہ اور اس کے عادی تھے،
ان کی مذہبی و سیاسی کشمکش کی داستان بڑی طویل ہے اس سلسلہ میں صاحبِ فجر الاسلام کا تبصرہ ہم یہاں نقل کیے دیتے ہیں، جس سے کچھ اندازہ ہو جائے گا۔

"حق یہ ہے کہ شیعیت ان تمام لوگوں کے لیے جائے پناہ تھی، جو کسی قدیم عداوت یا حسد کی بنا پر اسلام کی بنیاد کو گرانا اور اسلاف و اجداد کی تعلیمات کو اس میں داخل کرنا چاہتے تھے، مثلاً یہودی، نصرانی، زرتشتی اور مزدکی وغیرہ اسی طرح ان لوگوں کے لیے بھی یہ جائے پناہ تھی، جو اپنے ملک کو اسلامی مملکت سے کاٹنا اور حکومت کے خلاف بغاوت کرنا چاہتے تھے، غرض یہ کہ ایسے تمام افراد، اہل بیت کی محبت کو آڑ بنا کر اپنے اپنے اغراض کی تکمیل چاہتے تھے، مثال کے لئے تشیع میں یہودیت کا اثر و ظہور رجعت امام کے عقیدہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جس طرح یہود نے کہا تھا کہ ہم کو چند دن آگ جلائیگی۔ اسی طرح یہ عقیدہ کسی نہ کسی شکل میں تشیع میں بھی ہے، نصرانیت سے ان میں یہ تصور آیا کہ امام کو خدا سے وہی نسبت ہے جو حضرت مسیحؑ کو خدا سے تھی، انھوں نے کہا کہ لاہوت نے عالم ناسوت میں امام کا روپ دھار لیا ہے، اور نبوت و رسالت کبھی ختم نہیں ہوگی جس نے بھی لاہوت سے اتحاد پیدا کر لیا وہ نبی ہے اسی طرح تناسخ ارواح، خدا کی تجسیم اور حلول کا عقیدہ ان میں برہمنوں اور فلاسفہ کو اثر سے آیا۔"

مقریزی نے لکھا ہے جب اہل ایران نے جنگ و جدل کے میدان میں شکست کھائی تو ان میں سے ایک جماعت نے ظاہری طور پر اسلام قبول کر لیا، اور جو لوگ اہل بیت سے محبت رکھتے تھے، ان کو اکسا اکسا کر اپنے گرد جمع کرنا شروع کیا یہاں تک کہ آخر جو ہم

عن طریق الھدیٰ ان کو راہ حق سے دور ہٹائے گئے،

جیساکہ اوپر ذکر کیا گیا ہے ابتدا میں یہ ایک سیاسی تحریک تھی جس نے بعد مین ایک مذہبی فرقہ کی حیثیت اختیار کر لی لیکن پہلی صدی تک یہ صرف تفضیلیت تک محدود رہی، یعنی اس خیال کے لوگ حضرت علیؓ کو حضرات شیخین سے افضل سمجھتے تھے لیکن عباسی دور میں دوسری قوموں اور خاص طور پر اہل فارس سے ان کا اختلاط کثرت سے بڑھا تو اس نے ایک نئے مذہب کا قالب اختیار کر لیا جس نے عقائد اسلامی کے بارے میں ایسے عجیب و غریب خیالات کا اظہار کیا جن سے امت واقف نہیں تھی، اس نے کتاب اللہ کی ایک نئی تفسیر و تاویل اور حدیث کی ایک ایسی اچھوتی اصطلاح[1] گھڑی، جس کا ثبوت عہد صحابہ اور عہد تابعین مین نہیں ملتا، تفصیل کے لیے مقریزی حصۂ اول، اور ملل ونحل کا مطالعہ کرنا چاہیے، یہ سب زیادہ تر عہد تبع تابعین میں ہوا،

ائمہ کے تسلسل اور ان کی تعیین کے سلسلہ میں اور بھی بہت سے فرقے پیدا ہو گئے جن میں خاص طور پر دو فرقے بہت زیادہ مشہور رہیں، امامیہ اور زیدیہ، ان مین فرقۂ زیدیہ اہل سنت والجماعت سے سب سے زیادہ قریب تر ہے،[2] فرقہ امامیہ کا دوسرا نام اثنا عشریہ ہے، اسی اثنا عشریہ امامیہ کی ایک شاخ باطنیت ہے،[3] جو خالص عہد تبع تابعین[4] کا فتنہ ہے، جس کی بنیادی گمراہی اس کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن اور اسلامی تعلیمات کا ایک باطن ہے اور ایک ظاہر ہے اور احکام میں اصل چیز اس کی باطنی حیثیت ہے، اس تقسیم کی بنا پر انھوں نے اسلام کے عقائد، عبادات

لہ ج ۱ ص ۲۶۶ سے ان کے نزدیک حدیث صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل او تقریر کو نہیں کہتے، بلکہ ان کے نزدیک ائمہ معصومین کے قول وفعل و تقریر کو بھی حدیث کہتے ہیں گویا منصب نبوت و منصب امامت میں تقدم و تاخر کے علاوہ کوئی خاص فرق نہیں ہے، سے یمن میں اس فرقہ کی حکومت ہے، سے اب اثنا عشریہ ان کے خیالات سے اپنی برأت کا اظہار کرتے ہیں شہ مامون کے عہد میں اس کی ابتدا ہوئی اور معتصم کے عہد میں اسکو فروغ ہوا،

اور دوسرے امور دین کو ایک فلسفہ بلکہ ایک مذاق بنا کے رکھدیا ہے، انہی کو اسماعیلیہ بھی کہا جاتا ہے، ہندوستان میں ان کے دو حصے ہوگئے ہیں، عراق میں ان کو قرامطہ اور خراسان میں ملحدہ وتعلیمیہ کے نام مشہور تھے ہندوستان میں بھی ابتداً قرامطہ ہی کے نام سے ان کا ذکر تاریخوں میں ملتا ہے، یہ اپنے کو شیعوں سے جدا کرنے کے لیے شیعیہ اسماعیلیہ بھی کہتے ہیں۔

خوارج | عہد تبع تابعین میں گو ان کا زور قدرے کم ہوگیا تھا، مگر ان کے اور شیعوں کے بعض عقائد کی جھلک معتزلہ اور جہمیہ وغیرہ کے عقائد میں بھی ملتی ہے، جو خاص اس دور کی پیداوار ہیں، اس لیے مختصراً ان کا ذکر کردیا جاتا ہے، خوارج کی ابتدا اس جنگ سے ہوئی جو حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان صفین میں ہوئی تھی، حضرت معاویہؓ نے جب محسوس کیا کہ ان کو اب شکست ہوجائیگی تو انھوں نے یہ تجویز رکھی کہ یہ معاملہ ثالث کے سامنے رکھدیا جائے، چنانچہ حضرت علیؓ نے باوجودیکہ جنگ میں ان کا پلہ بھاری تھا، یہ تجویز منظور کرلی، اور حضرت معاویہؓ کی طرف سے عمرو بن العاص اور حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما ثالث مقرر کردیئے گئے، اس تحکیم کے مسئلہ میں حضرت علیؓ کے کچھ موافقین نے جن میں خاص طور پر قبیلۂ بنو تمیم کے وہ افراد شامل تھے جنھوں نے اس جنگ میں بڑی جاں فروشی دکھائی تھی، اس بنا پر اختلاف کیا کہ تحکیم تو اس مسئلہ میں ہونی چاہیے، جس میں فریقین میں سے کسی ایک فریق کے برسرحق ہونے میں شبہہ ہو لیکن یہاں تو حضرت علیؓ کا برسرحق ہونا واضح ہے، اور جب کوئی بات ظاہر ہو تو پھر اس میں خدا کے حکم کے علاوہ کسی دوسرے کو حکم بنانے کی قطعی ضرورت نہیں ہے، چنانچہ انھوں نے لاحکم الا اللہ کا نعرہ بلند کیا، اور اس نے ایک بڑے طبقہ کو متاثر کیا اور اسی کے بعد حضرت علیؓ سے یہ مطالبہ کیا کہ آپ سے حکم بنانے میں غلطی ہوگئی ہے، اس لیے

آپ کو اپنی اس غلطی کا بلکہ اپنے کفر کا اقرار کر لینا چاہیئے، اور اس کے بعد توبہ کر کے تجدید ایمان کرنا چاہیے، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جس اہم شرعی مصلحت کی بنا پر اپنی فتح کو شکست میں تبدیل کر لیا تھا، وہ اس مطالبہ کو کیسے منظور کر سکتے تھے۔ جب کہ ان سے یہ مطالبہ کرنے والوں کے استدلال کی بنیاد بھی صحیح نہیں تھی، حضرت علیؓ نے ان کے سامنے جو خطبہ دیا تھا اس میں ان کے استدلال کی غلطی واضح طور پر بیان کر دی تھی، یعنی یہ کہ تحکیم کا حکم بھی خدا ہی نے دیا ہے، اس لیے یہ تحکیم "ان الحکم الا للہ" کے خلاف نہیں بلکہ اس کے عین مطابق ہے، ان کے اس نعرہ کے بارے میں حضرت علیؓ کا یہ مقولہ زبان زد خاص و عام ہے کہ کلمۃ حق ارید بھا الباطل، بات صحیح ہے مگر اس سے باطل و غلط کام لیا جا رہا ہے،

حضرت علیؓ کے بعد یہ لوگ اموی دور میں اموی حکومت سے ہمیشہ برابر برسرپیکار رہے، خاص طور پر ان کے دو جنگی مرکز تھے، ایک مرکز بصرہ کے قریب بطائح تھا دوسرا جزیرۂ عرب میں خاص طور پر یمامہ، حضرموت، یمن اور طائف میں ان کا کافی زور تھا، عباسی دور میں گو ان کا زور کچھ کم ہو گیا تھا۔ مگر پھر بھی متعدد بغاوتیں ان کی طرف سے ہوئیں، جیسا کہ اوپر ذکر آیا ہے، ان کی ابتدا ایک دینی مسئلہ کی سیاسی تعبیر کے سلسلہ سے ہوئی، اور ان کی یہی حیثیت برابر باقی رہی، بلکہ بعد میں ان پر دینی رنگ زیادہ غالب ہو گیا، شیعوں کی طرح ان کے بھی متعدد فرقے ہو گئے تھے، جن میں مشہور یہ ہیں، ازارقہ، اباضیہ، اور زیدیہ و عوتیہ، پچھلے دونوں فرقے مسلمانوں سے بہت زیادہ دور اور اباضیہ سب سے زیادہ قریب تھے۔

شیعوں کی طرح خوارج نے بھی سیاسی اور دینی دونوں طرح کے فتنے پیدا کیے، لیکن ان پر چونکہ دین کا غلبہ تھا، اس لیے ان کے عقائد و اعمال میں بعض خوبیاں

تھیں، مثلاً وہ انتہائی عبادت گذار، اور دیانت دار ہوتے تھے، وہ جو قدم اٹھاتے تھے ان میں دینی رنگ غالب ہوتا تھا، ان کا سب سے بہتر عقیدہ یہ تھا کہ خلافت کسی خاص خاندان یا کسی خاص گروہ کے لیے مخصوص نہیں، بلکہ خلیفہ عام مسلمانوں کے انتخاب سے ہونا چاہئے، (ان کا سب سے غلط عقیدہ یہ تھا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

شیعوں کے مقابلہ میں ان میں خوبیاں زیادہ اور برائیاں کم تھیں، اس لیے اخیار امت کا سلوک ان کے ساتھ قدرے ہمدردانہ رہا، خود حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے کہ میرے بعد خوارج سے جنگ نہ کیجائے، اس لیے کہ جس شخص نے حق طلب کیا مگر اس میں اس سے غلطی ہوئی، اس شخص کی طرح نہیں ہے جس نے باطل طلب کیا اور اسے پا بھی لیا (فجر الاسلام ص ۳۱۵)

حضرت عمر بن عبد العزیز خوارج کو مخاطب کر کے فرماتے تھے کہ میں جانتا ہوں کہ تم نے یہ موقف دنیا اور نتائجِ دنیا کی طلب کے لئے نہیں اختیار کیا ہے، بلکہ آخرت کی طلب کیلئے اختیار کیا ہے، مگر . . . راستہ اختیار کرنے میں تم سے غلطی ہوئی، حضرت مالک بن انسؓ، عکرمہ مولی ابن عباس اور حضرت حسن بصری وغیرہ تحکیم کے مسئلہ میں قریب قریب وہی رائے رکھتے تھے، جو خوارج کی تھی، البتہ وہ اس کو کفر و فسق نہیں کہتے تھے، حضرت حسن بصری، حضرت علیؓ کا ذکر اپنی مجلس میں کرتے تو فرماتے کہ ان پر خدا رحم کرے کامیابی ان کا پیرحوم رہی تھی یہاں تک کہ انھوں نے تحکیم مان لی، آپ نے کیوں تحکیم قبول کی جب آپ حق پر تھے۔

(ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۱۳۶)

مرجیہ | شیعیت اور خارجیت کے غلو کے نتیجہ میں فرقہ مرجیہ پیدا ہوا، اگر یہ فرقہ ایمان و عمل کے مسئلہ میں غلو اختیار نہ کرتا۔ تو اس کا شمار اہل سنت والجماعت میں ہوتا،

مرجیہ کا عقیدہ | اس کا وجود بھی گو سیاسی اختلافات ہی کے نتیجہ میں ہوا، مگر دوسرے فرقوں

کیطرح جلد ہی اس نے ایمان وعمل کے مسئلہ تک اپنی توجہ مرکوز کر دی، اور اس میں حد سے زیادہ
مبالغہ سے کام لیا اور اسی وجہ سے جمہور امت نے ان سے بیزاری کا اظہار کیا، اور ان کی اس
مبالغہ آمیزی کو گمراہی قرار دیا۔ ورنہ فی نفسہ نہ تو ان کی بات گمراہی تھی، اور نہ ان کا شمار فرقہ ضالہ میں ہے،

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد امت میں کچھ لوگ تو حضرت علیؓ کے حامی ہو گیے، اور حضرت عثمانؓ کی تنقیص کرنے لگے، اور کچھ لوگ حضرت عثمانؓ کے حامی ہو گئے، اور حضرت علیؓ کی تنقیص کرنے لگے، لیکن انہی میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جو کہتے تھے کہ ان میں سے کوئی نہ تو غلطی پر ہے اور نہ ان میں سے کسی کی تنقیص کرنی چاہیے، ہم کو ان دونوں کے ساتھ احترام ہی کا شیوہ اختیار کرنا چاہیے، اور ان کے آپس کے معاملات کو خدا کے سپرد کرنا چاہیے، وہ خود فیصلہ کرے گا، مرجیہ ارجا سے نکلا ہے، جس کے معنی موخر کرنے کے ہیں، چونکہ وہ ختنین کے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے فیصلہ کو قیامت پر موخر کرتے تھے، اس لیے ان کو مرجیہ کہا جانے لگا، گویا اس اعتبار سے وہ تمام صحابہ مرجیہ تھے، جنھوں نے ان اختلافات سے اپنا دامن بچائے رکھا، لیکن شیعیت اور خارجیت کو جوں جوں فروغ ہوتا گیا، اور انھوں نے دینی مسائل میں مبالغہ آمیز رائیں دینی شروع کیں، ان لوگوں کی حیثیت بھی ایک مذہبی فرقہ کی ہو گئی، جس کی بحث کا دائرہ ایمان اور کفر اور مومن و کافر کی تعریف تک محدود ہو گیا، اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک طرف شیعوں نے اپنے علاوہ سب کی تکفیر شروع کر دی، اور امام معصوم کے اعتقاد کو ایمان کا ایک جز قرار دے دیا، دوسری طرف خوارج نے گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر قرار دینا شروع کر دیا، اور اپنے علاوہ سب کی تکفیر شروع کر دی، چنانچہ مرجیہ نے دونوں فرقوں کی مبالغہ آمیزی سے بچنے کے لیے ایمان کی یہ تعریف کی کہ

المعرفۃ باللہ وبرسلہ — اللہ اور رسولؐ کی معرفت کا نام ایمان ہے

بس اب جس نے بھی کلمۂ طیبہ کا اقرار کر لیا اس کو معرفت ایمان حاصل ہو گئی، اب وہ مومن ہے معرفت ایمان میں عمل کو کوئی دخل نہیں ہے، ایمان کی یہ تعریف ان خوارج کا بھی رد تھی، جو کہتے تھے کہ ایمان صرف اللہ اور اس کے رسول کی معرفت کا نام نہیں ہے، بلکہ فرائض کی ادائیگی اور کبائر سے اجتناب بھی اس میں شامل ہے، (تو جو شخص ایمان کے بعد فرائض ترک کر دے، یا گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرے، وہ خوارج کے نزدیک کافر ٹھہرے گا، اور مرجیہ اس کو کافر نہیں بلکہ مومن ہی کہیں گے) اسی طرح اس میں ان شیعوں کا جواب بھی تھا، جو امام کی اطاعت کو بھی ایمان کا ایک لازمی جزو سمجھتے تھے۔

یہاں تک تو مرجیہ کی بات اپنی جگہ پر درست تھی، لیکن بعضوں نے اس میں ذرہ زیادہ مبالغہ سے کام لیا اور یہاں تک کہنے لگے کہ اگر کوئی شخص ایمان کے بعد کفر کا اظہار بھی زبان سے کر دے، تو وہ دائرۂ اسلام سے خارج نہیں ہوتا، ان کی یہ بات اس لیے غلط ہے کہ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے، تو پھر کسی برائی پر نہ تو کسی کو ٹوکا جا سکتا ہے، اور نہ اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کی جا سکتی ہے۔

معتزلہ عموماً ہر اس شخص کو مرجی کہنے لگے تھے، جس کا اعتقاد یہ نہ ہو کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ابدی جہنمی ہوتا ہے، غالباً انہی کے اثر کی وجہ سے بہت سے ائمہ کو اور خاص طور پر امام ابو حنیفہ اور ان کے تلامذہ کو مرجی کہا جانے لگا۔ گو اس اعتبار سے تمام جمہور اہل سنت والجماعت کو مرجیہ کہا جا سکتا ہے، کہ وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر اور ابدی جہنمی قرار نہیں دیتے۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ مرجئیت اور خارجیت سے عام جمہور امت نے اپنا دامن بچائے رکھا مگر چونکہ یہ مسائل اٹھ چکے تھے، اور ان کا چرچا ہر جگہ عام ہو چکا تھا خاص طور پر عہد تبع تابعین میں ہر مجلس میں ان مسائل کا ذکر تھا، اس لیے ان بزرگوں کو بھی

زبان کھولنی پڑتی تھی، اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ رحمہم اللہ نے جو رائے دی وہ مرجئیت سے زیادہ قریب تھی، اور عام محدثین اور ائمۂ ثلاثہ رحمہم اللہ نے جو رائے دی وہ شیعیت اعتزال اور خارجیت سے کسی قدر قریب تھی، یعنی امام صاحب نے تو یہ فرمایا کہ ترک فرائض اور ارتکاب گناہ کی وجہ سے کوئی شخص خارج از اسلام نہیں ہو سکتا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گناہ کی کوئی اہمیت نہیں ہے، یا گناہ کا اثر ایمان کی کیفیت پر نہیں پڑتا یا اظہار کفر سے بھی آدمی مومن ہی رہتا ہے، اسی بنا پر شہرستانی نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو مرجیۂ اہل سنت میں شمار کیا ہے، اس کے برخلاف عام ائمۂ و محدثین نے یہ فرمایا کہ عمل بھی ایمان کا جزو ہے، اور ترک فرائض اور ارتکاب گناہ سے مومن کا ایمان کم ہو جاتا ہے، لیکن خوارج و معتزلہ کی طرح ان کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ترک عمل سے آدمی کافر ہو جاتا ہے، غرض یہ کہ ائمۂ اہل حق کے درمیان اس مسئلہ مین تھوڑا سا اختلاف ہے، لیکن منشا اور نتیجہ کے اعتبار سے دونوں کی رایوں مین کوئی فرق نہیں ہے۔

مسائل جبر و اختیار دوسری صدی کے آخر مین جو نئے کلامی مسائل مسلمانوں مین رواج پذیر ہوے ان مین مسائل جبر و اختیار اور قضا و قدر بھی ہیں، قرآن کی بعض آیات اور بعض احادیث نبوی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انسان اپنی ہدایت و ضلالت اور اپنے ارادہ و افعال مین مجبور محض ہے، اسی طرح بعض آیات و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے ارادہ و اختیار مین مختار ہے، اور اسی اختیار کی وجہ سے اس سے بازپرس ہو گی، ان مسائل پر جن لوگون نے کسی ایک ہی پہلو اور ایک ہی قسم کی آیات و احادیث کی روشنی مین غور کیا، انھون نے ٹھوکر کھائی، اور اسلام کی راہ اعتدال سے ان کا قدم ہٹ گیا، چنانچہ ان مسائل مین جن فرقون نے ایک پہلو پر زور دیا اور اس کے ذریعہ دین مین نئے

مسائل پیدا ہوے، ان میں جبریہ و قدریہ بہت زیادہ مشہور ہوئے، گو بعد میں ان فرقوں کا دائرۂ بحث ان مسائل سے آگے بڑھ کر خدا کی ذات وصفات تک پہنچ گیا، لیکن ان کی ابتدا قضا و قدر کے مسائل سے ہوئی، قدریت کی مذمت کا ذکر بعض احادیث نبوی اور آثار صحابہ میں بھی ملے گا، مگر اس زمانہ کی قدریت ریب و شک تک محدود تھی، اور تبع تابعین کے عہد میں یہ انکار کی سرحد میں داخل ہو گئی تھی، تبع تابعین کے عہد میں جبریہ عموماً جہمیہ اور قدریہ عموماً معتزلہ کے نام سے موسوم تھے، ان دونوں فرقوں میں شدید اختلاف کے باوجود بعض مسائل میں دونوں کی دانستہ یا نادانستہ رائے ایک ہو گئی تھی، خاص طور پر صفات باری کی نفی میں دونوں بالکل متحد نظر آتے ہیں، ان دونوں فرقوں کے خیالات کی مزید تفصیل ہے

جبریہ یا جہمیہ

اس فرقہ کا عقیدہ تھا کہ انسان جو کچھ کرتا ہے، اس میں اسکے ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہوتا، وہ جو کچھ کرتا ہے، اسے وہی کرنا ہی چاہئے تھا۔ خدا نے اسی کام پر اس کو مجبور کر دیا ہے، افعال کے صدور میں انسان اور جمادات و نباتات میں کوئی فرق نہیں ہے، محض مجازاً افعال کی نسبت انسان کی طرف کر دی جاتی ہے، جیسے مجازاً یہ کہا جاتا ہے، کہ آسمان سے پانی برسا، درخت سے پھل نکلا، اسی طرح انسان کے بارے میں مجازاً کہا جاتا ہے کہ انسان نے لکھا، یا انسان نے پڑھا، انسان نے نافرمانی کی، یا اطاعت کی، ورنہ حقیقۃً وہ یہ سب کرنے پر مجبور تھا،

اس عقیدہ کو سب سے زیادہ فروغ جہم بن صفوان نے دیا، اس لیے اس فرقہ کا دوسرا نام جہمیہ پڑ گیا، ائمہ تبع تابعین زیادہ تر اسی نام سے اس فرقہ کو یاد کرتے ہیں،

جہم بن صفوان خراسان کا رہنے والا تھا، بڑا زبردست خطیب تھا، لوگوں کو اپنی تقریر سے فوراً متاثر کر لیتا تھا۔ ابتدا میں اس کے مسلک کو خراسان کے علاقہ میں بڑا

فروغ ہوا ۱۲۸ھ میں بنو امیہ کے خلاف بغاوت میں قتل کیا گیا۔[1]

اس فرقہ نے مذکورہ بالا خیالات ہی کے اظہار پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس نے آگے چل کر خدا کو ایک مجرد ذات مان کر اس کی تمام صفات کا انکار کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ خدا کی صفات اور اعضا کا ذکر قرآن میں آیا ہے، ان سے مخلوق کے ساتھ تشبیہ لازم آتا ہے، اس لیے ان تمام آیات و احادیث کی تاویل کرنی چاہیے، اسی کے نتیجہ میں انھوں نے کہا کہ قرآن یعنی کلام الٰہی مخلوق ہے۔ اسی نفی صفات کے نتیجہ میں قیامت میں خدا کے دیدار کا انکار کیا، یہ بھی کہا کہ دوزخ و جنت اہل دوزخ اور اہل جنت کے دخول کے بعد فنا ہو جائیگی، اس لیے کہ ہر حرکت کی ایک ابتدا اور انتہا ہے، اس لیے ان کی بھی انتہا لازمی ہے، تبع تابعین اور ان کے تلامذہ اور بعد کے علمائے اپنی کتابوں میں ان عقائد و خیالات کی سخت الفاظ میں تردید کی ہے۔

قدریہ | فرقہ جبریہ یا جہمیہ کے بالکل مقابل قدریہ تھے، ان کا خیال تھا کہ انسان اپنے ارادہ و عمل میں بالکل آزاد اور مختار ہے، خدا انسان کا خالق ہے، مگر اس کے ارادہ و افعال کے پیدا کرنے میں اس کے ارادہ و مشیت کو کوئی دخل نہین ہے، وہ بھلی بری جو راہ چاہے اختیار کرے، اسی فرقہ نے بعد میں اعتزال کی صورت اختیار کر لی، اور قدریت کے بجائے دنیائے اسلام اعتزال کے فتنہ سے دوچار ہوئی، معتزلہ اور قدریہ کو جبریہ سے ارادہ و مشیت الٰہی کے سلسلہ مین شدید اختلاف تھا، لیکن نفی صفات میں وہ جبریت کے ہم نوا بن گیے تھے، غرض یہ کہ دوسری صدی مین قدریت کی مکمل اور نفی صفات کے سلسلہ میں جبریت و جہمیت کی جزئی نمایندگی یہی معتزلہ کر رہے تھے۔

---

[1] فجر الاسلام ص ۳۴۲۔

قضا و قدر پر بحث و مباحثہ کی ابتداء تو عہد نبوی ہی میں ہو گئی تھی، جس سے آپ نے روک دیا تھا، ابتداء میں جو لوگ قضا، و قدر میں قیل و قال کرتے تھے، ان کو قدری کہا جاتا تھا، انہی کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ القدریۃ مجوس ہذہ الامۃ[1] لیکن دوسری صدی میں عیسائیوں اور زردشتیوں کے اثر سے قدریت ایک مستقل فلسفہ بن گئی، جس پر صدیوں تک متکلمین اسلام اور دوسرے فرقوں میں معرکہ آرائی رہی اور جس کا مقصد اسلام کے بنیادی عقائد میں رخنہ اندازی تھی، اس فرقہ کے مسلمان بانی معبد اور غیلان ہیں، مگر ان کے ذہن میں فلسفیانہ قدریت کا وجود کیسے ہوا، اس کے لیے ابن نباتہ کا بیان ملاحظہ ہو،

قیل ان اول من تکلم فی القدر رجل من اھل العراق کان نصرانیا فاسلم ثم تنصر واخذ عنه معبد الجهنی وغیلان الدمشقی (شرح العیون)	کہا جاتا ہے کہ پہلا شخص جس نے قدر کے بارے میں کلام کیا وہ ایک عیسائی تھا جس نے اسلام قبول کیا اور پھر عیسائی ہو گیا، اسی سے معبد جہنی اور غیلان دمشقی نے قدریت کا سبق لیا۔

مورخین نے اس پر بحث کی ہے، کہ اس قدریت کا منبع عراق ہے یا شام، مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ بدعت سیئہ نصرانیت ہی کی دین ہے۔

قدریت کے داعی اول معبد اور غیلان دونوں عہد تابعین میں پیدا ہوئے، اور ان کے خیالات اسی عہد میں پھیلنے شروع ہو گئے تھے، اور علماء نے ان سے مباحثہ و مناظرہ بھی شروع کر دیا تھا، چنانچہ خود حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے غیلان سے گفتگو کے بعد تمام ممالک اسلامیہ

---

[1] اگر اس کو پیشین گوئی سمجھا جائے تو اس کی زد میں وہ تمام فرقے آتے ہیں جو قضا و قدر میں اعتدال کی راہ سے ہٹ گئے تھے۔

ہیں ان خیالات سے بچنے کی ہدایت کی تھی، مگر اس کا زیادہ زور تبع تابعین کے عہد میں اسوقت ہوا جب اس نے اعتزال کی صورت اختیار کر لی،

معتزلہ | اوپر ذکر آچکا ہے کہ قدریت کی دوسری شکل اعتزال تھی، اور نفی صفات کے سلسلہ میں وہ جبریوں کے ہم عقیدہ ہو گئے تھے، معتزلہ اپنے کو معتزلہ یا قدریہ کہلانا پسند نہیں کرتے تھے، کیونکہ قدریت پر حدیث میں تنقید و وعید آئی ہے، اور اعتزال کے لفظ سے علحدگی پسندی معلوم ہوتی ہے۔

وجہ تسمیہ | عام طور پر علم کلام کی کتابوں میں معتزلہ کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اعتزال کے داعی اول واصل بن عطا حسن بصری رحمہ اللہ کی مجلس میں شریک ہوتا تھا، گناہ کبیرہ کے مسئلہ میں اس نے خوارج اور جمہور امت کی رائے سے اختلاف کر کے ایک نئی رائے یہ دی کہ کبیرہ کا مرتکب نہ تو کافر ہے، جیسا کہ خوارج کہتے ہیں، اور نہ مومن فاسق ہے، جیسا کہ جمہور امت کا خیال ہے، بلکہ ان کے لیے کافر و مومن کے درمیان ایک دوسری منزل ہے، چونکہ یہ بالکل نئی بات تھی، اس لیے امام حسن بصری نے اس کو اپنی مجلس سے نکال دیا، اور وہ ان سے کنارہ کش ہو گیا، چونکہ کسی سے کنارہ کش ہو جانے کو عربی میں اعتزال کہتے ہیں، اس لیے ان کا نام معتزلہ پڑ گیا، الفرق بین الفرق کے مصنف نے لکھا ہے کہ ان کو حسن بصری کی مجلس سے علحدہ ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ امت کی عام رائے سے علحدہ ہو جانے کی وجہ سے کہا گیا ہے، مسعودی نے لکھا ہے کہ ان کو معتزلہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر اور مومن دونوں سے علحدہ ایک مقام تجویز کرتے تھے، مقریزی کے بیان سے پتہ چلتا ہے اس نام سے وہ لوگ یاد کئے گئے جو نو مسلم اہل کتاب تھے، ان میں سے جس پہلو سے بھی دیکھا جائے ان کو معتزلہ کہنا صحیح تھا،

لیکن ان کی وجہ تسمیہ کی سب سے زیادہ صحیح تعبیر صاحب الفرق بین الفرق نے کی ہے بہر حال وجہ تسمیہ جو بھی ہو مگر دوسری صدی ہجری کا سب سے بڑا فتنہ یہی اعتزال تھا۔

اعتزال اور شیعیت | اعتزال کی طرف جو لوگ سب سے زیادہ بڑھے وہ یا تو نومسلم تھے، جن میں اکثریت اہل کتاب نومسلموں کی تھی، یا وہ لوگ تھے جو اپنی آزادروی میں کوئی پابندی لگانا پسند نہیں کرتے تھے، یا فلاسفہ اور شیعوں نے اس کو لبیک کہا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس فتنہ کو پیدا فلسفہ نے کیا اور اس کو سب سے زیادہ فروغ شیعوں کی وجہ سے ہوا، صاحب الملل والنحل کا بیان ملاحظہ ہو وہ لکھتے ہیں کہ واصل بن عطا نے حضرت زید بن علی سے استفادہ کیا تھا جس کی وجہ سے صارت الزیدیہ کلھم معتزلہ (ص ۳۴) سارے زیدی معتزلہ کے ہم خیال بن گئے، اہل اعتزال اور شیعوں میں اصولی دبنیادی فرق ہے، لیکن تنقید صحابہ میں دونوں چونکہ ہم رائے ہیں، اس لیے شیعوں نے اعتزال کے قبول کرنے میں سبقت کی، شیعوں کے دخول سے پہلے معتزلہ صحابہ کے بارے میں اتنی سخت رائے نہیں رکھتے تھے، جتنی کہ اس کے بعد رکھنے لگے، چنانچہ اس کی تائید کیلئے ابن ابی الحدید کی شرح نہج البلاغہ کی جلد ۴ ص ۴۵۴ کا مطالعہ کرنا چاہیے، خلفائے عباسیہ اور اہل بیت کے تعلقات ہمیشہ خراب رہے، مامون پہلا خلیفہ گذرا ہے جس نے اہل بیت کو اہمیت دی حتی کہ ان کے حق میں وہ خلافت چھوڑنے کے لیے بھی تیار ہو گیا تھا، اور اتفاق سے اعتزال کو بھی سب سے زیادہ اہمیت بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ حکومت کی پالیسی میں اس کا داخلہ اسی کی وجہ سے ہوا، گویا ان دونوں متضاد عناصر کا اتحاد تنقید صحابہ کے سلسلہ میں بھی ہوا اور مامون بھی اس کا واسطہ بنا،

معتزلہ کے عقائد | جن عقائد پر معتزلہ سب سے زیادہ زور دیا کرتے تھے، ان میں چند یہ ہیں،

(۱) خدا کے بارے میں ان کا عقیدہ تھا کہ اس کی صفات اس کی ذات سے کوئی علحدہ اور زائد چیز نہیں ہے، اگر خدا کی ذات سے الگ صفات قدیمہ کا وجود تسلیم کیا جائے تو اس سے تعدد قدم اور تعدد الٰہ کا لزوم ہوتا ہے، حالانکہ وہ وحدہٗ لاشریک ہے، اور کسی حیثیت سے بھی اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

اس عقیدہ سے حقیقۃً تو نہیں، مگر بظاہر صفات الٰہی کی نفی لازم آتی تھی، اس لیے علمائے امت، اور خاص طور پر اتباع تابعین نے اس کی تردید کی، اور پھر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسی عقیدہ سے خلق قرآن کا مسئلہ پیدا ہوا، ان سب کی تفصیل آگے آتی ہے۔

(۲) ان کا دوسرا عقیدہ یہ تھا کہ انسان خود اپنے اچھے اور برے اعمال کا خالق ہے، اور اس پر پورے طور پر قادر ہے، خدائے تعالیٰ کی طرف خیر و شر کی تخلیق کی نسبت صحیح نہیں ہے، اللہ تعالیٰ اس نسبت سے بلند ہے۔

اس عقیدہ سے لازم آتا ہے کہ خلق کے بعد خدا تعالیٰ کا اپنے بندوں سے کوئی تعلق نہیں رہا، اور اب وہ معطّل ہو کر صرف تماشا دیکھ رہا ہے، ظاہر ہے کہ اللہ کی ذات کو معطّل سمجھنا اسلامی تعلیمات کے خلاف تھا۔ اس لیے اس کی تردید کی گئی۔

(۳) ان کا تیسرا عقیدہ منزلۃ بین المنزلتین تھا۔ یعنی وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو نہ تو جمہور امت کی طرح مومن فاسق کہتے تھے، اور نہ خوارج کی طرح کافر، بلکہ کہتے تھے کہ ایمان و کفر کے درمیان ایک تیسری منزل ہے، جس میں یہ فاسق رکھے جائیں گے، خوارج کے مقابلہ میں ان کا عقیدہ جمہور امت سے زیادہ قریب ہے۔

ان کا چوتھا عقیدہ جس پر علم کلام سے لیکر اصول فقہ کی کتابوں تک میں آج بحث و تمحیص ہوتی ہے وہ یہ ہے۔

(۴) حسن و قبح یا بھلائی و برائی کے پہچاننے کے لیے صرف عقل کی راہ نمائی کافی ہے، اگرچہ شریعت کسی برائی کو برائی اور کسی بھلائی کو بھلائی نہ بھی کہتی ہو، مثلاً صدق یعنی سچائی فی نفسہٖ سچائی ہے، اسی طرح جھوٹ فی نفسہٖ جھوٹ ہے، اس لیے شریعت کا علم ہو یا نہ ہو بندے پر لازم ہے کہ وہ سچائی اختیار کریں، اور جھوٹ کو ترک کردیں۔

اس عقیدہ کو تمام جمہور امت نے بالکل رد نہیں کیا ہے، بلکہ فقہائے احناف تو حسن و قبح کے عقلی ہونے کے قائل ہیں، البتہ ان کے اور معتزلہ کے طرزِ تعبیر میں تھوڑا فرق ہے تفصیل اصول فقہ کی عام کتابوں میں موجود ہے۔

یہ تو ان کے اصولی مباحث ہیں، جن میں تمام معتزلہ کا اتفاق ہے، لیکن ان کے علاوہ بعض اور مباحث ہیں، جن میں معتزلہ مختلف گروہوں میں بٹ گئے تھے، شہرستانی نے ان کے دس گیارہ فرقوں کا ذکر کیا ہے، مثال کے لیے حضرات شیخین کی افضلیت کے بارے میں بصرہ کے معتزلہ شیخین کو حضرت علیؓ سے افضل مانتے تھے، مگر بغداد کے معتزلہ حضرت علیؓ کو افضل سمجھتے تھے، اسی طرح حسن و قبح کے بارے میں بعض معتزلہ اشاعرہ کے ہم نوا ہوگئے تھے۔

عہد تبع تابعین کے مشہور معتزلی علماء اس عہد کے مشہور معتزلی علماء میں واصل بن عطا، عمرو بن عبید، نظّام، جاحظ، ابو الہذیل، ہشام الفوطی، بشر بن معتمر، ابو الحسین الخیاط، قاضی ابو دُواد وغیرہ،

معتزلہ کے کارنامے یہاں پر اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے، معتزلہ کے چند فلسفیانہ خیالات اور عقائد میں ان کی موشگافی کو نظر انداز کرکے اگر دیکھا جائے، تو اس فرقہ کے لوگوں نے علم دین کی جو بے بہا خدمات انجام دی ہیں وہ کسی دوسرے گمراہ فرقہ نے نہیں دیں، خاص طور تفسیر، علوم القرآن اور ادب میں انھوں نے جو نقوش چھوڑے ہیں، ان کو امت نے ہمیشہ

اپنے سینوں سے لگائے رکھا، انھوں نے شیعوں کی طرح نہ تو الگ امت بنائی، نہ نئی تفسیر نئی حدیث، نئی فقہ ایجاد کی، بلکہ انھوں نے اسلامی علوم کی خدمت میں ہمیشہ امت کا ساتھ دیا، یہ اور بات ہے کہ قرآن کی تعبیر میں بعض جگہ ان سے غلطی ہوئی ہے، لیکن ان کی غلطی ایسی ہی تھی جیسی کہ خود اشاعرہ اور ماتریدیہ سے بعض مسائل میں غلطی ہوئی ہے، اس کی تفصیل کیلئے ایک مستقل مضمون درکار ہے، اس لیے صرف اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

علمی فتنے | ان مذکورۂ بالا فتنوں کے علاوہ اس عہد میں بعض علمی فتنے بھی پیدا ہوئے، یہ فتنے دو طرح کے تھے، ایک تو فلسفیانہ اور مشرکانہ علوم و فنون کی کتابوں کے ترجمہ کا فتنہ دوسرے ان علوم کی مدد سے مختلف فرقوں کا اپنے خیالات کا اسلامی علوم میں داخل کرنے کی کوشش اور اپنے اپنے مزعومات کے مطابق قرآن و سنت کی سادہ تعلیم کی توجیہ و تاویل،

غیر اسلامی کتابوں کے ترجمہ کا فتنہ | گو اسلام دوسری قوموں کے علوم و فنون سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دیتا ہے، اس کا عام حکم ہے کہ حکمت و دانائی مومن کی کھوئی ہوئی چیز ہے، وہ جہاں پائے اس کو اپنے دامن میں سمیٹ لے لیکن اسلامی مملکت میں یونانی فلسفہ و نجوم، عجم کی قصہ گوئی اور موسیقی، ہندوستانی ویدانت کی کتابوں کا ترجمہ ایسے وقت میں شروع ہوا، جب شخصی حکومت کی بے راہ روی اور عجمیت نوازی کی وجہ سے پورا معاشرہ سیاسی اور مذہبی انتشار سے دوچار تھا، چنانچہ ان علوم و فنون کے ترجمہ سے عربی زبان ضرور مالا مال ہوئی، لیکن ان کی وجہ سے سادہ اور ٹھیٹ اسلامی ذہنیت اور دینی علوم کو بڑا نقصان پہنچا، انہی علوم کے نتیجہ میں نئے نئے خیالات اور مسائل پیدا ہوئے، اور پھر انہی کی وجہ سے امت میں نہ جانے کتنے نئے نئے فرقے اور گروہ بن گئے، آپ اگر اسلامی فرقوں کی تاریخ پر ایک سرسری نظر بھی ڈالیں گے، تو آپ کو نظر آئے گا، کہ ان سب کو غذا انہی

غیر اسلامی علوم اور مشرکانہ فلسفہ سے ملتی تھی، اوپر جہمیت اور اعتزال وغیرہ کے ذکر میں اس کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے، خاص طور پر شیعوں اور باطنیوں کے مذہب کی بنیاد تو حکمت شریعت کے بجائے سراسر حکمت یونان پر ہے، حکمت شریعت کا پردہ اس پر اس لیے ڈالا گیا تھا کہ اس عہد میں کوئی تحریک یہ نقاب ڈالے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی تھی، اس عہد میں نقل و ترجمہ کا جو کام ہوا اس کی تفصیل تو بڑی لمبی ہے، مختصر طور پر اس کا تذکرہ سن لیجئے،

یوں تو اموی دور میں بھی نقل و ترجمہ کا کام ہوا، خاص طور پر ہشام بن عبد الملک اور خالد اموی نے اس میں بڑا حصہ لیا، لیکن اس سلسلہ میں اصل کام عباسی دور میں ہوا، سب سے پہلے منصور نے اس کی طرف توجہ کی، پھر ہارون نے بیت الحکمۃ کے نام سے اس کے لیے ایک ادارہ قائم کیا، اسی کے عہد میں برامکہ پیدا ہوئے جنھوں نے غیر اسلامی خیالات اور علوم کی ترویج میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا، پھر مامون نے بیت الحکمۃ کو ترقی دی اور اس کام کو نقطۂ عروج تک پہنچایا، آل برمک کی علم دوستی قابل قدر چیز ہے، لیکن انکا نقطۂ نظر کیا تھا، اس کو مشہور لغوی ادیب اصمعی کی زبان سے سنیے۔

اذا ذکر الشرک فی مجلس اتنا	یعنی جب کسی مجلس میں شرک کی باتیں ہوتی ہیں تو آل
وجوہ بنی برمک واذا تلیت عندھم	برمک کے چہرے کھل جاتے ہیں اور جب قرآن کی
ایات اتوابالاحادیث عن مزدک	آیات کی تلاوت کیجاتی ہو تو یہ مزدک کی باتیں شروع

اسلامی عقائد میں بحث و مباحثہ بھی انہی برامکہ کا فیض ہے مسعودی نے لکھا ہے،

وکان یحیی بن خالد ذا بحث	یحیٰی بن خالد صاحب بحث و نظر تھا،
ونظر وله مجلس یجتمع فیه	اس کی مجلس میں مسلمان متکلمین (یعنی
من اهل الکلام من اهل الاسلام	معتزلہ) اور غیر مسلموں کا مجمع

وغیرھم۔ رہا کرتا تھا۔

مامونؔ کے عہد میں اس فتنہ نے سیلاب کی صورت اختیار کرلی، ہزاروں لاکھوں روپیہ خرچ کرکے اس نے آرمینیہؔ، شامؔ، مصرؔ اور سائپرسؔ سے فلسفہ، ہئیت اور نجوم کی کتابیں جمع کرائیں، اسکے عہد میں جو لوگ اس کام پر مامور تھے، ان کی تعداد ایک درجن سے زیادہ تھی، اور جن کو ہزار دو ہزار تک ماہوار تنخواہیں ملتی تھیں، مثلاً حجاجؔ بن یوسف کوفی، قسطاؔ بن لوقا، حنینؔ بن اسحاقؔ، سہلؔ بن ہارون، یعقوبؔ کندی، یوحناؔ، ماسویہؔ وغیرہ، مامونؔ کی اس فلسفہ نوازی کے نتیجہ میں اہل اعتزال کو اس کے دربار میں اتنا درخور حاصل ہوا کہ یہی مسلک اسلامی حکومت کا مذہب قرار پاگیا، جس کے خلاف علماء اور خاص طور پر امام احمد بن حنبلؔ نے اپنی جان کی بازی لگا کر جدوجہد کی اور خدا نے ان کو کامیاب بنایا۔

اسلامی علوم میں فلسفیانہ خیالات کی آمیزش اور ان کے مطابق اسلامی مسائل کی توجیہ و تاویل

تبع تابعین رحمہم اللہ کو اس فتنہ کے ساتھ ایک دوسرے علمی فتنہ سے بھی سابقہ پڑا، اس فتنہ کو "وضع و تلبیس" کہہ سکتے ہیں، اس وقت تک اسلامی ملکوں میں جتنے فرقے پیدا ہو چکے تھے، گو وہ اصول و فروع میں ایک دوسرے سے شدید اختلاف رکھتے تھے، لیکن اس "فتنہ وضع و تلبیس" میں سب متفق تھے، اگر ایک طرف انھوں نے وضع روایات کی تحریک شروع کی تو دوسری طرف اسلامی عقائد اور اصول میں فلسفیانہ موشگافی کرکے ریب و شک پیدا کرنے کی سعی کی، پھر تیسری طرف انھوں نے قرآن کی بے شمار آیات اور احادیث نبوی کی من مانی توجیہ و تاویل کرکے وہ مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی، جو نہ تو صحابہ و تابعین نے سمجھا تھا، اور نہ وہ روحِ شریعت سے میل کھاتا تھا۔ ان تمام گوشوں کی تفصیل کا موقع نہیں ہے، اس لیے چند اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

احادیث نبویؐ کی تحدیث اور قدیم اسرائیلی قصص کی روایت بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ عہد صحابہ تک اس پر قانونی اور اخلاقی دونوں طرح کی پابندی عائد تھی، اس لیے ہر شخص اس کی جرات نہیں کرتا تھا، حضرت عمرؓ کے سامنے جب کوئی روایت بیان کی جاتی تھی، تو وہ اس پر اکابر صحابہ تک سے شہادت طلب کرتے تھے، اس قانونی پابندی کے ساتھ عہد صحابہ تک روایت حدیث کی اہمیت اور اس کی ذمہ داری کا احساس بھی عام تھا، چنانچہ بعض جلیل القدر صحابہ اسی ذمہ داری کے شدتِ احساس کی بنا پر روایت حدیث سے گریز کرتے تھے۔

مگر بعد میں نہ اس پر سخت قانونی گرفت باقی رہی اور نہ وہ پہلا سا اخلاقی اثر رہا، پھر رواۃ حدیث کو معاشرہ میں عزت و شرف کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اس لیے اہل و صاحب کمال لوگوں کے ساتھ بعض نااہل بھی اس مجد و شرف میں شریک و سہیم بننے کے لیے اس منصب پر متمکن ہو گئے، اور انھوں نے نہایت غیر ذمہ دارانہ طور پر احادیث نبوی اور اسرائیلی قصوں کی روایتیں شروع کر دیں، خاص طور پر پیشہ ور واعظوں اور قصہ گویوں نے گرمی مجلس کی خاطر نہ جانے کتنی بے سروپا روایتیں عوام میں پھیلا دیں، پھر اسی کے ساتھ اموی اور عباسی کش مکش، عربی و عجمی عصبیت اور مختلف فرقوں نے اپنی اپنی تائید کیلئے نہ جانے کتنی روایتیں گھڑ ڈالیں، اور وہ روایتیں زبان زد خاص و عام ہو گئیں، اس فتنہ کی پوری تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، چند واقعات سے اس کی وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اس عہد کے معروف محدث حماد بن زید فرماتے تھے۔

وصنّف الزنادقة على رسول الله صلى الله عليه وسلم اثنى عشر الف حديث[1]	زنادقہ نے تقریباً بارہ ہزار جعلی حدیثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیں۔

---

[1] الموضوعات الکبیر

ہارون کے سامنے ایک گمراہ و بے دین شخص لایا گیا، اس نے اس کے قتل کا حکم دیدیا، قتل کا حکم سن کر اس نے کہا کہ آپ مجھے تو قتل کر دیں گے، لیکن ان چار ہزار روایتوں کو کیا کریں گے، جو میں نے لوگوں میں پھیلا دی ہیں، جن کا ایک حرف بھی صحیح نہیں ہے۔

عبد الرحمٰن واسطی بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے موت کے وقت کہا کہ میں نے ستر حدیثیں صرف حضرت علیؓ کی فضیلت میں وضع کی ہیں، (ص ۳۰) ابن جوزی رحمہ اللہ کہتے ہیں،

معظم البلاء فی وضع الحدیث من القصاص لانھم یریدون احادیث ترقق وتنفق[1]

وضع حدیث کا سب سے بڑا فتنہ واعظوں اور قصہ گویوں کی وجہ سے پیدا ہوا، اس لیے کہ یہ ایسی حدیثیں گھڑتے تھے جو دلوں میں رقت پیدا کرتی تھیں، اور آسانی سے رواج پذیر ہو جاتی تھیں۔

ایک شخص محمد بن شجاع ثلجی تھا، جو تشبیہ سے متعلق بہت سی احادیث وضع کرکے محدثین کی طرف منسوب کر دیتا تھا۔

آیات قرآنی اور احادیث نبوی کی غلط توجیہ و تاویل،

شیعہ، باطنیہ، خوارج، مرجیہ، قدریہ اور جہمیہ وغیرہ جتنے اسلامی فرقے پیدا ہوئے ان سب نے اپنے اصول کی بنیاد آیات قرآنی اور احادیث نبوی کو بنایا، مگر ان کی ترجمانی اور تاویل اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق کی جس کی کچھ تفصیل اوپر گذر چکی ہے، اور کچھ یہ ہے، متکلمین جن میں اکثریت اہل اعتزال کی تھی، ان کے بارے میں ابن قتیبہ نے لکھا ہے،

فسروا القرآن باعجب تفسیر یریدون ان یردوہ الی

یہ قرآن کی عجیب عجیب تفسیریں کرتے تھے، اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اس کو

---

[1] الموضوعات الکبیر ص ۳۰

مذاهبهم ويحملوا المتاويل — ان کے مذہب کی تائید ہو اور اسکے موقع

على محلهم[1] — ومحل کے خلاف اس کی تاویل کرسکیں،

اس کے بعد انھوں نے متعدد آیات کی تفسیر پیش کرکے اس کی تفصیل کی ہے، اسی طرح ابن فورک متوفی ۴۰۶ھ اپنی کتاب مشکل الحدیث میں لکھتے ہیں کہ خدا کی ذات وصفات اور مشیت وقدرت کے سلسلہ میں متشابہ آیات واحادیث کی تفسیر میں جمہور امت نے صحابہ وتابعین کی جوسادہ روش اختیار کی تھی، اس پر یہ تمام فرقے سخت اعتراض کرتے تھے، اس لیے کہ یہ چیز ان کی خواہش کے خلاف تھی[2]۔

غرض یہ کہ انھوں نے یہی نہیں کہ متشابہ آیات واحادیث سے غلط استدلال کیا، بلکہ جمہور امت نے اس کا جو مفہوم متعین کیا تھا، اس پر بھی وہ اعتراض کرتے تھے۔

تبع تابعین رحمہم اللہ نے ان تمام فتنوں کا مقابلہ کیا | حضرات تبع تابعین نے ان تمام فتنوں کا منفی ومثبت دونوں طریقہ پر مقابلہ کیا، ان میں سے کتنے فتنوں کا توزور انھوں نے توڑ دیا اور کچھ خاص اسباب کی بنا پر جن کا زور ختم نہ ہوسکا کم از کم ان کے اثرات سے جمہور امت کو انھوں نے محفوظ کرلیا، اس کام کے سلسلہ میں حضرات تبع تابعین بھی دوگروہوں میں بٹ گئے تھے، گو ان دونوں گروہوں نے اس میں حصہ لیا، مگر بعض اسباب کی بنا پر ان کے درمیان ایک خلیج سی حائل ہوگئی تھی، جو بعض بزرگوں کی کوشش سے جلد ہی پٹ بھی گئی، وہ دوگروہ محدثین اور فقہا کے تھے، یہ دونوں بعض مسائل کی تعبیر میں اختلاف کے باوجود ان فتنوں کے مقابلہ میں متحد تھے، البتہ دونوں کے کام کی نوعیت جدا تھی، ابن فورک نے لکھا ہے۔

فرقة منها هي اهل النقل و — ان میں سے ایک گروہ اہل نقل وروایت کا

---

[1] الموضوعات الکبیر ص ۱۳ [2] مشکل الحدیث ص ۴

والدراية الذين تشتد عنايتهم
بنقل السنن وتتوفر دواعيهم
على تحصيل طرقها وحفظ اسانيدها
والتمييز بين صحيحها وسقيمها
فغلب عليهم ذلك ويعرفون به
وينسبون اليه

تھا جن کی ساری توجہ احادیث نبوی
کی روایت ونقل پر مرکوز تھی، انھون نے
اپنی ساری کوشش اس کے طرق اور اسانید
کے جمع کرنے اور صحیح وسقم کے چھانٹنے
مین لگادی چنانچہ ان پر یہی کام غالب آگیا
اور اسی نام سے وہ مشہور ہوے اور
اسی کی طرف ان کی نسبت کی جاتی تھی،
(یعنی اہل نقل وروایت)

وفرقة منها يغلب عليهم تحقيق
طرق النظر والمقاييس
والابانة بترتيب الفروع على
الاصول ونفي شبه الملبسين عنها
وايضاح وجوه الحجج والبراهين
على حقائقها.

اور ایک گروہ پر فکر ونظر کی راہون
کی تحقیق وجستجو کا شوق اور قیاس و
اجتہاد اور فروع کو اصول کے مطابق
مرتب کرنے اور ان پر شبہ واعتراض
کرنے والون کے شبہ واعتراض دور کرنے
اور ان کے دلائل وشواہد کی پردہ کشائی

(یعنی اہل نظر واجتہاد)

ان دونون گروہون کے کام کی نوعیت ابن فورک کے نزدیک یہ تھی۔

فالفرقة الاولى للدين كالخزنة
للملك والفرقة الاخرى
كالبطارقة التي تذب عن خزائن
الملك اعترض عليها والمعترض لها

تو دین کے لیے پہلے گروہ کی حیثیت
بادشاہ کے خزانے کے خزانچیوں اور
محاسبوں کی ہو اور دوسرے گروہ کی حیثیت
پاسبانوں اور نگہبانوں کی ہو جو بادشاہ کے

خزانے کو دست درازی اور نظر بد ڈالنے

والوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلے گا کہ عہد تبع تابعین کے تمام ہی محتاط اور قابل اعتماد محدثین اور فقہانے کم وبیش ان فتنوں سے دین اور اہل دین کو محفوظ کرنے کی کوشش کی، اگر آپ ایک طرف فقہائے تبع تابعین مثلاً امام مالک، امام ابو یوسف، اور امام محمد کے حالات میں یہ پڑھیں گے کہ وہ لوگوں کو عقائد اور صفات باری کے سلسلہ میں کیف وکم اور تعین وتقید سے روکتے تھے، تو دوسری طرف ممتاز اہل نقل و روایت تبع تابعین جیسے سفیان بن عیینہ، یحیی بن معین، اسحاق بن راہویہ اور سفیان ثوری وغیرہ کو ان مسائل میں ان کا ہم نوا پائیں گے، ان دونوں گروہوں کے دو دو ایک ایک حضرات کے اقوال ہم یہاں نقل کرتے ہیں، امام ابو یوسف نے اپنے تلامذہ کو جو جامع نصیحت کی تھی، اس کا کچھ حصہ یہ ہے:-

اصول دین کے معاملہ میں شک، لڑائی اور کج بحثی کو چھوڑ دو اسلیے کہ دین بالکل واضح اور روشن ہے، خدا نے اس کے فرائض و واجبات متعین کر دئے ہیں اور اسکے حدود و قیود بھی مقرر کر دیئے ہیں، حلال کو حلال اور حرام کو حرام کر دیا ہے جیسا کہ اس نے خود فرمایا ہے کہ میں نے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت کو تمھارے اوپر تمام کر دیا، اور اور تمھارے لیے دین اسلام کو پسند کر لیا تو اس کے حلال کو حلال سمجھو اور حرام کو حرام سمجھو، قرآن کی محکم آیات پر عمل کرو اور آیات پر ایمان و یقین رکھو اور اس کے اندر جو امثال ہیں ان سے عبرت حاصل کرو، اگر دین (عقائد) میں کج بحثی کوئی تقوے کی بات ہوتی تو اس کی طرف سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپکے بعد آپکے اصحاب سبقت کرتے تو کیا انھوں نے کبھی عقائد اور اصول دین میں بحث و مباحثہ . . .

کیا ؟ اگر انھوں نے اختلاف اور بحث و مباحثہ کیا تو ان فقہی مسائل میں جن کا عملی زندگی سے ہے، مثلاً نماز، حج، طلاق، حلال و حرام وغیرہ انھوں نے عقائد، صفات باری اور اصول دین میں کبھی اختلاف اور منازعہ نہیں کیا۔ (دیکھئے اصل کتاب ص ۸۵)

امام محمد کے الفاظ ملاحظہ ہوں: مشرق سے مغرب تک تمام فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن اور ان احادیث پر جن کو ثقات نے روایت کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات پر بغیر کسی تفسیر، تشبیہ اور توصیف کے ایمان رکھنا چاہیے جو شخص ان چیزوں کی تفسیر و توضیح کرتا ہے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف کے طریقہ سے علیحدہ روش اختیار کرتا ہے، جس شخص نے جہم بن صفوان کی طرح بات کی وہ سلف کی جماعت سے خارج ہو گیا اس لئے کہ وہ خدا کو ایسی صفات سے متصف کرتا تھا جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

ان مسائل میں اسی طرح کا جواب آپ امام مالک، اوزاعی، ابن مہدی، سفیان ثوری اور امام احمد بن حنبل سے بھی سنیں گے، کتاب میں تفصیل موجود ہے، عام طور پر ان مسائل میں قیل و قال سے گریز کرنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ محدثین اور فقہا اس سے درماندہ تھے، بلکہ اس میں کئی دینی مصلحتیں تھی۔

ایک یہ کہ اسلام زندگی کے لیے ایک اخلاقی پروگرام اور عمل و تحریک پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، اگر اس کا دامن فلسفیانہ موشگافیوں اور بے نتیجہ دقیقہ سنجیوں میں الجھا دیا گیا، تو پھر وہ بھی دوسرے مذاہب کی طرح ایک فلسفہ ہو کر رہ جائے گا، اور عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہ جائے گا، اور یہ چیز سراسر اس کی روح کی منافی تھی،

دوسرے یہ کہ اگر یہ حضرات ان مسائل میں الجھ جاتے، تو ان میں الجھانے والوں کا مقصد پورا ہو جاتا، جس کے لیے یہ فتنے پیدا ہوئے تھے، یعنی دین اور علم دین کی تدوین و ترتیب

اور ترویج و اشاعت میں یہ حضرات جس یکسوئی کے ساتھ لگے ہوئے تھے وہ ختم ہو جاتی، اور وہ قیمتی کام نہ ہو پاتا جو ہوا جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

تیسرے یہ کہ منفی طور پر ان کا اس فتنہ سے دور رہنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ عام معاشرہ میں ان مسائل میں بحث و مباحثہ کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا، اور معاشرہ کے عام افراد ان سے اپنا دامن بچائے رکھنا ہی پسند کرتے تھے۔ اگر یہ حضرات ان موشگافیوں میں پڑ جاتے، تو پھر عوام کو ان سے بچانا مشکل تھا۔

ان اسباب و وجوہ کی بنا پر وہ زیادہ تر ان نئے نئے فلسفیانہ مباحث اور مسائل سے دور رہنے کی ترغیب دیتے تھے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اگر کوئی ضروری موقع آجاتا جب بھی وہ اس کا جواب نہیں دیتے تھے، آپ امام اوزاعی، امام احمد بن حنبل اور بعض دوسرے بزرگوں کے حالات میں پڑھیں گے کہ انھوں نے شرعی حدود میں متعدد اہل فرق کے افراد سے بحث و مباحثہ کر کے بھی ان کو قائل کرنے کی کوشش کی، امام بخاری جو تبع تابعین کے سب سے بڑے علمی وارث ہیں، ان کی کتاب سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ انھوں نے ان فرقوں کے خیالات کی تردید کرنے میں کتنی کد و کاوش کی تھی، البتہ استدلال میں انھوں نے متکلمین کی روش کے بجائے سلف کی روش اختیار کی ہے۔

یہاں پر دو اور باتوں کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے ایک یہ کہ ان فرقوں میں بھی بعض افراد ایسے تھے، جو خلوص سے یہ سمجھتے تھے کہ ان نئے مسائل و مباحث کا عقلی طور پر بھی جواب دیا جاسکتا ہے، اس لیے انھوں نے ان کا جواب دیا، اور انہی کو ہم متکلمین اسلام کے نام سے یاد کرتے ہیں، ابتدا میں یہ کام عام طور پر معتزلہ نے انجام دیا مگر بعد میں اس میں اہل سنت والجماعت کے بعض افراد بھی شریک ہو گئے، مگر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ اس سے نہ تو کوئی

عملی فائدہ اسلام کو پہنچا اور نہ تبلیغی و دعوتی۔

دوسری بات یہ کہ عباسی خلفاء نے گو ان فرقوں کو ذہنی غذا پہنچانے میں بالقصد یا بلا قصد بڑی مدد کی لیکن اس کا اظہار نہ کرنا احسان ناشناسی ہوگی کہ ان میں بعضوں نے ان افراد کے خلاف قانونی کارروائی بھی کی، اگرچہ یہ کارروائی زیادہ تر اس وقت ہوتی تھی جب عوام میں یہ اپنے خیالات پھیلانے کی کوشش کرتے تھے، اور اس سے کسی عوامی شورش پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا تھا، ورنہ دربار میں زیادہ تر "رواداری" کا سلوک ہوتا تھا، الا ماشاء اللہ

فتنۂ وضع حدیث کا مقابلہ | اوپر فتنۂ وضع حدیث کا مختصر ذکر کیا گیا ہے، لیکن اس سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ یہ فتنہ دین اور علم دین کے لیے کتنا بڑا خطرہ تھا۔ اس فتنہ کا مقابلہ حضرات تبع تابعین رحمہم اللہ نے کئی طرح سے کیا، سب سے پہلے انھوں نے صحیح اور غلط، مستند اور موضوع تمام روایتوں کے سارے ذخیرہ کو جمع کرنے کی کوشش کی، اور جمع کرکے پھر انھوں نے قرآن کی ہدایات، صحیح احادیث اور مختلف سلسلۂ اسناد کی روشنی میں ان کو پرکھا اور پھر صحیح وسقیم کو علحدہ کرکے رکھدیا امام سفیان ثوری کا یہ قول حاکم نے نقل کیا ہے کہ

> کبھی کسی حدیث کی صحت اور عدم صحت کے متعلق فیصلہ کو ملتوی کرنے کیلئے بھی ہم بعضوں کی روایتوں کو سن لیتے ہیں، اور بعضوں کی بیان کی ہوئی روایتوں کو ہم جانتے ہیں کہ مستحق توجہ نہیں ہیں، لیکن پھر بھی بیان کرنے والے کی روش اور مسلک کا پتہ چلانے کے لیے ہم اس سے روایت کرتے ہیں[1]

حاکم ہی نے ایک دوسرا واقعہ امام احمد بن حنبل کی زبانی یحییٰ بن معین کا نقل کیا ہے،

---

[1] معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۳۵۔

وہ کہتے ہیں کہ جس زمانہ میں ہم لوگ یمن میں تحصیل حدیث میں لگے ہوئے تھے، ایک دن ابن معین کو دیکھا کہ وہ گوشہ میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے ہیں، جب کوئی آدمی سامنے آتا ہے تو اسے چھپا دیتے ہیں، میں نے پوچھا تو فرمایا کہ حضرت انس رضؓ کے نام سے جعلی حدیثوں کا ایک مجموعہ ابان کی روایت سے جو مروج ہے اسے نقل کر رہا ہوں، امام احمد نے ان سے کہا کہ آخر ان جعلی اور موضوع روایتوں کو آپ کیوں نقل کر رہے ہیں، انھوں نے فرمایا کہ

میں جانتا ہوں کہ یہ ساری روایتیں جعلی ہیں، مگر اس کے لکھنے سے میری غرض یہ ہے کہ اگر کوئی ابان کی جگہ کسی معتبر راوی کا نام داخل کر کے لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنا چاہے گا، تو میں یہ کہہ کر اس غلط فہمی کا ازالہ کر سکوں گا کہ ان روایتوں کا واضع ابان ہے، (معرفہ ص ۷)

ابن معین کا ایک اور قول بھی کتاب میں ملے گا۔

اوپر یہ ذکر آچکا ہے کہ ایک بددین کو ہارون نے قتل کرنے کا حکم دیا، اس نے کہا کہ امیر المومنین آپ میرے قتل کا حکم کیوں دیتے ہیں، ہارون نے کہا کہ اللہ کے بندوں کو تیرے فتنے سے بچانے کے لیے، بولا کہ آپ قتل کر کے کیا کریں گے، میں نے جو چار ہزار روایتیں وضع کر کے عوام میں پھیلادی ہیں، ان کا آپ کے پاس کیا علاج ہے، ہارون بولا کہ

این انت یا زندیق عن عبد اللہ	اے ملعون تو کس خیال میں ہے عبد اللہ
بن مبارک و ابن اسحاق	ابن المبارک اور ابو اسحاق فزاری
الفزاری ینخلانہ فیخرجانہ	ان تمام جعلی حدیثوں کو چھلنی میں چھان کر
حرفاً حرفاً [1]	ان جعلی روایتوں کا ایک ایک حرف علحدہ کر کے

[1] کتاب الموضوعات ملا علی قاری ص ۱۴۳۔

دوسری کوشش ان حضرات نے یہ کی کہ تحدیث کا ایک معیار مقرر کیا، روایت و درایت کے اصول وضع کیے، ان حضرات کے انہی اصولوں پر فنِ اسماء الرجال کی بنیاد کھڑی ہوئی، اس سلسلہ میں اس عہد کے تمام ہی محدثین نے حصہ لیا، مگر ان میں حضرت ابن مبارک، امام شعبہ، ابن معین اور سعید القطان وغیرہ زیادہ ممتاز ہیں، امام نووی نے صالح بن محمد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:۔

اول من تکلم فی الرجال شعبۃ ثم تبعہ یحیی القطان ثم احمد بن حنبل ویحیی بن معین،[۱]	سب سے پہلے حدیث کے راویوں پر امام شعبہ نے کلام کیا، پھر یحیی قطان اور ان کے بعد ابن معین اور ابن حنبل وغیرہ نے اس میں حصہ لیا،

مزید تفصیل کتاب میں ملیگی۔

خاص طور پر درایت کے معیار پر کسی روایت کا جانچنا روایت کے معیار پر جانچنے سے بھی مشکل ہے، روایت کے معیار پر جانچنے کا دارومدار قوت حافظہ پر ہے، اگر خدا نے اس نعمت سے نوازا ہے تو تھوڑی سی ذکاوت و ذہانت کے ساتھ کسی روایت کے مختلف سلسلۂ سند اور راوی کے عام حالات سے واقفیت کی روشنی میں فیصلہ کر لیا جا سکتا ہے، لیکن درایت کا فیصلہ ذرہ مشکل ہے، درایت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی روایت کی خارجی حیثیت پر نہیں بلکہ اس کی معنوی اور داخلی حیثیت پر بھی نظر رکھی جائے کہ اس میں کوئی بات اسلام کی روح یا قرآن کی صریح تعلیم کے خلاف تو نہیں ہے، خواہ سند کے اعتبار سے اس میں کوئی عیب نہ ہو، ظاہر ہے کہ اس میں قوت حافظہ وسعت علم کے ساتھ دقت نظر کی بھی ضرورت ہوتی ہے، ائمۂ حدیث کی اصطلاح میں اسی کا

---

[۱] تہذیب الاسماء

دوسرا نام علم علل الحدیث ہے، اس لیے اس فن کے جاننے والے امت میں بہت کم پیدا ہوئے، زمرۂ تبع تابعین میں اس میں سب سے زیادہ ممتاز ابن مہدی اور ابن مدینی تھے، ابن مہدی نے درایت کی ایک بہترین مثال دی ہے۔

ایک شخص نے ان سے پوچھا کہ ابو سعید آپ کسی روایت کو قوی اور کسی کو ضعیف قرار دیدیتے ہیں، کسی پر صحت اور کسی پر عدم صحت کا حکم لگا دیتے ہیں، آخر آپ کے پاس وہ کونسا معیار ہے جس پر پرکھ کر آپ یہ حکم لگاتے ہیں، فرمایا کہ جب تم کسی صرّاف یا روپیہ کے پارکھ کے پاس روپئے وریز گاری لے جاتے ہو تو وہ دیکھتے ہی کھرا اور کھوٹا الگ کرکے رکھدیتا ہے تو کیا تم اس سے پوچھتے ہو کہ یہ حکم کیوں اور کیسے لگایا۔ یا بے چون وچرا تسلیم کر لیتے ہو، بولا نہیں تسلیم ہی کرلینا پڑتا ہے، فرمایا کہ یہی حال روایت کا بھی ہے، مگر یہ منصب ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لیے بڑی ممارست، اہل علم کی صحبت، تبادلۂ خیال اور وفور علم کی ضرورت ہوتی ہے۔

معرفت حدیث کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ "معرفت حدیث ایک طرح کا الہام ہے"، اس معیار پر انھوں نے صرف غیر ذمہ دار راویوں ہی کو نہیں پرکھا بلکہ اگر کسی شیخ وقت اور محدث معروف سے بھی کوئی غلطی ہو جاتی تھی، تو وہ اس کو ظاہر کر دیتے تھے، ان حضرات کی انہی کوششوں کے نتیجہ میں جو نااہل اس منصب پر فائز ہو گیے تھے، ان کا پردہ فاش ہو گیا، اور ان کو خواص ہی نہیں بلکہ عوام تک پہنچانے لگے، اور غلط اور جعلی روایتوں کا سارا سرمایہ بے قیمت ہو کر رہ گیا، گو اب بھی حدیث وتفسیر کی کتابوں میں بعض روایتیں ایسی ملیں گی، مگر ان کے سقم وعیب کو بھی بعد کے

محدثین نے واضح کر دیا ہے۔

علمی اور عملی کارنامے اب تک زیادہ تر ان کے منفی کارناموں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، انھوں نے جو خالص مثبت کارنامے انجام دیئے، ان کی طرف بھی کچھ اشارے یہاں کر دیے جاتے ہیں، پوری تفصیل کتاب میں ملے گی۔

علمی کارنامے ان کے علمی کارناموں میں سب سے بڑا کارنامہ علوم دینیہ کی تدوین و ترتیب ہے، گو یہ کام عہد صحابہ سے لے کر عہد تابعین تک برابر جاری رہا، لیکن اس عہد میں اس کام میں اتنی ترقی ہوئی کہ بعد کی صدیوں میں اس پر بہت کم اضافہ ہو سکا۔

تابعین اور تبع تابعین کے کام میں فرق، عہد تابعین میں بھی علوم دینیہ کی تدوین و ترتیب کثرت سے ہوئی، لیکن ابھی تک ان علوم کی نہ تو فنی تقسیم ہوئی تھی، یعنی تفسیر، حدیث، فقہ، مغازی، تاریخ، رجال و لغت وغیرہ فنون کے نام علیحدہ علیحدہ نہیں پڑے تھے، اور نہ ان کی علیحدہ علیحدہ تدوین ہوئی تھی، اس وقت عام طور پر ایک امام اپنے درس میں تفسیر، حدیث، تاریخ و مغازی اور ادب و لغت غرض ہر طرح کے مسائل سے گفتگو کرتا تھا اور ان کے تلامذہ ان کے افادات کو اپنے اپنے صحیفوں میں لکھ لیا کرتے تھے اور وہی پھر دوسروں تک پہنچ جاتے تھے گویا ان کی حیثیت اساتذہ کے نوٹس یا ذاتی ڈائری کی ہوتی تھی، بعض تابعین نے فنی تقسیم کے اعتبار سے بھی کتابیں لکھیں مگر انہیں سے مشکل ہی سے دو چار کتابیں اس وقت موجود ہونگی، لیکن عہد تبع تابعیں میں ان میں سے ہر فن کی علیحدہ علیحدہ ترتیب و تدوین ہوئی اور اس اونچے پیمانہ پر ہوئی، کہ وہ کتابیں آج تک اسی صورت میں موجود ہیں، اس کی پوری تفصیل مختلف ائمہ کے حالات میں ملیگی، یہاں ایک مجمل تبصرہ کر دیا جاتا ہے، امام ذہبی نے ۱۴۳ھ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

في سنة ١٤٣ شرع علماء
الإسلام في هذا العصر في
تدوين الحديث والفقه
والتفسير فصنف ابن جريج[1]
بمكة ومالك الموطا بالمدينة
والأوزاعي بالشام وابن
عروبة وحماد بن سلمة و
غيرهما بالبصرة ومعمر باليمن
وسفيان الثوري بالكوفة
وصنف ابن إسحاق المغازي و
صنف أبو حنيفة[2] رحمه الله
الفقه والرأي ثم بعد يسير صنف
هشيم والليث وابن لهيعة ثم
ابن مبارك وأبو يوسف وابن
وهب وكثر تدوين العلم
وتبويبه ودونت كتب العربية
واللغة والتاريخ وأيام الناس
وقبل هذا العصر كان الأئمة
يتكلمون من حفظهم أو يروون
العلم من صحف غير مرتبة[3]

۱۴۳ھ سے عام طور پر علمائے اسلام نے
اس عہد میں حدیث، فقہ و تفسیر ہر ایک کی الگ الگ
تدوین شروع کر دی، مکہ میں ابن جریج نے مدینہ
میں امام مالک نے شام میں امام اوزاعی
نے بصرہ میں ابن عروبہ اور حماد بن سلمہ
نے یمن میں معمر نے اور کوفہ میں سفیان
ثوری نے تصنیف و تالیف کا کام شروع
کر دیا، ابن اسحاق نے مغازی پر اور امام
ابو حنیفہ نے فقہ و رائے پر تصنیف کی،
پھر کچھ ہی مدت بعد ہشیم بن لہیعہ نے،
پھر ابن مبارک، امام ابو یوسف، ابن وہب
وغیرہ نے اس مبارک کام کو اپنے ہاتھ
میں لیا، پھر کثرت سے ہر فن میں تصنیفات
کا اور اس کی تدوین و ترتیب کا سلسلہ شروع
ہوا اور عربی ادب، لغت، تاریخ اسلام اور
قدیم تاریخ پر بے شمار کتابیں مدون ہو گئیں،
اور اس عہد سے پہلے عام طور پر ائمہ فن
یا تو اپنے حفظ و استحضار سے کسی فن پر کلام کرتے
تھے یا پھر غیر مرتب مجموعوں اور صحیفوں سے

---

۱ کتاب میں ص ۲۳۹ پر مزید تفصیل ملے گی ۲ یہ دونوں حضرات گویا تابعین ہی میں ہیں لیکن انکا عہد تبع تابعین ہی میں شروع ہوا
اور انہی کے ذریعہ دنیا انکی تصنیفات سے واقف ہوئی ۳ تاریخ الخلفاء ص ۲۰۱

۱۴۳ھ اور اس کے کچھ بعد کے سالوں میں تدوین وتالیف کا جو اہم کام ہوا، اس کے بارے میں امام ذہبی نے اشارہ کیا ہے، لیکن تدوین وتالیف کا سب سے زیادہ کام ۱۵۰ھ سے تیسری صدی کے نصف اول تک ہوا، ہر ہر فن پر اس عہد میں جو کچھ کام ہوا اس کی تفصیل تو طویل ہے، مگر ہر فن کے چند ممتاز اور صاحب تصنیف علماء کے نام یہاں درج کیے جاتے ہیں،

تفسیر | قرآن کی تفسیر وتشریح میں تو تقریباً تمام ہی تبع تابعین نے حصہ لیا، کسی نے حدیث کے نقطۂ نظر سے، کسی نے فقہ کے نقطۂ نظر سے اور کسی نے نحو وصرف، لغت وادب کے نقطۂ نظر سے، لیکن خاص طور پر جن لوگوں نے اس فن پر اپنی یادگاریں چھوڑیں اور جن کو عام علماء طبقۂ مفسرین میں شمار کرتے ہیں، ان کے نام یہ ہیں، اسحاق بن راہویہ، سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری، وکیع بن جراح وغیرہ۔

حدیث | اس عہد میں حدیث کی نقل و روایت اور تدوین وترتیب کا جتنا کام ہوا اتنا دوسری صدیوں میں نہیں ہوا اس طرح اس عہد میں جس کثرت سے ممتاز اور بلند مرتبت ائمۂ حدیث پیدا ہوئے بعد میں اتنی کثرت سے نہیں پیدا ہوئے اس عہد کے ائمۂ حدیث کے تذکرے پڑھیے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر مسجد اور ہر پڑھے لکھے گھر سے قال قال رسول اللہ کی آواز سنائی دے رہی ہے، اس عہد کے ممتاز اور صاحب تصنیف محدثین کے نام یہ ہیں:۔

امام مالک، امام احمد بن حنبل، حماد بن سلمہ، ابن مبارک، یحیٰی بن معین، ابن مہدی، سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری، امام شعبہ، یحیٰی بن سعید، ابن المدینی، ابو عوانہ، یحیٰی بن آدم، جریر بن عبد الحمید، محمد بن جعفر غندر، لیث بن مسلم، وکیع بن جراح، ہشیم بن بشیر، یونس بن بکیر، مکی بن ابراہیم، امام بخاری کی ثلاثیات زیادہ تر انہی کی روایت سے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض ائمۂ حدیث اور بھی ہیں، جن کا ذکر فقہ ومغازی کے ضمن میں آئے گا۔ ان میں بعض

ائمہ نے ستر ستر کتابیں تصنیف کی ہیں۔

فقہ | فن حدیث کی تدوین وترتیب اور اس کی تنقیح وتنقید میں تبع تابعین کے تلامذہ نے بہت کچھ اضافہ کیا اور ان کے بہت سے ادھورے کاموں کو مکمل کیا مگر فن فقہ کو ان حضرات نے خود اتنا مکمل اور مرتب کر دیا تھا کہ بعد کی صدیوں میں اس میں بہت کم اضافہ ہو سکا، لیکن اگر اضافہ ہوا تو توضیح وتشریح کی حد تک اس عہد کے ممتاز فقہا کے نام یہ ہیں، ائمہ ثلاثہ امام مالک امام شافعی، امام احمد بن حنبل امام ابو یوسف امام محمد امام سفیان ثوری، امام اوزاعی، ابن ابی لیلیٰ، لیث بن سعد، امام زفر، ابن وہب، اسد بن فرات، داؤد ظاہری، اسحاق بن راہویہ وغیرہ ان میں بعض ائمہ کی اہم تصانیف کی تعداد سو سے متجاوز ہے تفصیل کتاب میں ملے گی۔

تاریخ | عہد تابعین میں دوسرے فنون کی طرح تاریخ کا فن بھی علیحدہ نہیں ہوا تھا لیکن عہد تبع تابعین میں یہ فن مختلف شعبوں میں بٹ گیا، اور ہر شعبہ پر علیحدہ علیحدہ کام ہوا لیکن یہ تمام شعبے اسلامی فتوح، مغازی، سیرت، اور طبقات سے متعلق تھے، کوئی عمومی تاریخ اس دور میں نہیں لکھی گئی گو کہ اس کی نقل و روایت کا کام شروع ہو گیا تھا جن لوگوں نے اس فن کی تدوین میں حصہ لیا، ان میں واقدی المتوفی ۲۰۷ھ، ابن سعد المتوفی ۲۳۰ھ ہشام الکلبی متوفی ۲۰۶ھ، عبد الملک بن ہشام متوفی ۲۱۳ھ، الشیخ محمد اسماعیل زیاد البکائی متوفی ۱۸۳ھ، ابو معشر نجیح متوفی ۱۷۰ھ قابل ذکر ہیں، ان میں شیخ محمد اسماعیل کی فتوح الشام اپنے موضوع پر غیر مسبوق ہے، ان میں ہشام الکلبی اور واقدی پر علماء نے کم اعتماد کیا ہے۔

نحو ولغت | فن نحو کی تدوین کا آغاز عہد صحابہ ہی میں ہو گیا تھا کیونکہ جب اہل عجم نے اسلام قبول کیا اور انھوں نے قرآن کے پڑھنے میں بڑی فاش فاش غلطیاں شروع کر دیں تو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشورہ سے ابو الاسود دوئلی متوفی ۶۷ھ نے سب سے پہلے نحو کے کچھ قواعد مقرر کیے،

پھر اس کے بعد اس فن میں برابر ترقی ہوتی رہی، یہاں تک کہ عہد تبع تابعین میں اس فن نے آخری حد تک ترقی کرلی، اس میں سب سے زیادہ حصہ بصریوں نے لیا، گو بعد میں کسائی اور فراکی وجہ سے کوفی بھی ان کے سہیم و شریک ہو گئے، اسی طرح لغت کی تدوین بھی اسی عہد میں ہوئی، اس عہد کے ممتاز نحوی جنھوں نے اپنی تحریری یادگاریں بھی چھوڑی ہیں ان میں ابوبشر سیبویہ متوفی ۱۸۳ھ، کسائی معاذ الہرا، ابوزکریا، الفراء خاص طور پر ممتاز ہیں، سیبویہ کی "کتاب" اس عہد سے لیکر آج تک نحو کی سب سے معتبر تصنیف سمجھی جاتی ہے، لغت کی تدوین میں جن لوگوں نے حصہ لیا، ان میں سب سے ممتاز خلیل ابن احمد ہیں جن کی کتاب آج بھی قابل وثوق سمجھی جاتی ہے، اسی طرح عربی نثر و نظم کا سارا ذخیرہ اسی عہد میں مرتب ہوا جن لوگوں نے اس میں حصہ لیا، وہ ہماری فہرست سے خارج ہیں اس لیے ہم ان کو نظر انداز کرتے ہیں، اس دور کی شاعری گو اسلامی نقطۂ نظر سے بہت کچھ ہٹ گئی تھی لیکن پھر بھی کچھ شعراء خاص طور پر تبع تابعین کے تربیب یافتہ ایسے موجود تھے، جن کے اشعار میں اسلام کے اخلاقی رجحانات کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔

عملی کارنامے اوپر ذکر آچکا ہے کہ اسلام کا سب سے بڑا اعجاز یہ ہے کہ اس کے ذریعہ دنیا کو ایک ایسی پاکیزہ عملی زندگی ملی جس کی نظیر تاریخ، بنیا کے علاوہ کسی دوسری قومی، سیاسی، اور مذہبی تاریخ میں نہیں ملتی اور جہاں کہیں بھی اس کا کچھ سراغ ملتا ہے، تو اس کی عمر بہت زیادہ طویل نظر نہیں آتی، لیکن اسلامی تاریخ کے ہر دور میں کچھ ایسے برگزیدہ افراد پیدا ہوتے رہے ہیں، جن کو دیکھ کر ایک نظر میں اسلام کا عملی نقشہ سامنے آجاتا ہے، دوسری صدی میں یہ عملی زندگی حضرات تبع تابعین کی وجہ سے زندہ رہی،

عملی زندگی کا مطلب یہ ہے کہ اسلام نے عقائد سے لیکر معاملات و معاشرت تک جو تعلیم دی ہے

افراد کے عمل سے اس کا مظاہرہ ہو، چنانچہ آپ بزرگان تبع تابعین میں سے جن صاحب کا بھی تذکرہ پڑھیں گے، اس حیثیت سے وہ ممتاز نظر آئیں گے، پھر یہی نہیں کہ ان کے حالات پڑھنے کے بعد صرف ان کی عملی زندگی کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ بلکہ اس میں اتنی تاثیر ہے کہ اپنے اندر عمل کا جذبہ ابھرتا ہے یقین وتوکل، آخرت کی کامیابی کی آرزو، خدا سے محبت کے واقعات پڑھ کر خدا کی محبت اور آخرت کا یقین پیدا ہوتا ہے، ان کی جرات، حق گوئی اور احیائے سنت کے جذبہ وشوق سے مایوس کن حالات میں کچھ کرنے کا شوق اور ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ ان کی عبادت وتقویٰ کے قصے پڑھکر دل میں عبادت وتقویٰ کا جوش پیدا ہوتا ہے، غرض یہ کہ ان کی عملی زندگی میں جذب وانجذاب دونوں ہے۔

اللّٰھم احسن الیھم واجزھم احسن الجزاء واحشرنا معھم، ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم ٥

خادم

مجیب اللہ ندوی

۱۸ر جولائی ۱۹۵۹ء

مطابق

۱۱ر محرم الحرام ۱۳۷۹ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

امام ابو یوسفؒ

نام و نسب | یعقوب نام، ابو یوسف کنیت تھی، سلسلۂ نسب انصار سے مل جاتا ہے ان کے جدِّ اعلیٰ سعد بن حبتہؓ صحابی تھے، غزوۂ احد میں شرکت کی اجازت چاہی، مگر کم سنی کی وجہ سے اجازت نہیں ملی۔ دو سال بعد غزوہ خندق پیش آیا تو اس میں شرکت کا شرف حاصل کیا، اس غزوہ میں انھوں نے بڑی جانبازی دکھائی، دشمنوں سے برسرپیکار تھے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ مبارک ان پر پڑی۔ فرمایا کون ہو، بولے مجھے سعد بن حبتہ کہتے ہیں۔ پھر قریب بلایا، اور سر پر دست شفقت پھیرا۔ امام ابو یوسف فرماتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست شفقت پھیرنے کی برکت ہم اب تک محسوس کرتے ہیں[1]۔

ان کے والد ابراہیم ایک غریب آدمی تھے، اور کوفہ میں محنت مزدوری کر کے گذر اوقات کرتے تھے۔

سنہ ولادت | امام ابو یوسف کوفہ میں ۱۱۳ھ یا ۹۳ھ[2] میں پیدا ہوئے۔

---

[1] مناقب موفق ج ۲ ص ۲۰۹ و ۲۱۰ [2] عام ارباب تذکرہ ان کا سنہ ولادت ۱۱۳ھ لکھتے ہیں، لیکن ابو القاسم علی بن محمد السمحانی متوفی ۴۹۹ھ اور صاحب مسالک الابصار نے لکھا ہے کہ ان کی وفات ۸۹ برس کی عمر میں ہوئی۔ اور وفات کے بارے میں سب متفق ہیں کہ ۱۸۲ھ میں ہوئی،

تعلیم کا آغاز اور معاشی تنگی ابتداء عمر ہی سے ان کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا، مگر ان کے والد اپنی غربت کی وجہ سے چاہتے تھے کہ حصول معاش مین ان کا ہاتھ بٹائیں، اس وجہ سے ان کو بہت دنون تک باقاعدہ تحصیل علم کا موقع نہ مل سکا،[۱] مگر ان کے ذوق علم نے ان کو اتنا اکسایا کہ اسی تنگی و ترشی مین اپنے والد کے چپکے علمائے کوفہ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے، کوفہ میں اس وقت فقہ و حدیث کی بہت سی مجلسین برپا تھین، جن مین محمد بن ابی لیلی اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہما کی مجالس درس کو خاص امتیاز حاصل تھا، چنانچہ امام ابویوسف خصوصیت سے پہلے ابن ابی لیلی کی مجلس درس میں حاضر ہوئے، اور تقریباً ۸-۹ برس تک ان سے کسب فیض کرتے رہے، اس کے بعد امام صاحب کی مجلس درس میں شریک ہونے لگے، اور ان کو یہ مجلس ایسی بھائی کہ پھر امام صاحب کی زندگی میں اس سے علحدہ نہین ہوئے،

(بقیہ حاشیہ ص ۱) اس اعتبار سے ان کا سنہ ولادت ۹۳ھ قرار پانا چاہیے، علامہ زاہد الکوثری نے امام ابویوسف کے سوانح اور امام ذہبی کے رسائل کے حاشیہ میں یہ ثابت کیا ہے، کہ ۹۳ھ زیادہ قرین قیاس ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ۹۳ میں ۹ کا سرا مٹ کر ۱۱۳ رہ گیا- ظاہر ہے کہ ۱۱۳ھ مین تو ان کی ولادت قرار پا نہین سکتی تھی، اس لیے ارباب رجال نے قیاساً ۱۱۳ھ سمجھ لیا، عاجز کے خیال میں اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ امام ابویوسف اور امام ابوحنیفہ کو شیخین کہا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اس تغلیب میں عمر کا کوئی تناسب تو ہونا چاہیے، اگر ان کی عمر ۱۱۳ھ قرار دی جائے تو امام صاحب اور ان کی عمر میں ۳۳ برس کا تفاوت ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ اتنے تفاوت کے ساتھ دونوں کو شیخین کہنا مناسب نہین معلوم ہوتا [۱] آگے کے واقعات سے معلوم ہوگا کہ باقاعدہ طلب علم سے پہلے ہی ان کی شادی بھی ہو چکی تھی، اور وہ صاحب اولاد بھی ہو گیے تھے، ان کے بال بچوں کی معاشی ذمہ داری کی وجہ سے ان کے والد اور زیادہ ان کو حصول معاش پر مجبور کرتے تھے۔

ان کے والد کو طلب علم کی طرف ان کی حد درجہ توجہ اور انہماک اور کسب معاش سے بے پروائی بہت گراں گذرتی تھی، چنانچہ ایک دن یہ امام صاحب کی مجلس میں شریک تھے کہ ان کے والد پہنچے اور زبردستی ان کو اٹھا کر گھر لوا گئے، اور سمجھایا کہ ابو حنیفہ کھاتے پیتے آدمی ہیں، تم ان کی ریس کیوں کرتے ہو، والد کی تعمیل حکم میں کئی روز وہ امام صاحب کی مجلس میں نہیں گئے، تو امام صاحب نے دریافت کیا، امام ابو یوسف کو جب اس کی اطلاع ملی، تو وہ امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، امام صاحب نے آتے ہی پوچھا کہ اتنے دن سے درس میں کیوں نہیں آئے، بولے۔

الشغل بالمعاش وطاعة والدی — کسب معاش کی مشغولیت اور والد کی اطاعت مانع رہی،

یہ کہہ کر مجلس درس میں بیٹھ گئے، تھوڑی دیر کے بعد اٹھنا چاہا تو امام صاحب نے روکا، جب مجلس برخاست ہو گئی تو امام صاحب نے چپکے سے ان کو ایک تھیلی دی اور فرمایا کہ

لہ مناقب موفق اور تاریخ بغداد میں ایک دوسری روایت یہ ہے کہ ان کے والد کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا، ان کی والدہ کے لئے کوئی ذریعۂ معاش نہیں تھا، جب یہ ذرا ہوشیار ہوئے، تو انکی والدہ نے ایک کھانے کی دکان پر ان کو نوکر رکھوا دیا، لیکن یہ گھر سے روانہ ہوتے تو بجائے ملازمت پر جانے کے امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے، اور تعلیم میں مشغول رہتے شام کو گھر واپس آکر والدہ سے اس کا کوئی تذکرہ نہ کرتے، ایک مہینہ کے بعد ان کی والدہ نے کہا کہ دکان دار نے تم کو نہ کچھ سکھایا اور نہ کام کا کچھ معاوضہ ہی دیا، یہ خاموش رہے، اس پر ان کی والدہ نے ان کا ہاتھ پکڑا، اور دوکان دار کے پاس پہنچیں، اور اس سے کہا کہ تم نے اس بچہ کو نہ کچھ سکھایا، نہ اس کی محنت اور کارگذاری کا کچھ معاوضہ ہی دیا، اس نے کہا کہ یہ تو ایک مہینہ سے میرے یہاں آئے ہی نہیں، جب راز فاش ہوا، تو والدان پر

(بقیہ حاشیہ ص ۴۷ پر)

اس سے اپنی ضروریات پوری کرو، ختم ہو جائے تو پھر کہنا، گھر پہنچکر تھیلی کھولی تو سو درہم تھے،
اس کے بعد وہ برابر درس میں شریک ہونے لگے، جب چند دن گذر جاتے تو دوبارہ امام صاحب
ان کو کچھ رقم عنایت کر دیتے۔

امام ابویوسف کہتے ہیں کہ لحاظ کی وجہ سے میں کبھی اپنی ضرورت اور ان کی دی ہوئی رقم کے
ختم ہونے کا تذکرہ نہیں کرتا تھا، مگر وہ خود ہی اس کو محسوس کر لیا کرتے تھے، چنانچہ انھوں نے
اس وقت تک مدد جاری رکھی جب تک میں بے نیاز نہیں ہو گیا۔[۵]

ایک دوسری روایت ہے کہ امام صاحب سے ان کے والد نے کہا کہ میرا لڑکا یعقوب آپ کی
مجلس درس میں شریک ہوتا ہے اور رات دن حصول علم میں مشغول رہتا ہے، میرے کئی بچے ہیں، اور
پھر یہ بھی اللہ کے فضل سے میری طرح صاحب اہل وعیال ہیں، ان سے کہئیے کہ یہ دن کو آپ کے درس
میں شریک ہوں، اور اس کے بعد جو وقت بچے اس میں اپنے اہل وعیال کی کفالت کا سامان کریں۔

ان دونوں روایتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، ممکن ہے کہ ان کے والد کی گفتگو کے بعد ہی
امام صاحب نے ان کی مدد شروع کر دی ہو، تاکہ حصول معاش میں ان کو وقت اٹھانی نہ پڑے، اور انکا
وقت برباد نہ ہو،

امام صاحب کی خدمت میں آمد کی وجہ | امام ابویوسف کی ابتدائی تعلیم وتربیت کے بارے میں کوئی

(بقیہ حاشیہ ص ۳) بہت خفا ہوئیں اور ان کو درس سے روک دیا، چنانچہ وہ امام صاحب کی مجلس میں کئی روز نہیں
گئے، انھوں نے ان کو بلایا، اور کچھ رقم دی، اور کہا تعلیم جاری رکھو (مناقب موفق ج ۲ ص ۲۱۶)

ان کے والد کے بارے میں جو روایتیں مذکور ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت تک زندہ رہے
جب تک کہ امام ابویوسف صاحب عیال نہیں ہو گئے، مگر اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کو یتیم چھوڑ کر دنیا سے رخصت
ہو گئے تھے، مگر اس واقعہ میں بہت سی ایسی باتیں مذکور ہیں جنکی حیثیت قصہ کہانی سے زیادہ نہیں ہے، امام ذہبی نے اس روایت کو حکی کے لفظ سے بیان
کر کے کمزور کر دیا ہے۔ (ترجمہ ابی یوسف) ۵ مناقب موفق ج ۲ ص ۲۱۲،

تفصیل کتابون میں نہیں ملتی، اوپر کی روایات سے اتنا تو ضرور پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے جو کچھ حاصل کیا، اوس میں ان کے ذاتی ذوق وشوق کیساتھ امام صاحب کی مالی امداد اور تکفل کو بھی دخل رہا ہے، ورنہ ان کے گھر کی حالت اس قابل نہیں تھی کہ وہ تعلیم کے لیے وقت نکال سکتے۔

اوپر یہ ذکر بھی آچکا ہے کہ امام ابو یوسف سب سے پہلے محمد بن ابی لیلیٰ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے کسب فیض شروع کیا، مگر کئی برس کے بعد پھر وہ امام صاحب کی خدمت میں آنے جانے اور ان کے درس میں شریک ہونے لگے، امام ابو یوسف نے ابن ابی لیلیٰ کی مجلس درس کو چھوڑ کر کیون امام صاحب کی صحبت اختیار کی، اس بارہ میں ارباب تذکرہ بہت سی باتیں لکھتے ہیں. مگر ان میں بعض باتیں بالکل بے بنیاد معلوم ہوتی ہیں، اس لیے ہم اون کی قدرے تفصیل کرتے ہیں،

ان کے پہلے استاذ محمد بن ابی لیلیٰ ممتاز تابعی عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ کے صاحبزادے اور خود ممتاز تبع تابعین میں تھے، اموی اور عباسی دونوں دوروں میں برسوں قاضی رہ چکے تھے، اس لیے ان کا علم اور تجربہ دونوں وسیع تھا، امام ابو یوسف نے ان سے علمی اور عملی دونوں طرح سے فیض اٹھایا تھا، لیکن اس زمانہ میں کوئی طالب العلم وہ بھی فقہ کا، امام اعظم کی مجلس درس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا تھا، چنانچہ امام ابو یوسف فرماتے ہیں، کہ ابن ابی لیلیٰ باوجود اپنے ذاتی فضل وکمال اور علمی منزلت کے جب کوئی مشکل مسئلہ آتا، تو سب سے پہلے امام صاحب کی راے معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس سے مجھکو خیال پیدا ہوا، کہ امام صاحب کے درس میں بھی ضرور شریک ہونا چاہیے، مگر استاذ کا احترام ولحاظ ہمیں مانع تھا، اس وجہ سے میری ہمت وہاں جانے کی نہین پڑتی تھی، لیکن بعد میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ محمد بن ابی لیلیٰ کی مجلس سے منقطع ہوکر وہ ہمیشہ کے لیے امام صاحب کی مجلس سے وابستہ ہو گئے،

اہل تذکرہ نے اس سلسلہ میں متعدد ایسے واقعات لکھے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ

امام ابویوسف اور ان کے شیخ میں بعض مسائل میں اختلاف پیدا ہوا جس کے نتیجہ میں انھوں نے انکی مجلس درس چھوڑ دی، اور امام اعظم کی مجلس درس میں آکر انوسے تلمذ کرنے لگے لیکن عاجز کے نزدیک حتی دو وجوہ کی بنا پر یہ بات کلیۃً صحیح نہیں معلوم ہوتی ۔

۱۔ ایک یہ کہ اگر امام ابویوسف کو اپنے استاد سے ایک یا متعدد مسائل میں اختلاف ہوگیا تھا، تو یہ کوئی ایسی اہم بات نہین تھی جس کی وجہ سے وہ ان کی مجلس درس چھوڑ دیتے، کیا بعد میں خود امام ابویوسف نے امام صاحب سے متعدد امور و مسائل میں اختلاف نہیں کیا تھا، اس لیے.. نفس اختلاف مسائل کو ترک درس کا سبب قرار دینا صحیح نہیں ہے ۔

۲۔ دوسری ... یہ کہ اگر قاضی محمد بن ابی لیلیٰ سے اختلاف مسائل کی وجہ سے انکو تنفر پیدا ہوگیا ہوتا اور اسی بنا پر ان کی مجلس درس چھوڑ بیٹھے ہوتے تو امام اعظم کی درسگاہ سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ خود مسند درس وقضا پر بیٹھے، تو اپنے تلامذہ کے سامنے امام صاحب اور ابن ابی لیلیٰ کے اختلافی مسائل کو مساویانہ طور پر بیان نہ کرتے بلکہ ہر مسئلہ پر ابن ابی لیلیٰ پر نکیر کرتے لیکن انھوں نے کبھی ایسا نہیں کیا،

ایسے تمام مختلف فیہ مسائل کو امام محمد نے ایک کتاب میں "اختلاف ابی حنیفہ وابن ابی لیلیٰ" میں ... جمع کر دیا ہے، جو حیدرآباد میں چھپ گئی ہے، اس کے دیکھنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے دل میں اپنے دونوں اساتذہ کا احترام آخر وقت تک باقی تھا ۔

۳۔ تیسری ... یہ کہ امام سرخسی نے مبسوط کے آخر میں جہاں امام صاحب اور قاضی ابن ابی لیلیٰ کے اختلافی مسائل کا ذکر کیا ہے، وہاں امام ابویوسف اور ابن ابی لیلیٰ کے اسباب اختلاف کا بھی ذکر کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ امام ابویوسف نے ۹ برس ابن ابی لیلیٰ

کی خدمت میں تعلیم حاصل کی پھر اتنی ہی مدت امام صاحب کی خدمت میں رہے (ج ۳۰ ص ۱۲۸) اس کے بعد قیل (کہا گیا ہے) کے لفظ سے مذکورۂ بالا سبب کا ذکر کیا ہے، جو بعض لوگوں کے نزدیک استاد و شاگرد کے درمیان کشیدگی کا باعث ہوا، مگر قیل کے لفظ سے اس واقعہ کا ذکر کرنا بجائے خود اس کے ضعف کو ظاہر کرتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ علوم دینیہ کے جمع و تدوین کا ابتدائی زمانہ تھا، جو سیکڑوں اور ہزاروں اہل علم کے سینوں اور سفینوں میں منتشر تھے، اس لیے اس وقت کا یہ دستور تھا کہ طلبہ زیادہ سے زیادہ اہل علم و اصحاب درس کے پاس جا کر استفادہ کرتے تھے تاکہ ان منتشر اجزا کو وہ اپنے اپنے سینہ و سفینہ میں جمع کر سکیں، چنانچہ اس دور کا کوئی ایسا ممتاز اہل علم نہیں ملے گا جس کے سیکڑوں کی تعداد میں شیوخ نہ رہے ہوں، اس لئے امام ابو یوسف جیسے طبّاع اور ذہین طالب علم صرف ایک استاد پر کیسے قناعت کر سکتے تھے، انھوں نے بھی دستور زمانہ کے مطابق مختلف شیوخ و اساتذہ کی خدمت میں جا کر زانوے ادب تہ کیا ہوگا اور ازدیاد علم کا یہی شوق انکو ابن ابی لیلی کی مجلس درس سے اٹھا کر امام صاحب کی مجلس درس میں لایا ہوگا۔

اس لیے ایک شیخ کے یہاں سے دوسرے شیخ کے پاس جانے کی وجہ خواہ مخواہ ناراضگی ہی قرار دینا صحیح نہیں ہے، یہ صحیح ہے کہ امام صاحب اور ابن ابی لیلیٰ میں بعض فقہی مسائل میں اختلاف تھا اس لیے ابتدائً خود امام ابو یوسف کو امام صاحب کی مجلس درس میں جانے میں تامل ہوا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کو اس سے تکلیف ہو، مگر قاضی ابن ابی لیلیٰ سے کہیں یہ ثابت نہیں ہے کہ خود انھوں نے اس سے اپنے شاگرد کو روکا ہو۔

پھر امام صاحب اور ابن ابی لیلیٰ کا اختلاف نفسانیت پر مبنی نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے سے استفادہ میں مانع ہوتے چنانچہ ابن ابی لیلیٰ کے بارے میں خود امام ابو یوسف کا بیان ہے کہ مشکل

مسائل میں علانیہ امام صاحب کی رائے دریافت کرتے تھے[1]

تحصیل علم کی مدت امام ابو یوسف کی تحصیل علم یا استفادہ کی کل مدت کتنی ہے، تذکرہ نویسوں کی روایتیں اس کے بارے میں مختلف ہیں، یوسف بن ابی سعد نے خود امام ابو یوسف سے روایت کی ہو کہ انھوں نے فرمایا کہ امام ابو حنیفہ کی خدمت میں میری آمد و رفت مسلسل ۲۹ برس رہی،[2] دوسری روایت ہے کہ سترہ برس ان کی صحبت میں رہا،[3] تیسری روایت امام سرخسی کی ہے، جو اوپر نقل ہوئی ہے کہ ۹ برس ابن ابی لیلےٰ کی خدمت میں اور ۹ برس امام ابو حنیفہ کی مجلس درس میں رہے[4]

بظاہر ان میں دو روایتیں قابلِ تسلیم نہیں معلوم ہوتیں، اگر پہلی روایت تسلیم کیجائے، تو ان کی تعلیم کا زمانہ کم سے کم ۳۸ برس قرار پائے گا، ۹ برس ابن ابی لیلےٰ کی خدمت میں اور ۲۹ برس امام صاحب کی صحبت میں، دوسری روایت پر اعتبار کیا جائے، تو مدت تعلیم ۲۶ برس ہوتی ہے، اس میں اگر دوسرے شیوخ سے استفادہ کی مدت بھی شامل کر لیجائے تو معلوم نہیں یہ مدت کہاں سے کہاں پہنچ جائے، اس لیے یہ کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا، کہ انھوں نے اتنی طویل مدت صرف حصول تعلیم پر صرف کی ہوگی، امام سرخسی نے جو مدت تعلیم بتائی ہے یعنی ۱۸ برس، وہ بھی امام ابو یوسف جیسے قوی الحافظہ ذہین، الطباع اور غیر معمولی فہیم طالب علم کیلیے گو بہت ہے، تاہم اس کی صحت پر یقین کیا جا سکتا ہے،

پھر یہ روایتیں اس وقت اور زیادہ کمزور ہو جاتی ہیں، جب کہ ان کا سنہ ولادت یہی تذکرہ نگار ۱۱۳ھ قرار دیتے ہیں اس لیے کہ امام ابو حنیفہ کی وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی، اس لحاظ سے امام ابو یوسف کی عمر ان کی وفات کے وقت صرف ۳۷ برس کی تھی جو پہلی روایت کے مطابق انکی مدت

---

[1] مناقب مکی جلد ۲ صفحہ ۲۱۳، [2] حسن التقاضی، [3] ایضاً بحوالہ کردری، [4] مبسوط جلد ۳۰ صفحہ ۱۲۸،

تعلیم سے بھی کم ہے،

ان روایتوں میں اس طرح تطبیق دیجاسکتی ہے کہ پہلی روایت میں امام ابویوسف نے وہ عمر بتائی ہو، جس میں وہ امام صاحب کی خدمت میں گئے، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جب وہ امام ابوحنیفہ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں، تو ان کی عمر کافی تھی، اور صاحبِ اہل وعیال بھی تھے، جیساکہ انکے والد کے واقعہ کے سلسلہ میں ذکر آچکا ہے، دوسری روایت میں انھوں نے پوری مدت تعلیم بتائی ہو، اور تیسری روایت میں صرف امام صاحب کے ساتھ اپنی رفاقت کا زمانہ بتایا ہو، جنکو رواۃ نے باہم خلط ملط کردیا ہو، ان روایتوں سے بہرحال اتنی بات تو ضرور ثابت ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کا سب سے قیمتی اور طویل زمانہ ابن ابی لیلےٰ اور امام صاحب کی خدمت وصحبت میں گذارا،

علم دین سے شغف

اوپر ذکر آچکا ہے، کہ امام ابویوسف نہایت ہی غریب اور عسیر الحال باپ کے فرزند تھے، اس لئے بچپن ہی میں حصول معاش کا سوال ان کے لیے پیدا ہوگیا تھا، مگر ان کو طبعًا علم دین سے اتنا شغف اور ذوق تھا کہ معاش کی تنگی اور عسرت کی زندگی ان کی تحصیل علم کی راہ میں مانع نہ ہوسکی، اور اگر کبھی مانع ہوئی اور وہ مجبورًا کسب معاش کی طرف مائل ہوئے بھی، تو ان کے مشفق استاد نے ضرورت پوری کرکے مانع کو دور کردیا۔

ان کے ذوق وشغف کا اندازہ اس سے کرنا چاہیئے کہ یوسف بن سعید کا بیان ہے کہ امام ابویوسف نے ایک مدت تک امام صاحب کی خدمت میں آمدورفت کا سلسلہ جاری رکھا، مگر اس طویل مدت میں ایک دن بھی ایسا نہیں گذرا جس میں وہ فجر کی نماز میں ان کے ساتھ شریک نہ رہے ہوں[1]

امام ابویوسف کا خود بیان ہے کہ میں برسوں امام صاحب کی رفاقت میں رہا، مگر بجز بیماری کے عید الفطر وعید اضحیٰ کے دن بھی ان سے جدا نہیں ہوا، غور کیجئے کہ ان دونوں کی خوشی ومسرت

[1] حسن التقا

ین ہر شخص اپنے گھر والوں کے ساتھ ہوتا ہے، لیکن انھوں نے مجلس علم کی شرکت اور امام صاحب کی معیت و رفاقت کو عیدین کی خوشی و مسرت پر ترجیح دی،

مناقب موفق میں ہے کہ امام ابویوسف کے کسی بچہ کا انتقال ہو گیا، مگر وہ اس کے جنازہ اور تدفین میں اس لیے شریک نہ ہو سکے کہ مبادا امام صاحب کے درس و املا کا کوئی حصہ چھوٹ نہ جائے، خود فرماتے ہیں:۔

مات ابن لی فلم احضر جهازه	میرے ایک بچہ کا انتقال ہو گیا لیکن میں
ولا دفنه وترکته علی جیرانی	اس کی تجہیز و تدفین میں شریک نہیں ہوا،
واقربائی مخافة ان یفوتنی	اور اس کو اپنے پڑوسیوں اور عزیزوں
من ابی حنیفة شیئ ولا تذهب	کی ذمہ داری پر چھوڑ دیا، کہ کہیں ایسا نہ
حسرته عنی،	ہو کہ امام ابوحنیفہ کے درس کا کوئی حصہ
(ج ۲ ص ۲۱۵)	چھوٹ جائے، اور مجھے اس کی حسرت رہ جائے،

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کو علم دین سے کتنا ذوق اور شغف تھا، اور امام صاحب کی مجلس درس کی انکی نگاہ میں کیا قدر و قیمت تھی،

اس واقعہ سے اوس عہد کی اسلامی معاشرت پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے اوس زمانہ میں ہمدردی، مواسات اور اخوت اس درجہ عام تھی کہ امام ابویوسف نے اپنے لخت جگر کے جنازہ اور تدفین میں اس لیے شرکت ضروری نہیں سمجھی کہ وہ اگر نہ بھی شریک ہوں گے تو ان کے اعزہ، اقربا اور پڑوسی اس کام کو اپنا ذاتی کام سمجھکر پورا کر دیں گے۔

مناقب کردری میں یہ بھی ہے کہ امام ابویوسف اپنے والد کے جنازہ میں بھی امام صاحب کی مجلس درس کے چھوٹ جانے کے خیال سے شریک نہیں ہو سکے تھے، ممکن ہے دونوں واقعے ایک

ہی ہوں اور راویوں نے ذکر دیا ہو،

اوپر ذکر آچکا ہے کہ تنگی وعسرت کی وجہ سے ان کے والد ایک بار، ان کو درس سے اٹھا لیگئے تھے، احمد بن مکی کے بیان کے مطابق درس سے اٹھا لیجانے کا واقعہ ایک ہی بار پیش نہیں آیا بلکہ بسا اوقات ایک ہی دن میں کئی کئی بار پیش آتا تھا، پورا واقعہ یہ ہے،

عبد الحمید الحمانی کہتے ہیں کہ امام ابو یوسف کے والد امام ابو حنیفہ کی مجلس درس میں آتے اور ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا لیجاتے لیکن تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے والد کی نظر بچا کر پھر آجاتے، ان کے والد پھر آتے اور انھیں واپس لیجاتے، یہانتک کہ ایک دن ان کے والد بہت غصہ میں مجلس درس میں آئے، اور اپنے صاحبزادہ کو بہت سخت وسست کہا اور اہل مجلس سے مخاطب ہو کر کہا۔

یعصینی هذا الولد انتم تعینونه[1] میرا لڑکا بار بار میری عدول حکمی کرتا ہے اور تم لوگ اس میں اس کی مدد کرتے ہو،

امام صاحب نے ان سے فرمایا کہ آپ کیا چاہتے ہیں بولے یہ بازار جاکر کچھ کمائیں، اور اہل وعیال کی پرورش میں میرا ہاتھ بٹائیں۔ امام صاحب نے فرمایا انشاء اللہ اس کار خیر میں ہم ان کی مدد کریں گے، لیکن انھوں نے اس کو کچھ پسند نہیں کیا، بالآخر امام صاحب نے ذرا تلخ لہجہ میں فرمایا کہ اگر آپ ان کو تعلیم سے روکنا چاہتے ہیں تو اس میں آپ کی قطعی مدد نہیں کیجا سکتی، ہاں کفاف کے سلسلہ میں ہم ان کی مدد کے لیے تیار ہیں، آپ براہ کرم واپس جائیے[2]، اور اس مقدس کام سے نہ روکیے۔

بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ علم دین سے ان کو جو شغف وانہاک تھا، اس کی شکایت محض ان کے والد ہی کو نہیں تھی، بلکہ ان کی اہلیہ کو بھی۔ ۔ ۔ تھی، فرماتی ہیں کہ وہ دن بھر تو

---

[1] مناقب کردری جلد ۲ صفحہ ۱۵۰ [2] ایضاً

امام صاحب کی خدمت میں رہتے تھے، اور رات کو گھر آتے تھے، اور کبھی کبھی رات کو بھی وہیں رہ جاتے تھے، اور کئی کئی دن گھر نہیں آتے تھے، ایک دن یہ امام ابو یوسف کی شکایت لے کر امام صاحب کی خدمت میں پہنچیں، اور عرض کی کہ یہ آپ کے شاگرد ہمارے نان و نفقہ کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے، صرف پڑھنے پڑھانے ہی میں لگے رہتے ہیں، امام صاحب نے ان کو سمجھایا اور صبر کی تلقین کی، اور فرمایا کہ یہ عسرت اور تنگ دستی کے دن انشاء اللہ جلد ختم ہو جائیں گے، اور تم لوگ ان سے جو توقع رکھتے ہو اس سے زیادہ تم کو ملے گا، [۵]

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے، کہ حصول علم دین کی راہ میں ان کے لیے کتنے موانع تھے، جن کو کچھ تو ان کے طبعی ذوق و شوق نے دور کر لیا، اور کچھ امام صاحب کی نظر التفات اور مالی مدد نے، واقعہ یہ ہے کہ اگر امام صاحب کی نظر التفات نہ ہوتی تو وہ بہت دنوں تک ان موانع کی تاب نہ لا سکتے، اور علم دین سے محروم رہ جاتے۔

دوسرے شیوخ حدیث سے استفادہ، قاضی ابن ابی لیلیٰ کے تلمذ اور امام صاحب جیسے فقیہ و مجتہد کی خدمت و رفاقت میں رہنے کے بعد کسی دوسرے صاحب کمال کے سامنے ان کو زانوے تلمذ تہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں،

ماکان فی الدنیا مجلس احب الی من مجلس ابی حنیفة وابن ابی لیلیٰ، فانی مارایت فقیهاً افقه من ابی حنیفة ولاقاضیا خیراً من ابن ابی لیلیٰ [۲]	مجھے دنیا میں کوئی مجلس درس امام ابو حنیفہ اور ابن ابی لیلیٰ کی مجلس درس سے زیادہ محبوب نہیں ہے، اس لیے کہ نہ تو میں نے امام ابو حنیفہ جیسا بہتر فقیہ دیکھا اور نہ ابن ابی لیلیٰ جیسا قاضی،

---

[۵] مناقب کردری ج ۲ ص ۲۱۵ [۲] ایضاً،

لیکن ہر استاذ فن کی کچھ نہ کچھ خصوصیت ہوتی ہے، اس لیے متقدمین میں عام دستور تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ اساتذۂ فن کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے کسب فیض کرتے تھے، چنانچہ امام ابو یوسف بھی بے شمار شیوخ حدیث و فقہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے چشمۂ علم سے اپنی تشنگی بجھائی،

امام ابو یوسف نے جن شیوخ اور اساتذہ فقہ و حدیث سے استفادہ و روایت کی ہے ان کی تعداد سو سے متجاوز ہے، ہم ان میں سے ان چند مشاہیر کا نام یہاں درج کرتے ہیں جنکی روایتیں کتاب الخراج میں موجود ہیں

ابان بن[۱] عباس، ابو اسحاق[۲] الشیبانی، اسرائیل[۳] بن ابی اسحاق، اسماعیل[۴] بن ابراہیم المہاجر، اسمٰعیل[۵] بن ابی خالد، اسمٰعیل[۶] بن علیہ، اسمٰعیل[۷] بن مسلم، ایوب[۸] بن عتبہ، ابوبکر[۹] بن عبداللہ الہذلی، ثابت[۱۰] ابو حمزۃ الثمالی، (ترمذی کے رواۃ میں ہیں) ابن[۱۱] جریج، حجاج[۱۲] بن ارطاۃ، جریر[۱۳] بن عثمان، حسن[۱۴] بن دینار، حسن بن علی[۱۵] بن عمارہ، حصین[۱۶] بن عمرو بن میمون، حنظلہ[۱۷] بن ابی سفیان، روح[۱۸] ابن مسافر، سعید[۱۹] بن عروبہ، سعید[۲۰] بن مرزبان، سعید[۲۱] بن مسلم، سفیان[۲۲] بن عیینہ، سلیمان[۲۳] التیمی، سلیمان[۲۴] بن مہران الاعمش، سماک[۲۵] بن حرب، طلحہ[۲۶] بن یحییٰ، طارق[۲۷] بن عبدالرحمٰن، عاصم[۲۸] الاحول، عبداللہ[۲۹] بن سعید المقبری، عبداللہ[۳۰] بن علی، عبیداللہ[۳۱] بن عمر، عبداللہ[۳۲] بن محرر، عبداللہ[۳۳] بن واقد، عبداللہ[۳۴] بن ابو لبید المدنی، عمرو[۳۵] بن دینار، عمرو[۳۶] بن میمون بن مہران، غیلان[۳۷] بن قیس الہمدانی، الفضل[۳۸] بن مرزوق، قیس[۳۹] بن الربیع، قیس[۴۰] بن مسلم، لیث[۴۱] بن سعد، امام مالک[۴۲] بن انس، مالک[۴۳] بن مغول، محمد[۴۴] بن اسحاق صاحب المغازی، محمد[۴۵] بن ابی حمید، محمد[۴۶] بن السائب الکلبی، محمد[۴۷] بن سالم، محمد[۴۸] بن طلحہ، محمد[۴۹] بن عبداللہ، محمد[۵۰] بن عمرو بن علقمہ، مسعر[۵۱] بن کدام، مسلم[۵۲] الخزاعی، مطرف[۵۳] ابن طریف، ابو معشر[۵۴]، منیر[۵۵] بن مقسم، نافع[۵۶] مولیٰ ابن عمر، نصر[۵۷] بن طریف، ابن[۵۸] ابی نجیح، ہشام[۵۹] بن عروہ، ہشام[۶۰] بن سعید،

اس فہرست میں بعض ممتاز تابعین کا نام بھی نظر آئے گا اس میں ان شیوخ حدیث وفقہ کے نام بھی ہیں، جنکو حدیث وفقہ میں امامت کا مقام حاصل تھا، علامہ زاہد الکوثری نے ان کے ۴۰ شیوخ کا تذکرہ کیا ہے، علاوہ برین ان کی کتاب الخراج مین متعدد جگہ پر "غیر واحد من علماء اہل المدینہ" وغیرہ کے الفاظ ملتے ہین، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدینہ میں ان کے شیوخ بکثرت تھے، حالانکہ اس فہرست مین صرف چند نام آئے ہیں،

امام مالک سے ملاقات امام ابو یوسف اور امام مالک ہم عصر تھے، اور دونون درجۂ اجتہاد پر فائز تھے اس لئے ان دونون مین بعض اجتہادی مسائل میں اختلاف تھا، جن کے بارے مین بالمشافہ گفتگو بھی ہوئی، اور امام ابو یوسف نے باوجود معاصرت کے بعض مسائل میں امام مالک کی رائے کو ترجیح دی، یہ اختلاف بعض ان فروعی مسائل میں تھا، جن کا تعلق تمدن معاشرت اور معاملات سے تھا، مثلاً اس وقت تمام اسلامی ملکون میں غلہ وغیرہ کے وزن کرنے کے لیے صاع، مد، اور رطل وغیرہ رائج تھے، مگر ان کا وزن ہر ملک مین مختلف تھا، اور ہر جگہ کے علماء اپنے یہان کے پیمانون کو صحیح سمجھتے تھے، اور ان ہی سے عشرہ صدقہ فطر وغیرہ مین کام لینے کی ہدایت کرتے تھے، امام ابو یوسف کوفہ کے رہنے والے تھے، اس لیے وہ کوفی پیمانہ کو صحیح سمجھتے تھے، مگر جب وہ امام مالک سے ملے، تو انھون نے ان کو مدنی صاع دکھایا، اور فرمایا کہ یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صاع ہے، اس کے بعد سے امام ابو یوسف نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا،[۱]

موطا سے امام مالک کی تدوین کے وقت حدیث و آثار کا کوئی دوسرا جامع مجموعہ

---

[۱] اس روایت کے بارے مین زاہد الکوثری نے لکھا ہے کہ رجوع کا ذکر صحیح نہین ہے اور پھر انھون نے اس روایت کو ناقابل اعتبار ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، مگر یہ ان کی شدت پسندی ہے جس کا وہ ہر مسئلہ مین اظہار کرتے ہین، اس سے امام ابو یوسف کی عظمت مین کوئی فرق نہین آتا،

نہین تھا، اس لیے اس عہد مین انکی روایت وسماع سب سے زیادہ قابل فخر چیز سمجھی جاتی تھی جنکو یہ فخر نصیب نہین ہوتا تھا، ان کا بڑا نقص تصور کیا جاتا تھا۔ امام ابو یوسف نے موطا کا سماع براہ راست امام مالک سے نہیں کیا تھا، بلکہ ان کے مشہور اور جلیل القدر شاگرد اسد بن فرات صقلبی سے کیا تھا، اسی بنا پر امام محمد ان کے بارے مین کہا کرتے تھے کہ امام ابو یوسف نے علم حدیث کی صرف مہک پائی ہے[1]، یعنی انھون نے تو امام مالک کی خدمت مین رہ کر موطا کا سماع کیا تھا، اور امام ابو یوسف کو یہ شرف[2] حاصل نہین تھا،

محمد بن اسحاق صاحب المغازی، اور امام ابو یوسف

جس زمانہ میں امام ابو یوسف امام صاحب کے حلقہ درس مین بیٹھکر اکتساب فیض کر رہے تھے، اسی زمانہ میں محمد بن اسحاق کوفہ آئے، جو سیر ومغازی کے امام سمجھے جاتے تھے، ان کی علمی شہرت اور کشش امام ابو یوسف کو ان کے حلقۂ درس میں کھینچ لائی، ان کے ساتھ ان کے کئی رفقا بھی تھے، جنھون نے کتاب المغازی کے سماع کی خواہش ظاہر کی، اور وہ تیار ہو گئے، امام ابو یوسف کا بیان ہے کہ مین کئی مہینہ تک سماع مین مشغول رہا، اور امام صاحب کے حلقۂ درس اور خدمت مین نہ جاسکا، جب پوری کتاب ختم ہو گئی، تو امام صاحب کی خدمت مین حاضر ہوا،

---

[1] حسن التقاضی صفحہ ۷۰، [2] امام ابو یوسف کا علم حدیث وآثار میں اتنا وسیع تھا، کہ ان کو براہ راست سماع کی ضرورت ہی نہین تھی، بلکہ اس کا مطالعہ ان کے لیے کافی تھا، اور امام محمد کا مطالعہ چونکہ حدیث وآثار مین امام مالک کی خدمت مین وسیع ہوا تھا، اس لیے انھون نے اسکی ضرورت محسوس کی ہوگی، اسی بنا پر انھون نے امام ابو یوسف کے بارے میں یہ راے دی، مگر امام ابو یوسف نے جو علمی یادگارین چھوڑی ہیں، ان کے دیکھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ انکو علم حدیث میں درک نہین تھا،

امام صاحب نے غیر حاضری کی وجہ دریافت کی، تو کہا کہ میں محمد بن اسحاق سے ان کی کتاب المغازی کا سماع کر رہا تھا، اس لیے حاضر نہ ہوسکا، یہ سنکر امام صاحب نے محمد بن اسحاق کے علم و روایت پر اپنے عدم اطمینان کا اظہار کیا، مگر امام ابو یوسف نے کمال ادب کیساتھ اپنے شفیق و مہربان استاد کے سامنے صاحب مغازی کے علم و فضل کا اعتراف کیا۔[1]

حلقۂ درس | اتنے ائمۂ روزگار و شیوخ زمانہ سے استفادہ و حصول تعلیم کے بعد ان کو اپنا علیحدہ حلقۂ درس قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا اور قائم بھی کر لیا مگر اسکی اطلاع امام صاحب کو

---

[1] مناقب جلد ۲ صفحہ ۲۳۲ اس روایت کو ابن خلکان نے بھی نقل کیا ہے، مگر اس میں یہ اضافہ ہے، کہ امام ابو یوسف نے امام صاحب کے جواب میں بے دھڑک کہا، کہ آپ بھی تو علم کے مدعی ہیں، لیکن یہ نہیں جانتے کہ غزوۂ بدر پہلے ہوا ہے، یا غزوۂ احد، ظاہر ہے کہ یہ روایت کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتی، جس کی مجلس درس امام ابو یوسف کے نزدیک سب سے زیادہ پرکشش اور محبوب ہو، اور جہاں انھوں نے اپنی زندگی کا سب سے قیمتی اور طویل حصہ گذارا ہو، اس کے سامنے امام ابو یوسف یہ جسارت نہیں کر سکتے تھے، پھر امام محمد کی کتاب السیر الصغیر جس کو امام صاحب نے املا کرایا تھا اس کے دیکھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے، کہ امام صاحب خدانخواستہ مغازی و سیر سے ناواقف تھے، پھر امام ابو حنیفہ نے سیر و مغازی کی تکمیل امام شعبی سے کی تھی، جو اپنے زمانہ میں سیر و مغازی کے امام سمجھے جاتے تھے، جن کی وسعت علم اور تبحر میں کسی کو کلام نہیں ہے، یہ ضرور ہے، کہ جس طرح امام صاحب نے قرآن و حدیث و فقہ کو اپنا خاص فن بنا لیا تھا، اسی طرح ان کو اس فن کی طرف خاص توجہ کرنے کا موقع نہ مل سکا، ورنہ کون کہہ سکتا ہے، کہ وہ اس سے عاری تھے،

اس روایت کا راوی معافی الجریری ہے جس کو ائمۂ رجال نے ضعیف اور ناقابل اعتبار ٹھہرایا ہے (تاریخ بغداد و تہذیب اور حسن التقاضی ص۲۱)

نہین دی، امام صاحب کو معلوم ہوا تو اپنے کسی شاگرد کے ذریعہ چند مسائل دریافت کرائے جن کے جواب سے وہ مطمئن نہیں ہوا، اور اسی وقت اس کی تردید کی، اب امام ابویوسف کو احساس ہوا، کہ انھون نے قبل از وقت حلقۂ درس قائم کر دیا، چنانچہ وہ امام صاحب کی خدمت میں آئے، اور اپنی اس تقصیر کا اعتراف کیا، امام صاحب نے فرمایا۔

تزببت قبل ان تحصرم[1] — تم انگور ہونے سے پہلے ہی منقی بن گئے، (یعنی پختہ کار ہونے سے پہلے ہی درس و تدریس کا کام شروع کر دیا)

اس سلسلہ کی ایک روایت یہ ہے، کہ ایک بار وہ بیمار پڑے، امام صاحب ان کی عیادت کے لیے گئے، مزاج پرسی کے بعد امام صاحب نے فرمایا، کہ مجھکو تم سے بڑی توقعات ہین، اور تم مسلمانون کے لیے بہت مفید ہو سکتے ہو،[2] جب امام ابویوسف اچھے ہوئے، توان کو اپنا الگ حلقۂ درس قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا، جو عمل مین بھی آگیا، مگر اس کے بعد بھی، امام صاحب کی مجلس درس مین آمد و رفت قائم رہی، ایک بار آئے، تو کوئی دقیق مسلہ امام صاحب سے دریافت کیا، جس کو سنکر امام صاحب کو بڑا تعجب ہوا، فرمایا سبحان اللہ ایک شخص جو اپنا الگ حلقہ قائم کرتا ہے، خدا کے دین پر گفتگو کرتا ہے، تلامذہ کی ایک بڑی تعداد کو خطاب کرتا اور درس دیتا ہے، وہ اجارہ کا ایک مسئلہ اچھی طرح نہین جانتا، پھر آپ نے بطور نصیحت فرمایا،

من ظن انہ لیستغنی عن التعلیم لیبك علی نفسہ[3] — جو گمان کرتا ہے، کہ وہ حصول تعلیم سے مستغنی ہو گیا ہے اوس کو اپنے اوپر رونا چاہیے،

---

[1] حسن التقاضی [2] مناقب کردری، [3] ایضاً

غالباً یہ واقعہ اس وقت کا ہوگا، جب ابھی امام ابویوسفؒ کا علم پختہ نہیں ہوا تھا، اور ان میں مجتہدانہ شان نہیں پیدا ہوئی تھی، ایسا بہت ہوتا ہے کہ لوگ جلد ہی اپنے کو استفادہ و تحصیل سے مستغنی سمجھنے لگتے ہیں، اور درس و افادہ شروع کر دیتے ہیں، خود امام اعظمؒ نے اپنی فطری ذہانت وجودت طبع کی بنا پر اپنے استاد حماد بن سلیمان سے اپنے کو بے نیاز سمجھ لیا تھا، مگر فوراً ہی ان کو اس پر تنبہ ہو گیا، اور پھر آخر عمر تک ان کا دامن فیض نہیں چھوڑا، امام صاحب کو امام ابویوسفؒ سے خاص تعلق تھا، اور جس بڑے کام کے لیے وہ ان کو تیار کر رہے تھے، اس کے لائق ابھی نہیں ہوئے تھے، اس لئے اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر وہ چاہتے تھے کہ افادہ و استفادہ کا سلسلہ باہم ابھی کچھ دنوں اور قائم رہے، تاکہ وہ پورے طور پر اس کام کی ذمہ داریوں کے سنبھالنے کے قابل ہو جائیں، انہیں یہی احساس پیدا کرنے کے لیے ان کے سامنے امام اعظمؒ نے ایسے مسائل پیش کیے، جن میں ان کو اپنے قصور علم اور نارسائی ذہن کا احساس ہوا ورنہ امام صاحب تو خود ان کی برابر ہمت افزائی فرماتے اور ان میں اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے، ایک بار امام زفرؒ اور ان میں کسی مسئلہ میں مباحثہ ہو گیا، جب کئی گھنٹے گذر گئے، اور بحث جاری رہی تو امام صاحب نے امام زفرؒ سے فرمایا کہ علمی ریاست اور سیادت ابویوسفؒ کا حصہ ہے، تم اس کو لینے کی کوشش نہ کرو،

ان کی مجلس درس کا کوئی ذکر تذکروں میں نہیں ملتا، لیکن ان کے تلامذہ اور مستفیدین کی کثرت تعداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے چاہے کوئی باقاعدہ مجلس درس نہ قائم کی ہو، لیکن تشنگان علم ان کے چشمۂ علم سے سیراب ضرور ہوتے رہتے تھے، اور اور یہ سلسلہ تقریباً سولہ برس یعنی ۱۵۰ھ سے ۱۶۶ھ تک جاری رہا، ۱۶۶ھ میں وہ عہدۂ قضا پر مامور کر دیئے گئے، اور تقریباً ۱۶ برس تک یہ خدمت انھوں نے انجام دی،

گو قضاد کے زمانہ مین بھی درس وافادہ کا سلسلہ جاری تھا، اور مستفیدین برابر فائدہ اٹھاتے رہتے مگر ظاہر ہے کہ اس عہدہ کی مشغولیتون کیوجہ سے درس کی طرف پہلی جیسی یکسوئی تو باقی نہیں رہ سکتی تھی، چنانچہ ارباب تذکرہ لکھتے ہیں کہ دن مین توان کو بالکل فرصت نہیں ملتی تھی، البتہ رات مین اس کے لیے وقت نکال لیتے تھے، اور درس دیتے تھے، ہارون سے کچھ لوگون نے شکایت کی تو پہلے تو اس نے ان کے علم وتقوی کی تعریف کی، اس کے بعد کہاکہ۔

یقعد للناس ولیس معہ کتاب ولا شئی درسہ باللیل مع شغلہ فی اعمالنا۔ (جلد ۲ ص ۲۳۲ موفق)

عہدۂ قضا .... کی مشغولیت کی وجہ سے رات کو لوگوں کو درس دینے کے لئے بیٹھتے ہیں اور ان کے علم استحضار کا حال یہ ہے کہ ان کے ہاتھ مین نہ کوئی کتاب ہوتی ہے اور نہ کوئی چیز لکھی ہوئی ہوتی ہے۔

امام صاحب کے درس کی خصوصیات امام ابو یوسف کے درس میں،

امام صاحب اپنے معاصرین سے جہان بہت سی چیزون مین ممتاز تھے، وہان ایک امتیاز یہ بھی تھا کہ وہ طلبہ کے ساتھ نہایت خیر خواہی اور حسن سلوک کیساتھ پیش آتے تھے، ان کی تعلیم مین نہ بخل سے کام لیتے تھے، نہ تضیع اوقات کرتے تھے، بلکہ کوشش کرتے تھے کہ وہ اپنے فن مین بڑی سے بڑی شان امتیاز حاصل کرلیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے ایسے صاحب علم وفضل، ذہین وطباع تلامذہ دوسرے ائمہ کو نہین ملے، امام صاحب نے اپنے تلامذہ سے کہدیا تھا، کہ استاد ومربی ہونے کے باوجود میری کسی بات کو بغیر دلیل اور حجت کے نہ ماننا، استاد کے یہ اوصاف بڑی حد تک .... شاگردون مین بھی موجود تھے، وہ بھی اپنے تلامذہ کیساتھ نہایت فیاضانہ برتاؤ کرتے تھے، امام محمد بن حسن

کے حالات میں مذکور ہے۔ کہ وہ امام شافعی اور امام مالک کے مشہور افریقی شاگرد اسد بن فرات کو مجلس درس کے مقررہ اوقات کے علاوہ رات کو گھر پر پڑھاتے تھے، اور ان کو کوئی ناگواری نہیں ہوتی تھی، اسد کو مالی امداد کی ضرورت ہوتی تھی تو اس سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے، امام شافعی کہتے تھے،

لیس احدٌ اَمَنَّ علی من محمد بن حسن الشیبانی	امام محمد سے زیادہ میرے اوپر کسی نے احسان نہیں کیا ہے۔

امام ابو یوسف پر بھی استاد کا پرتو پڑا تھا، وہ بھی طلبہ کے ساتھ نہایت لطف و مہربانی سے پیش آتے تھے، ان کے سوالات کا نہایت خندہ پیشانی اور کمال حلم و صبر کے ساتھ جواب دیتے تھے اور ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے، حسن بن زیاد جو امام صاحب کی شاگردی میں رہ چکے تھے، ان کی وفات کے بعد امام ابو یوسف اور امام زفر کے پاس استفادہ کے لیے آتے تھے، امام ابو یوسف کے بارے میں فرماتے ہیں، کہ

کان ابو یوسف اوسع صدرًا بالتعلیم من زفر (حسن التقاضی ص ۱۹)	ابو یوسف تعلیم کے بارے میں زفر سے زیادہ کشادہ دل اور وسیع ظرف کے تھے،

انہی کا بیان ہے کہ میرے سامنے جب کوئی مشکل مسئلہ آتا، تو پہلے امام زفر کے پاس جاتا، ان سے دریافت کرتا، وہ جواب دیتے، میری سمجھ میں نہ آتا تو دوبارہ پوچھتا، یہانتک کہ جب وہ تکرار سوال سے زچ ہو جاتے تو فرماتے، کہ تمھارے لیے یہ فن نہیں ہے، وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ ہے، تمھارے ذہن و دماغ کا یہی حال ہے، تو مجھے امید نہیں ہے، کہ تم حصول علم میں کامیاب ہو گے، میں وہاں سے بہت غمگین واپس ہوتا، اور پھر امام ابو یوسف

کی خدمت میں جا کر مسئلہ دریافت کرتا، جب ان کا حل بھی میری سمجھ میں نہ آتا تو فرماتے اچھا گھبراؤ نہیں کیا تم کو اس مسئلہ کے مبادی سے بھی واقفیت نہیں ہے۔ کہتا کہ اس کے بہت سے گوشوں سے واقف تو ضرور ہوں لیکن جو واقفیت اور جو اطمینان چاہتا ہوں، وہ حاصل نہیں ہوتا، اور دل میں خلش باقی رہتی ہے، فرماتے، کہ ہر ناقص چیز بتدریج اتمام و اکمال کو پہنچتی ہے، صبر سے کام لو، ذہن و دماغ پر زور ڈالو، امید ہے کہ تم رفتہ رفتہ اپنے گوہر مقصود کو پالو گے، حسن کہتے ہیں، کہ میں ان کے اس صبر و حلم پر متعجب رہتا،

شاگردوں سے فرماتے تھے، کہ

لو استطعت ان اشاطرکم مافی قلبی لفعلت[1]

میرے قلب و دماغ میں جو کچھ علم و فضل، ہے اگر اسے تم لوگوں (تلامذہ) میں تقسیم کر سکتا تو تقسیم کر دیتا،

اس سے تلامذہ کے ساتھ ان کی غیر معمولی دلسوزی، ہمدردی اور تعلق خاطر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، جب تک عہدۂ قضا پر مامور نہیں ہوئے تھے، درس و افادہ کا کام یکسوئی سے انجام دیتے رہے مگر جب قضاوت کی ذمہ داری سنبھال لی، اور اس کے کاموں میں مشغول ہو گئے، تو ظاہر ہے کہ وہ یکسوئی، اور انہماک باقی نہیں رہ سکتا تھا، لیکن پھر بھی اس سے جو وقت بچتا تھا، وہ افادہ و تعلیم ہی میں صرف ہوتا تھا، یہانتک کہ حالت سفر میں بھی یہ فیض جاری رہتا تھا، ایک بار بصرہ تشریف لے گئے، تو بڑا ہجوم ہوا، اصحاب حدیث چاہتے تھے کہ پہلے وہ استفادہ کریں، اور اصحاب فقہ چاہتے تھے، کہ پہلے ان کو خطاب کیا جائے، فرمایا، میں دونوں گروہوں سے تعلق رکھتا ہوں، کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دے سکتا، اس کے بعد انھوں نے ایک سوال کیا، جن لوگوں نے جواب دیا، ان کو اندر لے گیے اور دیر تک یہ مجلس درس و افتاء

---

[1] رسائل ابن جوزی تذکرہ امام ابو یوسف ص ۴۲

جاری رہی۔[1]

حج کے لیے تشریف لے گئے تو وہان بھی درس و افادہ کا سلسلہ جاری تھا، امام مالک سو اسی سفر مین انھون نے ملاقات کی اور دونون میں علمی باتین ہوئین،

غرض یہ کہ انھون نے کوئی مخصوص مجلس درس تو قائم نہین کی مگر تعلیم و افادہ اور درس و تدریس کا مشغلہ پوری زندگی جاری رہا، حتی کہ موت سے چند لمحے پہلے تک یہ چشمۂ فیض جاری تھا، ان کے خاص شاگرد قاضی ابراہیم بن الجراح کا بیان ہے کہ امام ابو یوسف جب آخری بار بیمار پڑے تو مین برابر ان کی عیادت کے لیے جایا کرتا، ایک روز گیا تو وہ بے ہوش پڑے تھے، ذرا ہوش ہوا تو فرمایا ابراہیم! پیدل رمی جمار کرنا بہتر ہے، یا سوار ہو کر، عرض کیا پیدل فرمایا غلط ہے، میں نے پھر عرض کیا، سوار ہو کر، ارشاد ہوا یہ بھی غلط ہے، پھر انھون نے مسئلہ کی پوری تفصیل بیان کی، ان کی خدمت سے اٹھ کر ابھی دروازہ سے باہر نکلا بھی نہیں تھا کہ اندر سے آواز آئی کہ امام کی وفات ہو گئی،

ظاہر ہے کہ جس کا چشمۂ علم تقریباً ۲۰ برس تک مسلسل جاری رہا ہو، اوس سے پوری مملکت اسلامیہ کے نہ معلوم کتنے تشنگان علم نے اپنی پیاس رفع کی ہوگی، ان سب کے نامون کا معلوم اور جمع کرنا بڑا مشکل اور دشوار کام ہے، مگر جو نام تذکرون مین ملتے ہیں، ان کی تفصیل بھی طوالت سے خالی نہین، چند ممتاز اور مشہور تلامذہ و طالبان علم کے نام درج ذیل ہیں؛

قاضی ابراہیم بن جراح مازنی، ابراہیم بن سلمۃ الطیالسی، ابراہیم بن یوسف بن میمون البلخی، امام احمد بن حنبل فرماتے تھے، کہ میں نے تین الماریون کے بقدر کتابون کا علم ان سے حاصل کیا ہے، اسد بن فرات امام مالک کے مشہور شاگرد اسماعیل بن حماد، امام صاحب کے

---

[1] مناقب کردری ج ۲ ص ۱۴۴،

پوتے، اشرف بن سعید نیشاپوری، ابشار بن موسیٰ بصری، بشر بن یزید نیشاپوری، نویر بن سعد مروزی، جعفر بن یحییٰ برمکی (ہارون کا مشہور وزیر) حسن بن زیاد الحسین بن ابراہیم بغدادی، حسین ابن حفص اصفہانی، ابو الخطاب (امام ابو یوسف کے کاتب یعنی پرائیویٹ سکریٹری) خلف بن ایوب بلخی، داؤد بن رشید خوارزمی، سعید بن الربیع ہروی، شجاع بن مخلد، ابو العباس طوسی، عبد الرحمن بن اہر، عبد الرحمن بن عبدی، عبدوس بن بشر الرازی، عثمان بن بحر الجاخط، عوزم ابن فردہ، حافظ علی جعد الجوہری علی بن حرملہ کوفی، علی بن صالح جرجانی، علی بن المدینی، (مشہور حافظ حدیث) علی بن مسلم طوسی، عمرو بن ابی عمرو حرانی، فضیل بن عیاض، امام محمد بن حسن شیبانی، محمد بن ابی رجاء خراسانی، موسیٰ بن سلیمان جوزجانی، وکیع بن الجراح، ہلال بن یحییٰ بصری (صاحب احکام الوقف) یحییٰ بن آدم (صاحب کتاب الخراج) یحییٰ بن معین (امام جرح وتعدیل) یوسف (امام کے صاحب زادے جو کتاب الآثار کے راوی ہیں)

ان ناموں سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ امام ابو یوسف کے فیض کا دائرہ کتنا وسیع تھا، ان میں آپ کو خراسان، جوزجان، بلخ، مرو، ہرات، رے، بغداد، کوفہ، بصرہ، مدینہ، اور مغرب اقصیٰ تک کے شائقین علم، اس خرمن علم وکمال سے خوشہ چینی کرتے نظر آئیں گے ان میں وہ بھی ہیں جن کی ریاست علم وفضل اور جلالت قدر کا ایک عالم معترف ہے،

امام شافعی اور امام ابو یوسف کی ملاقات

امام ابو یوسف اور امام شافعی معاصر تھے، اس لیے دونوں بزرگوں کی باہم ملاقات اور روایت کا امکان موجود ہے، اور اسی وجہ سے غالباً بعض اہل تذکرہ نے ان کی ملاقات کا ذکر کیا ہے، اور بعض نے لکھا ہے کہ ہارون رشید کے سامنے دونوں مین ملاقات ہوئی تھی، اور بعض مسائل میں مناظرہ بھی ہوا، ایک

ایک صاحب تذکرہ نے تو یہانتک تصریح کی ہے، کہ امام ابو یوسف و امام محمد اُن سے مناظرہ مین پیش نہ پا سکے تو خلیفہ ہارون رشید کو امام شافعی کے قتل پر آمادہ کیا، اس آخری روایت کے خلاف کوئی تاریخی ثبوت نہ بھی ہوتا تو بھی نفس واقعہ کے پیش نظر یہ روایت کسی طرح قرین قیاس نہین ہو سکتی تھی، اس لیے کہ ان ائمہ کے بارے میں جن کے زہد و تقوی، بے نفسی و بے غرضی، اور صبر و تحمل پر سب کا اتفاق ہے، ان کی طرف ایسی رکیک باتون کا انتساب تو بڑی بات ہے، ان کے متعلق اس کا کوئی گمان بھی نہین کیا جا سکتا، یہ درحقیقت ادن رواۃ کا اختراع ہے، جو شافعیت اور حنفیت کے فتنہ کو ہوا دے کر اپنا کوئی ذاتی فائدہ اٹھانا چاہتے تھے تعجب ہوتا ہے کہ اس روایت کو امام الحرمین، امام رازی اور امام نووی جیسے محتاط بزرگون نے اپنی کتابون میں کیسے نقل کر دیا بہر حال اس کی تردید مین جو عقلی و نقلی دلائل ہمارے علم میں آئے ہین ہم ان یہان نقل کرتے ہیں،

اہل تذکرہ نے امام ابو یوسف اور امام شافعی کی دو ملاقاتون کا ذکر کیا ہے۔ ایک مدینہ منورہ مین، اور دوسری بغداد مین۔ بغداد میں امام ابو یوسف اور امام شافعی کی ملاقات بالکل افسانہ ہے، اس لیے کہ امام شافعی عراق مین پہلی بار ۱۸۴ھ میں گیے ہیں، جب کہ دو سال پہلے ۱۸۲ھ میں امام ابو یوسف کا انتقال ہو چکا تھا، پھر وہ امام فن کی حیثیت سے نہین بلکہ ایک معمولی طالب علم کی حیثیت سے امام محمد کی خدمت میں گیے تھے، خود فرماتے ہیں کہ مین نے محمد بن حسن سے ایک اونٹ کے برابر علم حاصل کیا، میری آنکھون نے ان کے جیسا کسی کو نہین پایا، ظاہر ہے کہ امام شافعی جو امام محمد کی شاگردی کیلئے گئے تھے۔ ان کا امام ابو یوسف سے بغرض . . . . محال وہ زندہ بھی ہوتے تو مناظرہ کرنا اور پھر ان کو ساکت کر دینا کس طرح سمجھ میں آسکتا ہے،

جب کہ امام ابویوسف ان کے استاد امام محمد کے بھی استاد تھے، اس روایت کی تردید کرتے ہوئے حافظ ابن کثیراور حافظ ابن حجر نے جو کچھ لکھا ہے، اس کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں،

من زعم من الرواة ان الشافعی اجتمع بابی یوسف کما یقول عبد اللہ بن محمد البلوی الکذاب فی الرحلۃ التی ساقھا للشافعی فقد اخطاء فی ذلک وانما ورد الشافعی بغداد فی اول قدمۃ قدمھا الیھا سنۃ اربع وثمانین ومأیۃ	جن راویوں نے یہ گمان کیا ہے کہ امام شافعی اور امام ابویوسف میں ملاقات ہوئی جیسا کہ عبد اللہ بن محمد البلوی کذاب نے ایک فرضی سفر امام شافعی کی طرف منسوب کیا ہے، اس نے اس میں ایک فاش غلطی کی ہے، بغیر کسی شبہ کے یہ بات مسلم ہے کہ امام شافعی پہلی بار بغداد میں ۱۸۴ھ میں گئے (اس سے دو برس پہلے امام ابویوسف کا انتقال ہو چکا تھا)

حافظ ابن حجر خود شافعی المسلک ہیں، انھوں نے امام شافعی کی سوانح عمری میں جو مستقل کتاب توالی التاسیس کے نام سے لکھی ہے، اس میں اس واقعہ کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ما الرحلۃ المنسوبۃ الی الشافعی المرویۃ من طریق عبد اللہ بن محمد البلوی فقد اخرجہ الآبری والبیھقی وغیرھما مطولۃ	اور عبد اللہ بن محمد البلوی کے واسطہ سے جو سفرنامہ امام شافعی کی طرف منسوب ہے اس کو آبری اور بیہقی وغیرہ نے مفصل اور مختصر طور پر نقل کیا ہے،

قول

---

[1] عبد اللہ بن محمد بلوی کے متعلق حافظ ابن کثیر کی اس رائے کی تائید میں امام ذہبی نے میزان میں دارقطنی کا یہ نقل کیا ہے یضع الحدیث یہ حدیث وضع کرتا تھا، ابن حجر نے جو لکھا ہے وہ آگے منقول ہے (البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۵۴)

ومختصره وساقها الفخر الرازي
في مناقب الشافعي بغير
اسناد ومعتمدا عليها وهو مكذوبة
وغالب ما فيها موضوع ...
واوضح ما فيها من الكذب
قوله فيها ان ابا يوسف ومحمد
بن الحسن حرضا الرشيد
على قتل الشافعي وهذا باطل
من وجهين احدهما ان ابا
يوسف لما دخل الشافعي بغداد
كان مات ولم يجتمع به الشافعي
والثاني انهما كانا اتقى الله
من ان يسعيا في قتل رجل مسلم
لا سيما وليس له اليهما
ذنب ... هذا ما لا يظن بهما
وان منصبهما وجلالتهما
وما اشتهر من دينهما ليصد
عن ذلك والذي تحرر لنا

اور امام رازی نے اپنی کتاب مناقب
الشافعی میں بغیر کسی سند کے اس کو
صحیح سمجھکر نقل کر دیا ہے، وہ بالکل افسانہ
ہے ... سب سے بڑا جھوٹ جو اس میں بولا
گیا ہے وہ یہ ہے کہ امام ابو یوسف اور
امام محمد نے ہارون رشید کو امام شافعی
کے قتل پر اکسایا، یہ بات دو وجوہ کی بنا پر
بالکل رد کر دینے کے قابل ہے، ایک
ایک تو یہ کہ جس وقت امام شافعی بغداد
پہنچے تھے اس وقت امام ابو یوسف کا
انتقال ہو چکا تھا، اور ان سے ملاقات
نہیں ہوئی، دوسری یہ کہ ان دونوں بزرگوں
کے دلوں میں جو خدا کا خوف اور تقویٰ
تھا اس سے بالکل مستبعد تھا کہ وہ ان کے
قتل کی کوشش کرتے، اور پھر ایک ایسے
مسلمان کے قتل کی کوشش کرتے جس کا
کوئی گناہ نہیں تھا ..... ان کے
بارے میں اس کا گمان ہی نہیں کیا جا سکتا

؎ ان تصریحات کے باوجود ابتک اہل علم اپنی کتابوں میں اسے نقل کرتے ہیں اور بعض جگہ طلبہ کو پڑھاتے ہیں،

بالطرق الصحیحة ان قدوم الشافعی بغداد اول ماقدم کان سنة اربع و ثمانین وکان ابویوسف قد مات قبل ذلک بسنتین ۱؎

ان کا منصب، ان کی جلالت اور ان کی انسانیت دوستی کی جو شہرت ہے یہ تمام چیزیں قطعی اس کی تردید کرتی ہیں اور یہ بات صحیح طریقوں سے ہمارے نزدیک ثابت ہے کہ امام شافعی ۱۸۴ھ میں پہلی بار بغداد گئے اور امام ابویوسف اس سے دو سال پہلے انتقال کر چکے تھے۔

رجال کے سلسلہ میں حافظ ابن حجر کی رائے کا جو وزن ہے اس سے اہل علم واقف ہیں، پھر ان کے ساتھ امام سخاوی جو رجال وحدیث کے دوسرے نقاد ہیں وہ اپنی کتاب مقاصد حسنہ میں اس روایت کی تکذیب کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

وھی موضوعة مکذوبة — یہ موضوع اور سراسر جھوٹ ہے،

امام ابن تیمیہ نے بھی منہاج السنہ میں اس کی تردید کی ہے،

مدینہ منورہ میں ان کی ملاقات کی جو روایت ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں کہ امام مالک کی موجودگی میں امام ابویوسف اور امام شافعی سے صاع، وقف اور اقامت کے بارے میں مباحثہ ہوا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امام ابویوسف نے امام شافعی کے مسلک کی طرف رجوع کر لیا،

اوپر بار بار ذکر آچکا ہے کہ امام شافعی پہلی بار ۱۸۴ھ میں جب بغداد گئے ہیں، تو اس وقت وہ طالب علم تھے، اور امام ابویوسف اس سے دو برس پہلے انتقال فرما چکے تھے، ظاہر ہے کہ مدینہ منورہ میں ان حضرات کی ملاقات اس سے پہلے ہی ہوئی ہوگی کیونکہ اس روایت

۱؎ توالی التاسیس ص ۱۰، ۲؎ ایضاً ۲۲۲، ۳؎ مغیث الخلق ص ۱۰

مین امام مالک کی موجودگی کا بھی ذکر ہے، اور وہ ۱۷۹ھ میں وفات پا چکے تھے، پھر تمام اہل تذکرہ لکھتے ہیں کہ امام شافعی جب امام مالک کی خدمت میں گئے ہیں، تو بہت کم سن تھے، اس لیے یہ کسی طرح قرین قیاس نہیں ہے کہ امام شافعی اس وقت کسی خاص مسلک کے حامل رہے ہوں گے جس کو امام ابو یوسف نے اختیار کر لیا ہوگا، جبکہ اسکے کئی برس کے بعد جب امام محمد کے حلقۂ درس میں گئے تو اسوقت بھی وہ ایک طالب علم ہی تھے، پھر امام مالک کی مجلس درس اور ان کی عام مجالس کے آداب سے جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ امام مالک کی مجلس میں کسی کو بلند آواز سے بولنے کی بھی اجازت نہیں تھی، ایسی صورت میں کسی شاگرد کو مناظرہ و مباحثہ کی اجازت کس طرح مل سکتی تھی،

یہ امکان ضرور ہے کہ امام ابو یوسف اور امام شافعی کی ملاقات مدینہ منورہ میں امام مالک کی خدمت میں ہوئی ہو، اس لیے کہ ان کی خدمت مین دونوں بزرگوں کا جانا اور کسب فیض کرنا بہرحال ثابت ہے، مگر اس روایت میں جو ہارون رشید کی موجودگی کا ذکر ہے اس کے بارے میں امام بخاری لکھتے ہیں،

وکذلک ما ذکر ان الشافعی اجتمع بابی یوسف عند الرشید باطل فلم یجتمع الشافعی بالرشید الا بعد موت ابی یوسف (مقاصد ص ۲۲۲)	اس طرح جو ذکر کیا جاتا ہے، امام شافعی اور امام ابو یوسف میں ہارون الرشید کی موجودگی میں ملاقات ہوئی، یہ بالکل باطل ہے، ہارون رشید سے امام شافعی کی ملاقات امام ابو یوسف کے انتقال کے بعد ہوئی۔

اس بیان سے مدینہ کی ملاقات کا امکان بھی ختم ہو جاتا ہے۔

ان تاریخی بیانات کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے کہ ان دونوں اماموں میں ملاقات نہیں ہوئی، اس سلسلہ میں ایک اور چیز قابل ذکر ہے، وہ یہ کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الام باب بیع الولاء اور مسند میں امام ابو یوسف سے امام محمد کے واسطہ سے روایت کی ہے یعنی اگر وہ براہ راست ان سے استفادہ کرتے تو پھر امام محمد کے واسطہ سے کیوں روایت کرتے،

امام ابو حنیفہ کے بعض مسانید میں امام شافعی کی براہ راست امام ابو یوسف سے روایت مذکور ہے، اس کے بارے علامہ زاہد الکوثری نے لکھا ہے کہ غالباً یہ سبقت قلم ہے، امام شافعی کے ایک شیخ یوسف بن خالد ہیں، ممکن ہے کہ بعض رواۃ نے غلط فہمی سے یوسف کے بجائے ابو یوسف کا نام روایت کر دیا ہو، اور وہی زبان زد ہو گیا ہو،

عہدۂ قضا عہد نبوی اور عہد صدیقی میں عہدۂ قضا اسلامی حکومت کا کوئی الگ شعبہ نہیں تھا بلکہ ہر صوبہ یا ضلع کا جو والی ہوتا تھا، وہی انتظامی اور عدالتی دونوں امور انجام دیتا تھا، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب اسلامی حدود مملکت میں بہت زیادہ وسعت پیدا ہوئی، اور گوناگون مصالح اور ضرورتوں کی بنا پر انتظامیہ اور عدلیہ کو ایک ساتھ رکھنا مشکل ہو گیا، اور پھر ولاۃ مملکت کی بے عنوانیوں کی خبریں بھی دربار خلافت میں پہنچنے لگیں، تو حضرت فاروقؓ نے دونوں شعبوں کو الگ کر دیا، اور دونوں کے الگ الگ ذمہ دار اور سربراہ کار مقرر کیے، اس کے بعد دونوں شعبے ایک دوسرے سے آزاد ہو گئے، جن کے عہدہ داروں کا تقرر خود خلیفۂ وقت کرتا تھا، عہد فاروقی کے بعد بہت دنوں تک اسی پر عمل درآمد تھا یعنی یہ دونوں شعبے الگ تھے، اور ان کے عہدہ داروں کا تقرر وقت کا خلیفہ کرتا تھا، مگر خلفائے بنو امیہ جن کو دین اور دین کے تقاضوں اور کاموں سے وہ شغف اور تعلق خاطر باقی نہیں رہ گیا تھا، جو ان کے پیشروں کو تھا، اس لیے انھوں نے عہدۂ قضا کی اہمیت کم کر دی، اور

قاضیون کا انتخاب ان کا تقرر، اور عزل صوبون کے والیوں کے ذمہ ہوگیا، ظاہر ہے کہ جب خود خلفاے بنو امیہ کا دینی تصور کمزور اور ان کی دینی زندگی مضمحل ہوگئی تھی اور دین سے زیادہ ان پر دنیا طلبی، پر غالب آگئی تھی، تو پھر ان کے مقرر کردہ والیون کی دینی زندگی کا کیا اعتبار ہوسکتا تھا، غرض اس کی وجہ سے بے عنوانیون کا ایک غیر مختتم سلسلہ شروع ہوگیا مروان جو سلسلۂ بنی امیہ کا تیسرا فرمانروا ہے، اس کے زمانہ کا ایک واقعہ ہے کہ جب وہ مصر پہنچا تو وہان کے قاضی کو بلوایا، اوسوقت وہان کے قاضی عابس تھے، اس نے ان سے پوچھا کہ قرآن یاد ہے، بولے نہین پھر پوچھا فرائض یعنی تقسیم وراثت میں پختگی پیدا کرلی ہے، جواب ملا نہین، مروان کو اس جواب سے حیرت ہوئی، بولا فبم تقضی پھر آپ فیصلہ کیسے کرتے ہیں؟

خلفاء کی اس بے توجہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دن بدن اس میں بے عنوانیان بڑھتی ہی چلی گئیں، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے دور خلافت مین دوسرے شعبون کی طرح اس کی طرف بھی توجہ کی مگر اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے سے پہلے ہی انتقال کر گئے،

صرف یہی نہین تھا، کہ قاضیون کے انتخاب میں اہل و نااہل کا بہت کم خیال کیا جاتا تھا، بلکہ حکمران طبقہ قاضیون کے فیصلون تک میں بھی دخل اندازی کرتا تھا، چنانچہ اموی اور عباسی دور کا مشکل سے کوئی ایسا قاضی ملے گا جس کے فیصلہ میں ارباب حکومت کی مداخلت کا کوئی نہ کوئی واقعہ نہ پیش آیا ہو، صرف اموی دور کے قاضی خیر بن نعیم، اور عباسی دور کے قاضی حفص بن غیاث کے متعلق ان کے تذکرہ نگارون نے لکھا ہے کہ ارباب حکومت نے ان کو اپنے فیصلون کے بدلنے پر مجبور کرنا چاہا تھا، مگر حکومت سے منسلک ہوتے ہوئے بھی ان کے پائے ثبات میں لغزش نہین پیدا ہوئی اور وہ اپنے فیصلون پر قائم رہے، یہی وجوہ تھے کہ محتاط فقہا اور محدثین

---

[1] حسن المحاضرة، ص ۸۸

حکومت وقت سے کسی قسم کے تعاون کو پسند نہیں کرتے تھے، اگر کسی مجبوری کی بنا پر یا اضطراراً وہ تعاون کرنے بھی تھے، تو اس سے مطمئن نہیں ہوتے تھے، بلکہ ایک اضطرار ہی سمجھ کر اسکو انجام دیتے تھے، قاضی حفص بن غیاث فرماتے تھے کہ جب میری حالت یہ ہوگئی کہ مردار کھانا میرے لئے حلال ہوگیا، تو اوس وقت میں نے عہدۂ قضا قبول کیا، قاضی شریک کو مجبوراً عہدۂ قضا قبول کرنا پڑا، تو انھوں نے اس کو دین کے فروخت کرنے سے تعبیر کیا، ان کے الفاظ یہ ہیں،

بعت دینی[1] — میں نے اپنے دین کو بیچ دیا،

وہ لوگ مردار اور دین فروشی سے اس لیے اسکو تعبیر کرتے تھے کہ وہ مسند قضا پر پہنچنے کے بعد، اس جرات اور آزادی کیساتھ دینی احکام کی روشنی میں معاملات کا فیصلہ نہیں کر سکتے تھے، جس آزادی سے وہ عہدۂ افتا پر رہ کر کر سکتے تھے، بلکہ جو لوگ حکومت سے اپنا تعلق قائم کرتے تھے ان کو یہ بھی کرنا پڑتا تھا، یافعی نے یزید بن عبدالملک کے زمانہ کا ایک واقعہ بیان کیا ہے،

اتوا اربعین شیخا شهد واله — ان کے پاس چالیس شیوخ آئے اور کہا

ان الخلفاء لا حساب علیهم — کہ خلفا کے لئے نہ حساب ہے اور نہ عذاب،

ولا عذاب۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں،

نعوذ بالله مما سیلقی الظالمون — ہم اللہ کی پناہ اس عذاب اور سزا سے

من شدة العذاب[2] — مانگتے ہیں، جن میں یہ ظالم مبتلا ہوں

لیکن ان میں جو بہت زیادہ غیر معمولی لوگ تھے، انھوں نے کسی قیمت پر اس اضطرا

---

[1] امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی ص ۵۰ [2] مرآة الجنان ج ۱ ص ۲۲۷،

کو اپنے لیے گوارا نہین کیا، ان ہی لوگون میں سفیان ثوری، امام مالک، امام ابوحنیفہ اور انکے بعض تلامذہ ہیں، امام ابوحنیفہ نے بنوامیہ اور بنوعباس دونون کا عہد دیکھا تھا، اور دونون عہدون مین ان کے سامنے یہ لقمۂ تر پیش کیا گیا، مگر انھون نے قبول نہین کیا، اور کسی قسم کے تعاون اور اشتراکِ عمل کو صحیح نہین سمجھا، ان کے اس عزم سے ان کی پوری زندگی بڑی بے اطمینانی اور بے چینی مین گذری مگر انھون نے اپنے اس ارادہ وعزم مین کسی قسم کی تبدیلی گوارا نہین کی، بلکہ اس سے آگے بڑھکر وقت کی ان دینی اور اصلاحی تحریکون کا علانیہ ساتھ دیا جو نظام حکومت کے بدلنے، اور اس مین انقلاب و اصلاح پیدا کرنے کیلیے اٹھین، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہین ہے، ان کے تلامذہ مین امام زفر بھی اسی عزم و ارادہ کے انسان تھے، ان کے سامنے بھی جب عہدۂ قضا پیش ہوا تو اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا، جب بہت زیادہ اصرار ہوا تو روپوش ہوگئے، حکم ہوا، کہ ان کا مکان گرا دیا جائے جس کی تعمیل کی گئی، لیکن وہ اپنے فیصلہ اور عزم راسخ پر قائم رہے،

امام محمد کو امام ابویوسف نے ایک مصلحت کی بنا پر اس عہدہ کے قبول کرنے پر مجبور کیا، جس کا رنج ان کو زندگی بھر رہا انھون نے حکومت کے خلاف بعض ایسے فیصلے دیئے کہ انکو اس کے نتیجہ میں جیل جانا پڑا تفصیل ان بزرگون کے حالات میں آئے گی،

لیکن امام ابویوسف نے اپنے استاد اور اپنے اصحاب کی روش کے برخلاف عہدۂ قضاء قبول کیا، جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ ان کو وقت کے اس نظام سے اتنی نفرت اور بے تعلقی نہین تھی، جو ان کے پیش رون، اور دوسرے ہم عصرون کو تھی اسی بنا پر بعض اہل تذکرہ نے ان کے بارے میں کچھ اچھی رائے نہین دی ہے، لیکن ان کے

---

[۱] مفتاح السعادہ ج ۲ ص ۱۱۴،

بارے میں متعدد وجوہ کی بنا پر یہ گمان صحیح نہیں ہے،

یہ صحیح ہے کہ جو لوگ حکومت کا کوئی عہدہ قبول کر لیتے تھے، ان کو عام طور پر اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا، خصوصیت سے اہل تقویٰ اور اہل علم کا گروہ تو اس کو سخت ناپسند اور حقیر سمجھتا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت سے متعلق ہونے کے بعد آدمی کی دینی حمیت اور ملی غیرت کچھ سرد ضرور پڑ جاتی تھی، اور صحیح فیصلہ کے مقابلہ میں حکومت کے مصالح اور مفادات کا لحاظ اس کو زیادہ کرنا پڑتا تھا، ایک شاعر کا قول ہے،

ان کل الناس اعداء لمن ولی الاحکام هذا ان عدل[1]

چنانچہ اسی بنا پر امام ابو یوسف کے بارے میں یہی عام طور پر یہ غلط فہمی تھی، اور ان کو عہدۂ قضا کے قبول کر لینے کی وجہ سے مطعون کرتے تھے، مگر ہم آئندہ تفصیل سے بتائیں گے کہ ان کے متعلق لوگوں کا گمان صحیح نہیں تھا، سب سے پہلی بات تو یہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ انھوں نے بہت دنوں تک اس عہدہ کو قبول نہیں کیا، مگر بعد میں کچھ ایسے اسباب پیدا ہو گئے کہ ان کو اپنی راے بدلنی پڑی، اور اس عہدہ کو انھوں نے قبول کر لیا، مگر باوجود اس کے انھوں نے کبھی حق و عدل سے اعراض نہیں کیا، ہمیشہ بے لاگ فیصلے کئے، اور ہمیشہ اپنی دینی حمیت اور ملی غیرت کو باقی رکھا، اگر کبھی نادانستہ لغزش بھی ہو گئی، تو اس پر سخت افسوس کرتے تھے، اوپر ہم نے لکھا ہے کہ امام ابو یوسف بہت غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، جب تک امام صاحب حیات تھے، ان کی اور ان کے بال بچوں کی کفالت کا خیال رکھتے تھے، اور ان کی مدد کرتے تھے، ان کی وفات کے بعد امام ابو یوسف کی معاشی زندگی کا یہ سہارا بھی ختم ہو گیا، پھر بھی انھوں نے نہ حکومت کا رخ کیا، اور نہ کسی کی امداد قبول کی کئی برس تک خالصۃً لوجہ اللہ درس دیتے رہے، اس درمیان میں

---

[1] لمحات النظر ص ۱۲،

گھر کا جو اثاثہ اور اسباب و سامان تھا، اوس کو بیچ بیچ کر گذر اوقات کرتے اور کام چلاتے رہے، خود ہی فرماتے ہیں کہ جب میرے ذاتی اثاثہ کا ایک ایک تنکا بک گیا، اور میری حالت بے انتہا خستہ ہوگئی۔ تو میں نے اپنے سسرالی مکان کی ایک کڑی نکلوا کر بازار میں بیچنے کیلیے بھیجی، جس کو میری ساس نے پسند نہیں کیا، اور مجھے برا بھلا کہا، جس سے میرے دل پر بہت چوٹ لگی، اور میں نے مجبور ہو کر بالآخر عہدۂ قضا قبول کر لیا۔

لیکن صرف اتنی ہی وجہ امام ابو یوسف کے عہدۂ قضا قبول کر لینے کے لیے کافی نہیں ہو سکتی تھی، بلکہ ان کے سوانح حیات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دین کی مصلحت اسی میں سمجھتے تھے کہ اس عہدہ کو قبول کر لیا جائے، اور اس کے ذریعہ اسلامی نظام کے ان قوانین کو نافذ کیا جائے' جو امام صاحب اور ان کی وفات کے بعد خود انھوں نے اور ان کے احباب نے کتاب و سنت سے مستنبط کیے تھے، چنانچہ جس زمانہ میں امام محمد کو عہدۂ قضا کے قبول کرنے میں عذر ہوا، تو ان سے کہا کہ اگر آپ اس عہدہ کو قبول کر لیں گے، تو شام میں ہمارے مسلک کی ترویج کا، ایک ذریعہ ہاتھ آجائے گا، اس واقعہ کا ذکر امام محمد کے حالات میں آئے گا،

پھر امام صاحب اور دوسرے بزرگوں کی دربار خلافت سے بے تعلقی کیوجہ سے حکومت نے بھی اپنے رویہ میں بڑی حد تک تبدیلی پیدا کر لی تھی، اب اس نے اسلامی احکام کے اجراء اور فیصلوں میں پہلے سے کہیں زیادہ مواقع اور آزادی دے رکھی تھی، خاص طور سے قضاۃ کے فیصلوں میں بہت کم دخل دیتی تھی، یہاں تک کہ بعض معاملات میں امام ابو یوسف کے ہم عصر قاضیوں نے ارکان

---

۵۱ امام صاحب کی سیاسی زندگی صفحہ ۳۵۷ مولانا مناظر حسن صاحب نے حوالہ نہیں نقل کیا ہے۔

۵۲ یہ مسلک جسکی ترویج کے لیے زور دے رہے تھے، وہ وہی ہے، جو امام صاحب امام ابو یوسف اور خود امام محمد نے کتاب و سنت سے مستنبط کیا تھا صرف امام محمد نے ایک ہزار مسائل صرف قرآن پاک سے مستنبط کیے تھے۔

حکومت تو الگ رہی خود خلفا کے خلاف فیصلے صادر کیے اور حکومت کو برداشت کرنا پڑا،

اس کے علاوہ امام صاحب نے اسلامی احکام کی ترویج کے لئے ایک جماعت تیار کی تھی، اور اس کے افراد میں جو سیرت اور کردار پیدا کیا تھا، اوس کی بنا پر اون سے یہ توقع نہیں کیجا سکتی تھی کہ وہ ارکان حکومت یا وزراء یا خلفاء کے سامنے اظہار حق کے بجائے ان کی خوشامد کرنے لگیں گے

ممکن ہے، اسی بنا پر خود امام صاحب نے ان لوگوں کو عہدہ قضا کے قبول کرنے کی اجازت دیدی ہو، تو کوئی تعجب نہیں جیسا کہ امام صاحب نے ان کے والد کو جواب دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ آیندہ یہ بڑی حیثیت کے مالک ہوں گے، ....

....

...... وہ خود فرماتے تھے کہ میرے یہ چھتیس اصحاب ہیں، جن میں سے ۲۸ تو عہدۂ قضا کے لائق ہیں، ۶ مفتی ہو سکتے ہیں، اور ۲ یعنی امام زفر اور امام ابویوسف یہ صلاحیت رکھتے ہیں، کہ قاضیوں اور مفتیوں کو تیار کریں، اور ان کو اس کام کے لائق بنائیں،[1]

عاجز کا خیال ہے کہ یہی وجوہ و اسباب تھے، جن کی بنا پر اب اہل علم اور اہل تقوی اصحاب عہدۂ قضا کے قبول کرنے میں اتنے زیادہ وہ سخت نہیں رہ گئے تھے جتنا کہ اس سے پہلے تھے، ممکن ہو کہ اس کے ساتھ معاشی تنگی و پریشانی نے بھی امام ابویوسف کو یہ عہدہ قبول کرنے پر مجبور کیا ہو ورنہ اگر ان کو یہ توقع ہوتی کہ ان کے کیے ہوئے فیصلوں میں کوئی قوت حارج نہیں ہوگی، یا اپنے اندر اس قسم کی کمزوری پاتے، کہ وہ ارباب حکومت کی خاطر اور پاسداری میں اظہار حق سے باز آ جائیں گے، تو یقیناً استاد کی طرح وہ بھی موت کو پسند کرتے لیکن اس عہدہ کے قریب نہ جاتے، ا جو واقعات نقل کیے جائیں گے، ان سے اندازہ ہوگا کہ انھوں نے ہمیشہ بے لاگ فیصلے کیے

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۴، مناقب موفق ج ۲ ص ۲۴۷،

کبھی کسی کی ناحق رعایت نہیں کی، وزراء وارکان حکومت تک کی شہادتیں رو کر دیں، ہارون رشید جیسے با اقتدار اور صاحب جبروت خلیفہ کو معمولی رعایا کی صف میں کھڑا کر دیا، اور اس کے سامنے کبھی اظہار حق سے باز نہیں آئے، اور وہ استاد کی وہ بات کیسے بھول سکتے تھے، جو انھوں نے منصور کے جواب میں کہی تھی، منصور نے جب امام صاحب کو عہدۂ قضا قبول کرنے پر مجبور کیا تو آپ نے اس سے کہا تھا کہ قاضی ایسے شخص کو ہونا چاہئے جو آپکے خلاف، آپکے بچوں کے خلاف اور آپکے سپہ سالاروں کے خلاف فیصلہ کر سکے، (مناقب موفق ج اص ۲۱۵)

ہم ذیل میں ان کے زمانۂ قضا کے چند واقعات نقل کرتے ہیں،

امام ابو یوسف تین عباسی خلفاء کے دور میں قاضی رہے، مہدی، ہادی، اور ہارون رشید، مہدی نے انہیں صرف بغداد کے مشرقی حصہ کا قاضی مقرر کیا تھا، مگر خلیفہ ہادی کے زمانہ میں وہ پورے بغداد[1] کے قاضی بنا دیئے گئے، ایک باغ کے معاملہ میں خلیفہ ہادی اور کسی عام آدمی میں اختلاف ہو گیا، ہادی نے حکم دیا کہ معاملہ قاضی کے روبرو پیش کیا جائے، امام ابو یوسف کے سامنے ایسی شہادتیں گذریں جن سے باغ ہادی کا ثابت ہوتا تھا، لیکن امام نے انہی شہادتوں پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ خفیہ تحقیقات کی، جس سے معلوم ہوا کہ باغ خلیفہ کے مخالف فریق ہی کا ہے، جس کے خلاف عدالت میں شہادتیں گذر رہی تھیں، قاضی صاحب نے مقدمہ تو اوسوقت ملتوی کر دیا، ہادی سے ملاقات ہوئی تو اس نے پوچھا کہ مقدمہ میں آپنے کیا فیصلہ کیا، امام ابو یوسف نے فرمایا، کہ شہادتیں تو آپکے موافق ہی گذر رہی ہیں، مگر مدعا علیہ کی طرف سے یہ مطالبہ ہوا ہے کہ مدعی (خلیفہ) سے حلف بھی لے لی جائے، ہادی نے پوچھا تو آپ کی کیا رائے ہے، کیا آپ مدعی کا حلف[2] اٹھانا

---

[1] بغداد کی آبادی اس وقت چھ سات لاکھ تھی [2] حنفی مسلک کے مطابق قسم مدعی کے ذمہ نہیں، بلکہ مدعا علیہ کے ذمہ ہے، مگر امام ابو یوسف کے نزدیک ایک حق دار کے حق کو واپس لانا اس سے زیادہ ضروری ہوگا کہ حنفی مسلک کی پیروی کیجائے،

صحیح سمجھتے ہیں، امام ابو یوسف نے فرمایا کہ قاضی ابن ابی لیلی کی تو یہی رائے ہے[2]، اس کے بعد ہادی نے کہا کہ اچھا تو باغ مدعا علیہ کے حوالہ کر دیجئے[3]۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امام ابو یوسف صحیح فیصلہ تک پہنچنے، اور حق کو حق دار تک پہنچانے میں کتنی کد و کاوش کرتے تھے،

اسی طرح کا ایک فیصلہ انھوں نے ہارون رشید کے خلاف بھی دیا تھا، مگر اس میں ان سے ذرہ سی غلطی ہو گئی تھی، جس کا ان کو زندگی بھر افسوس رہا، واقعہ یہ ہے کہ سواد عراق کے ایک بڈھے نے ہارون کے خلاف یہ دعوی دائر کیا کہ فلاں باغ میرا ہے، لیکن خلیفہ نے اس پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے، اتفاق سے یہ مقدمہ اس روز پیش ہوا، جس روز خود ہارون رشید فیصلے کے لئے بیٹھا تھا، قاضی ابو یوسف فریقین کے بیانات اور ان کے دعوی ہارون کے سامنے پیش کر رہے تھے، جب اس مقدمہ کی باری آئی، تو انھوں نے خلیفہ کے سامنے اس کو پیش کیا، اور کہا کہ آپ کے اوپر دعوی ہے کہ آپ نے فلاں آدمی کا باغ زبردستی لے لیا ہے، مدعی یہاں موجود ہے، حکم ہو تو حاضر کیا جائے بڈھا سامنے آیا تو قاضی ابو یوسف نے پوچھا بڑے میاں! آپ کا دعوی کیا ہے، اس نے کہا کہ میرے باغ پر امیر المومنین نے ناحق قبضہ کر لیا ہے، جس کے خلاف داد رسی چاہتا ہوں، قاضی نے سوال کیا، اس وقت وہ کس کے قبضہ اور نگرانی میں ہے، بولا امیر المومنین کے ذاتی قبضہ میں ہے، اب قاضی ابو یوسف نے ہارون سے مخاطب ہو کر کہا کہ دعوی کے جواب میں کچھ آپ کہنا چاہتے ہیں، ہارون نے کہا کہ میرے قبضہ میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جس میں اس شخص کا حق ہو، نہ خود باغ ہی میں اس کا کوئی حق ہے، قاضی نے فریقین کے بیانات سننے کے بعد

---

[1] جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ امام ابو یوسف وغیرہ امام صاحب کے قول کے خلاف کبھی فتوی نہیں دیتے یا فیصلہ نہیں کرتے تھے، صحیح نہیں ہے [2] مناقب موفق ج ۲ ص ۲۱۷،

مدعی سے پوچھا کہ تمہارے دعوے کے ثبوت کے لیے کوئی دلیل بھی ہے، کہا ہاں خود امیر المومنین سے قسم لے لی جائے، ہارونؔ نے قسم کھا کر کہا کہ یہ باغ میرے والد مہدیؔ نے مجھے عطا کیا تھا، میں اس کا مالک ہوں، بڈھے نے یہ سنا تو اس کو بہت غصہ آیا اور یہ بڑبڑاتا ہوا عدالت سے نکل گیا تھا جس طرح کوئی شخص آسانی سے ستو گھول کر پی جائے، اسی طرح اس شخص نے آسانی سے قسم کھالی[۱]۔ ایک معمولی آدمی کی زبان سے یہ الفاظ سنکر ہارونؔ کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا، یحییٰ برمکی نے ہارونؔ کو خوش کرنے کے لیے امام ابو یوسفؔ سے مخاطب ہو کر کہا آپنے دیکھا اس عدل و انصاف کی نظیر دنیا میں مل سکتی ہے، امام ابو یوسفؔ نے اس کی تحسین کی کہا کہ مگر انصاف کے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا،

ان واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امام ابو یوسفؔ نے اپنی جرأت، دینی حمیت اور اظہار حق سے اس عہدہ کو جس پر علم دین سے ناواقف تک مقرر ہونے لگے تھے، کتنا اونچا اور بلند کر دیا کہ مطلق العنان خلفاء تک کو ان کے فیصلہ کے آگے سر جھکا دینا پڑتا تھا، موجودہ زمانہ میں شاید کوئی استعجاب کی بات نہ سمجھی جائے، مگر جس مطلق العنانی اور شخصی فرمانروائی کے دور کے واقعات ہیں، اس میں یہ بات حد درجہ تعجب خیز اور حیرت انگیز ہے،

ان واقعات سے ایک اور بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس وقت اسلامی نظام کے چلانے والوں اور خواص کے طبقہ میں گو دین کی وہ روح باقی نہیں رہ گئی تھی، جو قرون اولیٰ میں تھی، مگر چونکہ اسلامی نظام کا ڈھانچا کسی نہ کسی شکل میں اب بھی موجود تھا جس کا اثر تھا کہ معاشرہ کے متساہل اور دین سے غافل افراد کے دلوں میں بھی اتنا خوف خدا اور احساس زمہ داری باقی تھا کہ جب ان کے سامنے

---

[۱] امام ذہبی نے لکھا ہے کہ مدعی نصرانی تھا، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عدل و انصاف کا اس زمانہ میں کیا معیار تھا۔ [۲] مناقب موفق ج ۲ ص ۲۴۳ [۳] ایضاً ۲۴۴

کوئی داعی حق، حق کی دعوت دیتا، یا ان کی کسی ناحق بات پر تنقید کرنا، تو چاہے، ان کی مرضی اور خواہش کے خلاف ہی کیوں نہ ہوتا، اس کو قبول ضرور کرتے تھے، اور اگر قبول نہ کرتے تو کم از کم انکو اس پر ندامت ضرور ہوتی تھی،

حقیقت یہ ہے کہ اگر عام علما و فقہا فریضۂ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا پورا حق ادا کیا ہوتا، تو نہ تو اسلامی نظام ہی کو دھکا لگتا، نہ اس کے چلانے والے غلط راہ پر پڑ جاتے، چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی مجددانہ عزم و ارادہ کا انسان حکومت کے مقابلہ میں سینہ سپر ہو گیا ہے، تو اس نے بڑی حد تک زمانہ کی رفتار اور حکومت کا رخ موڑ دیا ہے،

مذکورۂ بالا معاملہ میں امام ابو یوسف نے انصاف کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، مگر پھر بھی آخر وقت تک ان کو جب اس واقعہ کا خیال آجاتا تو فرماتے تھے ....

.... میں اپنے اندر سخت کوفت، اذیت اور رنج محسوس کرتا ہوں، اور ڈرتا ہوں کہ میں نے انصاف میں جو کوتاہی کی ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا کیا جواب دوں گا، لوگوں نے پوچھا آپ نے انصاف میں کیا کوتاہی کی، اور آپ اس سے زیادہ کیا کر سکتے تھے کہ ایک معمولی کسان کے مقابلہ میں وقت کے سب سے بڑے بادشاہ کو قسم کھانے پر مجبور کر دیا، فرمایا تم لوگوں نے نہیں سمجھا کہ مجھے کس خیال سے تکلیف ہوتی ہے، پھر افسوس کے لہجہ میں فرمایا کہ مجھے تکلیف اور کڑھن اس کی ہے کہ میں ہارون سے یہ نہ کہہ سکا کہ آپ کرسی سے اتر جائیے جہاں آپ کا فریق کھڑا ہے وہیں ایک فریق کی حیثیت سے آپ بھی کھڑے ہو جائیے، یا پھر اجازت دیجئے کہ اس کے لیے بھی کرسی لائی جائے (مناقب ج ۲ ص ۲۴۴)

ان کی جرأت و حق گوئی صرف فیصلوں ہی تک محدود نہیں تھی، بلکہ ہر موقع پر وہ اس کا ثبوت دیتے تھے، ہارون نے ان سے کتاب الخراج لکھنے کی فرمائش کی، تو اس کی تعمیل کی، اور کتاب

مرتب کرائی کہ اسلامی قانون کی تدوین کا ایک اہم اور بہت ضروری کام تھا لیکن اس کے دیباچہ میں ہارون کو جس صفائی اور جرأت کے ساتھ نصیحتیں اور ہدایتیں کی ہیں، وہ ان کی حق گوئی کی ایک زبردست یادگار ہے،

بعض اہل تذکرہ نے جو امام ابو یوسف صاحب کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ دنیا نے ان کو مشغول کر لیا تھا، اس کی تردید میں دوسرے تذکرون اور تاریخون سے جو بیانات نقل کیے جاتے ہیں، انہین تو شبہ کیا جا سکتا ہے اور اس کے متعلق دو رائیں ہو سکتی ہیں، لیکن انھون نے خود اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، اس میں کون شبہ کر سکتا ہے، یہ نصائح و ہدایات کتاب کے صفحہ ۱۷ - ۱۸ پر پھیلے ہوئے ہیں، ہم اس کا خلاصہ یہان پیش کرتے ہیں،

امیر المومنین! خدا کا شکر ہے کہ اس نے ایک بڑی ذمہ داری (حکومت) آپکے سپرد کی ہے، اس کی ادائیگی کا ثواب بھی تمام ثوابون سے بڑا اور اعلیٰ ہے، اور اس میں کوتاہی کی سزا بھی تمام سزاؤن سے بدتر اور سخت تر ہے، آپکے سپرد اس امت مسلمہ کے تمام معاملات کیے گیے ہیں، آپ ان رات کوشش کرین، کہ ان کے حقوق کی بنیادین مستحکم ہون، اور آپ ان کے جان و مال کے امین ہیں، اللہ تعالےٰ نے آپ پر یہ ذمہ داری ڈال کر آپ کی آزمائش کی ہے،

مین یہ کہہ دینا چاہتا ہون، کہ خدا کے خوف اور ڈر پر جس تعمیر کی بنیاد نہیں رکھی جائیگی، اس کیلیے ہر وقت خطرہ ہے کہ کس وقت خداے قدوس اوندھے منہ بنانے والے کے اوپر اسے گرا دے تو آپ امت اور عام رعیت کے حقوق کی حفاظت اور ان کے معاملات کی دیکھ بھال میں کوتاہی نہ کرین، عمل میں خدا قوت بخشتا ہے۔

آج کے کام کو کل پر نہ اٹھا رکھیے، اگر آپنے ایسا کیا تو نقصان ہوگا، وقت کو توقع اور امید کے ساتھ نہ رکھیئے، بلکہ وقت کو عمل کے ساتھ رکھیے، (یعنی امید پر کوئی کام اٹھا نہ رکھیے، بلکہ ہر کام

وقت پر کریجیے۔)

ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے، وقت کے بعد کام بیکار ہے، پھر بہت سی نصیحتیں کرنے کے بعد فرماتے ہیں،

قیامت کے دن وہی حکمران سب سے زیادہ خوش بخت ثابت ہوگا، جس نے اپنی رعیت کو خوش حال رکھنے کی کوشش کی،

دیکھیے آپ کسی معاملہ میں جادۂ مستقیم سے نہ ہٹیے گا، ورنہ آپ کی رعیت بھی ہٹ جائیگی، خبردار کسی معاملہ میں خواہش نفس اور اپنے غیظ و غضب کو دخل نہ دیجئے گا،

جب دین و دنیا میں کشمکش کی صورت پیش آئے تو چاہیئے کہ آپ دین کے پہلو کو اختیار کریں اور دنیا کو چھوڑ دیں دین باقی رہنے والی چیز ہے، اور دنیا فانی ہے،

آپ تمام لوگوں کو خدا کے قانون کے لحاظ سے برابر سمجھیں، خواہ وہ آپکے قریب کے ہوں، یا بعید کے، اللہ کے قانون کے نفاذ میں آپ ملامت کرنے والوں کی بالکل پرواہ نہ کیجیے"

غرض اسی انداز سے انھوں نے ایک طویل نصیحت کی ہے، اسی کے بعد موضوع کتاب پر بحث کی ہے، اس کے بعد کس کو شبہ ہوسکتا ہے کہ جس بلند مقصد کے لیے انھوں نے یہ عہدہ قبول کیا تھا اس کو انھوں نے پورے طور پر انجام نہیں دیا۔ ہارون خودرائی کے باوجود بہت سی خوبیوں میں دوسرے عباسی حکمرانوں میں ممتاز تھا خصوصاً اس کی رعایا پروری کے واقعات تو ابتک زبان زدِ عام و خاص ہیں، اور ان خصوصیات کے پیدا کرنے میں اوس کی نیک فطرتی کے ساتھ ساتھ بلاشبہ امام ابویوسف کی معیت کو بھی بہت کچھ دخل تھا،

امام ابویوسف نے جب خلفا کی پروا نہیں کی، تو وزراء اور ارکان حکومت کی پروا کیا کرتے، چنانچہ انھوں نے متعدد وزراء اور خواص حکومت کی شہادتیں رد کردیں، ایک بار علی بن عیسیٰ

وزیر مملکت نے کسی معاملہ میں شہادت دی، تو امام ابو یوسف نے قبول نہین کی، یہ ایک وزیر کی بڑی توہین تھی، اس نے معاملہ ہارون رشید کے سامنے پیش کیا، ہارون نے امام موصوف سے دریافت کیا، تو فرمایا کہ مین نے شہادت اس لیے رد کر دی کہ میں نے اپنے کانون سے ان کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں تو خلیفہ کا عبد اور غلام ہون اور جب یہ غلام ہیں تو غلامون کی شہادت معتبر نہیں بعض روایتون مین ہے کہ انھون نے کہا کہ یہ جماعت سے نماز نہیں پڑھتے[1]، اس لیے میں نے ان کی شہادت رد کر دی،

ممکن ہے کہ یہ دو الگ الگ واقعے ہون یا امام نے دونون باتیں کہی ہون۔

قاضی القضاۃ کے عہدہ کی ابتدا، امام ابو یوسف خلیفہ مہدی کے عہد خلافت میں بغداد کے مشرقی حصہ کے قاضی مقرر ہوئے تھے، خلیفہ ہادی کے زمانہ میں بھی اسی عہدہ پر تھے، ہارون کے ہاتھون میں خلافت کی باگ ڈور آئی تو سال بھر تک تو اوس نے ان کو اسی حیثیت میں رکھا، مگر اس کے بعد تمام ممالک محروسہ کا قاضی القضاۃ بنا دیا، مقریزی نے لکھا ہے کہ عراق، خراسان، شام، مصر میں ان کے حکم کے بغیر قضاۃ کے منصب پر کوئی مقرر نہیں ہو سکتا تھا، (مقریزی ج ۴ ص ۱۸۱)

جواہر مضیہ میں ہے،

کان الیہ تولیۃ القضاء فی الآفاق من الشرق والغرب	مشرق سے مغرب تک تمام اسلامی ملکون میں قاضیون کا تقرر انہی کے سپرد تھا،

(ج ۲ ص ۲۲۱)

خود امام ابو یوسف فرماتے ہیں،

فولّانی قضاء البلاد کلھا[2]،	پھر مجھکو تمام ممالکِ محروسہ کی قضاۃ کی ذمہ داری سونپ دی،

---

[1] موفق ج ۲ ص ۲۳۹ [2] ایضاً

ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رسمًا اور تبرکًا قاضی نہیں بنائے گئے تھے بلکہ کہنا چاہیے کہ وہ حکومت کے محکمۂ عدلیہ کے پورے انچارج یا بالالفاظ دیگر وزیر عدل وقانون تھے یہ محکمہ اس سے پہلے کبھی قائم نہیں ہوا تھا یہ امام ابو یوسف ہی کی ذات تھی جس نے عہدۂ قضا کو جس کی خلافت راشدہ کے بعد کوئی قیمت باقی نہیں رہ گئی تھی اتنا باوقار، بلند اور اہم بنادیا کہ اس کو ایک الگ محکمہ اور عہدہ کی حیثیت حکومت کو دینی پڑی، اس کی تائید ابو الولید الطیالسی کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے، وہ کہتے تھے کہ

هذا هو الوزیر وقاضی القضاة — یہی وہ شخص ہے جو وزیر اور قاضی القضاۃ ہے

ہارون رشید جیسا باجبروت وخود پرست خلیفہ ان کا اس قدر اعزاز واکرام کرتا تھا، کہ ان کو ہمہ وقت اس کے دربار میں باریابی کی اجازت تھی، ان کے لیے کوئی روک ٹوک نہیں تھی، یہانتک کہ باب خلافت تک پہنچ جانے کے باوجود بھی سواری سے نہیں اترتے تھے، حریم خلافت کا پردہ اٹھادیا جاتا اور ان کی سواری اندر چلی جاتی تھی، جب ہارون کا سامنا ہوتا تو وہ خود سلام میں سبقت کرتا اور یہ مصرع دہراتا تھا،

جاءت به معتجرا ببرده

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ اعزاز واکرام اور بے پایاں اختیار واقتدار خلیفہ کے بعض حواریوں اور حاشیہ نشینوں کو برا لگا، ممکن ہے، ان میں وہ وزیر اور عہدہ دار بھی رہے ہوں، جن کی شہادتیں امام ابو یوسف نے ان کے عہدہ ومنصب اور اقتدار وجلال کے علی الرغم رد کردی تھیں ان لوگوں نے ہارون سے شکایت کے طور پر کہا۔

وکان فقیها عالما انک فعت	وہ محض ایک عالم اور فقیہ تھے، آپ نے انکی
ابا یوسف فوق المقدار وانزلته	حیثیت سے کہیں زیادہ ان کو بلند کردیا
المنزلة الجلیلة الرفیعة	اور غیر معمولی اعزاز واکرام بخش دیا، تو یہ

فبای وجہ نال ذلک منک — مرتبہ آپ کے یہاں انھوں نے کس وجہ

(مناقب موفق ۲ ص ۲۳۲) — سے حاصل کر لیا ہے،

ہارون نے ان حاسدون کو جواب دیا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے، بہت سوچ سمجھکر، اور کافی تجربہ کے بعد کیا ہے، خدا کی قسم علم کے جس باب میں بھی، میں نے ان کو جانچا کامل پایا، پھر کہا کہ ان کی علمی قابلیت کو ان کی طالب علمی کے زمانہ سے جانتا ہوں، پھر ان علمی امتیازات کے علاوہ میں نے مذہب میں انکے قدم کو استوار اور ان کے دین کو تمام آلودگیون سے محفوظ پایا، اگر کوئی قاضی ابو یوسف جیسا ہو تو پیش کر دے[1]

مذکورہ واقعات سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ امام ابو یوسف نے جس مقصد کی خاطر یہ عہدۂ قضا قبول کیا تھا، اس میں وہ کتنے کامیاب تھے، اور انھون نے اپنے ذاتی کردار اور علم و تفقہ سے اس عہدہ کو کتنا بلند اور خود حکومت میں کتنا اثر اور رسوخ پیدا کر لیا تھا کہ وزراء اور ارکانِ حکومت تک کے دل میں رشک و حسد پیدا ہونے لگا تھا، اور یہ ہارون کے عہد -- کا واقعہ ہے، جس میں برامکہ جیسے بیدار مغز وزراء اور ارکان دولت تھے۔

امام ابو یوسف کے بعد اسی عہدہ پر جب وہب بن وہب المعروف بابی البختری کا تقرر ہوتا ہے، تو وہ ہارون کے ہر کام کے جواز کے لیے حدیثیں وضع کرنے لگتے ہیں، مشہور ہے کہ انھون نے کئی بار اسی طرح کا اقدام کیا، دو ایک بار تو ہارون کچھ نہین بولا، مگر وہ بھی صاحب علم و نظر تھا، اور پھر امام ابو یوسف جیسے متدین اور محتاط قاضی ---- کی رفاقت میں رہ چکا تھا، کب تک خاموش رہتا، چنانچہ ایک روز وہ کبوتر اڑا رہا تھا کہ وہب آگئے، پوچھا کہ کبوتر بازی کیلئے بھی کوئی حدیث آئی ہے، بے محابا شیخ نے یہ روایت سنا دی:

---

[1] موفق ج ۲ ص ۲۳۲

مجھ سے ہشام بن عروہ نے یہ روایت کی ہے کہ ان کے والد حضرت عائشہؓ کے واسطہ سے بیان کرتے تھے کہ وہ فرماتی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبوتر بازی کی ہے، اور اس سے شغف فرمایا ہے،

یہ سنکر ہارون آپے سے باہر ہوگیا، اور نہایت خشم گین آواز میں بولا نکل جاؤ میرے سامنے سے اگر تمہارا تعلق قریش سے نہ ہوتا تو میں تمھیں ابھی معزول کر دیتا۔ اور یہی ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد معزول کر دیے گئے۔[1]

عہدۂ قضا کی مدت | امام ابویوسف عہدۂ قضا پر کتنے دنوں مامور رہے، اس میں اختلاف ہے، ایک مرتبہ خود انھوں نے اپنے شاگردوں سے بیان کیا کہ میں ۱۶ برس امام صاحب کی خدمت میں رہا، اور ۱۷ برس دنیا کے کاموں میں (یعنی عہدۂ قضا پر) اوپر ذکر آچکا ہے کہ سب سے پہلے مہدی کے وقت میں قاضی مقرر ہوئے اور ان کی وفات ۱۸۲ھ ہجری میں عہدۂ قضا کی حالت میں ہوئی تو اگر ان کے تقرر کا ۱۵۹ھ مانا جائے تو قضا کی مدت ۲۲، ۲۳ برس ہوتی ہے، اور اگر یہ مانا جائے کہ وہ ۱۷ برس عہدۂ قضا پر رہے تو اس اعتبار سے ان کا تقرر ۱۶۶ھ میں ہونا چاہیے، غرض پہلی صورت میں امام صاحب کی وفات کے ۹ برس کے بعد عہدۂ قضا قبول کیا اور دوسری صورت میں پندرہ برس کے بعد۔

علالت اور وفات | موت سے کچھ دن پہلے بیمار پڑے، ان کو بیمار ہونے سے پہلے ہی اپنی موت کا کچھ اندازہ ہوگیا تھا، وہ برابر کہتے تھے کہ ۱۶ برس امام صاحب کی خدمت میں رہا، اور ۱۷ برس دنیا کے کاموں میں اب میرا وقت قریب ہے، موت سے کچھ پہلے وصیت کی کہ میرے مال میں سے ایک لاکھ درہم اہل مکہ، اہل مدینہ، اور اہل کوفہ پر تقسیم کر دیا جائے، اس کے بعد وراثت تقسیم ہو،[2] علالت کے ایام میں ان پر عجیب رقت طاری رہتی تھی، عہدۂ قضا کی ذمہ داریوں کو انھوں نے

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۲۵۳ [2] کردری ج ۲ ص ۱۱۹

جس دیانت داری سے انجام دیا اس کی تفصیل اُوپر آچکی ہے، لیکن آخر وقت میں وہ کہتے تھے کہ کاش میں فقر و فاقہ کی حالت میں اس دنیا سے چلا جاتا، اور عہدہ قضا نہ قبول کرتا، پھر بھی میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہون کہ میں نے قصداً نہ کسی پر ظلم کیا ہے، اور نہ کسی فریق کی پاسداری کی ہے، اور نہ میری خواہش ہوئی کہ فلان فریق کامیاب ہو، اور فلان ناکامیاب۔[۱] جس روز انھون نے اس دارفانی کو چھوڑا ان پر عجیب کیفیت تھی، اور زبان پر یہ کلمات تھے،

"بار الٰہا تو جانتا ہے کہ میں نے کسی فیصلہ میں جو تیرے بندون کے درمیان تھا، خود رائی سے کام نہین لیا، اور نہ خلاف واقعہ فیصلہ کیا ہمیشہ میری کوشش رہی کہ جو فیصلہ ہو وہ تیری کتاب اور تیرے رسول کی سنت کے موافق ہو جب کسی مسئلہ مین مشکل پیش آتی تھی، تو میں امام ابوحنیفہ کو اپنے اور تیرے درمیان واسطہ بناتا تھا، اور جہان تک مجھے معلوم ہے کہ امام ابوحنیفہ تیرے احکام کو خوب سمجھتے تھے، اور عمداً وہ کبھی حق کے دائرہ سے باہر نہیں جاتے تھے، یہ بھی زبان پر تھا کہ اے اللہ تو جانتا ہے کہ میں ہمیشہ پاکدامن رہا، اور کبھی ایک درہم جان بوجھ کر حرام کا نہین کھایا۔[۲]

تعلیم و تعلم آخری سانس تک جاری تھا، ایک شاگرد کو کسی مسئلہ کی تفصیل بتارہے تھے، ابھی خاموش بھی نہیں ہوے تھے کہ چند منٹ کے بعد آواز ہمیشہ کے لیے بند ہوگئی،

معروف کرخی ایک مشہور بزرگ گذرے ہین، یہ امام ابویوسف کے معاصر تھے انکو جب بیماری کی اطلاع ہوئی تو انھون نے اپنے ایک رفیق سے کہا کہ اگر آج انکی وفات ہو جائے، تو مجھے اطلاع دینا مین جنازہ مین شریک ہون گا، ان رفیق کا بیان ہو کہ جب میں دار الرقیق کے دروازہ پر پہنچا، تو امام ابویوسف کا جنازہ نکل رہا تھا، مین نے خیال کیا کہ اگر مین معروف کرخی کو خبر کرنے جاتا ہون تو مجھے جنازہ کی نماز نہ ملیگی، چنانچہ جنازہ کی نماز پڑھکر ان کے پاس گیا، اور خبر وفات سنائی تو انکو سخت صدمہ ہوا، اور بار بار انا للہ پڑھا اور پھر یہ فرمایا کہ انشاء اللہ انکو جنت مین اچھا مقام ملیگا۔ لوگون نے پوچھا کہ

---

[۱] موفق ج ۲ ص ۲۴۲ [۲] موفق ج ۲ ص ۲۴۲ تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۲۵۳ [۳] کردری ص ۱۲۷،

یہ مقام انکو کیونکر حاصل ہوگا، فرمایا کہ تعلیم اور تعلم اور لوگون کی ایذا رسانی پر صبر کی بدولت، (تاریخ بغداد ج ۱۴)

یہ واقعہ جمعرات کے دن ظہر کے وقت ربیع الاول کی پانچوین تاریخ ۱۸۲ھ کو پیش آیا۔

ان کی وفات کا لوگون پر بڑا اثر ہوا خصوصیت سے ہارون رشید بہت غمگین تھا، جنازہ نکلا، تو مشایعت کی اور خود نماز جنازہ پڑھائی اور اپنے خاندان کے خاص مقبرہ مین دفن کرایا،[1] اس سے فارغ ہوا، تو لوگون کی طرف مخاطب ہوکر کہا کہ تمام اہل اسلام کو چاہیے کہ انکی وفات پر ایک دوسرے کی تعزیت کرین یعنی حادثہ ایک شخص یا ایک خاندان کا نہین بلکہ پوری ملت کا ہے۔

شجاع بن مخلد کا قول ہے کہ ہم امام ابو یوسف کے جنازہ مین شریک تھے، عباد بن عوام بھی ہمارے ساتھ تھے، مین نے ان کو یہ کہتے سنا کہ اہل اسلام کو چاہیے کہ ابو یوسف کی وفات پر ایک دوسرے کی تعزیت کرین،[2]

اہل تذکرہ کا بیان ہے کہ امام ابو یوسف کے جنازہ مین ابو یعقوب خزیمی شاعر بھی شریک تھا، اس نے لوگون کو یہ کہتے سنا کہ دوسرے امام کا خاتمہ ہوگیا، فقہ کا خاتمہ ہوگیا تو اس نے برجستہ ایک مرثیہ کہا جس کے چند اشعار ہین،[3]

یا ناعی الفقہ الی اہلہ	ان مات یعقوب وما تدری
لم یمت الفقہ ولکنہ	حول من صدر الی صدر
القاہ یعقوب ابی یوسف	فزال من ظہر الی ظہر
فہو مقیم فاذا ما ثوی	حل وحل الفقہ فی قبر

حلیہ نہایت ہی پتلے دبلے اور پستہ قد تھے، ان کے ایک شاگرد قاسم بن زریق کہتے تھے کہ جب وہ مسند درس پر بیٹھتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس میں ڈوب جائیں گے لیکن جب درس دینے لگتے تھے، تو حیرت میں ڈال دیتے تھے، ان کا جثہ دیکھکر یہ کہا کرتے تھے، کہ اگر اللہ چاہے تو پرندہ کے پیٹ میں علم بھر دے[4]

اولاد امام ابو یوسف کثیر الاولاد تھے، مگر ارباب تذکرہ صرف ان کے دو صاحبزادون کا تذکرہ کرتے ہین، ایک تو بچپن ہی میں داغ مفارقت دے گئے، اور ایک یوسف نام کے صاحبزادے تھے جنھون نے علم دین امام ابو یوسف

[1] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص و شذرات الذہب کردری ج ۲ ص ۵۰ [2] ایضاً [3] کردری ج ۲ ص ۱۲۶

سے ورثہ میں پایا تھا امام ابو یوسف کی زندگی ہی میں قاضی مقرر ہو گئے تھے، امام ابو یوسف پہلے بغداد کے شرقی حصہ کے قاضی تھے، جب وہ قاضی القضاۃ بنائے گئے تو انکی جگہ پر ان کے صاحبزادے کا تقرر ہوا، والد کی وفات کے بعد پھر یہ رصافہ کے قاضی بنا دیئے گئے، یہ جامع منصور کے امام بھی تھے،

ان کے صاحبزادے فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے گھر میں تیس برس سے عہدۂ قضا ہے،

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو یوسف کے بعد یہ بھی قاضی القضاۃ بنائے گئے تھے، مگر یہ روایت صحیح نہیں ہے، بلکہ امام ابو یوسف کے بعد وہب بن وہب ابو البختری اس عہدہ پر مامور ہوئے، ممکن ہے کہ کچھ دنوں کے لیے انھوں نے نیابت کا کام انجام دیا ہو، ۱۹۳ھ میں ان کی وفات ہوئی، [1]

ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ یہ امام ابو یوسف کی کتاب الآثار کے راوی ہیں، کتاب الآثار

لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد نے ۱۳۵۵ھ میں شائع کی ہے۔

محاسن اخلاق | ان کا صحیفۂ اخلاق ہر قسم کے محاسن و فضائل سے پر ہے، عہدۂ قضا پر رہتے ہوئے انھوں نے حسن اخلاق و کردار کا ثبوت دیا، وہ ان کی خصوصیت ہے، اس عہدہ پر پہنچنے کے بعد بڑے بڑے پاکباز لوگوں کا دامن بھی آلودہ ہو جاتا ہے، مگر انھوں نے اپنا دامن کبھی داغ دار نہ ہونے دیا، لوگوں سے ملنا جلنا، تواضع و خاکساری، لوگوں کی امداد و اعانت، علم کی عزت و توقیر، فیاضی و سیر چشمی یہ سب چیزیں اس زمانہ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ سایہ کی طرح رہیں،

مشہور سیرت نگار واقدی امام ابو یوسف کے ہم عصر تھے، امام ابو یوسف حج میں گئے، تو حجاز میں ان سے ملاقات ہوئی، ان دنوں واقدی کی مالی حالت اچھی نہیں تھی، امام ابو یوسف ان کو اپنے ساتھ بغداد لائے، اور ہارون کے دربار میں لے گئے، یحییٰ برمکی بھی موجود تھا، پوچھا کہ قاضی صاحب مکہ سے کیا تحفہ لائے ہیں، امام ابو یوسف نے کہا کہ میں ایسا تحفہ تمھیں دوں گا کہ اس سے پہلے کبھی نہ ملا ہوگا، یحییٰ نے کہا کہ، کیا ہے، انھوں نے واقدی کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہی تحفہ ہے، اس کے بعد

---

[1] موفق ج ۲ ص ۱۱۰

[1] موفق ج ۲ ص ۱۱۱،

انھوں نے یحییٰ کے ذریعہ اس کی کافی مالی مدد کرائی، [1]

ہارون ایک بار خطبہ دے رہا تھا، ایک شخص کھڑا ہوا، اور اس کو مخاطب کر کے کہا کہ خدا کی قسم! تم نے نہ تو مال کی تقسیم برابر کی، اور نہ عدل و انصاف سے کام لیا، بلکہ اس کے بجائے فلاں فلاں برائیاں کیں، ہارون نے حکم دیا کہ اس کو گرفتار کر لیا جائے، نماز کے بعد وہ پیش کیا گیا، ہارون نے ایک آدمی امام ابو یوسف کو بلانے کے لیے بھیجا، امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ میں آیا تو وہ آدمی دو عقابوں کے بیچ میں کھڑا تھا اور اس کے پیچھے دو جلاد کوڑے لیے کھڑے تھے، ہارون نے کہا کہ اس شخص نے مجھ سے آج ایسی گفتگو کی ہے کہ اس سے پہلے کسی نے نہیں کی، یہ موقع بڑا نازک تھا، لیکن، امام ابو یوسف نے نہایت جرات کیساتھ ہارون کو اسوۂ نبویؐ کی طرف متوجہ کیا، کہا کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غنیمت تقسیم کی، تو آپ سے بھی اسی طرح کی بات چیت کی گئی تھی،

ما اُرید بھا وجہ اللہ — غنیمت کی تقسیم مرضی الٰہی کے خلاف ہوئی ہے،

یہ کتنی سخت بات تھی۔ مگر آپ نے معاف کر دیا کسی نے کہا آپ نے عدل سے کام نہیں لیا، فرمایا اگر میں عدل نہ کروں گا تو اور کون کرے گا پھر کہنے والے سے کوئی باز پرس نہیں کی، حضرت زبیرؓ اور ایک انصاری نے آپ کے سامنے کوئی معاملہ پیش کیا، آپ نے حضرت زبیرؓ کے حق میں فیصلہ کر دیا، انصاری نے غصہ میں کہا کہ اپنے پھوپھی زاد بھائی کے حق میں آپ نے فیصلہ کر دیا، لیکن آپ نے اس گستاخی سے درگذر کیا اور کچھ نہ فرمایا،

ہارون کے سامنے جب یہ اسوہ نبویؐ آیا، تو اس کا غصہ بالکل سرد ہو گیا۔ اور اس شخص کو چھوڑ دینے کا حکم دیدیا، [2]

---

[1] حسن التقاضی ص ۵۰ [2] ایضاً صفحہ ۴۷،

فیاضی اور شکر گذاری بچپن سے فقر و فاقہ کی زندگی تھی، مگر کبھی اس پر ناشکری کے کلمات زبان سے نہیں نکلے، فقر و فاقہ کے ساتھ ان کی شکر گذاری کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے، عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ ایک بار میں ان کے پاس گیا تو انھوں نے مجھ سے معاشی تنگی کی شکایت کی، میں نے تسلی دی، جب ان کے پاس سے چلنے لگا تو دیکھا کہ مٹی کا ایک میلا سا برتن ان کے پاس رکھا ہوا ہے، وہ اتفاق سے میرے دامن سے لگ کر ٹوٹ گیا، اور اس کی وجہ سے ان کے چہرہ پر شکن آگئی اور رنگ فق ہو گیا، مگر زبان سے کچھ نہیں کہا، میں نے کہا کیا بات ہے، فرمایا یہی ایک برتن تھا جس سے میں اور میری والدہ وضو کرتے تھے، اور اسی سے پانی بھی پیتے تھے، عبداللہ بن مبارک ان کا یہ حال سنکر بہت متاثر ہوئے اور کچھ رقم ان کو دی،[1]

قاضی القضاۃ ہوئے تو مال و اسباب کی کافی فراوانی ہوئی، اور اس منصب کے لحاظ سے بھی کچھ ساز و سامان زیادہ ہو گیا مگر اس پر نہ وہ کبھی مغرور ہوئے، اور نہ کبھی دروازہ پر دربان بٹھایا بلکہ آخر تک اپنی زندگی بالکل طالب علمانہ رکھی، پھر بھی اپنے ساتھ دنیاوی ساز و سامان رکھنے کا ان کو افسوس رہا، آخر وقت میں فرماتے تھے: "کاش میں فقر و فاقہ ہی کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہو جاتا، اور یہ عہدہ قضا قبول نہ کرتا۔"[2]

وہ قاضی القضاۃ ہوئے تو ان کو دو ہزار روپیہ سے زیادہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی،[3] پھر ہارون رشید کے دربار سے سال میں لاکھوں روپیے کے انعامات ملتے تھے، اس لیے وفات کے وقت ان کے پاس کافی دولت موجود تھی، لیکن اس دار فانی سے رخصت ہونے لگے تو سب کو غرباء پر تقسیم کرنے کی وصیت کر گیے، چنانچہ تقریباً چار لاکھ روپیہ اہل مکہ، اہل مدینہ، اہل کوفہ اور اہل بغداد کو تقسیم کیا گیا، ہارون نے ان کو کچھ خراجی زمین بھی دیدی تھی، جس پر کوئی ٹیکس نہیں لیا جاتا تھا، اس سے

ص ۵۲

[1] کردری ج ۲، ص ۱۴۳، [2] ایضاً، [3] اس وقت کے سکہ کے لحاظ سے دینار اور ایک ہزار درہم تھی، جواہر مضیئہ ج ۲

جو آمدنی ہوتی تھی وہ صدقہ کر دیتے تھے۔[1]

نرم خوئی اور احساس ذمہ داری

نہایت نرم خو اور فیاض تھے، مگر ان کی نرم خوئی اور فیاضی احساس ذمہ داری سے خالی نہیں تھی، گو یہ دونوں صفتیں بہت کم جمع ہوتی ہیں مگر ان میں یہ دونوں چیزیں جمع تھیں، ذیل کے واقعہ سے اس کا اندازہ ہو جائے گا۔

ایک بار ایک شخص ان کے پاس آیا، اور کہا کہ میں نے فلاں شخص سے آپ کی طرف سے ایک خط لکھکر اتنے روپیے حاصل کر لیے تھے، اب وہ مجھ سے مانگتا ہے، اس سے مجھکو چھٹکارا دلائیے، امام ابو یوسف نے اس کو قید کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ جب تک روپیہ واپس نہ کرو گے، اس وقت تک قید سے رہائی نہیں مل سکتی، اس نے کہا میں نے ایک بار اسی طرح آپکے استاد امام ابو حنیفہ کی طرف سے بھی ایک فرضی خط ایک شخص کو لکھ کر روپیہ حاصل کیے تھے مگر جب میں نے ان کو اس کی اطلاع دی تو انھوں نے وہ روپیہ میری طرف سے ادا کر دیا، اور .... فرمایا کہ جس شخص کے بارے میں یہ خیال ہو کہ وہ میرا خط دیکھ کر تمھیں روپیہ دیدیگا، تو تم خط لکھ کر منگا لیا کرو، آپ بھی انہی کے اصحاب میں ہیں، آپ سے بھی مجھے یہی توقع تھی، امام ابو یوسف نے فرمایا کہ میں امام ابو حنیفہ نہیں ہوں، وہ ایک جلیل القدر عالم اور فقیہ تھے، لوگ ان کا، ان کے علم و فضل کی وجہ سے احترام و اعزاز کرتے تھے اور اسی وجہ سے انکے نام پر روپیہ دیدیتے تھے، اور میں حکومت کا ایک ذمہ دار ہوں اس لئے اس بات کا امکان ہے کہ جس کو تم نے لکھا ہو وہ روپیے دینا نہ چاہتا ہو، مگر میرے خوف سے اس نے دیدیا ہو، ایک دن تک اس کو محبوس رکھا، پھر دوسرے دن اس کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ جس سے تم نے روپیے لیے تھے، میں نے اس کو واپس کر دیئے، اور تم کو رہا کرتا ہوں، اگر وہ دوبارہ وہ رقم بطیب نفس بھی تمھیں واپس کرے تو نہ لینا، جاؤ اور آئندہ ایسا نہ کرنا۔[2]

---

[1] جواہر مضیہ ج ۲ ص ۱۴۰۔ [2] موفق ج ۲ ص ۲۲۵۔

حکومت کے تعلق اور اس کے ذمہ داروں کے نام سے عام طور پر جو فائدے حاصل کیے جاتے ہیں، امام ابو یوسف نے اس کے سدباب کے لئے اس کو قید کر دیا، مگر ان کی طبعی فیاضی اور نرم خوئی کا اثر تھا کہ روپیہ بھی ادا کر دیا،

تقویٰ اور خوف آخرت | نہایت پاک دامن اور عفت مآب تھے، فرماتے تھے، بار الٰہا تو جانتا ہے کہ میں نے کبھی کوئی حرام فعل نہیں کیا اور نہ حرام کا ایک پیسہ کھایا[1]۔

فرماتے تھے بار الٰہا! تو جانتا ہے کہ جب دو آدمی میرے پاس کوئی معاملہ لائے تو میں نے کبھی کوئی جانبداری نہیں کی، اور نہ میری یہ کبھی خواہش ہوئی کہ فلاں کے حق میں فیصلہ ہو[2]، خواہ وہ خلیفہ وقت ہی کیوں نہ ہو، بار الٰہا! اس کے بدلہ تو مجھے معاف کر دے،

ابو حفص ان روایتوں کے راوی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ انھوں نے آخر وقت میں ایسی بات کہی ہے جس پر زندگی میں ان کا عمل نہیں تھا، بلکہ ان کی ساری زندگی اسکی آئینہ دار تھی،

علی بن عیسیٰ کہتے ہیں کہ میں ایک بار ایسے وقت میں امام ابو یوسف کے پاس آیا کہ مجھے گمان تھا کہ وہ آرام گاہ میں ہوں گے، اور ملاقات نہ ہو سکیگی، میں نے اطلاع کرائی تو فوراً اندر بلا لیا، دیکھا کہ ایک علیحدہ کمرے میں لنگی باندھے ہوئے بیٹھے ہیں، اور ان کے گرد کتابوں کا انبار ہے، میں نے کہا میں تو سمجھتا تھا کہ آپ سے ملاقات نہ ہو سکیگی، امام ابو یوسف نے فرمایا کہ دیکھو اس کمرے کے چاروں طرف یہ الماریاں ہیں، ان میں کتابیں اور کاغذات کے بہت سے پوٹ رکھے ہوئے ہیں، یہ تمام میرے فیصلوں کی نظیریں ہیں، قیامت کے دن جب مجھ سے بازپرس ہوگی کہ تم نے فیصلے کس طرح کیے تو خدا کے حضور اس کے جواب میں یہی پیش کر دوں گا[3]،

قرآن مجید کا احترام اور عبادت | امام ابو حنیفہؒ کے درس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ حفظ قرآن کے

---

[1] موفق ج ۲ ص ۲۴۲ [2] ایضاً [3] موفق ج ۲ ص ۲۴۴،

بغیر اپنے درس میں کسی کو شریک ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے، امام محمد صاحب پہلی بار ان کی خدمت میں آئے تو ان کو پورا قرآن مستحضر نہیں تھا اس لئے ان کو واپس کر دیا جب پورا قرآن ان کو مستحضر ہو گیا، تو پھر ان کو درس میں شریک ہونے کی اجازت دی، قرآن کے احترام اور اس کی تلاوت میں بھی وہ ضرب المثل تھے۔

امام ابو یوسف بھی حافظ قرآن تھے، قرآن کا اعزاز و احترام بھی انھوں نے استاذ سے سیکھا تھا، ایک بار کہیں جا رہے تھے، راستہ میں دو آدمی خرید و فروخت میں جھگڑا کر رہے تھے، ان میں سے ایک شخص نے اپنے ساتھی سے کہا کہ میری اور تمہاری مثال تو قرآن کی اس آیت کے مطابق ہے، اس کے بعد اس نے سورہ ص کی یہ آیت پڑھی،

هٰذَا اَخِي لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً	یہ میرا بھائی ہے جس کے پاس ۹۹ دنبیاں
وَّلِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا	ہیں اور میرے پاس صرف ایک دنبی ہے
	یہ کہتا ہے کہ یہ ایک بھی مجھے دے دو

امام ابو یوسف نے جب یہ سنا تو ان پر غصہ اور افسوس سے ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی، قریب تھا کہ بے ہوش ہو جائیں، جب ذرہ یہ کیفیت دور ہوئی تو اس شخص سے بڑے درشت لہجہ میں کہا کہ

"تو اللہ سے ذرا بھی ڈرتا نہیں، کلام الٰہی کو تو نے معمولی بات چیت بنا لی ہے، قرآن کے پڑھنے والے کو چاہئے کہ وہ اس کو نہایت خشوع و خضوع اور خوف و ہیبت کے ساتھ پڑھے ایسا نہ ہو کہ وہ خدا کی ناراضگی کا سبب بن جائے، میں تجھ میں یہ کیفیت بالکل نہیں پاتا کیا تیری عقل جاتی رہی ہے کہ تو نے کلام الٰہی کو لہو و لعب بنا لیا ہے"[1]

اسی طرح ایک بار ایک شخص کو سورہ طٰہ کی کوئی آیت پڑھتے ہوئے سنا تو اس کو بھی بہت ڈانٹا، محمد بن فضیل فرماتے ہیں کہ میں امام ابو یوسف کو اس لیے ناپسند کرتا تھا کہ یہ حکومت کے ارکان سے

---

[1] موفق ج ۲ ص ۲۴۴،

اختلاط رکھتے ہیں، لیکن جس روز سے ان کو یہ تنبیہ کرتے ہوئے میں نے دیکھا اس روز سے ان سے محبت کرنے لگا،[1]

کردری نے لکھا ہے کہ دین کے تمام کاموں میں وہ بڑا اہتمام کرتے تھے[2]، دعا کرتے تھے تو دونوں ہاتھ چادر کے اندر کبھی نہیں رکھتے تھے بلکہ باہر نکالکر دعا کرتے تھے،[3]

موفق اور قرشی دونوں حضرات نے لکھا ہے کہ عہدۂ قضا کے قبول کرلینے کے بعد وہ سو رکعت روزانہ نماز پڑھتے تھے، روزہ کا بھی بڑا اہتمام کرتے تھے خصوصیت سے رجب و شعبان میں پورے مہینہ روزہ رکھتے تھے،[4]

احسان شناسی | امام ابو یوسف، امام ابوحنیفہ اور ابن ابی لیلیٰ دونوں حضرات کے خاص شاگرد تھے ان دونوں اساتذہ کی احسان شناسی سے وہ پوری زندگی گرانبار رہے، ہمیشہ دونوں کے لیے دعاے مغفرت کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ میں نے جب بھی کوئی نفل یا فرض نماز پڑھی تو ان کے لیے دعا ضرور کی، بعض روایتوں میں ہے کہ وہ اپنے والدین سے پہلے امام صاحب کے لیے دعا کرتے تھے،

حاضر جوابی | امام ابو یوسف نہایت ذکی اور ذہین تھے، اس لیے جب کوئی بات یا مسئلہ سامنے آتا تو اس کا وہ فوراً جواب دیتے، ایک بار ہارون کے ساتھ حج کو تشریف لے گئے، ظہر یا عصر کے وقت انھوں نے امامت کی چونکہ یہ مسافر تھے، اس لیے قصر کیا یعنی دو رکعت کے بعد سلام پھیر کر نمازیوں سے کہا کہ اپنی نمازیں پوری کرلو میں مسافر ہوں[5]، اہل مکہ میں سے ایک شخص نے نماز ہی میں کہا ہم لوگ یہ مسئلہ تم سے اور جس نے تم کو سکھایا ہے اس سے بہتر جانتے ہیں، امام ابو یوسف نے کہا یہ تو ٹھیک ہے، لیکن اگر تم کو یہ مسئلہ معلوم ہوتا تو نماز میں بات چیت نہ شروع کردیتے، اس جواب پر ہارون

---

[1] موفق جلد ۲ صفحہ ۲۲۵، [2] ایضاً ص ۲۴۰، [3] اس میں سنت کی موافقت بھی مقصود رہی ہوگی اور اس صورت میں تضرع کی کیفیت بھی زیادہ پیدا ہوتی ہے، [4] موفق ج ۲ ص ۲۲۱ و حسن التقاضی ص، و کردری ج ۲ ص ۱۲۱، [5] یہی مسنون طریقہ ہے،

بہت خوش ہوا اور اس نے کہا کہ اگر نصف سلطنت کے بدلہ مجھے یہ جواب مل جاتا تو بھی میں پسند کرتا[1]

ایک بار ہارون نے ان سے کہا کہ آپ میرے پاس بہت کم آتے ہیں میں آپکی صحبت زیارت کا مشتاق رہتا ہوں، امام ابو یوسف نے فرمایا کہ یہ اشتیاق اسی وقت تک ہے جب تک کہ میں کم آتا ہوں جب زیادہ آنے لگوں گا تو یہ اشتیاق و اعزاز باقی نہیں رہے گا، ہارون نے اس جواب کی تحسین کی[2]

ایک لطیفہ | ایک صاحب، امام ابو یوسف کی خدمت میں ہمیشہ خاموش بیٹھے رہتے تھے، ایک بار ان سے فرمایا کہ تم کچھ بولتے نہیں کہا کہ بہت اچھا کچھ دیر کے بعد بولے روزہ کب افطار کرنا چاہئے فرمایا جب آفتاب غروب ہو جائے، بولے اگر آفتاب آدھی رات تک غروب نہ ہو تو؟ یہ سن کر امام ابو یوسف ہنس پڑے، اور کہا کہ تمھارا خاموش رہنا ہی اچھا تھا، تمھاری زبان کھلوا کر میں نے خطا کی[3]

قوت حافظہ | نہایت قوی الحفظ تھے، امام ذہبی نے انھیں حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے، ابن جوزی نے ان کو امت کے ان سو قوی الحفظ لوگوں میں شمار کیا ہے، جو ضرب المثل تھے، انھوں نے لکھا ہے کہ اپنے شیوخ حدیث سے جب وہ سماع حدیث کرتے تھے، تو بسا اوقات ایک ہی مجلس میں انھیں پچاس ساٹھ حدیثیں مع سند زبانی یاد ہو جاتی تھیں، ابن عبد البر کے بیان سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، حافظ ابن حجر نے حسن بن زیادہ کے واسطہ سے نقل کیا ہے، کہ وہ ایک بار بیمار تھے، اسی حالت میں سفیان بن عیینہ نے چالیس حدیثیں سنائیں اور وہ سب ان کو اسی وقت یاد ہو گئیں اور ان کے جانے کے بعد اپنے رفقاء کو وہ تمام حدیثیں مع سند سنا دیں، رفقا کو ان کی قوت حفظ پر سخت تعجب ہوا، ابو معاویہ کہتے ہیں کہ میں اور ابو یوسف دونوں سماع حدیث کیلئے جاتے تھے، میں تو شیخ سے سنی ہوئی تمام حدیثیں لکھ لیا کرتا تھا، اور انھیں بغیر لکھے زبانی یاد ہو جاتی تھیں، خلیفہ ہارون رشید بھی ان کا

---

[1] مفتاح السعادہ ج ۲ ص ۱۰۴، [2] ایضاً ص ۱۰۶، [3] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص

ہم سبق رہ چکا تھا، اس سے ایک بار لوگوں نے امام ابو یوسف کی شکایت کی، تو اس نے کہا میں ان کے علم وفضل کو بچپن سے جانتا ہوں، یہ درس میں حدیثیں لکھتے نہیں تھے، مگر حافظہ ایسا قوی تھا کہ ان کو سب حدیثیں زبانی یاد ہو جاتی تھیں، اور درس کے بعد لکھنے والے ان کے حفظ سے اپنی مکتوبہ احادیث کی تصحیح کرتے تھے،[1]

علم وفضل | امام ابو یوسف کے صحیفۂ زندگی کا سب سے جلی عنوان یہی ہے، امام ابو یوسف ائمہ تابعین اور تبع تابعین کے اس دور میں تھے، جس میں علم وفن کا چرچا گھر گھر تھا، دینی علوم تفسیر و حدیث و فقہ، و سیرت، رجال و طبقات اور مذاہب اربعہ کے ائمہ اور اعاظم رجال علما اسی دور میں تھے، مثلاً امام ابو حنیفہ، امام مالک، سفیان سوری، امام اوزاعی، عبداللہ بن مبارک، سفیان بن عیینہ، امام احمد بن حنبل، امام شافعی، محمد بن اسحاق، یحییٰ بن معین، وکیع بن جراح وغیرہ، ان ائمہ کبار کی موجودگی میں کسی دوسرے کے علم وفضل کا چراغ اس وقت تک نہیں جل سکتا تھا جب تک وہ غیر معمولی حیثیت کا مالک نہ ہو، ان میں سے متعدد ائمہ امام ابو یوسف کے استاذ تھے، اور متعدد شاگرد تھے، اور ان میں سے ہر ایک نے ان کے علم وفضل کا جن الفاظ میں اعتراف کیا ہے، ان سے امام ابو یوسف کی علمی عظمت اور بلند پایگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

امام ابو حنیفہ جو آسمان علم کے مہر درخشاں تھے، اور جن کے فیض صحبت سے ابو یوسف، امام ابو یوسف ہوئے تھے، وہ بھی ان کے مداح تھے، ایک بار امام ابو یوسف بیمار پڑے، امام صاحب عیادت کے لیے گئے، جب وہ باہر نکلے تو بہت متفکر نظر آئے، کسی نے سبب پوچھا تو فرمایا یہ جوان مر گیا تو زمین کا سب سے بڑا عالم اٹھ جائے گا،[2]

---

[1] حسن التقاضی صفحہ ۱۵، یہ تمام واقعات کردری، موفق انتقاد جواہر مضیہ اور تاریخ بغداد وغیرہ میں مذکور ہیں، [2] موفق ج ۲ ص

علی بن صالح جو امام شعبہ اور ابن ابی ذئب جیسے ائمہ کی صحبت میں رہ چکے تھے، جب امام ابویوسف سے روایت کرتے تھے، تو فرماتے تھے، سید العلما افقہ الفقہاء علماء کے سردار سب سے بڑے فقیہ یعنی ابویوسف نے یہ روایت کی ہے[1]،

علی بن جعد درس دے رہے تھے اثنائے درس میں امام ابویوسف کا تذکرہ آگیا، کسی نے کہا کہ آپ جیسا آدمی بھی درس میں امام ابویوسف کا تذکرہ کرتا ہے، ان کو بڑا رنج ہوا اور اس شخص سے مخاطب ہو کر کہا کہ امام ابویوسف کا نام لینے سے پہلے چاہیے تھا کہ تم اپنا منہ اشنان (ایک گھاس اور گرم پانی سے صاف کر لیتے، پھر فرمایا کہ مارأیت مثلہ میں نے ان کے جیسا کوئی صاحب علم نہیں دیکھا، یہ علی بن جعد امام مالک، سفیان ثوری، لیث بن سعد، شعبہ بن حجاج وغیرہ ائمۂ فقہ وحدیث کے فیض یافتہ تھے، اس لئے ان کی یہ رائے بہت ہی اہمیت رکھتی ہے[2]۔

بشر بن ولید نے ایک شخص سے کہا کہ تم امام ابویوسف کی تعظیم نہیں کرتے، میں نے ان کے مثل کسی کو نہیں پایا[3]

ہلال الرای کہتے تھے کہ امام ابویوسف تمام علوم کے جامع تھے، فقہ ان کے علوم میں اقل العلوم تھی[4]،

طلحہ بن جعفر فرماتے تھے کہ امام ابویوسف مشہور ومعروف تھے، ان کا علم وفضل بلند درجہ کا تھا، ان سے بڑھ کر ان کے زمانے میں کوئی نہیں تھا، علم وحکمت اور ریاست وقدر میں انتہا کو پہنچے ہوئے تھے، وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے امام ابو حنیفہ کا علم تمام عالم میں پھیلایا[5]،

امام صاحب کے پوتے اسمٰعیل بن حماد فرماتے ہیں کہ میرے دادا (ابوحنیفہ) کے خاص اصحاب دس تھے،

---

[1] کردری جلد ۲ صفحہ ۱۲۷ [2] حسن التقاضی صفحہ ۳۰۔

[3] حسن التقاضی صفحہ ۳۰ [4] حسن التقاضی صفحہ ۲۹ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۸)

لیکن ان میں امام ابو یوسف سے بڑھ کر کوئی نہیں تھا۔

احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، علی بن المدینی جیسے ائمۂ جرح و تعدیل نے بھی ان کے علم و فضل کا اعتراف کیا ہے، اور ان کی توثیق کی ہے، ان ائمہ کے اقوال آگے آئیں گے۔

ان اقوال سے ان کے علم و فضل کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا، اس لیے کہ معاصرین اور ائمۂ رجال کے اقوال و آراء کے آئینہ میں بھی اسلاف کی زندگی کے حسن و قبح اور .... خط و خال بڑی حد تک نظر آجاتے ہیں، لیکن یہ ان کے علم و فضل کا بہر حال ایک اجمالی ہی خاکہ کہا جائے گا، تفصیل کے لیے ضرورت ہے کہ ان تمام فنون پر بحث کی جائے، جن میں انھوں نے اپنے اجتہاد کے نقوش چھوڑے ہیں، خصوصیت سے قرآن اور حدیث و آثار کے سلسلہ میں،

قرآن اوپر ذکر آچکا ہے، کہ وہ قرآن کے حافظ تھے، قرآن سے ان کو اتنا انس و شغف تھا کہ بغیر خشوع و خضوع اور توجہ الی اللہ کے کسی کو پڑھتے ہوئے دیکھتے تھے، تو اس کو سخت تنبیہ کرتے تھے، اوپر یہ بھی ذکر آچکا ہے، کہ امام صاحب کے عام درس میں تو نہیں مگر ان کا جو خاص شورائی درس ہوتا تھا، اس کی شرکت کے لیے حفظ قرآن پہلی شرط تھی، چنانچہ ان کے مخصوص تلامذہ میں امام محمد، امام زفر، حسن بن زیاد، داؤد طائی، فضیل بن عیاض، سب حافظ قرآن تھے،

امام صاحب نے یہ شرط ایک بڑے مقصد کی خاطر لگائی تھی، وہ یہ کہ امام صاحب کا طریقہ استنباط یہ تھا کہ ہر معاملہ میں وہ پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرتے تھے، اس کے بعد آثار و احادیث کی طرف، اور اسی طریقہ پر وہ اپنے تلامذہ کی بھی تربیت کرتے تھے، پھر وہ اپنے اجتہاد و استنباط کو اپنے تلامذہ پر تھوپتے یا ان کو صرف املا نہیں کراتے تھے، بلکہ وہ ہر مجتہد فیہ اور مستنبط مسئلہ کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۶) سے مقصد یہ ہے کہ عملاً امام صاحب کے مستنبط مسائل کو سب سے زیادہ اشاعت انہی کے ذریعہ ہوئی۔

کو اپنی مجلس علمی میں پیش کرتے تھے، اس کے بعد سب کو قرآن و سنت میں غور کر کے رائے دینے کا اختیار دیتے تھے، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں کسی ایسے شاگرد کا اس مجلس میں گذر نہیں ہو سکتا تھا، جو حافظ قرآن نہ ہو، اور پھر اسی کے ساتھ اس میں قرآن سے اجتہاد اور استنباطِ مسائل کی پوری پوری صلاحیت موجود نہ ہو،

امام صاحب کی اس مجلس درس میں امام ابو یوسف کی جو حیثیت تھی، اس کا ذکر خود امام کی زبانی اوپر آچکا ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کو قرآن میں غور و خوض اور اس سے تخریج مسائل کا کتنا ملکہ رہا ہوگا،

فرماتے تھے کہ میں نے جن مسائل میں فتوے دیئے تھے، ان میں جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق تھے، انھیں تو باقی رکھا اور جو خلاف تھے ان سب سے رجوع کر لیا[1] یعنی امام صاحب کی مجلس درس میں جو کچھ حاصل کیا تھا، اس کو دوبارہ کتاب و سنت کے معیار پر رکھا، پھر اس کو اختیار کیا یا چھوڑا،

قرآن پر غور و خوض اور اس سے نتائج اخذ کرنے کے لیے، حدیث و آثار کے علاوہ لغت عرب اور بعض دوسرے علوم سے واقفیت بھی ضروری ہے، چنانچہ امام ابو یوسف ان تمام علوم کے جامع تھے، جن کی ضرورت ایک مجتہد کے لیئے ضروری ہے قرآن سے ان کے استدلال اور استنباط کی دو چار مثالیں یہاں پیش کیجاتی ہیں۔

مصارف زکوٰۃ کے سلسلہ میں قرآن کی یہ آیت :۔

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنِ	زکوٰۃ، فقرا، مساکین اور ان کے وصول
وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا ۔	کرنے والوں کا حق ہے،

کو آخر تک نقل کرنے کے بعد اس کی مجتہدانہ تفسیر و تفصیل کرتے ہیں،

---

[1] موفق ج ۲ ص ۱۳۱،

انھوں نے تفسیر میں آیت کی ترتیب بدل دی ہے یعنی پہلے انھوں مولفۃ القلوب کو لیا ہے۔

ان کے بارے میں عام ائمہ کی طرح ان کی بھی رائے یہی ہے کہ اب یہ مصرف باقی نہیں رہا،[1] پھر عاملین زکوٰۃ کا تذکرہ کرتے ہیں، اس میں انھوں نے ایک خاص بات یہ لکھی ہے، ان کو اتنا معاوضہ دینا چاہئے کہ ان کی ضروریات زندگی پوری ہوسکیں، اس میں نہ تو اسراف کیا جائے، اور نہ بخل سے کام لیا جائے، اگرچہ معاوضہ اس کے اصل حصہ سے زیادہ ہی کیوں نہ ہو جائے،[2]

پھر فقراء، مساکین اور غارمین کا ذکر کرنے کے بعد ابن السبیل (مسافر) کی تشریح کی ہے، انھوں نے یہ اجتہاد کیا ہے کہ اس میں مسافروں کی ذاتی مدد کے علاوہ اون کی راحت رسانی کے سامان کی تیاری مثلاً راستوں کی درستی، پلوں اور مسافر خانوں کی تعمیر وغیرہ بھی داخل ہوسکتی ہے، ان کی اصل عبارت یہ ہے۔

وفی ابناء السبیل سھم یحملون بہ ویعاونون (کتاب الخراج ص ۴۶)

ایک حصہ مسافروں کا ہے، جس کے ذریعہ ان کے لیے سواری اور راحت رسانی کا سامان کیا جائے۔

اس کے بعد رقاب (گردن چھڑانا) کا تذکرہ کیا ہے، پھر فی سبیل اللہ کے مصرف کی تفصیل کی ہے، اس سلسلہ میں ان کا رجحان فی سبیل اللہ میں وسعت کی طرف معلوم ہوتا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں :۔

---

[1] امام شافعی، امام داؤد، اور دوسرے ائمہ کی رائے ہے کہ یہ اب بھی باقی ہے۔

[2] یعنی صدقہ میں ۸ مصارف ہیں، ان میں مولفۃ القلوب کو نکال دیا جائے، تو عاملین کا حصہ ۱/۷ ہوا، اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ خواہ ان کو اصل حصہ یعنی ۱/۷ سے زیادہ ہی کیوں نہ مل جائے، مگر بہرحال ان کی ضروریات پوری کیجائیں، کتاب الخراج ص ۴۴،

وسہم فی اصلاح طرق المسلمین[1]   ایک حصہ مسلمانوں کے عام اصلاح و ترقی

کے لیے مخصوص ہونا چاہیے،

انھوں نے لکھا ہے کہ فقرا و مساکین کا حصہ تو خود اس بستی یا شہر کے مستحقین میں تقسیم کر دیا جائے

مگر دوسرے مصارف میں امام وقت کو اختیار ہے خواہ اسی جگہ صرف کر دے یا دوسری جگہ بھیج دے

اسی طرح غنیمت و فے کا جہاں تذکرہ کیا ہے، وہاں قرآن کی تمام آیات کو جمع کر کے

بہت سے لطیف نکتے پیدا کیے ہیں، ہم یہاں ان کی پوری عبارت نقل کرتے ہیں، تاکہ ان کی

وسعت نظر کا اندازہ کیا جا سکے۔

وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ	جان لو کہ بیشک جو تم مال غنیمت حاصل کرو اس میں پانچواں حصہ اللہ اور رسول اور ذوی القربیٰ کا ہے،

یہ آیت غنیمت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس میں ۱/۵ تو ان کا حصہ ہے، جن کا ذکر قرآن

میں موجود ہے، اور ۴/۵ فوج کا ہے، اور فوج میں وہی لوگ شامل نہیں ہیں، جو باقاعدہ حکومت کے

ملازم ہیں یا ان کو حکومت نے مقرر کیا ہو بلکہ اس میں وہ لوگ بھی حصہ دار ہوں گے، جو رضاکارانہ

شریک جہاد ہوئے ہیں،[1]

اس سلسلہ میں ایک بحث یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس مختلف قسم کی سواریاں ہیں ان میں کس کو کتنا حصہ

ملنا چاہیے، مثلاً کسی کے پاس اچھے قسم کا گھوڑا ہے، دوسرے کے پاس ذرا گھٹیا قسم کا، اسی طرح دوسری

سواریاں ہیں، تو کیا ان سب کو برابر حصہ ملے گا، یا سب کو ان کی سواری کی حیثیت کے مطابق ملے گا،

بعض لوگ اس میں حیثیت کا لحاظ کرتے ہیں، مگر امام ابو یوسف کی رائے ہے کہ

---

[1] یہ بات راقم کو کسی اور جگہ نظر نہیں آئی۔

ولا يفضل الخيل بعضها على بعض
اور بعض گھوڑوں کو بعض پر ترجیح نہیں ہوگی

استدلال میں وہ قرآن کی یہ آیات پیش کرتے ہیں۔

وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا
ہم نے گھوڑے اور خچر پیدا کئے تاکہ تم سواری کرسکو

دوسری جگہ قرآن میں ہے۔

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ (توبہ)
اپنی طاقت بھر تیار کرو اسلحہ اور بندھے ہوئے گھوڑے تاکہ ان کے ذریعہ رعب ڈال سکو خدا کے اور اپنے دشمنوں پر۔

مقصد یہ ہے کہ ان آیات میں کوئی تخصیص نہیں ہے، بلکہ فائدہ کے لحاظ سے سب کو ایک ہی صف میں رکھا گیا ہے، مزید استدلال کے لیے وہ عربوں کے استعمالات سے بحث کرتے ہیں۔

والعرب تقول هذه الخيل وفعلت الخيل ولا يعنون بذلك الفرس دون البرذون
عرب بولتے ہیں کہ یہ گھوڑے ہیں یا گھوڑوں نے یہ کیا ہے تو اس سے صرف اعلیٰ درجے کے گھوڑے ہی مراد نہیں لیتے ہیں بلکہ کم تر درجہ کے گھوڑے بھی مراد لیتے ہیں،

اس استدلال کے بعد اس پر دیگر مسائل کو قیاس کرتے ہیں۔

ولا يفضل الفرس القوي على الفرس الضعيف ولا يفضل الرجل الشجاع التام السلاح على الرجل الذي لا سلاح
اس سلسلہ میں کسی تندرست گھوڑے کو کمزور پر ترجیح نہیں ہوگی اور نہ کسی بہادر آدمی کو جو اسلحہ سے پورے طور پر لیس ہو

لہ الراسیفدہ، اس شخص پر ترجیح ہوگی جس کے پاس ایک تلوار کے علاوہ کچھ نہ ہو۔

ان مثالوں سے اندازہ ہوسکتا ہے، کہ وہ قرآن میں کس قدر غور وخوض کرتے تھے، اور اس سے نتائج کے اخذ کرنے میں کتنی وسعتِ نظر سے کام لیتے تھے، اور اجتہاد و استنباط میں شریعت کی روح کو کس قدر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے،

ان کے ان اجتہادات سے دو باتیں خاص طور پر واضح ہوتی ہیں (۱) ایک یہ کہ حکومت کی فوج کے افراد اور وہ مجاہدین جو رضا کارانہ طور پر شریک جہاد ہوں دونوں کے ساتھ یکساں معاملہ کیا جائے گا، (۲) دوسرے یہ کہ صرف سامان کی فراوانی کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ اصل چیز نیت اور وہ جذبہ ہے جو اسکو اس خدمت پر کھینچ کر لایا ہے، ممکن ہے ایک ہوائی جہاز سوار کے دل کے اندر کوئی جذبۂ خیر موجود نہ ہو اور ایک خالی ہاتھ مجاہد جو مجاہدین کی معمولی خدمت میں لگا ہو اس میں طیارہ سوار سے زیادہ جذبہ موجود ہو، اس کا اندازہ تو بہر حال لگایا نہیں جاسکتا۔ اس لیے صرف سامان کی زیادتی کی بنا پر کسی کو زیادہ حصہ دینا اور کسی کو کم دینا مناسب نہیں ہے، بلکہ جب باطن کا حال معلوم نہیں ہے، تو حکم ظاہر ہی پر ہونا چاہئے، یعنی جو بھی ایک طرح کے کام میں لگا ہوا ہے۔ اس کو برابر حصہ ملنا چاہئے اور پھر جنگی مصلحت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ایک ہی طرح کا کام کرنے والوں کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے ورنہ معمولی کاموں کو لوگ دلچسپی کے ساتھ انجام نہ دیں گے،

حدیث وآثار | حدیث وآثار میں ان کی حیثیت امام کی تھی، اوپر ذکر آچکا ہے کہ سماعِ حدیث کا اتنا شوق تھا کہ ایک طرف امام صاحب کی مجلس درس میں فقہ کی تحصیل کرتے تھے، پھر وہاں سے فرصت پانے کے بعد ان شیوخ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، جن کے یہاں صرف

لہ کتاب الخراج ص ۱۰

حدیث کا املاو سماع کرایا جاتا تھا، بعض روایتوں میں ہے کہ یہ جس وقت امام صاحب کے درس میں شرکت کے لیے گئے تو اسوقت ان کا شمار حفاظ حدیث میں ہوتا تھا[1]، یہ بات تعجب خیز اس لیے نہیں ہے کہ ان کے حافظہ کا حال یہ تھا کہ وہ ایک مجلس میں جتنی حدیثیں سنتے تھے وہ ان کو مع سند[2] زبانی یاد ہوجاتی تھیں

ابومعاویہ ایک محدث ہیں، جو بغداد میں درس حدیث دیتے تھے، ان کے پاس مشہور محدث حجاج بن ارطاۃ کی مرویات کا ذخیرہ بہت تھا، انھوں نے اپنے تلامذہ سے فرمایا کہ امام ابویوسف کی موجودگی میں میرے پاس آنے کی کیا ضرورت ہے۔ حجاج کی روایت کا ذخیرہ ان کے پاس ہم سے زیادہ ہے ان کا حال تو یہ تھا کہ ہم درس حدیث میں جو حدیثیں سنتے تھے، انھیں لکھ لیتے تھے، اور ان کو بغیر لکھے ہوئے زبانی یاد ہوجاتی تھیں، اور یاد بھی اس صحت کے ساتھ ہوتی تھیں کہ ہم اپنی مکتوبہ احادیث کی ان سے صحت کرتے تھے[3]، اسی طرح ہارون اور دوسرے ائمہ حدیث نے بھی ان کے حفظ حدیث کی توثیق کی ہے۔

امام ذہبی نے ان کو حفاظ حدیث کے چھٹے طبقہ میں شمار کیا ہے، جس میں یحیی بن معین، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، عبد اللہ بن مبارک، سفیان بن عیینہ وغیرہ ہیں، ۔ ۔ ۔ امام ذہبی نے امام ابویوسف کے حالات پر ایک الگ رسالہ لکھا ہے، جو اب احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد کی طرف سے شائع ہوگیا ہے

امام مزنی سے کسی نے ائمہ عراق کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے امام صاحب کے بارے میں کہا سیدہم، سب کے سردار، امام ابویوسف کے متعلق کہا،

اتبعہم للحدیث ان میں سب سے زیادہ حدیث کی پیروی کرنے والے،

---

[1] کردری ج ۲ ص ۱۲۶، [2] یعنی راویوں کے ساتھ حدیث کا حفظ بہت غیر معمولی بات ہے، [3] تاریخ بغداد ج ۱۴ و تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۷۱،

امام محمد کی بابت کہا سب سے زیادہ مسائل اخذ کرنے والے اور امام زفر کے بارے میں کہا، قیاس میں سب سے زیادہ بہتر،[1] یحییٰ بن معین فرماتے تھے میں نے ائمہ مجتہدین میں ان سے زیادہ ثبوت اور حفظ فی الحدیث اور صحیح روایت کرنے والا نہیں پایا، انہی کا قول ہے کہ امام ابو یوسف، صاحب حدیث اور صاحب سنت تھے، وہ اصحاب حدیث کی طرف مائل تھے،

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ اوّل جب مجھکو حدیث کی تحصیل کا خیال پیدا ہوا، تو امام ابو یوسف ہی کی خدمت میں گیا،[2] اور ان ہی کا قول ہے کان منصفا فی الحدیث حدیث میں انصاف پسند تھے۔

علی المدینی فرماتے تھے کہ ابو یوسف صدوق صدو درجہ سچے تھے،

حدیث و آثار کے بارے میں یحییٰ بن معین، احمد بن حنبل اور ابن المدینی کی رائے بہت قیمتی سمجھی جاتی ہے، ان تینوں بزرگوں کی متفقہ رائے ہے کہ امام ابو یوسف حدیث میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے، لیکن اگر ان ائمہ میں کسی کی رائے ہم کو نہ بھی معلوم ہوتی تب بھی حدیث و آثار میں ان کا جو کارنامہ اور ان کی جو قلمی یادگاریں ہیں، وہ خود حدیث میں ان کی مہارت اور غیر معمولی درک کا پتہ دیتی ہیں حدیث و آثار کے سلسلہ میں ان کی دو کتابیں ہیں ایک کتاب الآثار جس کے راوی ان کے صاحبزادے یوسف ہیں، دوسری کتاب لخراج جس کو خود انھوں نے مرتب کیا ہے، کتاب الآثار میں احادیث و آثار کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہے، کتاب الخراج کا موضوع گو خالص فقہی ہے، مگر اس میں مشکل سے کوئی مسئلہ ایسا ہوگا، جس کے لیے قرآن یا حدیث یا آثار نبوی یا آثار صحابہ سے دلیل نہ لائی گئی ہو،

امام ابو یوسف کے زمانہ میں عام طور پر درس کا طریقہ یہ تھا کہ شیوخ حدیث، اپنے تلامذہ کو حدیث کا املا کرادیتے تھے، اور ائمہ فقہ صرف فقہ کا درس دیدیتے تھے، لیکن امام ابو یوسف کے درس کی یہ

---

[1] جزء الذہبی ص ۴۰ [2] امام احمد بن حنبل کا یہ جملہ بڑا معنی خیز ہے اس دور میں بیشمار محدثین تھے مگر حدیث کے سلسلہ میں منصفانہ مزاج رکھنے والے بہت کم تھے، ایک طرف کچھ لوگ محض روایت پرستی میں مبتلا تھے دوسری طرف کچھ اس سے بے نیاز ہوگئے تھے تفصیل آگے آتی ہے،

خاص خصوصیت تھی کہ وہ دونوں کا مجمع البحرین ہوتا تھا، وہ درس میں نہ تو صرف اجزا و حدیث خوانی پر اکتفا کرتے تھے، اور نہ قال اقول ہی پر، بلکہ اگر ایک حدیث سناتے تھے، تو اسی کے ساتھ اس سے اخذ کیے ہوئے نتائج و مجتہدات کو بھی طلبہ کے سامنے رکھتے جاتے تھے۔

علی مدینی فرماتے ہیں کہ جب امام ابو یوسف ۱۸۰ھ میں بصرہ آئے، تو ہم لوگ ان کی خدمت میں استفادہ کے لیے پہنچے ان کا طریقہ درس یہ تھا کہ اگر وہ دس حدیثیں بیان کرتے، تو دس فقہی رائیں بھی ان کے ساتھ پیش کرتے تھے[1]

حدیث دانی صرف اس کا نام نہیں ہے کہ جو روایت اپنے شیخ سے سنی اس کو طلبہ کے سامنے رکھ دیا یا املا کرا دیا بلکہ اس کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اس سے مسائل اخذ کئے جائیں اس سے اجتہاد و استنباط کیا جائے، تاکہ احادیث رسول سے زندگی کے ہمہ گیر نظام کے لئے زیادہ سے زیادہ روشنی حاصل کیجا سکے، چنانچہ حدیث کے سلسلہ میں انھوں نے بھی دونوں طرح کی خدمتیں انجام دیں مگر ان کا اصلی کارنامہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استخراج مسائل ہے، اعمش مشہور امام حدیث (ان کے شیوخ میں ہیں) نے ایک مرتبہ امام ابو یوسف سے کوئی مسئلہ پوچھا، جواب سن کر فرمایا کہ یہ کہاں سے اخذ کیا، کہا کہ فلاں حدیث سے، اعمش نے ہنس کر کہا کہ یہ حدیث مجھ کو اس وقت سے یاد ہے، جب تمھارے والد کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی، مگر میں اس سے یہ مسئلہ مستنبط نہ کر سکا تھا،

"خراج" کے موضوع پر خود ان کے زمانہ میں اور اس کے بعد بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں، مگر سب کی سب بغیر استثنا نقل و روایت کا مجموعہ ہیں اجتہاد و استنباط کی کوئی علامت ان میں نہیں پائی جاتی، مزید تفصیل تصانیف اور اجتہاد و استنباط کے عنوان کے تحت آئیگی، یہاں صرف ان کا ایک قول نقل کر دیا جاتا ہے، "فرماتے تھے کہ بار الہا! میں نے کتاب اللہ سے اس کے بعد سنت

---

[1] تذکرۃ الذہبی ص ۲۷۲،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ مسائل کیا ہے لیکن جہاں مجھے سنت نبوی نہیں ملی، وہاں میں نے امام صاحب کے قول پر عمل کیا،

مختصر طور سے یہ کہنا صحیح ہوگا، کہ امام ابو یوسف، امام صاحب کے اصحاب میں سب سے زیادہ حدیث داں تھے، لیکن ان کا یہ اصول تھا کہ وہ تحدیث روایت کو بغیر روایت کے صحیح نہیں سمجھتے تھے فرماتے تھے کہ جو محض کثرت روایت کے ساتھ جو حدیث طلب کرے گا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کچھ نہ کچھ ضرور جھوٹی تہمت لگا دے گا ان کا دوسرا بیان ہے کہ جو مشہور و معروف احادیث کو چھوڑ کر، شواذ کے پیچھے دوڑے گا، وہ آپ پر جھوٹ باندھے گا،

فقہ | ان کے علم و فضل کا سب سے وسیع میدان یہی ہے، اس میں انھوں نے تمام علوم سے زیادہ اپنی جودت طبع اور جولانی فکر کا ثبوت دیا ہے اور فقیہ ہی کی حیثیت سے دنیا ان کو جانتی ہے، امام صاحب انکو افقہ اصحابی میرے اصحاب میں سب سے زیادہ فقیہ فرماتے تھے، علی بن صالح ان کو افقہ الفقہا اور سید الفقہا کہتے تھے یحییٰ بن معین فرماتے تھے، افقھھم . . . . . . اہل عراق میں سب سے زیادہ افقہ تھے، فقہ میں ان کی متعدد یادگاریں ہیں، جن کا تذکرہ آگے آئے گا ان کی صرف ایک کتاب "اختلاف ابن ابی لیلیٰ و ابی حنیفہ" ان کے تفقہ کے ثبوت کے لیے کافی ہے تفصیل آگے آئیگی،

ان کا دوسرا بڑا کارنامہ اصول فقہ کی تدوین ہے، باقاعدہ[2] اصول فقہ کی تدوین اس سے پہلے نہیں ہوئی تھی، امام ابو یوسف پہلے شخص ہیں، جنہوں نے اس فن کو باقاعدہ مدون کیا، افسوس ہے کہ یہ کتاب ناپید ہے، تذکروں میں صرف اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بھی منقول ہے، کہ وہ اصول فقہ کے سب سے پہلے مولف ہیں، یہ دونوں باتیں اپنی جگہ پر صحیح ہیں، اس لیے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ کی طرح، اصول فقہ کی بھی تجدید کی، اور ان کی تجدید صرف فروع تک نہیں، بلکہ اصول میں بھی تھی،

---

[1] کردری ص ۳۰ ج ۲ موفق ج ۲ ص ۲۳۰، [2] باقاعدہ کی قید اس سے لگائی گئی ہے کہ یہ فن امام ابو یوسف کا ایجاد کردہ نہیں ہے بلکہ قرآن و سنت کے کلیات کو سامنے رکھکر صحابہ اور تابعین نے بہت سے مسائل مستنبط کئے تھے،

اس لحاظ سے انکو اس فن کا پہلا مولف قرار دے سکتے ہیں، مگر حقیقتاً تقدم۔۔۔ امام صاحب اور ان کے تلامذہ ہی کو حاصل ہے
فقہ حنفی کی جس کتاب کو بھی اٹھا کر دیکھیے اس میں امام ابویوسف کے اقوال، مجتہدات اور استنباطات ملیں گے، لیکن پھر بھی ان کا فقہی کارنامہ امام محمد کے مقابلہ میں کم ہے، گو امام محمد کی کتابیں ان سے استفادہ کی بہت زیادہ مرہون منت ہیں،

فرائض | فرائض یعنی وہ فن جس میں وصیت اور وراثت کی تقسیم کے مسائل بیان کیے جاتے ہیں، یہ فقہ ہی کا ایک شعبہ ہے، مگر اہمیت کے لحاظ سے یہ مستقل ایک فن ہو گیا ہے، اس فن کے لیے سب سے زیادہ ضرورت حساب دانی کی ہے، امام صاحب کے تلامذہ میں امام ابویوسف اور امام محمد دونوں اس حیثیت سے ممتاز تھے، امام ابویوسف فرماتے تھے کہ میں نے فرائض کے مسائل ایک مجلس میں امام صاحب سے سیکھ لیے تھے، امام ابویوسف اس سے صرف واقف ہی نہیں تھے بلکہ اس میں مجتہدانہ نظر بھی رکھتے تھے، صحابہ میں اس فن کو جاننے والے متعدد حضرات تھے مگر ان میں حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت علیؓ خاص طور پر ممتاز تھے، چنانچہ امام ابویوسف اس میں اکثر انہی کا اتباع کرتے تھے، کہتے تھے کہ جہاں ان دونوں بزرگوں میں اختلاف ہو جاتا ہے وہاں میں حضرت علیؓ کی رائے کو ترجیح دیتا ہوں، اس کی وجہ یہ بیان کرتے تھے کہ حضرت علیؓ حضرت زیدؓ سے زیادہ قوت فیصلہ رکھتے تھے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ اقضاکم علی، تم میں سب سے اچھا فیصلہ کرنے والے علیؓ ہیں،

ان علوم کے علاوہ دوسرے دینی علوم جو قرآن وسنت کے لیے ذریعہ کی حیثیت رکھتے ہیں، مثلاً تاریخ، سیرت، ادب ونحو اور ایام عرب وغیرہ سے بھی واقف تھے، اسی بناپر امام صاحب فرماتے تھے

(بقیہ حاشیہ ص ۹۷) انہی اصول و کلیات اور صحابہ کے مستنبط مسائل کی روشنی میں انھوں نے اصول فقہ مرتب کیا، امام ابویوسف سے پہلے اس موضوع پر ایک کتاب خود امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لکھی تھی جو کتاب الرائے کے نام سے مشہور ہے (ص ۱۳۰) بحث کر دی ہے،

کہ "میرے اصحاب میں یہ سب سے زیادہ جامع العلم ہیں"۔ ان علوم میں ان کی مہارت کا اندازہ ان کی کتابوں سے ہوتا ہے، خصوصیت سے "کتاب الخراج" میں اس کی مثالیں بکثرت ملینگی،

اوپر ذکر آچکا ہے کہ سیرت و مغازی میں انھوں نے محمد بن اسحاق سے استفادہ کیا تھا، جو اس وقت اس فن کے امام تھے، عربی ادب و لغت کا بصرہ کے بعد دوسرا مرکز کوفہ کا تھا وہی انکا مولد ہے، پھر امام ابو یوسف خالص عربی النسل تھے، اس لیے ان علوم کی تحصیل کی ان کو قطعاً ضرورت نہیں تھی، اسی طرح نحو یعنی قواعد عرب کے سیکھنے کی بھی ضرورت ان کو نہیں تھی، مگر پھر بھی وہ ایک فن بن گیا تھا، اس لیے اسکو بقدر ضرورت حاصل کیا، خود فرماتے ہیں کہ میں نے ایک ماہر نحوی سے نحو کے مسائل کو ایک مجلس میں حاصل کر لیا، ممکن ہے اس سے مراد کسائی یا سیبویہ ہوں،

علم تاریخ سے ان کی واقفیت کا اندازہ لگانے کے لیے ان کی کتاب الخراج کا مطالعہ کافی ہے، ان کا طریقہ یہ ہے کہ جو باتیں تاریخ سے متعلق ہوتی ہیں، ان کی مختصر تاریخی حیثیت واضح کرنے کے بعد پھر شرعی حیثیت بیان کرتے ہیں، مثلاً اہل سواد کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے خراسان، مصر، افریقہ، اور سندھ وغیرہ پر بڑی جامع گفتگو کی ہے، پھر اسی طرح جزیہ کے بیان کے سلسلہ میں بعض مقامات اور قبائل کی تاریخی حیثیت واضح کی ہے، اگر کسی جگہ کے بارے میں ان کو خود علم نہ ہوتا تھا تو وہ جاننے والوں سے دریافت کر کے لکھتے تھے، چنانچہ جب ہارون نے ان سے اہل شام اور اہل جزیرہ کے بارے میں دریافت کیا، تو امام ابو یوسف کو چونکہ ان کی تاریخی حیثیت معلوم نہیں تھی، اس لیے انھوں نے جیرہ کے کسی صاحب نظر واقف کار کو لکھا، چنانچہ ان کا جو جواب آیا، امام ابو یوسف نے اسی کو کتاب میں نقل کر دیا ہے، اس کے چند ابتدائی الفاظ یہاں نقل کیے جاتے ہیں،

جزیرہ قبل اسلام دو حصوں میں منقسم تھا، ایک رومی عیسائیوں کے قبضہ میں تھا، دوسرا

---

[1] کردری ج ۲ ص ۱۲۷،

ایرانیوں کو ادان میں سوہر ایک حکومت اپنی فوج رکھتی تھی، اور محصل مقرر کرتی تھی، راس العین سے فرات تک کا علاقہ حکومت روم کے قبضہ میں تھا، اور نصیبین اور اس کی پشت کا علاقہ دجلہ تک حکومت ایران کے ماتحت تھا، اسی طرح سیل ماردین اور دارا سے سنجار تک کا حصہ اہل فارس کا مقبوضہ تھا، اور جبل ماردین دارا اور طور دعبدین اہل روم کا،

ا ان حکومتوں کی سرحدوں پر ایک سرحدی چوکی کے طور پر ایک قلعہ تھا، جو حصن سرجا کے نام سے مشہور تھا،

قبل از اسلام کی تاریخ بیان کرنے کے بعد اسلام کے بعد کی تاریخ بیان کی ہے۔ یہ۔۔ خط دو تین صفحہ کا ہے، مگر اس میں پچاسوں صفحے کے مضمون کو انھوں نے سمیٹ لیا ہے۔

بہر نوع امام ابو یوسف کے اندر وہ تمام صلاحیتیں اور علم و فضل کی وہ تمام لیاقتیں موجود تھیں جو ایک مجتہد کے لیے ضروری ہیں، اب ہم ان کے اجتہاد و استنباط پر مفصل بحث کرتے ہیں،

اجتہاد و استنباط عموماً مجتہدین کی دو قسم مانی جاتی ہے، ایک مجتہد مطلق غیر منتسب[ل] دوسرے مجتہد مطلق منتسب یا مجتہد مطلق مقید بمذہب، متاخرین علمائے احناف کی کتابوں میں ائمہ مجتہدین اور اصحاب فتاوی کے درجات کی جو تقسیم کی گئی ہے، اس میں یہ کہا گیا ہے، کہ امام ابو یوسف امام محمد وغیرہ مجتہد مطلق نہیں بلکہ مجتہد فی المذہب تھے، مجتہد مطلق سے مراد یہ ہے، کہ جن لوگوں نے کتاب وسنت سے براہ راست اجتہاد کے اصول مرتب کیے، اور اس سے تفریع مسائل

ل اگر مجتہد مطلق غیر منتسب کا مطلب یہ ہے کہ ان کا اجتہاد کسی کے فیض تربیت کا مرہون منت بھی ہے تو پھر اسی لحاظ سے مجتہد مطلق غیر منتسب تو سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کے کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، مجتہد مطلق منتسب کی تعریف میں ائمہ اربعہ داخل ہو سکتے ہیں، مگر عام طور پر ائمہ اربعہ کو پہلی قسم میں شمار کیا گیا ہے حالانکہ ان ائمہ میں سے ہر ایک کسی نہ کسی صحابی یا تابعی کی طرف منتسب ہے۔

کی، جیسے ائمہ اربعہ تھے، مجتہد فی المذہب یا مجتہد منتسب ان کو کہتے ہیں کہ جنھوں نے ان ائمہ کے مرتب کردہ اصول کی روشنی میں مسائل کی تخریج کی، جیسے امام ابو یوسف، امام محمد اور دوسرے ائمہ کے مشہور تلامذہ،

بعض فقہ و تذکرہ کی کتابوں میں یہ بھی درج ہے، کہ صاحبین فرماتے تھے، کہ ہم نے امام صاحب سے جہاں اختلاف کیا ہے، اور ان کے قول کو مرجوح قرار دیا ہے، وہ بھی امام صاحب ہی کا قدیم قول تھا، جسے انھوں نے مرجوح سمجھکر ترک کر دیا تھا، اسی طرح کے اور بھی اقوال منقول ہیں، جن سے انکا مجتہد مقید بہ مذہب ہونا معلوم ہوتا ہے۔

مگر یہ کہنا بڑا ظلم ہے . . . . . . کہ صاحبین امام صاحب کے مقلد محض تھے۔ . . . . حالانکہ . . . کہ وہ خود امام اور مجتہد مطلق تھے، یہ ان کی احسان شناسی ہے کہ انھوں نے اپنی ذات اپنے اساتذہ سے بے نیاز کر کے دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا، حالانکہ وہ کر سکتے تھے، پھر امام ابو یوسف کیو اور امام محمد کو اجتہاد و استنباط میں ائمہ ثلاثہ امام مالک امام شافعی اور امام احمد سے گھٹانا اور کم رتبہ قرار دینا بھی بڑی زیادتی ہے، جب کہ خود ان ائمہ اور ان کے مشہور تلامذہ نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ لوگ اجتہاد و استنباط میں ان سے کسی طرح کم نہ تھے۔ اس کی تفصیل تو ہم آیندہ کریں گے، پہلے ہم مختصراً اجتہاد و استنباط کی تعریف اس کے اصول و شرائط پر بحث کرتے ہیں، تاکہ یہ اندازہ ہو جائے، کہ یہ ائمہ فقہ خصوصیت سے امام ابو یوسف مجتہد مطلق تھے، یا مجتہد منتسب اجتہاد کی تعریف علماء نے یہ کی ہے۔

ھو استفراغ الجھود فی استنباط	اصل سے کسی فروعی سلسلہ کے استنباط میں
الحکم المفرعی عن دلیلہ[1]	اپنی وسعت بھر کوشش کرنے کا نام اجتہاد ہے

---

[1] اصول فقہ کی کتابوں میں اس کی متعدد تعریفیں کی ہیں، یہ تعریف بڑی جامع اور مانع ہے تفصیل کے لیے ارشاد الفحول، امام شوکانی اور المستصفی، امام غزالی اور الاحکام آمدی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

اجتہاد کے اصول و شرائط کیا ہونے چاہئیں، اس میں مختلف رائیں ہیں، جو چیزیں سب میں مشترک ہیں وہ حسب ذیل ہیں،

(۱) کتاب اللہ کا عالم ہو، یعنی قرآن کے لغوی اور شرعی معانی سے واقف ہو، اس کے طرز کلام کو جانتا ہو، افراد و ترکیب اور ناسخ و منسوخ پر اس کی نظر ہو،

(۲) سنت رسول اللہ میں اسے درک ہو، یعنی روایات کی سند اور ان کے متون سے واقف ہو، بعض لوگوں نے قرآن کی آیات اور احادیث کی تعداد پر بھی بحث کی ہے، یعنی یہ کہ مجتہد کے لیے کتنی آیتوں اور حدیثوں میں بصیرت پیدا کرنا ضروری ہے، مگر یہ بحث فضول ہے، مجتہد کے لیے پورے قرآن، اور احادیث کے تمام متداول ذخیروں پر نظر رکھنی ضروری ہے،

(۳) اجماع کے موارد اور مواقع سے واقف ہو،

(۴) قیاس کے شرعی طریقوں سے واقف ہو،

ان شرائط کو سامنے رکھیے اور پھر امام ابو یوسف کے علم و فضل اور کتاب و سنت آثار صحابہ اور تعدیل صحابہ سے ان کی واقفیت کا جو ذکر اوپر کیا گیا ہے، اس پر ایک نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ کیا ان کے مجتہد مطلق قرار دینے کے لیے وہ کافی نہیں ہے، پھر امام صاحب کا طریقہ درس اس قدر مجتہدانہ ہوتا تھا کہ اس میں موارد اجماع اور وجوہ قیاس کی ہر روز مشق ہوتی تھی، اوپر امام صاحب کے طریقۂ درس کا مختصر تذکرہ آچکا ہے، اس سلسلہ میں چند اور باتیں پیش کیجاتی ہیں،

امام صاحب کے سامنے جب کوئی نیا مسئلہ پیش ہوتا تو وہ اپنے ممتاز تلامذہ سے پوچھتے کہ تم لوگوں کے پاس، اس بارے میں کوئی حدیث نبوی یا اثر صحابہ موجود ہے، تلامذہ اپنی اپنی معلومات کے بقدر آثار و احادیث پیش کرتے، اس کے بعد امام صاحب کو جو معلومات ہوتیں وہ سب کے سامنے رکھتے پھر وہ اس میں غور کرتے، اگر آثار مختلف ہوتے تو جس قول کی تائید میں نقلی دلائل ان کو زیادہ مل جاتے

تو اسی کے مطابق فیصلہ کر دیتے، اگر آثار تقریباً برابر ہوتے تو پھر غور و خوض کر کے کوئی رائے قائم کرتے، ظاہر ہے کہ یہ مشق و تمرین اسی لئے تو کرائی جاتی تھی کہ ان میں شان اجتہاد پیدا ہو، اسی بنا پر امام صاحب کے مسلک کو شورائی مسلک کہا جاتا ہے، کردری کا بیان ہے ا۔

مذهبه شورى بينهم ولم يستبد فيه بنفسه دونهم اجتهادا منه في الدين۔

ان کا مسلک شورائی تھا یعنی وہ اپنے تلامذہ سے ہر مسئلہ میں مشورہ کرتے تھے اور کسی دینی مسئلہ میں اجتہاد کرتے وقت وہ نہ تو خود رائی سے کام لیتے تھے، اور نہ اپنی رائے کو تلامذہ پر تھوپتے تھے۔

پھر ان کے طریقۂ درس کے بارے میں لکھتے ہیں،

فكان يطرح مسئلة مسئلة ثم يسأل ما عندهم ويقول ما عنده ويناظرهم في كل مسئلة شهرا او اكثر ويأتي بدلائل ثم يثبتها الامام ابو يوسف في الاصول[1]

وہ ایک ایک مسئلہ کو باری باری تلامذہ کے سامنے رکھتے تھے، پھر اس کے بارے میں ان سے سوال کرتے تھے، اور اس بارے میں ان کی رائے اور دلائل سننے کے بعد اپنی رائے اور اپنی دلیل پیش کرتے تھے، اور پھر ان سے مباحثہ کرتے تھے یہاں تک کہ ایک ایک مسئلہ میں بحث و مباحثہ کرتے ایک مہینہ یا اس سے بھی زیادہ دن لگ جاتے تھے، پھر اس کے بعد امام ابو یوسف اس مسئلہ کو اصول مذہب[2]

---

[1] کردری جلد ا صفحہ ۵۰۔

اور نہ صرف ان کا طریقۂ درس ہی ایسا تھا کہ اس سے اجتہاد و استنباط کی صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی، بلکہ تلامذہ کو یہ عام ہدایت تھی کہ

لا یحل لاحد ان یقول بقولی	کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ میری
مالم یعلم من این قلت	کسی کے مطابق کوئی فتوی دے جب تک
(حسن التقاضی ص ۶۲)	کہ اس کو یہ نہ معلوم ہو جائے کہ میں نے یہ رائے
	کسی دلیل کی بنا پر قائم کی ہے،

یہی وجہ ہے کہ امام صاحب کے جن مجتہدات کو ان کے تلامذہ نے اپنی تحقیق میں کتاب و سنت کے مطابق نہیں پایا، ان سے اختلاف کیا، اور ان کے مقابلہ میں اپنے مجتہدات پیش کیے، اور یہ اختلاف صرف دو چار مسائل میں نہیں ہے بلکہ بعض فقہاء کے قول کے مطابق امام صاحب سے ثلث مسائل میں صرف صاحبین یعنی امام ابو یوسف اور امام محمد نے اختلاف کیا ہے، امام زفر کے اختلافات اس کے علاوہ ہیں،

ان تصریحات سے آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ مجتہد مطلق تھے، یا مجتہد فی المذہب، عام فقہائے احناف نے اجتہاد و استنباط کے لحاظ سے مجتہدین کے درجات کی جو تقسیم کی ہے، اس موقع پر اس کو مختصراً پیش کرنے کے بعد اس کی تردید میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا پیش کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مجتہدین کے درجات کی تفصیل ابن حجر مکی نے "شن الغارہ" میں جو کی ہے، اسی کو شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور مولانا عبد الحئی صاحبؒ وغیرہ نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔

ابن کمال بارہویں صدی کے مشہور علمائے دولت عثمانیہ میں گذرے ہیں، انھوں نے مجتہدین اور فقہاء کے طبقات پر ایک رسالہ لکھا ہے، متاخرین فقہاء نے عام طور پر اسی کو اختیار کیا ہے، ہم یہاں اس کا تھوڑا سا خلاصہ نقل کرتے ہیں،

اعلم ان الفقهاء على سبعة طبقات
الطبقة الاولى طبقة المجتهدين
فی الشرع كالائمة الاربعة ...
.... الثانية طبقة المجتهدين
فی المذهب كابی یوسف ومحمد
وسائر اصحاب ابی حنيفة ...
... فانهم وان خالفوه فی
بعض الاحكام الفرعية لكنهم
يقلدونه فی قواعد الاصول[1]

فقہا کے سات طبقے ہیں، طبقۂ اولیٰ کے فقہا ہیں وہ ائمۂ مجتہدین ہیں جو مجتہدین فی الشرع کہے جاتے ہیں جیسے ائمۂ اربعہ .... دوسرا طبقہ .. مجتہدین فی المذہب کا ہو جیسے امام ابو یوسف امام محمد اور دوسرے اصحاب ابو حنیفہ ..... ان لوگوں نے بعض فروعی احکام میں امام صاحب کی مخالفت کی ہے لیکن اصول میں ان کے مقلد ہیں،

اسی طرح انھوں نے سات درجات میں تمام فقہاے احناف کو تقسیم کیا ہے، ہم نے طوالت کے خیال سے اتنی ہی عبارت نقل کی ہے۔ ابن کمال کے اس رسالہ کا بیشتر حصہ قابل تنقید ہے، چنانچہ خدا جزاے خیر دے علامہ مرجانی متوفی سنہ ۱۳۰۶ھ کو کہ انھوں نے بڑی تفصیل سے اس پر بحث کی ہے، اس کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا ہے، جتنا حصہ ہمارے موضوع سے متعلق ہے، ہم اسے یہاں نقل کرتے ہیں۔

ابن کمال کا پورا رسالہ نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

هذا ما ذكره وقد اورده التميمی
فی طبقاته بحروفه ثم قال[1]
وهو تقسيم حسن جدا اقول:

ابن کمال نے جو کچھ لکھا ہے اس کا یہ خلاصہ ہے، اس تقسیم کو تمیمی نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے اور اس کے بارے میں لکھا ہے کہ

---

[1] حسن التقاضی صفحہ ۲۵۔

بل هو بعيد عن الصحة بمراحل
فضلاً عن حسنه جداً فانه
تحكمات باردة وخيالات فارغة
وكلمات لا روح لها والفاظ
غير محصلة المعنى . . . . .
فليت شعري ما معنى قوله
ان ابا يوسف ومحمد او زفر وان
خالفوا ابا حنيفة في الاحكام
لكنهم يقلدونه في قواعد
الاصول ما الذي يريد من
الاصول؟ فان اراد منه الاحكام
الاجمالية التي يبحث عنها في
كتب اصول الفقه فهي قواعد
عقلية وضوابط برهانية
يعرفها المرء من حيث انه
ذو عقل وصاحب فكر ونظر
سواء كان مجتهداً اولا تعلق لها
بالاجتهاد فقط وشان الائمة
الثلاثة ارفع واجل . . . . .

یہ بہترین تقسیم ہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ
صحت اور حقیقت سے اس کو انتہائی بعد ہے،
اسی تقسیم میں بے دلیل دعوے، بے کار خیالات
آرائی، بے روح اور بے مغز باتیں ہیں، سمجھ میں
نہیں آتا کہ ان کے اس قول کے کیا معنی ہیں
کہ امام ابو یوسف، امام محمد اور امام زفر نے
اگرچہ بعض احکام میں امام ابو حنیفہ کی مخالفت
کی ہے مگر اصولی باتوں میں ان کی تقلید کرتے
ہیں؛ اصول سے ان کی کیا مراد ہے؟
اگر اس سے مراد وہ اجمالی احکام ہیں جن سے
اصول فقہ میں بحث کی جاتی ہے تو یہ قواعد
تو عقل اور دلائل کی مدد سے مرتب کئے گئے
ہیں جن کو ہر صاحب عقل اور صاحب فکر و
نظر جانتا ہے خواہ وہ مجتہد ہو یا غیر مجتہد،
اجتہاد سے اس کا قطعی تعلق نہیں ہے، اور
ان ائمہ ثلثہ کی شان بہر حال اس سے بلند
ہے کہ ان کو اس درجہ میں رکھا جائے،
حالانکہ فقہ و اجتہاد میں امام ابو یوسف
اور امام محمد وغیرہ کا مرتبہ امام مالک اور

وحالهم في الفقه ان لم يكن
ارفع من مالك والشافعي و
امثالهما فليسوا بدونهما وجرى
مجرى الامثال قولهم (ابو حنيفة
ابو يوسف) بمعنى ان البالغ الى الدرجة
القصوى في الفقاهة هو ابو يوسف
وقولهم (ابو يوسف ابو حنيفة)
بمعنى ان ابا يوسف بلغ الدرجة
القصوى من الفقاهة

اور امام شافعی سے بلند نہیں ہے تو ان سے
کم تر بھی نہیں ہے اور یہ بات تو ضرب المثل
بن گئی ہے کہ ابو حنیفہ تو ابو یوسف ہیں،
یعنی فقاہت میں امام ابو یوسف امام صاحب کے
رتبہ تک پہنچ گئے ہیں، اور بعض لوگوں کا
یہ قول بھی ہے کہ ابو یوسف ابو حنیفہ ہیں،
یعنی مرتبۂ اجتہاد میں، امام صاحب اور
ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اس کے بعد انھوں نے تمام ممتاز فقہا اور ائمہ کے وہ اقوال نقل کیے ہیں جن سے ان کے مجتہد مطلق ہونے کا ثبوت ملتا ہے پھر لکھتے ہیں۔

وكفى بذلك شهادة له ولكل
واحد منهم اصول مختصة به
تفردوا بها عن ابي حنيفة و
خالفوه فيها ومن ذلك ان الاصل
في تخفيف النجاسة تعارض
الادلة عندهما وعند ابي حنيفة
رحمه الله واختلاف الائمة

ان ائمہ کی یہ شہادتیں ان کے مجتہد مطلق ہونے
کے لئے کافی ہیں، ان میں سے ہر ایک کے
کچھ مخصوص اصول تھے جن میں انھوں نے امام
صاحب سے تفرد اختیار کیا تھا اور ان ہی میں ان سے
اختلاف کرتے تھے، انہی اصول میں سے ایک
یہ ہے کہ تخفیف نجاست میں اصول یہ ہے
کہ اس کے دلائل میں تعارض ہے اور
صاحبین کے نزدیک ائمہ کے اختلاف کی وجہ سے

۲ یعنی تخفیف سے [illegible] ہے

اس کے بعد یہ امام غزالی اور امام الحرمین کے اقوال نقل کرتے ہیں۔

قال الغزالی انھما خالفا ابا حنیفۃ فی ثلثی مذاھبہ و نقل النووی فی کتابہ تہذیب الاسماء واللغات عن ابی المعالی الجوینی "ان کل ما اختارہ المزنی اری انہ تخریج ملتحق بالمذھب فانہ لا یخالف اقوال الشافعی لا کابی یوسف ومحمد فانھما یخالفان اصول صاحبھما

امام غزالی نے لکھا ہے کہ صاحبین نے دو تہائی مسائل میں امام صاحب سے اختلاف کیا ہے اور امام نووی نے تہذیب الاسماء میں امام جوینی سے نقل کیا ہے کہ امام مزنی نے جن مسائل کو ترجیح دی ہے وہ امام شافعی کے کسی قول ہی سے ماخوذ ہے کیونکہ وہ امام شافعی کے اقوال کی اس طرح مخالفت نہیں کرتے جس طرح امام ابو یوسف اور امام محمد امام ابو حنیفہ سے اصول و فروع میں اختلاف کرتے ہیں۔

پھر انھوں نے امام ابو جعفر طبری کی یہ رائے نقل کی ہے کہ وہ امام احمد بن حنبل کو مجتہدین میں شمار نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کو وہ صرف حفاظ حدیث میں شمار کرتے تھے، اسی طرح ابن خلدون نے لکھا ہے، کہ

واما احمد ابن حنبل فمقلدہ قلیل لبعد مذھبہ عن الاجتہاد[۱]

اور امام احمد بن حنبل تو ان کے مقلدین اس لئے بہت کم ہیں ان کے مسلک میں اجتہاد

[۱] اوپر ذکر آچکا ہے کہ حدیث میں سب سے پہلے امام احمد نے ابو یوسف سے استفادہ کیا، کسی نے فقہی مسائل کے بارے میں پوچھا کہ یہ مسائل آپ نے کہاں سے معلوم کیے تو انھوں نے فرمایا کہ "امام محمد کی کتابوں سے" انھوں نے یہ نہیں کہا کہ فقہی مسائل میں انھوں نے خود اجتہاد کیا ہے،

تو امام احمد کو تو مجتہدین مطلق میں شمار کیا جائے اور امام ابو یوسف اور امام محمد جن کے اجتہادات سے امام احمد نے استفادہ کیا ہو ان کو مقلد قرار دیا جائے یہ ایک طرح کا ظلم ہے۔

اس کے بعد انھوں نے اجتہاد کے مآخذ و شرائط یعنی کتاب و سنت، اجماع، قیاس اور آثار صحابہ پر بحث کی ہے، اور یہ ثابت کیا ہے، کہ ان میں سے کسی چیز میں بھی وہ امام صاحب کے مقلد نہیں تھے، بلکہ وہ براہ راست ان مآخذ سے استنباط مسائل کرتے تھے،

یہ اتنی مفصل بحث ہے کہ اس کے بعد کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

اب ہم ان کی کتابوں سے چند ایسے مسائل کا جو ان کے اور امام صاحب کے درمیان مختلف فیہ ہیں تذکرہ کرتے ہیں، جن سے اندازہ ہوگا کہ وہ محض فروع میں نہیں بلکہ اصول میں بھی مخالفت کرتے ہیں۔

اس وقت امام ابو یوسف کی تین کتابیں ہمارے پیش نظر ہیں۔ کتاب الآثار، کتاب الخراج اور اور اختلاف ابی لیلی وابی حنیفہ، ان ہی سے انتخاب کر کے چند مسائل کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) دریا سے اگر زیورات اور بڑی مچھلیاں برآمد ہوں تو ان کا خمس لیا جائے گا یا نہیں؟ اس بارے میں ان ائمہ کی رائیں ملاحظہ ہوں، امام صاحب کی رائے ہے کہ اس میں خمس نہیں لیا جائے گا، اور ان کی اصولی دلیل یہ ہے کہ جس طرح چھوٹی مچھلیوں پر کوئی ٹیکس نہیں لیا جاتا، اس میں بھی نہیں لیا جائے گا، امام ابو یوسف نے ان سے اختلاف کیا ہے، ان کی رائے ہے کہ ۱/۵ تو حکومت لیگی، اور ۴/۵ اس شخص کا حصہ ہے جس نے ان کو نکالا ہے، امام صاحب سے ان کا اختلاف اس اصول پر ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایسا ہی کیا تھا،

ظاہر ہے کہ یہ اختلاف فروعی نہیں، بالکل اصولی ہے، وہ یہ ہے کہ دریا کے حاصلات میں حکومت کو ٹیکس لینے کا حق ہے یا نہیں، اور ہے تو کس حد تک اور نہیں ہے تو کس حد تک،

(۲) حدود کے سلسلہ میں بحث ہے کہ مشرکین جو دارالاسلام میں موجود ہوں ان پر حدود جاری کیے جائیں گے یا نہیں، امام صاحب کی رائے ہے کہ اہل شرک پر حدود جاری نہیں کیے جائیں گے، امام ابو یوسف کی رائے ہے کہ ان پر بھی حدود جاری کیے جائیں گے، سرخسی نے مبسوط میں تفصیل سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے، اور دونوں کے اصولی دلائل نقل کیے ہیں، اس مسئلہ میں امام محمد کی رائے دونوں بزرگوں سے مختلف ہے، کیا یہ اختلاف صرف فروع کا ہے یا اصول کا۔

ہم زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتے، اگر ... ان ائمہ کے اصولی اور فروعی اختلافات دیکھنا ہوں تو اختلاف ابی لیلی وابی حنیفہ کا مطالعہ کر لینا چاہیے۔

اس بحث کو صرف اس لیے طول دیا گیا ہے تاکہ یہ واضح طور پر دکھایا جائے کہ امام صاحب کے کم از کم تین تلامذہ کے بارے میں یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ وہ مجتہد مطلق نہیں تھے یا اپنے اجتہاد میں وہ ان اصولوں کے پابند تھے، جو امام صاحب نے مقرر کر دیئے ہیں،

جیسا کہ علامہ مرجانی نے لکھا ہے کہ یہ تو معلوم نہیں کہ وہ اصول ہیں کیا جن سے یہ ائمہ باہر نہیں گئے، اگر ان سے مراد وہ چار اصول کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اجماع اور قیاس ہیں، تو پھر اس حیثیت سے تو امام صاحب بھی مجتہد مطلق نہیں ہیں کہ وہ خود اہل عراق[1] کے متبع ہیں۔

پھر یہ بھی ایک بڑی زیادتی ہے کہ بعض ان بزرگوں کو جن میں اجتہاد و استنباط کی اتنی بھی صلاحیت نہیں تھی، جتنی کہ ان بزرگوں میں تھی انکو تو مستقل مجتہد تسلیم کیا جائے اور صاحبین کو مقلد فی الاجتہاد کا رتبہ دیا جائے۔

---

[1] اہل عراق سے مراد وہ صحابہ اور تابعین ہیں جن کے فقہ وفتاوی پر اہل عراق امام صاحب سے پہلے عمل کرتے تھے اور جن کی رائے کا امام صاحب سب سے زیادہ لحاظ کرتے تھے۔

علم کلام، امام ابو یوسفؒ کے زمانہ میں علم کلام کے مسائل کا چرچا اور اس میں بحث و مباحثہ ایک عام چیز بن گئی تھی، اس بحث سے نہ تو خلفاء و امراء کے دربار خالی تھے، نہ فقہا و محدثین کی مجالس درس اور نہ عوام اور بازاری لوگوں کے حلقے خصوصیت سے ایمان کی زیادتی و کمی، قرآن کے مخلوق و غیر مخلوق ہونے، گناہ کبیرہ کے مرتکب کے کافر ہونے اور خدا تعالیٰ کی تجسیم و عدم تجسیم وغیرہ کے مباحث کا تقریباً ذکر ہر مجلس اور ہر گھر میں تھا۔

یہی مسائل اس وقت کی ثقاہت و عدم ثقاہت، اس سے بھی بڑھ کر فسق و فجور، صلاح و تقوی بلکہ ایمان و کفر کا معیار بنے ہوئے تھے، جس نے کسی گروہ کے خیالات سے اختلاف کیا جھٹ دوسرے فریق نے اس کو زندیق، فاسق بلکہ کافر تک بنا دیا،

فقہا و محدثین میں جو حضرات محتاط تھے، انھوں نے ہمیشہ ان مسائل پر گفتگو کرنے اور ان پر رائے دینے سے احتراز کیا، اور اپنی حد تک دوسروں کو بھی وہ اس سے روکتے رہے، مگر پھر بھی بسا اوقات انھیں اپنی رائے ظاہر ہی کرنی پڑتی تھی، اب وہ رائے جن لوگوں کے خلاف پڑتی تھی وہ ان کو مطعون کرتے تھے، اور ان کے اثر سے بعض اوقات ہمارے فقہاء و محدثین بھی اس شخص کے بارے میں ایک رائے قائم کر لیتے تھے، اور وہ اس کو مطعون کرتے تھے، اسی اثر سے بعض خلفاء نے بڑے بڑے ائمہ کے ساتھ وہ سلوک کیا، جو ایک معمولی آدمی کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا، امام احمدؒ اسی طرح کے ابتلا میں پڑے تھے، مثال کے طور پر ارجاء کے مسئلہ کو لیجئے، یعنی یہ کہ آدمی کی نجات کے لیے عمل ضروری نہیں ہے بلکہ اس کا ایمان کافی ہے، یہ مسئلہ اس خیال کا رد عمل ہے، کہ آدمی اگر گناہ کبیرہ کرلے، تو وہ مومن نہیں رہتا، ظاہر ہے کہ یہ کتاب و سنت کے خلاف بات تھی، اس لیے اس پر بعض ائمہ نے اپنی زبان کھولی خصوصیت سے امام صاحبؒ نے، انھوں نے کہا کہ ایمان ایسی سیال چیز نہیں ہے جو کسی معمولی اشارہ سے بہ جائے

بلکہ وہ ٹھوس حقیقت ہے، اس کو بے عملی یا ارتکاب معاصی زائل نہیں کرسکتا لیکن اس سے ان کا یہ مقصد بالکل نہیں تھا کہ آدمی عمل کرنا چھوڑ دے، مگر بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی یا پھیلائی گئی کہ امام صاحب اس معنی میں مرجیہ ہیں کہ وہ عمل کو کوئی ضروری چیز نہیں سمجھتے جس سے ہمارے بہت سے سادے محدثین بھی متاثر ہوگئے، حالانکہ اگر کوئی امام صاحب کی زندگی ہی پر ایک سرسری نظر ڈال لے تو اسے معلوم ہوجائے گا کہ وہ تمام ائمہ بلکہ اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ عامل بالسنۃ تھا لحج اور متقی تھے، کیا ان کے قول اور عمل میں کوئی تضاد تھا؟ نہیں بلکہ لوگوں نے ان کی بات سمجھنے میں سخت غلطی کی،

امام صاحب سے چونکہ لوگوں نے یہ سوء ظن، قائم کرلیا تھا، اس لیے اس جرم میں ان کے تلامذہ بھی شریک کرلیے گئے، اگر آپ صرف تاریخ بغدادہی کو اٹھا کر دیکھ لیجئے تو آپ کو نظر آئیگا کہ خطیب تمام مناقب اور فضائل کے ذکر کے بعد ان ائمہ کے بارے میں یہ رائے دیتے ہیں کہ یہ مرجیہ تھے، خلق قرآن کے قائل تھے، جہمیہ تھے، اسی طرح بعض دوسرے تذکرہ نگار بھی ان اقوال کو نقل کرتے ہیں، چنانچہ امام ابو یوسف کی طرف بھی یہ تمام جرائم منسوب کئے گئے ہیں، مگر ہم خود امام ابو یوسف کے اقوال نقل کردیتے ہیں، جس سے ان تمام الزامات کی تردید ہوجائے گی، جو ان پر اس سلسلہ میں لگائے گئے ہیں۔

خلق قرآن | امام ابو یوسف کے زمانہ میں اس مسئلہ کو بڑی اہمیت حاصل تھی[1]، ان سے بھی اس بارے میں سوال کیا گیا، تو انھوں نے فرمایا کہ

> قرآن اللہ کا کلام ہے اور جو شخص کیوں اور کیسے کی شق نکالتا ہے اور اس کے بارے میں رد و کد کرتا ہے وہ قید و بند اور سخت تعزیر کا مستحق ہو (حسن التقاضی ص ۳۵)

[1] اس کی کچھ تفصیل، امام احمد کے حالات میں ملیگی۔

یہ کہنے کے بعد وہ اپنے تلامذہ سے کہتے تھے کہ اس بات کو اچھی طرح گرہ دے لو،

ایک بار ایک شخص نے لوگوں میں یہ مشہور کیا کہ امام ابو یوسف خلقِ قرآن کے قائل ہیں، ان کے تلامذہ نے سنا . . . . تو ان کو بڑی تشویش ہوئی، وہ ان کے پاس آئے، اور کہا کہ آپ کے بارے میں یہ بات معلوم ہوئی ہے، آپ تو اس سے پہلے برابر ہم لوگوں کو اس مسئلہ میں پڑنے سے روکا کرتے تھے، انھوں نے سنا تو بڑے غصہ میں فرمایا،

اے کم عقلو! یہ لوگ جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھ سکتے ہیں، ان کو میرے اوپر کوئی بہتان تراش لینے میں کیا باک ہو سکتا ہے،

پھر فرمایا کہ

اھل بدع یحکون کلامھم	اہل بدعت بات اپنی طرف سے کہتے
ویکذبون علی الناس	ہیں، اور لوگوں پر جھوٹ باندھتے
(ص ۳۶)	ہیں۔

جہمیت ان کے خاص خاندان کے ایک نوجوان نے ایک بار جہمیت[1] کا اظہار کیا، تو انھوں نے ۳۵ کوڑے کی سزا دی، ایک شخص نے ان سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ اس کی شہادت

---

[1] یہ فرقہ جہم بن صفوان کی طرف منسوب ہے نفی صفات کے سلسلہ میں ان کا اور معتزلہ کا ایک ہی عقیدہ ہے، ان کے پانچ اصول ہیں، ایک یہ کہ جن صفات سے بندہ متصف ہے اس سے خدا کو متصف نہ ہونا چاہیے مثلاً انسان میں علم و قدرت ہے تو خدا تعالیٰ کو ان صفات سے خالی ہونا چاہیے نعوذ باللہ، دوسرے یہ کہ خدا تعالیٰ کو کسی چیز کے پیدا کرنے سے پہلے اس کا علم نہیں ہوتا، یعنی اس کا علم حادث ہے خلق کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، تیسرے یہ کہ انسان اور عام مخلوقات مجبور محض ہیں، چوتھے یہ کہ خلود کو دوامِ ہمیشگی پر محمول نہیں کرتے ہیں، پانچویں یہ کہ جس شخص کو خدا کی معرفت حاصل ہو جاتی ہو اگر وہ زبان سے کفر کا اظہار کرے جب بھی کافر نہیں ہوتا، ان اصولوں کی تمام اہل سنت نے تردید کی ہے تفصیل کیلیے ملل و النحل دیکھی جائے

قبول کرتے ہیں، جو اس بات کا قائل ہے کہ اللہ کسی چیز کو اسکے وقوع سے پہلے نہیں جانتا، فرمایا، ایسا شخص اگر توبہ نہ کرے تو میں قتل کر دوں گا نہ کہ اس کی شہادت قبول کروں گا،

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قصداً ان ائمہ کے بارے میں بعض معاندین کیسی کیسی بے سر و پا باتیں اڑاتے رہتے تھے،

ایمان | ایمان کے سلسلہ میں بھی امام ابو یوسف کے بارے میں عجیب عجیب باتیں کہی جاتی تھیں یہانتک کہ بعض لوگوں نے کہا کہ وہ اپنا اور حضرت جبرئیل کا ایمان برابر سمجھتے ہیں، جب انکو معلوم ہوا تو اس کی تردید کی۔

من قال ایمانی کایمان جبرئیل	جو یہ کہتا ہے کہ میرا ایمان حضرت جبرئیل کے
فهو صاحب بدعة[1]	ایمان کی طرح ہے وہ بدعتی ہے۔

وہ فرماتے تھے کہ خراسان میں دو گروہ ہیں جن سے بد تر دنیا میں کوئی نہیں ہے، ایک مجسمہ[2] دوسرے جبریہ، انھوں نے ایک بہت جامع نصیحت تمام تلامذہ کو کی تھی جس کا خلاصہ یہاں نقل کر دیتے ہیں۔

ذروا الخصومة فی الدین والمراء	دین کے بارے میں شک لڑائی کج بحثی اور
فیه والجدال، فان الدین	جدال چھوڑ دو، اس لیے کہ دین بالکل واضح
واضح بین قد فرض اللّٰہ	ہے، خدا نے اس کے فرائض بھی مقرر کر دیئے
عز وجل فرائضه وشرع	ہیں اور اس کی سنتیں بھی اور اس کے تمام
سننه وحد حدوده واحل	حدود مقرر کر دئے ہیں اور حلال کو حلال اور

---

[1] کردری، [2] مجسمہ یعنی وہ لوگ جو خدا کے لیے جسم و اعضا ثابت کرتے ہیں، جبریہ جو انسان کو مجبور محض رکھتے ہیں گناہ و ثواب کا اس کو ذمہ دار نہیں سمجھتے،

وحرم حرامه فقال اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتی ورضيت لكم الاسلام دينا فاحلوا حلال القرآن وحرموا حرامه واعملوا بحكم وآمنوا بالمتشابه منه واعتبروا بالامثال فيه

حرام کو حرام کردیا ہے جیسا کہ اس نے خود فرمایا میں نے تمھارے لیے دین کو مکمل کردیا، اور اپنی نعمت کو تمھارے اوپر تمام کردیا اور تمھارے لیے دین اسلام کو پسند کرلیا، تو اس کے حلال کو حلال سمجھو اور اس کے حرام کو حرام سمجھو، قرآن کی محکم یعنی واضح آیات پر عمل کرو، جو متشابہ آیات ہیں ان پر ایمان و یقین رکھو اور اس کے اندر جو امثال ہیں یعنی مثالیں ان سے عبرت حاصل کرو

فلو كانت الخصومة في الدين تقوى عند الله لسبق اليها رسول الله صلى الله عليه وسلم واصحابه بعده فهل اختصموا الذين تنازعوا فيه وقد اختصموا في الفقه وتكلموا فيه واختصموا في الفرائض و الصلوة والحج والطلاق والحلال والحرام ولم

اگر دین کے مسائل میں کج بحثی کوئی تقویٰ کی بات ہوتی تو اس کی طرف سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے بعد آپ کے اصحاب اس کی طرف سبقت کرتے تو کیا انھوں نے کبھی عقائد کے مسائل میں کج بحثی کی؟ انھوں نے اگر اختلاف اور بحث و مباحثہ کیا تو فقہی مسائل میں جن کا تعلق عمل سے ہے، انھوں نے اگر گفتگو کی تو فرائض، نماز، حج، طلاق جیسے مسائل میں،

يختصموا في الدين ولم يتنازعوا فيه فاقتصروا على تقوى الله وطاعته والتزموا ما جرت السنة ورفضوا ما احدث المحدثون من التنازع في الدين

اور حلال اور حرام میں انھون نے ایمانیات مین کبھی قیل وقال نہیں کیا، انھون نے خدا کے تقوی اور اس کی اطاعت پر بس کیا، اور انھون نے سنت متواتر کو مضبوط پکڑ لیا تھا، اور جو ان مبتدعین نے نئے نئے مسائل پیدا کر دئے ہیں انکو انھون نے کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔

وقد انزل الله عز وجل في كتابه "اذا رايت الذين يخوضون في اياتنا فاعرض عنهم" ولو شاء انزل في ذالك جدلا وحجاجا ولكنه ابى ذالك وقال "ولا تقعد معهم" وقال "فان حاجوك فقل اسلمت وجهي لله ومن اتبعن" ولم يقل وحاجهم،

اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں کہا ہے کہ جب دیکھو کہ وہ ہماری آیات میں کرید کر رہے ہیں تو ان سے الگ ہو جاؤ، اگر اللہ تعالی چاہتا تو اپنی کتاب مین جدال اور قیل وقال کا طریقہ بھی نازل فرما سکتا تھا مگر اس سے اس نے گریز کیا اور یہ حکم دیا کہ ان کے ساتھ نہ بیٹھو" اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ "اگر وہ تم سے حجت کرین تو کہدو کہ میں نے اور جن لوگون نے میری اتباع کی ہے اپنی پوری توجہ خدا کی طرف منہ دل کرلی ہے آپ سے یہ نہین کہا گیا کہ آپ بھی ان سے بحث مباحثہ اور قیل وقال کیجئے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام ابو یوسف کا دامن ان الزامات سے پاک ہے، جو ان پر بعض لوگوں نے عائد کرنے کی کوشش کی ہے، ان کا یہ قول آج تک زبان زد خاص و عام ہے کہ

جس نے دین علم کلام[1] کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کی اوس نے بیدینی کو راہ دی،

جرح و تعدیل | وہ ائمہ اور بزرگان دین جو صدیوں سے کروروں آدمیوں کے متبوع چلے آرہے ہیں اور جن کی جلالت اور امامت پر سب کا اتفاق ہے۔ ان کی عدالت و ثقاہت پر کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے، اور نہ ان کے بارے میں کوئی جرح قابل اعتنا ہے، مگر پھر بھی ایک سوانح نگار کا کام ہے کہ وہ جس کی سوانح عمری لکھ رہا ہے، اس کی زندگی کے ہر گوشہ کو اجاگر کرے، اور اس کے بارے میں اگلوں نے جو رائے دی ہے اسے بھی من وعن نقل کر دے، اس لیے یہاں مختصراً اس سے بحث کی جاتی ہے۔

امام احمد، یحیی بن معین، ابن مدینی اور امام مزی جو جرح و تعدیل کے امام ہیں ان سب نے ان کی توثیق کی ہے، اوپر ذکر آچکا ہے کہ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا مختصر تذکرہ لکھا ہے اور اس کے بعد الگ ایک رسالہ ان کے حالات میں لکھا ہے، جو اب چھپ کر بازار میں آگیا ہے اس میں لکھتے ہیں۔

ان کے علم و فضل میں کسی کو شبہ کرنے کی گنجایش نہیں ہے، جن لوگوں نے ان پر جرح کی ہے، وہ ناقابل اعتبار ہے۔[2]

ابن جوزی نے ان کو ان سو حفاظ میں شمار کیا ہے جو پوری امت میں ممتاز ہیں، اسی طرح ابن حبان، ابن عبد البر نے بھی ان کی ثقاہت و عدالت کی توثیق کی ہے،

---

[1] مقصود وہ مباحث ہیں جن میں خصوصیت سے خدا کی ذات و صفات کی بحث ہوتی ہے، وہ چونکہ انسانی دسترس سے باہر ہیں، اس لیے انسان ان کے بارے میں اٹکل پچو تیر چلاتا ہے [2] جزء الذہبی ص ۴۷

ابن جریر فرماتے ہیں: "یہ حفظ حدیث میں مشہور و معروف ہیں"،

ابن ابی حاتم نے اپنی کتاب الجرح والتعدیل میں امام بخاری سے نقل کیا ہے، کہ ابوزرعہ اور ابو حاتم ان سے حدیث کی روایت نہیں کرتے تھے،

لیکن ابوزرعہ اور ابن ابی حاتم کی رائے یحییٰ بن معین، ابن مدینی کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی، پھر ابن ابی حاتم نے تو امام بخاری پر بھی جرح کی ہے، ظاہر ہے کہ ان کی رائے زیادہ محتاط نہیں کہی جا سکتی۔

خطیب نے عقیلی اور ابن ثابت کی جرح بھی نقل کی ہے، امام ذہبی اس جرح کے بارے میں لکھتے ہیں،

ولخبار فی الحط علیہ بعضہا لیس بصحیح اوردہا العقیلی وابن ثابت فی تاریخ بغداد وغیرہما	ابو یوسف کو گرانے کے لیے جو باتیں عقیلی اور ابن ثابت کے ذریعہ تاریخ بغداد وغیرہ میں منقول ہیں ان میں بعض بالکل صحیح نہیں ہیں

ایک جرح خطیب نے نقل کی ہے اس میں ہے کہ عبداللہ بن مبارک ان کا ذکر اچھے الفاظ سے نہیں کرتے تھے، ان کی وفات کے بعد کسی نے ان کی موت کی اطلاع دی تو انھوں نے مسکین یعقوب (یعنی دنیا سے خالی گئے) کے الفاظ فرمائے،

ظاہر ہے کہ اس روایت کی غلطی دو وجہوں سے ثابت ہے ایک تو یہ کہ عبداللہ بن مبارک امام ابو یوسف سے دو سال پہلے وفات پا چکے تھے، مگر یہاں ان کو زندہ اور امام ابو یوسف کو مردہ دکھایا جا رہا ہے' دوسری یہ کہ اس روایت میں کئی راوی غیر ثقہ ہیں۔

اسی طرح دارقطنی کی جرح بھی نقل کی گئی ہے، مگر دارقطنی نے اپنی کتاب "غرائب مالک" میں امام محمد کو ثقہ قرار دیا ہے، پھر خطیب نے ان سے یہ نقل کیا ہے، کہ امام ابو یوسف کے بارے میں

وہ کہتے تھے کہ

هو اقوى من محمد بن حسن — وہ محمد بن حسن سے زیادہ قابل اعتماد تھے

ظاہر ہے کہ امام محمد سے زیادہ ثقہ قرار دینے کے معنی تو ان کی تعدیل ہوئی، اب اگر کوئی جرح ان سے ثابت بھی ہو جائے، تو تعدیل کو جرح پر ترجیح ہونی چاہیے۔

ایک جرح یہ نقل کی ہے کہ اس حدیث میں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کا ذکر ہے، یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غابہ سے ثنیۃ الوداع تک گئے، خطیب نے لکھا ہے کہ امام ابو یوسف کو غابہ کا تلفظ تک معلوم نہیں تھا، اور وہ غابہ (ب) کی بجائے غایہ (ی) کہتے تھے، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ظاہر ہے کہ جس نے بارہا حج کیا ہو، اور ان مقامات کو خود دیکھا ہو، اور مغازی و سیر محمد بن اسحاق سے پڑھی ہو، امام اوزاعی کی سیرت پر نقد کیا ہو اس کے بارے میں اس قسم کی باتیں کس طرح قابل اعتبار ہو سکتی ہیں،

غرض یہ ہے کہ امام ابو یوسف پر جتنی جرحیں کی گئی ہیں، وہ زیادہ تر یا تو سوء ظنی کی بنا پر ہیں یا امام صاحب کے تلمذ کی وجہ سے، اس لیے کہ اس وقت امام صاحب اور ان کے تلامذہ کے بارے میں عام طور پر یہ غلط فہمی اور سوء ظنی قائم تھی کہ یہ لوگ حدیث و آثار کے مقابلہ میں قیاس و رائے کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ صرف سوء ظنی اور غلط فہمی ہے، ممکن ہے، اس وقت سوء ظنی کسی حد تک صحیح رہی ہو، مگر اس وقت جب کہ امام صاحب کی مجلس مشاورت اور ان کے تلامذہ کے اجتہادات سے جو بنا بنایا مسلک ہمارے سامنے موجود ہے، اس کے بارے میں کیا یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے کوئی نسبت نہیں ہے، اور وہ صرف رائے و اجتہاد کا مجموعہ ہے؟ پھر اس میں امام صاحب اور ان کے تلامذہ کو جو قبول عام حاصل ہوا وہ بھی بہت سے معاصرین کے لیے وجہ خلش تھی،

حیل | امام ابویوسف اور امام محمد کی طرف تذکرہ نہیں بہت سے حیل منقول ہیں، ان کی کوئی اصلیت نہیں ہے، لیکن اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ کوئی ایسی لطیف تدبیر کرنا جس سے نہ تو شریعت کا حکم بدلتا ہو نہ وہ کسی نص صریح سے ٹکراتی ہو نہ اس سے کسی کا حق مارا جاتا ہو اور نہ اس سے کسی باطل کو ثابت کرنے کی کوشش کیجا رہی ہو، کوئی ممنوع چیز نہیں ہے، بلکہ وہ مباح ہے، مثال کے طور پر ہجرت کے واقعہ کو سامنے رکھیے، جب کسی نے راستہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے فرمایا کہ

رجل یھدینی السبیل — ایک شخص ہیں جو مجھے راستہ بتا رہے ہیں'

غور کیجیے کہ آپ نے کتنے لطیف انداز سے سائل کا جواب بھی دیدیا اور خطرہ سے آپ کو بچا بھی لیا' اور واقعیت میں بھی کوئی فرق نہیں آنے دیا، جن ائمہ نے حیلوں سے کام لیا ہے، یا ان کو مباح قرار دیا ہے، ان کے سامنے بھی یہی مثال تھی، نہ کہ مکر و فریب کو وہ حیلہ سمجھتے تھے حاشا و کلا۔

امام ابویوسف نے ایک بار ایک شخص کو اس کا مال بچانے کی ایک جائز تدبیر بتائی جس پر ان کے شاگرد ابو یقظان نے ان سے کہا کہ یہ تو وہی بات ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کیلئے چربی حرام کر دی تھی تو انھوں نے یہ کیا کہ اس کو پگھلا کر فروخت کر دیتے، اور اس کی قیمت اپنے مصرف میں لاتے، امام ابویوسف نے فرمایا کہ انھوں نے ایک حرام کو حلال کرنے کے لیے ایسا کیا تھا، مگر ہم کوئی تدبیر اگر کرتے ہیں تو اس لیے کہ حلال کو حرام نہ ہونے دیں[1]۔

مثال کے لیے ایک اور واقعہ نقل کیا جاتا ہے، ایک بار امام ابویوسف کے یہاں خلیفہ ہادی کے خلاف ایک باغ کا مقدمہ پیش ہوا، ظاہری طور پر حق خلیفہ کا معلوم ہوتا تھا، شہادت وغیرہ بھی اسی کی طرف سے گذری تھی، مگر امام ابویوسف نے تحقیق کی تو حق اس غریب دعوی کرنے والا ہی کا

---

[1] مناقب موفق ج ۲ ص ۲۲

معلوم ہوا، جس کے خلاف شہادت گذر چکی تھی، امام ابو یوسف نے مقدمہ اس وقت ملتوی کر دیا، ہادی سے ملاقات ہوئی تو اوس نے پوچھا کہ میرے معاملہ میں کیا فیصلہ ہوا، فرمایا مدعی آپ سے قسم لینا چاہتا ہے، پوچھا کیا آپ اس کو صحیح سمجھتے ہیں، امام ابو یوسف کا اپنا ذاتی مسلک یہ نہیں تھا اسلیے انھوں نے اپنی کوئی رائے نہیں دی، بلکہ یوں کہا کہ "ابن ابی لیلی اس کو صحیح سمجھتے تھے"!

ہادی نے کہا اچھا تو پھر آپ باغ اس شخص کو واپس کر دیجیے،

ظاہر ہے کہ یہ تدبیر شرعی نقطۂ نظر سے کوئی قابل اعتراض نہیں ہے، اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہو کہ ان ائمہ کو بہت سے مظلوموں کی جان بچانے اور کتنے لوگوں کے حق واپس کرنے کے لیے بھی اس قسم کی تدبیریں کرنی پڑتی تھیں، اگر اسی کا نام حیلہ ہے تو پھر شرعی نقطۂ نظر سے اس میں کوئی برائی نہیں ہے

خطیب بغدادی اور دوسرے بعض سوانح نگاروں نے امام ابو یوسف کی طرف بہت سے ایسے حیلے منسوب کیے ہیں، جو انھوں نے ہارون رشید کے لیے کیے تھے، مگر وہ اس لیے ناقابل اعتبار ہیں کہ ان کی پوری زندگی جس کا نقشہ اوپر کھینچا گیا ہے، اس سے ان کی تردید ہوتی ہے

امام ابو یوسف کیطرف منسوب کتاب المخارج والحیل کے نام سے ایک مستقل کتاب مصر کے متعدد کتب خانوں میں موجود ہے۔ جسے ایک جرمن مستشرق جوزف شخت نے طبع کرا دیا ہے۔ مگر اس پر نام امام محمد کا درج ہے۔

کتاب الحیل کے بارے میں مزید تفصیل امام محمد کے حالات میں ملیگی،

زریں اقوال | امام ابو یوسف کے بہت سے حکیمانہ مقولے اور زریں اقوال کتابوں میں درج ہیں، ان میں سے چند کا ترجمہ یہاں نقل کیا جاتا ہے، فرماتے تھے کہ

بار الٰہا! میرے سامنے جب کوئی مسئلہ پیش آیا تو پہلے میں نے کتاب اللہ میں غور کر کے اس کا جواب معلوم کرنے کی کوشش کی، اگر کتاب اللہ میں اس کا جواب نہیں ملا تو

پھر سنت رسول اللہ کی طرف رجوع کیا، اگر اس میں بھی جواب نہ ملا، تو آثار صحابہ اور ان کے تعامل پر غور کیا، اگر اس میں بھی جواب نہ ملا تو میں نے امام صاحب کو اور اپنے اور آپ کے درمیان واسطہ بنایا (یعنی ان کے قول پر عمل کیا)

اے اللہ تو جانتا ہے کہ جب میرے پاس دو فریق آئے، اور ان میں سے ایک ضعیف اور دوسرا قوی تھا، تو میں نے دونوں میں ہمیشہ مساوات رکھی، میں نے اس بارے میں خلیفہ اور ایک بازاری آدمی کو یکساں سمجھا، میرا قلب کبھی کسی کی وجاہت وقوت کی طرف مائل نہیں ہوا، اے اللہ! اگر میں نے ایسا کیا ہے تو میری مغفرت کر دے

فرماتے تھے کہ بسا اوقات مجھ سے کسی مسئلہ کے بارے میں سوال کیا گیا اور اس کی علت بھی میری سمجھ میں آگئی، مگر زبان سے اس کے اظہار پر قادر نہیں تھا، اس وقت میری مثال اس شخص کی سی ہوتی تھی، جس کے سامنے ایک درہم رکھا جائے، اور اس سے پوچھا جائے کہ یہ کھرا ہے یا کھوٹا، تو وہ جواب میں کھرا یا کھوٹا کہے، مگر جب اس سے اس کی علت اور وجہ دریافت کی جائے تو وہ کوئی جواب نہ دے سکے، حالانکہ وہ اس کا کھرا کھوٹا ہونا جانتا ہے، اور اس کا قلب اس پر مطمئن ہے مگر زبان سے اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔ فرماتے تھے کہ بعض اوقات میں نے دو مسئلوں میں بال برابر فرق کیا ہے، اور بعض اوقات پہاڑ کے برابر اور بعض وقت فرق کو دل میں محسوس کر لیا، مگر زبان سے یارائے اظہار نہیں تھا۔

تلامذہ سے فرماتے تھے کہ اے لوگو! صرف رضائے الٰہی کے لیے علم حاصل کرو، اس میں کوئی دوسری غرض شامل نہ ہو، میرا خود اپنا حال یہ تھا کہ جس مجلس میں متواضع ہو کر شریک ہوا، اس سے بلند ہو کر اٹھا، اور جس مجلس میں علم کے غرور و پندار کے ساتھ گیا، اس میں میری ذلت و فضیحت ہوئی، پس خبردار اللہ ہی کے لیے علم حاصل کرو،

فرمایا اس شخص کی صحبت سے بچو جو قیامت کی ذلت اور رسوائی سے نہیں ڈرتا۔

فرماتے تھے کہ تین نعمتیں اصل ہیں ایک اسلام کہ دنیا کی کوئی نعمت اس کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی، دوسری صحت کہ اس کے بغیر کوئی راحت خوشگوار نہیں ہو سکتی، تیسری فارغ البالی کہ اس کے بغیر زندگی پر سکون نہیں ہوتی۔

فرماتے تھے کہ علم ایسی چیز ہے کہ جب تم اپنی پوری زندگی اس کو دیدو گے تب جاکر اس کا کچھ حصہ تم کو ملے گا، جب تم کو اس کا بعض حصہ ملے تو اس پر تکیہ نہ کرو، بلکہ برابر اس میں لگے رہو،

فرماتے تھے کہ حکومت کے ذمہ داروں کا پھٹے حال رہنا اور موٹی جھوٹی زندگی اختیار کرنا ذلت کا باعث ہے، اور قضاۃ اور علماء کے لیے سادہ زندگی قابل فخر ہے۔

فرماتے تھے کہ جو شاذ و نادر حدیث کے پیچھے پڑے گا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بہتان تراشی میں ضرور مبتلا ہو جائے گا، اور جو علم کلام کے ذریعہ دین حاصل کرنے کی کوشش کرے گا وہ گمراہی میں پڑ جائے گا، اور جو کیمیا سازی کے ذریعہ مال و دولت کمانے کی کوشش کرے گا وہ مفلس ہی رہے گا۔

تصانیف امام ابو یوسف ان بزرگوں میں ہیں جنہوں نے ابتدائی صدیوں میں علوم دینیہ کی تدوین میں حصہ لیا تھا، بلکہ بعض فنون کی تدوین میں انھیں اولیت حاصل ہے۔ ان کا شمار کثیر التصانیف علماء میں ہوتا ہے کشف الظنون میں ہے کہ

ان الامالی لابی یوسف فی ثلثمائۃ مجلد — امام ابو یوسف کی امالی تین سو جلدوں میں تھیں،

ابن ندیم نے متداول کتابوں کے علاوہ ان کی ایک امالی کا ذکر کیا ہے، جو ۳۶ مباحث پر مشتمل تھی، اور دوسری کتاب "کتاب الجوامع" کا ذکر بھی کیا ہے، جس کے ۴۰ حصے تھے اس کے اندر علماء کے فقہی اختلافات و آراء کا مفصل تذکرہ ہے، یہ کتاب انھوں نے یحییٰ بن برمکی کی

فرمایش پر لکھی تھی،

ابن ندیم نے ایک کتاب اختلاف (علماء) الامصار کے نام سے بھی ان کی تصانیف میں شمار کی ہے، لیکن یہ تمام کتابیں زمانہ کی دستبرد کی نذر ہو گئیں۔

ایک کتاب انھوں نے امام مالک کے رد میں لکھی تھی، جس میں ان کے بعض فقہی مسائل پر تنقید تھی ان کی سب سے اہم کتاب اصول فقہ پر تھی، جس کی تدوین میں ان کو اولیت کا شرف حاصل ہے، اس کتاب کے بارے میں محمد بن جعفر کہتے ہیں،

داول من وضع الکتب فی اصول الفقہ علی مذہب ابی حنیفۃ[1]	وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے امام ابو حنیفہ کے مسلک کے مطابق اصول فقہ کی تدوین کی،

لیکن تاتاریوں کے حملوں اور مصر و عراق کے آئے دن کے انقلابات میں نہ جانے اس طرح کے کتنے گنجہائے گرانمایہ خاک کی نذر ہو گئے، انہی میں یہ کتابیں بھی تلف ہو گئیں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بعض لوگوں نے لکھا ہے، کہ سب سے پہلے اصول فقہ پر انہی نے "الرسالہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی جو اہل علم کے ہاتھوں میں موجود ہے، مگر ان دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے، امام ابو یوسف نے حنفی مسلک پر اصول فقہ کی تدوین کی تھی اور امام شافعی نے خود اپنے مسلک کے اصول متعین کیے تھے، اس لیے دونوں کی اولیت کی حیثیت جداگانہ ہے، پھر امام شافعی کی اولیت اس لحاظ سے بھی ہو سکتی ہے کہ انکی کتاب آج بھی موجود ہے، اور امام ابو یوسف کی کتاب کا سراغ نہیں ملتا، لیکن اس کے باوجود زمانہ کے اعتبار سے امام ابو یوسف متقدم ہیں۔

امام ابو یوسف کی جو کتابیں اس وقت مطبوعہ یا مخطوطہ موجود ہیں، وہ حسب ذیل ہیں۔

---

[1] مفتاح السعادۃ و کردری و موفق وغیرہ،

(۱) کتاب الآثار اس میں وہ احادیث و آثار جمع کر دیے ہیں جو حنفی مسلک کے مآخذ ہیں، اس میں انھوں نے زیادہ تر امام ابو حنیفہ ہی سے روایتیں کی ہیں، دوسرے شیوخ کی بہت کم روایتیں ہیں، اس میں بعض جگہ اپنی مرویات کا اضافہ بھی کر دیا ہے، اس کو مسند ابو یوسف بھی کہا جاتا ہے، اس میں ایک ہزار سے زیادہ احادیث و آثار ہیں، کتاب کے راوی امام ابو یوسف کے صاحبزادے یوسف ہیں جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے، اس کتاب کو لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد نے شایع کیا ہے، اس پر مولانا ابو الوفا افغانی مدظلہ، صدر مجلس کے بہت سے مفید حواشی بھی ہیں۔

(۲) "اختلاف ابی حنیفہ و ابن ابی لیلی" ذکر آچکا ہے کہ امام ابو یوسف پہلے ابن ابی لیلی[1] کے یہاں تحصیل علم کرتے تھے، اس کے بعد امام صاحب کی خدمت میں گئے، امام صاحب اور ابن ابن ابی لیلی میں بہت سے فقہی مسائل میں اختلاف تھا، امام ابو یوسف نے اپنے ان دونوں اساتذہ کے اختلافات کو کتابی شکل میں جمع کر دیا ہے، اس کتاب میں ایک دو جگہ نہیں بلکہ بیسیوں جگہ امام ابو یوسف نے امام صاحب کی رائے سے اختلاف کیا ہے، اور ابن ابی لیلی کی رائے کو ترجیح دی ہے اور بعض جگہ اپنے دونوں اساتذہ سے اختلاف رائے کیا ہے، یہ کتاب ان دونوں اماموں کے مجتہدات کے ساتھ امام ابو یوسف کے مجتہدات اور استنباطات کا بھی بہترین نمونہ ہے، کتاب کے راوی یا مولف امام محمد ہیں، اس کا کچھ حصہ امام سرخسی نے مبسوط میں بھی نقل کیا ہے،[2] اس کتاب کو بھی "لجنۃ المعارف" نے شایع کیا ہے کتاب کی افادیت کو علامہ ابو الوفا کے حواشی نے کئی گونہ زیادہ کر دیا ہے، بلکہ وہ خود ایک کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۳) الرد علی سیر الاوزاعی" امام ابو حنیفہ نے سیر مغازی پر اپنے تلامذہ کو جو کچھ املا کرایا تھا

---

[1] ابن ابی لیلی کا خانوادہ علم اور دین کے لحاظ سے ممتاز تھا، ان کے والد ممتاز تابعین میں تھے، یہ خود اپنے وقت کے امام تھے کوفہ میں امام صاحب کا اگر کوئی ہمسر تھا تو یہی تھے [2] ج ۳۰ ص ۱۲۸

اس کو انھوں نے مدون کر دیا تھا، چنانچہ امام محمد نے خاص طور پر اس کے لیے السیر الصغیر مرتب کی، جب یہ کتاب امام اوزاعی کی لیسا منے جو اس وقت اہل شام کے مرجع و ماوٰی تھے! . . . . آئی تو انھوں نے کہا کہ اہل عراق سیر و مغازی کیا جانیں، اور اس کی تردید میں اس موضوع پر ایک کتاب لکھی، امام محمد کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے اس کے جواب میں السیر الکبیر لکھی اور امام ابو یوسف نے بھی اس کا جواب دیا، امام ابو یوسف کی کتاب الرد علی السیر الاوزاعی کے نام سے حیدرآباد میں چھپ گئی ہے، اس کے دیکھنے سے حدیث، آثار پر امام ابو یوسف کی وسعت نظری اور امام صاحب کی سیر و مغازی سے پوری . . . واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۴) کتاب الخراج، امام ابو یوسف کی سب سے اہم کتاب یہی ہے، "خراج" اسلامی ریاست کا ایک شعبۂ آمدنی ہے، مگر یہ لفظ امام ابو یوسف نے تقریباً اسلامی مالیات کے ان تمام مداخل و مخارج کے لیے استعمال کیا ہے، جن کا تعلق حکومت یا مسلمانوں کی اجتماعی زندگی سے ہے۔ امام ابو یوسف کے معاصرین اور ان کے بعد کے بہت سے علماء نے اس موضوع پر کتابیں لکھی ہیں خصوصیت سے یحییٰ بن آدم کی کتاب الخراج، ابن عبید کی کتاب الاموال، ابن رجب کی استخراج احکام الخراج وغیرہ بہت مشہور ہیں، مگر ان میں سے کوئی کتاب ان خصوصیات کی حامل نہیں ہے جن کی امام ابو یوسف کی کتاب حامل ہے، ابن عبید کی کتاب اس موضوع پر سب سے زیادہ مفصل اور ضخیم ہے، مگر کیفیت کے لحاظ سے وہ امام ابو یوسف کی کتاب سے کم درجہ کی ہے، اس موضوع کے دوسرے مصنفین خصوصیت سے ابن عبید نے یہ کیا ہے کہ اس موضوع پر جو قرآن کی جو آیات، احادیث نبوی، آثار صحابہ اور اقوال تابعین ملے ہیں، وہ سب جمع کر دیئے ہیں۔ استخراج احکام انھوں نے بہت کم کیا ہے، لیکن امام ابو یوسف صرف نقل روایات ہی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ جہاں تاریخی مباحث آ جاتے ہیں، ان پر بھی روشنی ڈالتے ہیں، قرآن و حدیث کے معانی کی تشریح اور تعیین میں لغت عرب اور استعمالات اور بادیہ کر

بھی بحث کرتے ہیں، پھر سب سے زیادہ اس کی افادیت اس حیثیت سے ہے، کہ وہ حکومت اور عامۂ مسلمین کی نئی نئی ضروریات و مشکلات کا قرآن و حدیث اور آثار صحابہ سے یا ان کی روشنی میں اجتہاد کر کے حل پیش کرتے ہیں۔

اس کتاب کا طریقۂ بیان یہ ہے کہ جب کوئی بحث شروع کرتے ہیں، تو پہلے قرآن کی آیت پیش کرتے ہیں، پھر حدیث نبویؐ اور آثار صحابہ، اس کے بعد ضرورت ہوتی ہے تو امام صاحب یا دیگر ائمہ کے اقوال سے استدلال کرتے ہیں، اس کے بعد بھی اگر ضرورت مقتضی ہوتی ہے تو وہ خود اجتہاد پیش کرتے ہیں، یہ کتاب ہارون رشید کی فرمایش سے انھوں نے لکھی تھی، عموماً امراء وسلاطین کی فرمائش پر جو کتابیں علماء نے لکھی ہیں، ان میں بہت کم ایسی کتابیں ملینگی، جن میں موقع کے لحاظ سے جرات وحق گوئی کا پورا اظہار بھی ہو اور ان کو نصیحت بھی کی گئی ہو مگر امام ابو یوسف کی یہ کتاب اس لحاظ سے آپ اپنی مثال ہے، انھوں نے مقدمۂ کتاب میں ہارون کو جو نصیحتیں کی ہیں، اور جس جرات وحق گوئی کے ساتھ کی ہیں، اس کی اہمیت کا اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب عباسی خلفاؔ اور خصوصیت سے ہارون رشید کی خود رائی اور اس کے استبداد کی تاریخ کو بھی سامنے رکھا جائے، اوپر اس کا کچھ حصہ ہم نقل کر آئے ہیں، تطویل کا خیال نہ ہوتا تو اس کا پورا خلاصہ یہاں نقل کیا جاتا،

یہ کتاب کئی بار چھپی ہے، سب سے پہلے مطبعہ بولاق سے ۱۳۰۲ھ (۱۸۹۱ء) میں شائع ہوئی، اس کتاب کو ایک فرانسیسی مستشرق نے فرنچ میں بھی ترجمہ کیا ہے، جو ۱۹۲۹ء میں پیرس سے شائع ہو چکا ہے۔

(۵) کتاب المخارج والحیل، امام ابو یوسف کی طرف یہ کتاب بھی منسوب ہے، یہ کتاب آستانہ سے شائع ہو چکی ہے، جس کو ایک جرمن عالم نے ایڈٹ کیا ہے۔ اور اس نے اس کو امام محمد کی تصنیف بتایا ہے، مگر اس کے بارے میں علامہ زاہد الکوثری نے لکھا ہے کہ مصر کے متعدد

کتب خانوں میں اس کتاب کے قلمی نسخے موجود ہیں اور یہ امام ابویوسف کی تصنیف ہے۔

مرجوع مسائل اجتہاد و استنباط کا تعلق اس دینی بصیرت سے ہے، جو علوم دینیہ میں غور کرتے رہنے، اور اس سے غیر معمولی شغف و انہماک رکھنے کی وجہ سے حاصل ہوجاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بصیرت علم و تجربہ کی زیادتی کے لحاظ سے روز بروز بڑھتی رہتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ائمہ کرام کے بہت سے مجتہدات جن پر ابتدا میں انکو پورا وثوق اور اعتماد تھا، علم دین اور فہم و بصیرت کی زیادتی کے بعد ان میں ان کو تبدیلی کرنی پڑی، امام ابوحنیفہ کے سیکڑوں مسائل اور استنباطات ایسے ملیں گے جن کو انھوں نے ترک کردیا، یا ان میں ترمیم کردی، اسی طرح امام مالک اور امام شافعی وغیرہ کا حال بھی ہے خصوصیت سے امام شافعی نے تو امام محمد کے تلمذ کے بعد تقریباً اپنے تمام مسائل پر نظر ثانی کرکے انھیں بدل ڈالا، چنانچہ شافعی فقیہ کے لیے ان کے قدیم و جدید اقوال میں فرق کرنے میں بڑی دقت پیش آتی ہے، امام ابویوسف بھی مجتہد تھے، اس لیے انھوں نے بھی اپنے بہت سے استنباطات میں جزوی ترمیم کی ہے، اور بہت سے مسائل سے بالکلیہ رجوع کرلیا ہے، ائمہ کے مرجوع مسائل کو ذہن میں نہ رکھنے کی وجہ سے بسا اوقات ان کے اور ان کے مسلک کے بارے میں بہت شدید غلط فہمی پیدا ہوجاتی ہے، غالباً اسی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر مفتی مہدی حسن صاحب (دیوبند) نے امام ابوحنیفہ، امام محمد اور امام ابویوسف کے جتنے مرجوع مسائل ہیں، ان کو ایک کتابی شکل میں جمع کردیا ہے یہ رسالہ عربی میں ہے، اس لیے اردو داں اصحاب کے لیے تو بیکار ہے، مگر عربی خواں اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

امام صاحب کی وصیت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی وہ مشہور وصیت جس میں انھوں نے اہل سنت والجماعت کے تمام عقائد تفصیل سے بیان کردئے ہیں، اس سے اہل علم تو عام طور پر واقف ہیں، مگر اس کے علاوہ ایک اور وصیت بھی ہے، جو انھوں نے خاص طور سے امام ابویوسف کو لکھ کر دی تھی، جس میں اخلاق، معاملات، معاشرت، سیاست کے متعلق بہت سی قیمتی ہدایتیں اور زریں اقوال

اقوال ہیں، جن سے ہر خاص و عام فائدہ اٹھا سکتا ہے، اس لیے ہم اس کا خلاصہ ذیلی عنوانات کے تحت یہاں نقل کرتے ہیں۔

حکومت و اہل حکومت سے تعلقات | سلاطین کے پاس بہت کم آمد و رفت رکھنا، ان سے ہر وقت اس طرح پر خطر رہنا جس طرح آدمی آگ سے پر خطر رہتا ہے، جب تک کوئی خاص ضرورت نہ ہو دربار شاہی میں نہ جانا، اس لیے کہ اس سے اپنا اعزاز و اکرام قائم رہتا ہے، اور اس لیے بھی کہ سلطان اپنے مقابلہ میں کسی کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا، اور جب وہ اپنے حاشیہ نشینوں میں ہوتا ہے، تو اس وقت اس سے زیادہ گفتگو نہ کرنی چاہئے، اس لیے کہ اس موقع پر اس کی خواہش یہ ہوگی کہ ان کے سامنے اپنے کو تم سے زیادہ عالم اور صاحب فضل ظاہر کرے، تو خواہ مخواہ تمھیں نیچا دکھانے کی کوشش کرے گا، اور اس سے لوگوں میں تمھاری ذلت ہوگی۔

اگر سلطان تم کو عہدۂ قضا پر مقرر کرنا چاہے، تو پہلے دریافت کر لو کہ وہ تمھارے فقہی مسلک اور طریقہ اجتہاد سے واقف ہے یا نہیں، ایسا نہ ہو کہ حکومت کے دباؤ سے تم کو اپنے فیصلہ کے خلاف عمل کرنے پر مجبور ہونا پڑے[1] اور پھر یہ بھی سوچ لینا کہ اگر تم نہیں قبول کرتے ہو تو اس جگہ پر کوئی ایسا

---

[1] اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت اسلامی نقطۂ نظر سے حکومت اور ارکان حکومت کی اخلاقی حالت کیا تھی، امام صاحب نے ہر جگہ سلطان کا لفظ استعمال کیا ہے، حالانکہ اس وقت صاحب امر امیر المومنین، اور خلیفۃ المسلمین کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے، خلفاء کے لیے سلطان کا لفظ بہت بعد میں مستعمل ہوا ہے اس لفظ سے غالباً انھوں نے تغلب، انفراد بالمجد اور ڈکیٹر شپ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ [2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب شروع میں عہدۂ قضا قبول نہ کرنے پر جس قدر مصر تھے، اب ان کا اصرار اتنا باقی نہیں تھا، جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ امام صاحب نے حکومت سے استغناء دکھا کر اب عہدۂ قضا کی اہمیت کو کافی بڑھا دیا تھا، اسی وجہ سے چند شرائط کے ساتھ اس کے قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے، ان شروط کی تفصیل آگے آتی ہے،

آدمی تو مقرر نہیں کیا جائے گا، جو اس کا اہل نہیں ہے، اور اس سے عام لوگوں کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہے پھر یہ بھی معلوم کر لو کہ تمھارا یہ تقرر علم و فضل کی وجہ سے کیا جا رہا ہے[1]،

سلطان کے وزراء اور اس کے حاشیہ نشینوں سے تعلقات قائم کرنے کی کوشش نہ کرنا، صرف سلطان سے تعلقات قائم کرنا، اس میں بھی خود پیش قدمی نہ کرنا، اس لیے کہ جب خود پیش قدمی کرو گے تو وہ اپنے اغراض تمھارے سامنے رکھیں گے، اگر تم انھیں پورا کرو گے، تو پھر وہ تمھاری توہین کریں گے اور اگر پورا نہ کرو گے تو وہ تمھاری عیب چینی کریں گے،

اظہار حق اور امر بالمعروف اظہار حق میں کسی کی پروانہ کرنا خواہ وہ سلطان ہی کیوں نہ ہو، اگر کوئی شخص دین میں کسی بدعت کا موجد ہوا ہو تو علانیہ اس کی غلطی کو ظاہر کر دینا، اگرچہ وہ شخص صاحب وجاہت و صاحب حکومت ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ اظہار حق میں خدا تعالے تمھارا معین اور مددگار ہوگا، اور اپنے دین کا محافظ و حامی ہے اگر تم ایسا کرو گے، تو لوگوں کو دین میں رخنہ اندازی کی جرات نہ ہوگی، اور وہ تمھارے اظہار حق سے بھی خائف رہیں گے، خود بادشاہ سے اگر کوئی نامناسب اور دین کے خلاف حرکت صادر ہو تو صاف کہدینا کہ عہدۂ قضا کے لحاظ سے میں آپ کا مطیع ہوں لیکن کسی غلطی پر آپ کو مطلع کر دینا میرا فرض ہے، خصوصیت سے جس کا تعلق علم دین سے ہو، اگر اس کے بعد بھی وہ نہ مانے تو تنہائی میں اس طرح سمجھانے کی کوشش کرنا کہ آپ کا یہ فعل کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہے، اگر وہ سمجھ جائے تو خیر ورنہ خدا سے دعا کرنا، کہ وہ تم کو اس کے شر سے محفوظ رکھے، اس میں اتنا زیادہ اصرار نہ کرنا کہ وہ زچ ہو جائے، اور تمھارا قلع قمع کر دے، اس سے دین کو نقصان ہوگا، اس اس حد تک اظہار حق کرو، جس سے وہ تمھاری دینی جدوجہد اور امر بالمعروف[2] سے واقف ہو جائے۔

---

[1] یعنی یہ تو نہیں ہے کہ وہ کہیں اپنے اغراض کے استعمال کے لیے انتخاب کر رہے ہیں۔ [2] بڑی حکیمانہ بات ہے، اس لیے کہ جب اس جذبہ کا اظہار ہو جائیگا۔ تو وہ خود ہی بے راہ روی سے پرہیز کرے گا۔

علم اور اہل علم سے تعلق | تحصیل علم کو سب پر مقدم رکھنا، جب اس سے فراغت ہو چکے تو اس کے بعد جائز ذرائع سے مال حاصل کرنے کی کوشش کرنا، کیونکہ ایک وقت میں علم و دولت دونوں حاصل نہیں ہو سکتے،

کسی شہر میں جاؤ تو وہاں کے علماء و فضلاء سے اس طرح ملو کہ ان کو رقابت کا خیال نہ ہو، کسی علمی گفتگو کا موقع آئے تو جو بات کہو خوب سوچ سمجھکر کہو اور وہی بات کہو جس کا کافی ثبوت تمھارے پاس موجود ہو، اگر کبھی علمی مباحثہ کا موقع آجائے تو نہایت جرات اور استقلال کے ساتھ اس میں حصہ لو، دل میں ذرہ برابر بھی خوف وہراس رہے گا تو خیالات منتشر ہو جائیں گے اور زبان میں لغزش آجائیگی، جو لوگ علمی مجالس کے آداب سے واقف نہ ہوں بلکہ مکابرہ یعنی بحث وجدال کرنا چاہتے ہوں، ان سے ہرگز گفتگو نہ کرو، اپنے اساتذہ کو برا بھلا نہ کہو، ورنہ تمھارے تلامذہ بھی تم کو برا بھلا کہیں گے، اپنے اساتذہ اور جن لوگوں سے تم نے استفادہ کیا ہے، ان کے لیے دعائے مغفرت کرتے رہا کرو، اپنے شاگردوں کے ساتھ ایسے خلوص ومحبت سے پیش آؤ کہ دوسرا دیکھے تو سمجھے کہ یہ تمھاری اولاد ہیں، شاگردوں میں سے اگر کسی کو درس کی اجازت دو تو خود بھی اس کی مجلس درس میں شریک ہو کر اس کی صلاحیت کا اندازہ کرو، اگر اس سے کبھی کوئی غلطی ہو جائے، تو بتا دو ورنہ تمھارے چپ رہنے سے لوگوں کو گمان ہوگا کہ اس نے جو کچھ کہا ہے صحیح کہا ہے، جب تم سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے تو بقدر ضرورت اس کا جواب دو، اپنی طرف سے اس میں کچھ اضافہ نہ کرو، علمی مجالس میں خصوصیت سے غصہ نہ کرو،

مہمات دین | مہمات دین اور عقائد کے اختلافی مسائل میں عوام سے کوئی گفتگو نہ کرو، ہر بات میں تقویٰ اور امانت کو پیش نظر رکھو، ظاہر و باطن ایک رکھو، خدا کے ساتھ وہی معاملہ رکھو جو لوگوں کے سامنے ظاہر کرتے ہو، دنیا کا نظام اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کا ظاہر و باطن ایک نہ کر دیا جائے [1]

---

[1] دعوت دین اور اقامت دین کے نقطۂ نظر سے یہ بڑی اہم ہدایت ہے۔

اپنے نفس کا محاسبہ کرتے رہو، علم کی نگہداشت رکھو، دنیا کو بالکل حقیر سمجھو، دنیا کے کسی کام میں مطمئن ہو کر نہ لگ جاؤ، خدا تعالےٰ کے یہاں تمام باتوں کی بازپرس ہوگی۔ اللہ کا ذکر کثرت سے کرتے رہو۔

اتنی ہی عبادت پر اکتفا نہ کرو، جتنی عام لوگ کرتے ہیں، جس وقت اذان کی آواز آئے فوراً نماز کی تیاری اور مسجد میں پہنچنے کی کوشش کرو، ہر نماز کے بعد کچھ دیر قرآن کی تلاوت اور ذکر الٰہی میں مشغول رہو، اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرو، کہ اس نے دین پر جمے رہنے کی توفیق دی، اور طرح طرح کی نعمتیں عطا کیں، تلاوت قرآن پر مداومت رکھو، جب تک لوگ تم کو خود امام نہ بنائیں آگے نہ بڑھو، ہر مہینہ میں دو چار دن روزہ کے لیے مقرر کر لو، زیارت قبر کی عادت ڈالو، موت کو ہمیشہ یاد رکھو،

معاشرت و آداب معاشرت | جو لوگ اپنی خواہشات کے بندے ہو چکے ہیں، ان سے ربط ضبط نہ رکھو مگر تبلیغ اور دعوت دین کی غرض سے ان سے ملنا یا تعلق قائم کرنا مناسب ہے، کسی پر لعن طعن نہ کرو، اگر کسی انسان میں اپنی طرف سے برائی دیکھو تو اس کے لیے بھلائی چاہو، اور بھلائی کے ساتھ اس کا تذکرہ کرو، مگر یہ برائی اگر دین کے بارے میں ہے تو لوگوں سے اس کا تذکرہ کرو، تاکہ لوگ اس کا اتباع نہ کریں، اور اس برائی سے محفوظ رہ سکیں۔

تجارت اور کاروباری معاملات کے بارے میں زیادہ گفتگو نہ کرو، ورنہ لوگوں کو خیال ہوگا، کہ تم مال کے حریص ہو، یہ بھی گمان ہوگا کہ تم رشوت لیتے ہو، عام آدمیوں اور خصوصیت سے دولتمندوں سے کم میل جول رکھنا ورنہ ان کو گمان ہوگا کہ تم ان سے کچھ توقع رکھتے ہو،

اگر تم دس برس بھی کسی ذریعۂ معاش کے بغیر رہو تو علم دین سے گریز نہ کرنا، اگر گریز کرو گے تو اس آیت کے مصداق ہو گے۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیْشَۃً ضَنْکًا۔	جس نے ہماری یاد سے منہ موڑا اس کے لیے معاشی تنگی ہے۔

اس وقت شادی کرنا جب یہ یقین ہو جائے کہ اہل وعیال کی تمام ذمہ داریاں اٹھا سکو گے حتی الامکان ایسی عورت سے نکاح نہ کرنا جو دوسرے شوہر سے اولاد رکھتی ہو،

عام لوگوں کو ذلیل نہ سمجھو بلکہ ان کی توقیر کرو، جب تک یہ لوگ خود تعلقات قائم نہ کریں، خود اس کی کوشش نہ کرو،[1]

زیادہ نہ ہنسا کرو، اس سے قلب مردہ ہو جاتا ہے، جو کام کرو اطمینان اور وقار کے ساتھ کرو، جلدی نہ کرو،

کوئی شخص پیچھے سے پکارے تو جواب نہ دو، اس لیے کہ پیچھے سے پکارنا جانوروں کے لیے مخصوص ہے، راستہ چلو تو دائیں بائیں نہ دیکھو، بلکہ نیچی نظریں کر کے چلو، بازار میں زیادہ نہ جایا کرو،

گفتگو میں نہ سختی و درشتی ہو، اور نہ آواز بلند ہو، بلکہ متانت و وقار پیش نظر رہے، لہو ولعب سے پرہیز کرو، لوگوں کے راز کو افشا نہ کرو، جو تم سے مشورہ کرے، تو اپنی معلومات کے بقدر بتانے میں کوتاہی نہ کرو، اس سے اللہ کا تقرب حاصل ہوگا، اپنے ہمسایہ کی کوئی برائی دیکھو تو پردہ پوشی کرو، اس لیے کہ یہ امانت ہے، بخل سے پرہیز کرو حریص نہ ہو، اور نہ کبھی جھوٹ بولو، بازاری لوگوں کی صحبت نہ اختیار کرو، ہر معاملہ میں اپنی عزت اور وقار کا خیال رکھو، ہمیشہ قلب میں استغنا رکھو، دنیا کی طمع و رغبت بالکل نہ کرو، اپنی طرف سے ہمیشہ استغنا کا اظہار کرو، خواہ تم مفلس ہی کیوں نہ ہو،

ہر معاملہ میں ہمت وجرات سے کام لو، اس لیے کہ جس کی ہمت کمزور ہو جاتی ہے، اس کا رتبہ بھی گر جاتا ہے، عام عورتوں سے بات چیت نہ کرو، اور نہ ان کے ساتھ اٹھو بیٹھو، اس سے قلب مردہ ہو جاتا ہے، بیوی کے ساتھ بھی بہت زیادہ بات چیت میں مشغول نہ رہو، بقدر ضرورت خلا ملا رکھو، اور اس اثنا میں بھی ذکر الہی سے غافل نہ ہو، اپنی بیوی کے سامنے دوسری عورتوں کا تذکرہ نہ کرو، اس لیے کہ پھر وہ بھی غیر مردوں

---

[1] اوپر ذکر آچکا ہے کہ دعوت دین کے سلسلہ میں ان سے ملنا جلنا اور تعلق قائم کرنا چاہئے، یہ ہدایت عام ہے۔

تذکرہ شروع کر دینگی، اس لیے آپس میں اختلاف ہوگا۔

نوخیز لڑکوں سے بات چیت نہ کرو، اس لیے کہ اس سے فتنہ میں پڑ جانے کا اندیشہ ہے، چھوٹے بچوں سے پیار کرنے اور ان کے سر پر دست شفقت پھیرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

بازار میں زیادہ نہ جایا کرو، راستہ میں نہ بیٹھا کرو، اگر راستے میں بیٹھنے کی ضرورت آجائے، تو پھر مسجد میں چلے جایا کرو"

میں نے مختصر طور سے پوری وصیت کا ترجمہ کر دیا ہے، اس میں میں نے اتنی تبدیلی ضرور کی ہے، کہ بعض جملوں کو مقدم اور بعض کو مؤخر کر دیا ہے، اور ان پر سرخیاں قائم کر دی ہیں، تاکہ ایک مضمون سے متعلق تمام باتیں یکجا ہو جائیں۔

اس وصیت کو سامنے رکھ کر اگر امام ابویوسفؒ کے صحیفۂ زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے استاد کی اس نصیحت کو اپنی زندگی کا لائحۂ عمل بنا لیا تھا، گو یہ وصیت امام صاحب نے خاص طور پر امام ابویوسفؒ کے لیے کی تھی مگر اسمیں ہر اس شخص کی زندگی کے لیے بہترین مشورے اور نہایت قیمتی ہدایتیں موجود ہیں جو انسان بننا چاہتا ہو، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کی توفیق دے، آمین!

امام محمد شیبانی

نام و نسب	محمد نام ابو عبداللہ کنیت، مختصر شجرۂ نسب یہ ہے محمد بن الحسن الفرقد الشیبانی[1]۔
ولادت	ان کے والد دمشق کے ایک گانون حرستا[2] کے رہنے والے تھے، ترک وطن کرکے یا یہ سلسلۂ

ملازمت عراق آئے، اور وہیں کے ایک گانون واسط مین سکونت اختیار کرلی، امام محمد یہین ۱۳۲ھ[3] مین پیدا ہوئے۔

تعلیم و تربیت	واسط مین ابھی عمر کے چند ہی سال گذرنے پائے تھے، کہ ان کے والد وہان سے شامی

---

[1] ان کی یہ نسبت ولائی ہے، یعنی ان کے والد حسن بنو شیبان کے غلام تھے، اسی نسبت سے وہ شیبانی مشہور ہین

[2] ابن سعد نے لکھا ہے، کہ یہ جزیرہ کے رہنے والے تھے، ان کے والد فوجی ملازمت کے سلسلہ سے شام آئے اور وہیں سکونت پذیر ہوگیے، خطیب بغدادی کا خیال ہے، کہ وہ دمشقی تھے، اور وہان سے واسط چلے آئے تھے، قاضی ابو حازم کا بیان ہے، کہ وہ قریہ رملہ (فلسطین) کے قریب کے رہنے والے تھے، (کردری ج ۲ ص ۱۴۶) ان بیانات میں زیادہ تضاد نہیں ہے، ہو سکتا ہے، کہ ان کے والد نے شامی لشکر کی ملازمت کے سلسلہ میں ان تمام مقامات پر قیام کیا ہو اس لیے کہ حرستا اور رملہ دونون شام کے ملحقہ علاقے ہیں، اور جزیرہ بنو شیبان کی چراگاہ تھی، اور وہان برابر ان کی آمد و رفت رہا کرتی تھی، اس بنا پر امام محمد کے وطن کی نسبت اس طرف ہو جانا کوئی تعجب خیز نہیں ہے، لیکن یہ غلط ضرور ہے، ہم نے اس سلسلہ مین سمعانی اور امام نووی کے بیانات کو ترجیح دی ہے،

[3] بعض روایتون مین ان کا سنہ ولادت ۱۳۵ھ اور بعض میں ۱۳۱ھ درج ہے، لیکن صحیح ۱۳۲ھ ہے، تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۷۲، ذیل جواہر مضیۂ،

لشکر کے ساتھ کوفہ چلے آئے، اور پھر وہیں مستقل بود و باش اختیار کر لی، کوفہ اس وقت علم و فن کا مرکز، اور علمائ و مشائخ کا گہوارہ تھا، علمی اعتبار سے اسے تمام ممالک اسلامیہ میں "ام البلاد" کی حیثیت حاصل تھی، اسی مادر علمی کی آغوش میں، امام محمد کی تعلیم و تربیت کا آغاز ہوا، اور اسی ماحول میں انھون نے نشو و نما پائی، سب سے پہلے قرآن کی تعلیم ہوئی، اس کے بعد ادب و لغت کی ابتدا کی گئی[1]، ادب و لغت کی ابتدائی تعلیم کے بعد کوفہ کے بڑے بڑے شیوخ کے درس میں شریک ہونے لگے، فطری استعداد و صلاحیت اور کوفہ کے علمی ماحول نے کم سنی ہی میں انھیں ایک جوہر قابل بنا دیا۔

امام ابو حنیفہ کی خدمت مین آمد

ابھی تیرہ چودہ سال کا سن تھا، کہ ایک روز ایک مسئلہ دریافت کرنے کی غرض سے امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوے، وہ مسئلہ یہ تھا کہ اگر کوئی نابالغ عشا کی نماز پڑھکر سو جائے، اور اسی رات میں وہ بالغ ہو تو عشا کی نماز دہرائے گا یا نہیں، امام صاحب نے اثبات میں جواب دیا، یہ سوال چونکہ انھون نے اپنے متعلق کیا تھا، اس لیے وہان سے فوراً اٹھے، وضو کیا اور مسجد کے ایک گوشہ میں جاکر عشاء کی نماز دہرائی، امام صاحب نے یہ دیکھکر حاضرین سے فرمایا کہ ان شاء اللہ یہ لڑکا رشید ہوگا[2]۔

امام صاحب سے شرف تلمذ

گو یہ ایک معمولی واقعہ تھا، لیکن یہی واقعہ تحصیل فقہ اور امام صاحب سے ان کی عقیدت اور تلمذ کا سبب بن گیا، چنانچہ کچھ دنون کے بعد وہ پھر امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حلقۂ تلمذ مین داخل ہونے کی خواہش ظاہر کی[3]،

امام صاحب کا دستور تھا کہ وہ قرآن کو مستحضر کیے بغیر، کسی کو اپنے حلقۂ درس میں بہت کم لیتے تھے حسب دستور ان سے بھی فرمایا، کہ قرآن کو حفظ کر لو، پھر میرے پاس آؤ، ایک ہفتہ کے بعد وہ اپنے والد کے ساتھ دوبارہ امام صاحب کے پاس آئے، اور عرض کیا کہ میں نے قرآن حفظ کر لیا[4]،

---

[1] بلوغ الامانی ص ۵ [2] مناقب کردری جز ۲ ص ۱۵۵ [3] ایضاً [4] مناقب کردری جز ثانی ص ۱۵۵،

اس کے بعد انھون نے کوئی مسئلہ دریافت کیا، امام صاحب نے ان سے پوچھا کہ یہ مسئلہ تم کسی سے سنکر دریافت کررہے ہو، یا تمھارا طبع زاد ہے، امام محمد نے کہا کہ یہ سوال خود میرے ذہن میں آیا ہے، امام صاحب نے ان سے فرمایا کہ تم تو بڑے لوگون جیسا سوال کرتے ہو، تم برابر میرے حلقۂ درس میں آتے جاتے رہو[1]، اس کے بعد امام محمد مستقل طور پر امام صاحب کے سلسلہ تلامذہ مین داخل ہو گیے، اور ہمیشہ سفر و حضر میں ان کے ساتھ ساتھ رہے، اور ان کی حیات تک کسی دوسرے حلقۂ درس میں نہیں گئے[2]،

امام ابویوسف کی شاگردی

امام محمد کو امام صاحب سے صرف چار برس استفادہ کا موقع ملا، لیکن یہ مدت فقہ جیسے دقیق اور وسیع فن کے لیے کافی نہیں تھی، اس لیے انھون نے امام صاحب کی وفات کے بعد امام ابویوسف کی طرف رجوع کیا جو امام صاحب کے محبوب اور سب سے زیادہ ذی علم تلامذہ میں تھے، اور ان کے حلقۂ درس میں جاکر فقہ کی تکمیل کی، اور بجز چند آخری سالون کے ان سے[3] وہ بہت کم جدا ہوئے امام ابویوسف علم اور عمر دونون میں امام محمد سے بڑے تھے، لیکن اس کے باوجود وہ امام محمد کا کافی لحاظ کرتے تھے، طحاوی نے اسماعیل بن حماد سے روایت کی ہے کہ امام محمد کا دستور تھا کہ وہ بالکل سویرے دوسرے شیوخ حدیث کی مجالس درس میں چلے جایا کرتے تھے، اور ہم لوگ علی الصباح امام ابویوسف کی مجلس فقہ میں پہنچ جاتے تھے، امام محمد جب وہان سے امام ابویوسف کے درس میں واپس آتے تو اس وقت تک بہت سے مسائل گذر چکتے تھے، لیکن جب وہ آجاتے تو امام ابویوسف ان تمام مسائل کو پھر ان کے لئے دہراتے،[4]

امام محمد بھی ان کے مرتبہ شناس تھے، چنانچہ جب امام ابویوسف بغداد کے قاضی تھے امام محمد نے

---

[1] مناقب کردری جز ثانی ص ۱۵۵ [2] جواہر مضیہ ج ۲ ص ۴۴ [3] مناقب امام محمد ذہبی ص ۵، آخری سالون مین عہدۂ قضا کے معاملہ مین جس کا تذکرہ آگے آئیگا ان سے اور امام ابویوسف سے کچھ شکر رنجی ہو گئی تھی، جس کی وجہ سے دونون کی ایکدوسرے کے یہان آمد و رفت بند ہو گئی تھی [4] بلوغ الامانی ص ۳۵

کوفہ سے انھیں لکھا کہ میں آپ کی ملاقات کے لیے بغداد آنا چاہتا ہون، لیکن امام ابویوسف نے لکھا کہ اہل کوفہ کو آپ سے فائدہ پہنچ رہا ہے، یہان آنے میں ان کا نقصان ہوگا، ان کو فائدہ پہنچائیے،[1] امام محمد فرماتے تھے کہ علم کی توقیر کرنی ہمیں امام ابویوسف نے اس طرح سکھائی، کہ جب میں پہلی بار امام صاحب کی خدمت میں گیا، تو مجلس میں پہنچکر مین نے پوچھا کہ امام ابوحنیفہ کون صاحب ہیں، امام ابویوسف نے اشارہ سے مجھ سے کہا کہ بیٹھ جاؤ جب بیٹھ گیا تو انھون نے اشارہ سے بتایا کہ فلان صاحب ہیں۔[1] سوال کا یہ طریقہ پسندیدہ نہین تھا، اس لیے انھون نے ٹوکا۔

تحصیل حدیث، فقہ و قرآن کے علاوہ، حدیث کا ذوق بھی امام محمد کو شیخین[2] ہی کی صحبت میں پیدا ہو چکا تھا، لیکن اس حلقۂ درس کی اصلی خصوصیت فقہ و قرآن تھی، اس لیے ان کو کسی ایسے استاد کی ضرورت تھی جو خالص حدیث کا ذوق رکھتا ہو، اس کے لیے انھون نے دیار نبوی کا رخ کیا، اور امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوے،

امام مالک سے سماع حدیث کوفہ و بصرہ میں بڑے بڑے شیوخ حدیث موجود تھے، مکہ میں سفیان بن عیینہ اور خراسان میں عبداللہ بن مبارک مرجع اخلائق تھے۔ ۔ ۔ خود مدینہ منورہ میں ابراہیم ابن محمد او عبیداللہ بن محمد وغیرہ کے حلقۂ درس قائم تھے، لیکن امام مالک کے درس حدیث کی چند ایسی خصوصیتین تھیں، جن کی وجہ سے حدیث میں وہ ساری دنیاے اسلام کے مرکز توجہ بن گیے تھے، یہی چیز امام محمد کو کشان کشان کوفہ سے کئی سو میل دور مدینہ لے گئی، یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انھیں جس طرح فقہ کی تعلیم کے لیے امام صاحب جیسا استاد ملا، اسی طرح حدیث کی تحصیل کے لیے اس وقت کے سب سے بڑے شیخ کی صحبت نصیب ہوئی،

مدینہ میں قیام کی مدت امام محمد تین برس تک دیار نبوی میں رہے، اور بالالتزام امام مالک سے

---

[1] مناقب کردری ج ۲ ص ۱۵۴، [2] حنفی فقہار کی اصطلاح میں امام صاحب او امام ابویوسف کو شیخین کہا جاتا ہے

سماع حدیث کرتے رہے، انھون نے کم وبیش ۷۰۰ حدیثین ان سے سنین، خود فرماتے ہیں۔

اقمت علی باب مالك ثلاث	مین امام مالک کے دروازہ پر تین برس یا اس سے
سنین او اکثر و سمعت منه	زیادہ قیام پذیر رہا، اور اس مدت مین سات
سبعمائة حديث (الكردری ج ۲ ص ۱۶۰)	سو حدیثین ان سے سنین۔

۱؎ یہ بات قابل غور ہے، کہ امام محمد مسلسل تین برس تک امام مالک کی خدمت میں رہے، لیکن ان سے صرف ۷۰۰ حدیثین سماع کین، آخر اس قلت سماع کی کیا وجہ ہے۔

قلت سماع کی وجہ | بعض روایتون سے پتہ چلتا ہے کہ اس قلت سماع کی وجہ یہ تھی، امام مالک امام محمد کے کثرت سوال اور مسائل میں زیادہ کرید کرنے کی وجہ سے جو علمائے عراق کا خاصہ تھا۔ ۔ ۔ ۔ کچھ کبیدہ خاطر ہوگیے تھے جس کی وجہ سے وہ ان کو موطا کا سماع نہیں کراتے تھے، وہ مسجد کے ایک گوشہ میں بیٹھے رہتے تھے، لوگ مسجد میں امام مالک سے مسائل دریافت کرنے آیا کرتے تھے، وہ حدیث و آثار کی روشنی میں جو کچھ جواب دیتے تھے، امام محمد اسے حفظ کرتے جاتے تھے، اس طرح تین برس مین انھون نے سات سو حدیثیں سنین، اس روایت کے نقل کرنے کے بعد ابن البزار کردری لکھتے ہیں، وانما کان یفعل ذالک لما کان بینه و بین الامام امام محمد ایسا اس لیے کرتے تھے کہ ان کے اور امام مالک کے درمیان کچھ شکر رنجی تھی (ج ۲ ص ۱۶۰) کردری نے یہ روایت حافظ ابو العلار کے واسطہ سے نقل کی ہے، روایت کا پورا سلسلۂ سند معلوم نہیں ہوسکا، کہ راویون کی جرح یا تعدیل کی جا سکے، بہر حال سند کے اعتبار سے روایت کا جو پایہ بھی ہو لیکن اپنے متن اور مفہوم کے اعتبار سے صحیح معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ امام محمد جیسا شخص جو برسون امام صاحب اور امام ابو یوسف کی مجلس فقہ و حدیث کا خوشہ چین رہ چکا ہو، اور جو ذکاوت اور قوت حافظ کی بھی غیر معمولی دولت سے بہرہ ور ہو، اتنی لمبی مدت مین اس کا صرف سات سو حدیثون کا سماع کرنا تعجب خیز معلوم ہوتا ہے جب کہ ان سے کم درجے کے لوگ اس سے کم مدت میں کئی گنا زیادہ حدیثین سماع اور حفظ کر لیا کرتے تھے، اور پھر امام محمد گھر بار چھوڑ کر امام

امام مالک کے علاوہ مدینہ منورہ کے دوسرے شیوخِ حدیث سے بھی انھوں نے استفادہ کیا، اس کی تفصیل آگے آئیگی۔

شیوخ حدیث کی تعداد، امام صاحب کی صحبت اور امام ابویوسف اور امام مالک سے استفادہ کے بعد، کسی دوسرے استاد کی ضرورت نہین تھی، لیکن پھر بھی ہر شیخ اور ہر استاد کے درس کی کچھ نہ کچھ علیحدہ خصوصیت ہوتی ہے، جس مین وہ اپنے ہمعصرون سے ممتاز ہوتا ہے، نیز اسوقت کا یہ عام دستور بھی تھا کہ طلبہ جس قدر زیادہ سے زیادہ اساتذہ اور شیوخ کی خدمت مین پہنچ سکتے تھے، پہنچکر ان سے استفادہ اور روایت کرتے تھے، اس سے یہ فائدہ ہوتا تھا کہ جو علمی جواہر پارے سیکڑون گوشون مین منتشر ہوتے تھے، اس طرح ایک جگہ سمٹ جایا کرتے تھے، چنانچہ امام محمد بھی اس غرض سے اس وقت کے تمام قابل الذکر شیوخ کی خدمت مین حاضر ہوئے اور ان سے استفادہ کیا۔

امام محمد نے اپنی کتابون مین جن لوگون سے روایتین کی ہین، ان کی تعداد ۱۰۰ [1] سے متجاوز ہے، لیکن ان سب کا شمار ان کے اساتذہ مین نہین ہے، بلکہ اس مین کافی تعداد ان کے اقران و اصاغر کی بھی ہو جن سے انھون نے روایتین تو کی ہیں، لیکن ان کے سامنے زانوے تلمذ تہ نہیں کیا ہے،

علامہ زاہد الکوثری [2] نے امام محمد کے شیوخ حدیث کی تعداد ستر بتائی ہے، لیکن انھون نے ماخذ کا حوالہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۹) امام مالک کی خدمت میں اسی غرض سے گیے تھے، اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس سے امام محمد کے عزم و استقلال اور تحصیل حدیث کے غیر معمولی شوق کا پتہ چلتا ہے، یہان یہ بات بھی قابل ذکر ہے، کہ امام محمد نے موطا میں امام مالک کی سند سے جو مرفوع یا غیر مرفوع روایتین نقل کی ہیں، ان کی تعداد ۱۰۰۵ ہے۔ [1] صرف کتاب الحجج میں جن لوگون سے روایتین کی ہیں، ان کی تعداد ۱۰۰ ہے، اور کتاب الآثار مین جن شیوخ سے روایتیں کی ہین، ان کی تعداد ۱۵ ہے، لیکن بعض نام دونوں میں مشترک ہیں، [2] انھون نے عربی میں امام محمد کی سوانح حیات "بلوغ الامانی" بڑی تحقیق و تدقیق سے لکھی ہے، یہ کتاب مصر سے چھپکر بازار میں آگئی ہے، پہلے میرا ارادہ تھا کہ اسی کتاب کا ترجمہ کر دون، مگر اس مین بعض باتین

نہین دیا ہے، مگر ان کی وسعت نظر پر اعتماد کرتے ہوے ہم ان کی دی ہوئی فہرست کو یہان نقل کرتے ہین، ان مین سے جن نامون کے ماٰخذ معلوم ہو سکے ہین، ان کے حوالے دیدیئے گیے ہیں، مقامات کے لحاظ سے شیوخ کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

کوفہ | امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف، اسمٰعیل بن ابی خالد الاحمسی، سفیان بن سعید الثوری، مسعر بن کدام، مالک بن مغول، قیس بن ربیع، عمر بن ذر، بکیر بن عامر، ابوبکر النہشلی، عبداللہ بن قطاف، محل بن محرز الضبی، ابوکدینہ یحیٰی بن المہلب، عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن عتبہ، اسرائیل بن یونس، بدر بن عثمان، ابوالاحوص، سلام بن سلیم، سلام بن سلیمان، ابومعاویہ انصریہ، محمد بن حازم، امام زفر، اسمٰعیل بن ابراہیم البجلی فضیل بن غزوان، حسن بن عمارہ، یونس بن ابواسحٰق السبیعی، عبدالجبار بن العباس، محمد بن ابان الصالح القرشی، سعید بن علبید الطائی، ابوفروہ عروہ بن الحارث، ابوزہیر العلاء بن زہیر،

مدینہ | امام مالک، ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ، عبیداللہ بن عمر، عبداللہ بن عمر بن حفص، خارجہ بن عبداللہ ابن سلیمان، محمد بن صلال، ضحاک بن عثمان، اسمٰعیل بن رافع، عطاف بن خالد، اسحاق بن حازم، ہشام ابن سعید، اسامہ بن زید اللیثی، داؤد بن قیس الفراء، عیسیٰ بن ابی عیسیٰ الخیاط، عبدالرحمٰن بن ابی الزناد،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۰) اپنے ذوق اور اعتدال کے خلاف معلوم ہوئیں، اس لئے اس ارادہ سے باز رہا، اور اب ماٰخذ سے ان کے حالات لکھ رہا ہون، جہان اصل ماٰخذ کی طرف رجوع نہیں کیا جاسکا ہے، مصنف کی وسعت نظر پر اعتماد کرتے ہوے اس کتاب کا حوالہ دیدیا گیا ہے، لہ اس سلسلہ مین کتاب الحج کا ذکر بھی آئے گا، لیکن یہ کتاب دارالمصنفین کے کتب خانہ مین نہین ہے، قبلہ سید صاحب کے ساتھ ۱۹۴۵ء میں سورت جانے کا اتفاق ہوا تھا، وہان مفتی مہدی حسن صاحب کے کتب خانہ میں یہ کتاب مل گئی تھی جس سے مین نے بہت سرسری طور پر ان کے شیوخ کی فہرست تیار کرلی تھی، اس فہرست پر اعتماد کرتے ہوے یہان کتاب الحج کا حوالہ دیا گیا ہے، لیکن اس میں غلطی کا امکان ہے، اس لیے جو صاحب غلطی دیکھین براہ کرم مجھے اس سے آگاہ کردین،

محمد بن عبد الرحمان بن ابی ذئب ہشیم بن بشیر ،

مکہ	سفیان بن عیینہ، زمعہ بن صالح، اسمٰعیل بن عبد الملک، طلحہ بن عمرو، سیف بن سلیمان، ابراہیم ابن یزید الاموی، زکریا بن اسحاق، عبداللہ بن عبد الرحمن بن یعلی الثقفی ،
بصرہ	ابوالعوام عبد العزیز بن الربیع البصری، ہشام بن ابی عبد اللہ الربیع بن الضبی، ابو حرہ واصل ابن عبد الرحمن، سعید بن ابی عروبہ، اسمٰعیل بن ابراہیم البصری، مبارک بن فضالہ،
واسط	عباد بن العوام، شعبہ بن الحجاج، ابو مالک عبد الملک
شام	ابو عمرو عبد الرحمن الاوزاعی، محمد بن راشد المکحولی، اسمٰعیل بن عیاش الحمصی، ثور بن یزید الدمشقی،
خراسان	عبد اللہ بن مبارک،
یمامہ،	ایوب بن عتبہ الشیمی،

یہان صرف ان ستر شیوخ کا تذکرہ کیا گیا ہے، جو ان کے اکابرین شمار کیے جاتے ہیں، ورنہ اقران واصاغر کی تعداد اس سے بہت زیادہ ہے۔

مغازی کی تعلیم سیر و مغازی حدیث ہی کا ایک شعبہ ہے، لیکن اس وقت تک یہ ایک علحدہ فن ہو چکا تھا، اور خاص خاص شیوخ اس کی تعلیم دیتے تھے، اور اہل علم خصوصیت سے اس فن کی سند حاصل کرتے تھے، امام محمد نے فن مغازی میں محمد بن عمر الواقدی سے جو اس فن کے مشہور شیخ تھے، استفادہ کیا تھا۔ واقدی امام محمد کے تلامذہ میں ہین، اور انھون نے امام محمد سے جامع صغیر خاص طور سے پڑھی تھی، فن مغازی اور سیر مین واقدی کو اس وقت خاص خصوصیت حاصل تھی، اس لیے امام محمد نے ان سے اس فن مین فائدہ اٹھایا۔[1]

نحو بیت مین کسائی سے تبادلہ خیالات اور استفادہ، یہ تو نہین معلوم ہو سکا کہ ادب و لغت کی ابتدائی تعلیم

[1] مناقب کردری ج ۲ ص ۱۵۱،

کس سے حاصل کی، اور تکمیل کہاں کی، لیکن کردی کی ایک روایت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مسند درس پر متمکن ہونے کے بعد تک بھی ادب اور لغت مین ائمۂ فن سے تبادلۂ خیالات اور استفادہ کرتے رہے، بشر بن یحییٰ کا بیان ہو کہ کسائی نحو اور لغت کے مشہور امام، اکثر امام محمد کے پاس آیا کرتے تھے، ایک روز انھون نے امام محمد سے کہا کہ آپ لوگ یعنی فقہا اکثر اپنے کلام کے ثبوت میں یہ جملہ کہا کرتے ہیں کہ "اسی طرح لوگ بولتے ہیں اور یہی محاورہ ہے" تو آپ لوگون کو یہ دعوی نہین کرنا چاہیے، عرب کے محاورون کو تو اس فن کے حذاق ہی جانتے ہیں، امام محمد نے ان کی بات تسلیم نہین کی اور کہا کہ ہم لوگ اس چیز کو بہتر طور سے جانتے ہیں، لیکن جب کسائی کی آمد و رفت ان کے پاس برابر ہوتی رہی، اور امام محمد ان کے مبلغ علم سے واقف ہوئے تو ایک روز فرمایا کہ بے شک تم لوگ (لغویین اور نحویین) زبان اور محاورون سے زیادہ واقف ہو اس کے بعد امام محمد نے ان سے عربیت میں انتفاع حاصل کیا، روایت کے الفاظ یہ ہیں،

فانتفع محمد فی العربیۃ | پھر امام محمد نے ان سے عربیت میں استفادہ کیا،

امام سرخسی نے لکھا ہے کہ کسائی، امام محمد کے خالہ زاد بھائی تھے، سیر کا جو خاص باب "کتاب الاعیان" ہے جن میں فقہائے حنفیہ نے کمال دقیقہ سنجی سے کام لیا ہے۔ اس کے لغوی اور نحوی مسائل میں امام محمد نے کسائی سے خاص طور سے مدد لی ہے۔[1]

طالب علمی میں فراغت قلب | اکثر و بیشتر اہل علم اور ائمۂ فن کے سوانح حیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انکا زمانۂ طالب علمی بڑی عسرت اور تنگی میں گذرا ہے، لیکن امام محمد کے ساتھ خدا تعالیٰ کا یہ بڑا فضل شامل حال رہا کہ ان کی طالب علمی کا پورا زمانہ نہایت خوشحالی اور فارغ البالی میں گذرا اور انھیں کبھی کوئی مالی دقت پیش نہیں آئی، جب تک ان کے والد زندہ رہے ان کی کفالت کرتے رہے، جب ان کا انتقال ہوا تو انھون نے ترکہ میں ایک بڑی رقم چھوڑی، جس کو امام محمد نے اپنی تعلیم پر صرف کیا، خود فرماتے ہیں،

---

[1] شرح السیر الکبیر ج ۱ ص ۱۲۸

مجھے اپنے والد سے تیس ہزار درہم وراثت میں ملے تھے، ۱۵ ہزار میں نے شعر و ادب لغت اور نحو کی تحصیل پر اور ۱۵ ہزار فقہ و حدیث کے حصول پر صرف کیا۔[۱]

علم و فن کا ذوق اور مطالعہ میں انہماک | علم و فن کا ذوق امام محمد میں فطری تھا، وہ آغاز شعور ہی سے مسائل میں ایسی باریکیاں پیدا کرتے تھے کہ بڑوں کی نگاہیں بھی وہاں تک کم پہنچتی تھیں، ان کے اسی فطری ذوق اور استعداد کو دیکھ کر امام صاحب نے فرمایا تھا کہ ان شاء اللہ یہ لڑکا رشید ہوگا، ایک روز ان کے ایک سوال پر فرمایا کہ تم تو بڑوں جیسا سوال کرتے ہو، میرے پاس آمد و رفت رکھو،[۲]

محمد بن سماعہ جو ان کے خاص تلامذہ میں ہیں، فرماتے تھے کہ امام محمد کو مطالعہ میں اس قدر انہماک ہوتا تھا کہ اگر کوئی شخص ان کو اسلام کرتا تو انہماک بے خبری میں (جواب دینے کے بجائے) اس کے لیے دعا کرنے لگتے، پھر جب وہ شخص کچھ اور الفاظ زیادہ کرکے دوبارہ سلام کرتا تو وہی الفاظ دہرا دیتے تھے،[۳]

ان کے نواسے فرماتے ہیں، کہ (امام محمد کی وفات کے بعد) میں نے اپنی والدہ سے دریافت کیا کہ نانا گھر میں رہتے تھے تو کیا کرتے تھے، انھوں نے اشارہ کرکے بتایا کہ فلاں کوٹھری میں رہا کرتے تھے، اور گرد و پیش کتابوں کا انبار لگا رہتا تھا، میں نے مطالعہ کے وقت ان کو کبھی بولتے ہوئے نہیں سنا بجز اس کے کہ وہ ابرو اور ہاتھ کے اشارہ سے اپنی ضرورت بتلا دیا کرتے تھے۔[۴]

علمی شغف کا یہ حال تھا کہ کپڑے میلے ہو جاتے تھے، لیکن جب تک کوئی دوسرا شخص کپڑا نہ بدلوا دیتا، وہ کپڑے نہیں اتارتے تھے،

گھر میں ایک مرغ پلا ہوا تھا جو رات میں اکثر بانگیں دیا کرتا تھا، انھوں نے اہل خانہ سے کہا کہ اسے ذبح کر دو، اس کی بانگ بے ہنگام کی وجہ سے (علمی) کام میں خلل پڑتا ہے۔[۵]

اپنے گھر میں کہہ رکھا تھا، کہ مطالعہ کے وقت مجھ سے دنیا کی کسی ضرورت کا ذکر نہ کیا جائے، کہ میرا

---

[۱] تاریخ خطیب ج ۲ ص ۱۷۲ [۲] بلوغ الامانی [۳] کردری ج ۲ ص ۱۶۴ [۴] مناقب کردری ج ۲ ص ۱۶۲

قلب اس کی طرف متوجہ ہو، جو کچھ کہنا ہو میرے وکیل (منتظم خانہ) سے کہو۔[1]

ذکاوت وذہانت | نہایت ذکی، ذہین اور طباع تھے، ان کے تمام اساتذہ ان کی ذہانت اور ذکاوت کے قائل تھے، امام مالک ان کے بارے میں فرماتے تھے کہ مشرق سے اس نوجوان (امام محمد) جیسا کوئی ذکی اور طباع آدمی میرے پاس نہیں آیا، حالانکہ اس وقت ان کے درس میں اہل مشرق ہی سے عبداللہ بن مبارک، وکیع بن جراح، عبدالرحمٰن بن مہدی جیسے ائمہ حدیث موجود تھے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں نے امام محمد جیسا فربہ اندام ذکی نہیں دیکھا، دوسری روایت میں ہے کہ میں نے ان کے جیسا عاقل اور فہیم نہیں دیکھا[2]، امام ذہبی نے لکھا ہے کہ وکان من اذکیاء العالم دنیا کے ذکی اور فہیم انسانوں میں تھے۔

قوت حافظہ | فہم وذکا کے ساتھ ساتھ قوت حافظہ کا عطیہ بھی قدرت کی طرف سے انھیں وافر ملا تھا اوپر ذکر آچکا ہے، کہ امام صاحب نے ان سے قرآن حفظ کرنے کے لیے فرمایا تو ایک ہفتہ کے اندر انھوں نے پورا قرآن حفظ کرلیا،

ایک مرتبہ امام ابو یوسف کے درس میں شریک تھے، امام نے کسی گذشتہ مسئلہ کے متعلق ان سے دریافت کیا، انھوں نے جواب دیا تو امام نے فرمایا کہ یہ جواب صحیح نہیں ہے، امام محمد نے اپنے جواب پر اصرار کیا، تھوڑی سی رد وقدح کے بعد کتاب کی طرف رجوع کیا گیا، امام محمد کا جواب صحیح نکلا، پھر امام ابو یوسف نے فرمایا کہ

هكذا يكون الحفظ (بلوغ الاماني) حافظہ ایسا ہی ہوتا ہے۔

مجلس درس | اسی ذکاوت وذہانت اور علمی ذوق وانہماک کا نتیجہ تھا، کہ بیس ہی برس کی عمر میں مسند درس کی زینت بنادئے گیے، اور کوفہ، بصرہ، شام، ہرات، رے، نیشاپور، حلب، بخارا، اور اقصائے مغرب

---

[1] مناقب کردری ج ۲ ص ۱۹۲، [2] بلوغ الامانی ص ۵۵ [3] تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۷۲، جواہر مضیہ جلد ۲ ص ۴۲،

غرض دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ سے تشنگان علم آکر اس سرچشمۂ علم سے سیراب ہونے لگے،

تلامذہ | امام محمد کی عمر کا بیشتر حصہ درس وتدریس اور افادہ وتعلیم کے مشغلہ مین گذرا، سیکڑون اشخاص نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہوگا، ان سب کے نامون کا استقصا نہایت دشوار ہے، جن تلامذہ کے نامون کا پتہ چل گیا ہے، ان کی فہرست بھی کافی لمبی ہے، اس لیے یہان ان مشاہیر تلامذہ کا ذکر کیا جاتا ہے جنھین کوئی امتیازی حیثیت حاصل تھی،

ابوحفص الکبیر البخاری یہ امام بخاری کے شیوخ میں ہین ابوسلیمان موسی بن سلیمان الجوزجانی انھی کی روایت سے ظاہر الروایۃ کی چھ کتابین مشرق ومغرب میں پہنچین، امام شافعی، ابوعبید قاسم بن سلام ہروی اپنے وقت کے مجتہد تھے، عمرو بن ابی عمرو الحرانی، محمد بن سماعہ الیتمی، علی بن معبد بن شداد جامع کبیر اور جامع صغیر کے ایک راوی یہ بھی ہیں، اسد بن فرات امام مالک کے خاص شاگرد اور ان کے مسلک کے مدون بھی ہیں اور مدونہ کے مرتب شیخ سحنون کے استاد بھی، محمد بن مقاتل الرازی ابن جریر طبری کے استاد ہیں، یحییٰ بن معین امام جرح تعدیل ابوجعفر احمد بن محمد بن مہران النسوری موطائے امام محمد کے راوی ہیں، شعیب بن سلیمان الکیسانی کیسانیات کے راوی، علی بن صالح الجرجانی جرجانیات کے راوی، اسمٰعیل بن توبۃ القزوینی السیر الکبیر کے خاص راوی، ابوبکر بن ابراہیم نوادر کے راوی، ابوزکریا یحی بن صالح ابوحاتم امام بخاری کے شامی شیوخ مین ہیں، ابوموسیٰ عیسیٰ بن ابان البصری کتاب الحج کے راوی اور کتاب الحج الکبیر اور کتاب الحج الصغیر کے مصنف ہیں، ایک کتاب انھون نے امام شافعی اور مریسی کے رد میں بھی لکھی تھی، سفیان بن سحبان البصری کتاب العلل کے مصنف ہیں۔

درس کا طریقہ | اس وقت درس وتدریس کے مختلف طریقے رائج تھے، بعض شیوخ اپنے حافظہ پر اعتماد کرکے طلبہ کو زبانی املا کراتے تھے، بعض لوگ، اپنی لکھی ہوئی تحریر تلامذہ مین سے کسی ایک کو دیدیتے

وہ اس کی قرات کرتا جاتا، اور عام طلبہ اسے لکھتے یا حفظ کرتے جاتے تھے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے درس کا یہی طریقہ تھا، بعض حضرات کا یہ طریقہ تھا کہ انھیں جو کچھ املا کرانا ہوتا تھا وہ پہلے لکھ لیتے تھے اور پھر خود ہی طلبہ کے سامنے اس کی قرات کرتے، اور طلبہ اسے نوٹ کرتے جاتے تھے، امام محمد کا بھی غالبًا عام دستور یہی تھا کہ وہ خود قرات کرتے تھے،

یحیی بن صالح وحاظی[1] فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حج میں محمد بن حسن کا رفیق سفر تھا، ایک روز میں نے ان سے کہا کہ اپنی کسی کتاب کی تحدیث کیجیے، انھوں نے کہا کہ اس وقت طبیعت موزون نہیں ہے، میں نے کہا کہ میں قرات کرتا ہوں، انھوں نے کہا کہ کیا تم اپنی قرات کو میرے لیے آسان سمجھتے ہو، میں نے کہا ضرور، اس پر انھوں نے فرمایا کہ نہیں میری قرات زیادہ آسان ہوگی، اس لیے کہ میں قرات کروں گا تو محض زبان اور آنکھ استعمال کروں گا، لیکن جب تم قرات کروگے تو مجھے آنکھ، کان، اور ذہن تمام اعضا استعمال کرنے پڑیں گے، اس لیے تمھاری قرات میرے لیے زیادہ مشکل ہوگی،[2]

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ درس میں وہ قرات کرنا پسند کرتے تھے، اسد بن فرات کا بیان بھی ہے کہ وہ قرات خود کرتے تھے،[3]

درس میں طلبہ کے سامنے جو تقریر کرتے تھے، وہ نہایت ہی صحیح اور حشو و زوائد سے پاک ہوتی تھی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ دیکھکر فرماتے تھے کہ امام محمد جب کسی مسئلہ کو لیتے اور اس پر تقریر کرتے تھے، تو کلام میں ایک حرف کی بھی تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا، ان پر قرآن کا نزول ہو رہا ہے،

موطاے امام مالک کا درس | اہل عراق میں امام محمد غالبًا پہلے شخص تھے جنھوں نے مدینہ میں تین برس تک

---

[1] امام محمد کے شاگرد اور امام بخاری کے شیخ ہیں [2] بلوغ الامانی ص ۵۴ [3] معالم الایمان ج ۱ ص ۵ [4] تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۷۲، ۱۷۵، مناقب کردری،

رہ کر، امام مالک اور دوسرے شیوخ مدینہ سے استفادہ کیا، اور ان کی مرویات کا ایک بڑا سرمایہ اپنے ساتھ عراق لائے۔ متعدد وجوہ کی بنا پر امام مالک کی مرویات کو، اس وقت ایک خاص خصوصیت حاصل تھی، اس لیے امام محمد نے ان کی روایتوں کے درس کے لیے ایک خاص دن معین کر دیا تھا، تاکہ وہ لوگ جو امام دار الہجرت کی خدمت میں نہیں پہنچ سکتے تھے، وہ ان کی مرویات سے مستفیض ہو سکیں، چنانچہ جس روز وہ امام مالک کی روایتوں کی تحدیث کرتے تھے، اس قدر ہجوم ہوتا تھا کہ مجلس میں جگہ ناکافی ہو جاتی تھی، چنانچہ ایک مرتبہ امام محمد نے حاضرین سے فرمایا کہ تم لوگ اپنے اصحاب کے بارے میں کتنے برے ہو، کہ جب میں امام مالک سے روایت کرتا ہوں، تو ٹوٹ پڑتے ہو، اور جب تمھارے اصحابِ حدیث (اہل عراق) سے روایت کرتا ہوں، تو بادل ناخواستہ شریک ہوتے ہو[1]

امام مالک کی وفات کے بعد جب ان سے براہ راست سماع کی امید منقطع ہو گئی تو یہ مجمع اور زیادہ بڑھنے لگا، اسد بن فرات[2] کے الفاظ میں اس کی کیفیت سنیے فرماتے ہیں کہ: ایک دن ہم لوگ امام محمد کے درس میں شریک تھے، کہ ایک شخص مجلس میں کودتا پھاندتا ہوا تیزی سے امام محمد کے پاس پہنچا، اور اس نے ان سے کچھ آہستہ سے کہا ہم نے سنا کہ امام نے انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا اور فرمایا کہ کتنی بڑی مصیبت ٹوٹ پڑی کہ امام مالک امیر المومنین فی الحدیث کی وفات ہو گئی، اس کے بعد تمام مجمع میں ماتم برپا ہو گیا، اسد کا بیان ہے، کہ اس کے بعد سے امام محمد جس دن امام مدینہ کی مرویات کا درس دیتے تھے، اس قدر ہجوم ہوتا تھا کہ راستہ بند ہو جاتا تھا،[3]

رات کے وقت درس کا سلسلہ | امام محمد دن کے علاوہ، رات کے وقت بھی، درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھتے تھے، لیکن یہ درس عام نہیں ہوتا تھا، بلکہ جو طلبہ دور دراز سے خاص ذوق لے کر ان کی

---

[1] تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۷۳، [2] اسد بن فرات امام مالک اور امام محمد دونوں کے شاگرد ہیں آگے ان کا تذکرہ آئیگا، [3] بلوغ الامانی ص ۱۵، ۱۶،

خدمت میں آتے اور ان کے پاس وقت کم ہوتا تھا تو ان کے لیے وہ رات کے وقت مجلس درس منعقد کرتے تھے، چنانچہ اسد بن فرات قیروانی سے ان کی خدمت میں پہنچے، تو کچھ روز درس میں شرکت کے بعد انھوں نے امام محمد سے عرض کیا کہ میں ایک کم علم اور مسافر آدمی ہوں آپ کے درس میں اس قدر مجمع ہوتا ہے، کہ مجھے پورے طور پر استفادہ کا موقع نہیں ملتا، امام محمد نے فرمایا کہ تم دن کے وقت عام اہل عراق کے ساتھ سماع کیا کرو، اور رات کے وقت میرے یہاں چلے آیا کرو، میں تمھیں وقت دونگا، اسد کا بیان ہے کہ میں روزانہ رات کے وقت ان کے یہاں جایا کرتا تھا، جب میں پہنچتا تو وہ ایک پیالہ پانی اپنے سامنے رکھ لیتے اور قرات و درس کا سلسلہ شروع کر دیتے، جب رات زیادہ گذر جاتی تو مجھے غنودگی طاری ہونے لگتی، وہ کیا کرتے کہ پیالہ سے ایک چلو پانی لے کر، میرے چہرے پر چھڑک دیتے، پھر درس کا سلسلہ شروع کرتے، جب پھر مجھے غنودگی طاری ہوتی تو پھر ایسا ہی کرتے، یہی روزانہ کا معمول ہو گیا تھا،[1]

اسد بن فرات کے علاوہ امام شافعی اور ابو عبید کے لیے بھی انھوں نے رات کو مخصوص طور پر وقت نکالا تھا،[2] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام محمد اپنے تلامذہ کے وقت کو کس قدر عزیز رکھتے تھے، اور ان کے افادہ کے لیے خود کتنی مشقتیں برداشت کرتے تھے،

عورتوں کا درس کبھی کبھی آپ کے پاس عورتیں بھی استفادہ کے لیے آیا کرتی تھیں، ان کے لیے بھی آپنے رات ہی کا وقت رکھا تھا، محمد بن سماعہ کا بیان ہے کہ ایک بار دس رومی لونڈیاں انشاء اور عربیت میں ماہر ہو کر (غالباً فقہ میں) استفادہ کے لیے آپکے یہاں آئی ہوئی تھیں۔[3]

تلامذہ کے ساتھ حسن سلوک تلامذہ کے ساتھ ان کا تلطف اور حسن سلوک صرف درس تدریس اور وقت کی قربانی ہی تک محدود نہیں تھا، بلکہ روپیہ پیسہ کے بارے میں ان کا یہ وصف اور زیادہ

---

[1] معالم الایمان ج ۲ ص ۴، [2] بلوغ الامانی [3] مناقب کردری ج ۲ ص ۱۶۳

نمایاں ہو جاتا تھا، ایک بار اسد بن فرات کا خرچ چک گیا، انھوں نے کسی سے ذکر نہیں کیا، ایک دن امام محمد نے دیکھا کہ وہ پنسرے سے پانی پی رہے ہیں، انھوں نے وجہ دریافت کی اسد نے صرف اتنا کہا میں مسافر آدمی ہوں، امام محمد سمجھ گیے، اور چپکے ہو رہے، اور رات کے وقت خادم کے ذریعہ ان کے پاس اسّی دینار بھجوا دیے[۱]، (سونے کے موجودہ بھاؤ کے اعتبار سے دو ہزار سے زیادہ روپیے ہوتے ہیں)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی کئی بار انھوں نے مالی امداد کی، ایک بار انھوں نے پچاس دینار ان کو دیئے اور کہا اس میں تنگ و عار محسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے، امام شافعی نے فرمایا اگر مجھے تنگ و عار ہوتا تو مجھ پر آپ جو احسانات کرتے ہیں، ان کا بار میں کیوں اٹھاتا[۲]، امام محمد دوسرے کے ساتھ حسن سلوک کے موقع پر اس مصرع کے مصداق ہوتے تھے،

کانک تعطیہ الذی انت سائلہ ،	جب تم کسی کو کچھ دیتے ہو تو اس کے سامنے (اپنی عاجزی و کسر نفسی کیوجہ سے) تم ایسے معلوم ہوتے ہو کہ تم خود اس سے مانگ رہے ہو

عراق کے زمانۂ قیام میں ایک بار امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ قرض کے سلسلہ میں نظر بند کر دیئے گیے تھے، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے قرض خواہ کا قرضہ ادا کر کے انھیں رہا کرایا[۳]،

امام شافعی سے خاص تعلق امام محمد کو امام شافعی سے بڑا تعلق خاطر تھا، وہ جب آ جاتے، تو ضروری سے ضروری کام چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے، ایک بار کسی ضرورت سے دار الخلافہ جانے کے لیے تیار ہو چکے تھے کہ امام شافعی آ گیئے، انھوں نے دار الخلافہ جانے کا قصد ترک کر دیا، اور پورے دن ان کے ساتھ مشغول رہے، ایک مرتبہ امام شافعی نے امام محمد کے پاس ایک منظوم خط لکھا کہ وہ اپنی کتابیں عاریۃً بھیج دیں، امام محمد نے اپنی تمام کتابیں ہدیۃً بھیج دیں[۴]،

---

[۱] معالم الایمان ج ۲ ص ۵ [۲] جواہر مضیۃ ج ۲ ص ۵۲ [۳] مناقب کردری ج ۲ ص ۱۵۰ [۴] ایضاً ص ۱۴۹ ؛

اس دور میں جب کہ طباعت وکتابت کے موجودہ طریقے رائج نہیں ہوے تھے، کسی کو کوئی کتاب ہدیۃً دے دینا، موجودہ زمانہ کی مطبوعہ کتابوں کا ایک کتب خانہ دینے سے زیادہ مشکل کام تھا، انہی تمام احسانات اور تعلقات کی بنا پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ

لیس علی منۃ فی العلم و اسباب الدنیا ما لمحمد (کردری ص ۱۵۰)

علم اور دنیاوی اسباب کے سلسلہ میں مجھپر امام محمد کا جتنا احسان ہے اتنا کسی دوسرے کا نہیں ہے۔

انہی احسانات کی بنا پر ابن عبد البر نے لکھا ہے کہ قیامت تک ہر شافعی پر ضروری ہے کہ وہ امام محمد کا ممنون رہے اور ان کی مغفرت کی دعا کرتا رہے، (شذرات الذہب ج ۲)

طلبہ کے سوالات کا خندہ پیشانی سے جواب دیتے تھے

اکثر اساتذہ طلبہ کے سوالات اور مسائل میں کرید کرنے سے گھبراتے اور چین بجبین ہو جاتے ہیں اور بسا اوقات غصہ و غضب تک نوبت پہنچ جاتی ہے، لیکن امام محمد کی یہ خاص خصوصیت تھی، وہ عمیق سے عمیق سوال اور دقیق سے دقیق مسائل میں رد و قدح کرنے سے چین بجبین نہیں ہوتے تھے، بلکہ نہایت خندہ پیشانی سے تمام باتوں کا جواب دیتے تھے، امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں نے جس سے بھی کوئی مسئلہ دریافت کیا اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا،[۱] لیکن محمد بن حسن اس سے مستثنیٰ تھے، ایک دوسری روایت میں ہے کہ جس سے بھی کوئی دقیق مسئلہ دریافت کیا میں نے دیکھا کہ اس کی پیشانی پر شکن آگئی، لیکن امام محمد کا حال اس سے بالکل جدا تھا،[۲]

علمی مباحثے

امام محمد شروع ہی سے تفحص اور تعمق کے عادی تھے، اور فقہی اور علمی مسائل پر ان کی نظر ہمیشہ مجتہدانہ پڑتی تھی، اس لیے بسا اوقات انہیں اپنے اساتذہ اور ہمعصروں کے ساتھ

---

[۱] تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۷۴، [۲] الانتقاء ص ۱۹۶،

بحث ومباحثہ کی نوبت آجاتی تھی، ایک بار کسی مستفتی نے قاضی ابویوسف سے کوئی مسئلہ دریافت کیا، قاضی صاحب نے اس کا جواب دیا، مستفتی وہاں سے امام محمد کے پاس آیا اور وہی مسئلہ دریافت کیا، امام محمد نے نہایت مدلل طور پر اس مسئلہ کا کوئی دوسرا جواب دیا، مستفتی نے امام محمد سے کہا کہ اس مسئلہ میں امام ابویوسف کی دوسری رائے ہے، اگر آپ دونوں صاحبان ایک جگہ جمع ہوکر اس مسئلہ پر گفتگو کر لیتے تو مسئلہ صاف ہوجاتا، چنانچہ امام محمد اور امام ابویوسف کا کسی مسجد میں اجتماع ہوا اور اس مسئلہ پر گفتگو شروع ہوئی، مستفتی کا بیان ہے کہ تھوڑی دیر تک تو میں نے صاحبین کی گفتگو سمجھی لیکن اس کے بعد گفتگو اس قدر دقیق ہوگئی کہ میں بالکل نہیں سمجھ سکا۔[1]

موطا کے سماع سے پہلے ایک مرتبہ امام محمد کو آغاز شباب میں امام مالک کی خدمت میں جانے کا اتفاق ہوا، انھوں نے امام مالک سے دریافت کیا کہ ایک شخص کو غسل کی ضرورت ہے، اور مسجد کے اندر پانی رکھا ہوا ہے اور اسے مسجد کے سوا کسی دوسری جگہ پانی میسر نہیں ہے، کیا وہ مسجد جاکر پانی لے سکتا ہے، امام مالک نے فرمایا کہ جنبی (ناپاک آدمی) مسجد میں نہیں جاسکتا، امام محمد نے کہا نماز کا وقت بالکل قریب آگیا ہے، اور پانی اس کے سامنے موجود ہے، وہ کیا کرے؟ امام مالک نے پھر وہی جواب دیا، اسی طرح امام مالک مکرر سہ کرر یہی فرماتے رہے کہ جنبی مسجد میں نہیں داخل ہو سکتا، لیکن جب امام محمد کا اصرار بہت بڑھا تو امام مالک نے ان سے فرمایا کہ اس بارے میں آپ ہی بتائیے، امام محمد نے کہا کہ "وہ تیمم کرلے اور مسجد میں جاکر پانی لے آئے اور پھر غسل کرلے" اس کے بعد امام مالک اور ان میں کچھ اور باتیں ہوئیں، جب وہ مجلس سے اٹھکر چلے گیے، تو لوگوں نے امام مالک سے بتایا کہ یہ محمد بن حسن، امام ابوحنیفہ کے شاگرد ہیں۔[2]

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب کبھی فقہ وغیرہ کے مسائل میں مباحثہ کا موقع آتا،

---

[1] کردری ۲ ص ۱۵۷، [2] تاریخ بغداد اور مناقب کردری ۲ ص ۱۵۰،

تو امام کا دستور تھا کہ وہ ایک حکم مقرر کر دیا کرتے تھے، تاکہ وہ فریقین کو مناسب ہدایت اور فیصلہ کر سکے، چنانچہ عموماً ان کی مجلس مباحثہ کے حکم عیسیٰ بن ہارون ہوا کرتے تھے،[1]

امام محمد کے علمی مباحثوں اور مناظروں کے سلسلہ میں بعض غلط روایتیں بھی رواج پا گئی ہیں، آگے ہم ان روایتوں پر ناقدانہ نظر ڈالیں گے،

عہدۂ قضا اسلاف میں بہت سی ایسی ہستیاں ملینگی، جنھوں نے اپنے فضل و کمال کے باوجود حکومت کا کوئی عہدہ قبول نہیں کیا، اور نہ امراء و سلاطین کی صحبت کو پسند کیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ بسا اوقات سلاطین اور ارکان دولت کے دباؤ سے انھیں ایسا کام کرنا پڑتا تھا، جو ان کے ضمیر اور حمیت دینی کے خلاف ہوتا تھا، اور اس طرح ان کی زندگی کے سارے زہد و اتقا پر پانی پھر جاتا تھا، لیکن ان میں بعض ایسی شخصیتیں بھی ملیں گی، جو کسی دینی مصلحت یا کسی اور مجبوری کی بنا پر حکومت سے منسلک ہو گئی تھیں، چنانچہ امام ابو حنیفہ سے منصور نے عہدۂ قضا قبول کرنے کی درخواست کی تو انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا، کہ "میں اس عہدہ کی صلاحیت نہیں رکھتا" امام صاحب کے شاگردوں میں امام ابو یوسف نے کچھ خاص وجوہ کی بنا پر عہدۂ قضا قبول کر لیا تھا، لیکن انہی میں امام محمد اور عبد اللہ بن مبارک اور امام زفر بھی تھے، جو حکومت سے کوئی تعلق قائم کرنا پسند نہیں کرتے تھے، امام محمد اس بارے میں اتنے سخت تھے کہ جب امام ابو یوسف نے عہدہ قضا قبول کیا تو انھوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا،[2] لیکن بعد میں کچھ ایسے واقعات پیش آ گیے، کہ امام محمد بھی عہدۂ قضا قبول کرنے پر مجبور ہو گیے،

امام ابو یوسف نے عہدۂ قضا اس مصلحت سے قبول کر لیا تھا کہ اس کے ذریعہ امام صاحب کے مسلک کی ترویج و اشاعت ہوگی، اسی لیے ان کی خواہش تھی کہ امام محمد بھی اس عہدہ کو قبول کر لیں، تاکہ ان کے نقطۂ نظر کو مزید تقویت ہو، اتفاق سے اسی زمانہ میں رقہ[3] میں قاضی کے تقرر کا مسئلہ

---

[1] بلوغ الامانی ص ۴۸ [2] ایضاً ص ۴۹ [3] یہ مقام گرمیوں کے زمانہ میں عباسیوں کا دار الخلافہ ہوتا تھا،

صد پیش ہوا، اور اس سلسلہ مین امام ابویوسف سے مشورہ کیا گیا، انھون نے امام محمد کے انتخاب کا مشورہ دیا، امام محمد اس وقت کوفہ میں تھے، کوفہ سے بغداد بلائے گیے، چنانچہ وہ بغداد آئے، اور پہلے امام ابویوسف کے پاس گئے، اور ان سے اپنے انتخاب کی وجہ دریافت کی، امام ابویوسف نے اون سے پورا واقعہ بیان کردیا، اور کہا کہ مین نے یہ مشورہ اس لیے دیا ہے کہ کوفہ اور بصرہ میں تو ہمارے مسلک کی بہت کافی اشاعت ہوچکی ہے، اگر آپ شام مین چلے جائین گے، تو وہان بھی اس کی ترویج کا ذریعہ پیدا ہو جائے گا، امام محمد نے اس مصلحت کو اپنے انتخاب کے لیے پسند نہیں کیا، اور کہا کہ اس مین براہ راست مجھ سے گفتگو کرنی چاہیے تھی، اس گفتگو کے بعد امام ابویوسف نے ان سے یحییٰ برمکی کے پاس چلنے کے لیے کہا، دونون صاحب یحیی کے پاس گیے، امام ابویوسف نے یحییٰ سے کہا کہ محمد بن حسن سامنے موجود ہیں، ان سے (عہدۂ قضا کے) معاملات طے کر لیجئے، یحییٰ نے امام محمد پر ایسا دباؤ ڈالا کہ وہ عہدۂ قضا قبول کرنے پر مجبور ہو گیے،[1]

امام محمد نے عہدۂ قضا قبول تو کر لیا، لیکن یہ بات چونکہ ان کی طبیعت اور ضمیر کے خلاف ہوئی تھی، اور اس کا ذریعہ امام ابویوسف ہوئے تھے، اس لیے انھون نے امام ابویوسف سے ناپسندیدگی کا اظہار کیا، اور اس میں اس قدر شدت اختیار کی کہ ان کے یہان آمد و رفت بھی ترک کر دی، اور مشہور ہے کہ وفات کے بعد ان کے جنازہ مین بھی شرکت نہین کی،[2] دوسری روایت ہے کہ ہارون رشید نے خود ان کو اس عہدہ کے لیے منتخب کیا تھا، جب امام محمد کو معلوم ہوا تو وہ امام ابویوسف کے پاس گئے، اور اپنے گذشتہ تعلقات کو یاد دلا کر فرمایا کہ مجھے اس آزمایش ہی مین نہ ڈالیے، امام ابویوسف انکو لے کر یحییٰ کے پاس گیے، اس نے ان کو ہارون رشید کے پاس بھیج دیا، اور اس طرح مجبور ہو کر انھین

---

[1] ترجمہ محمد بن حسن امام ذہبی مطبوعہ مصر ص ۵۵، ۵۶، [2] تاریخ بغداد و ترجمہ محمد بن حسن امام ذہبی، اس سلسلہ مین بعض غلط روایتین بھی مشہور ہو گئی ہیں، آگے ان پر ناقدانہ نظر ڈالی جائیگی،

یہ عہدۂ قبول کر لینا پڑا،[1]

بے لاگ فیصلہ اور عہدۂ قضا سے برطرفی

امام محمد نے یہ عہدہ بادل ناخواستہ قبول کیا تھا، ان کی خواہش کو اس میں ذرہ بھی دخل نہیں تھا، اس لیے وہ جب تک اس عہدہ پر فائز رہے، بڑی دیانت داری سے بلا کسی رو رعایت کے اس کے فرائض انجام دیتے رہے، انھوں نے کبھی اپنے فیصلہ میں خلیفۂ وقت یا ارکان دولت کی پرواہ نہیں کی، چنانچہ ان کے قاضی ہونے کے کچھ ہی روز بعد یحییٰ بن عبداللہ کی امان کا قصہ دربار میں پیش ہوا، ہارون نقض عہد کر کے یحییٰ کو سزا دینا چاہتا تھا، لیکن اس ارادہ کی تکمیل کے لیے قضا کے فیصلہ کی ضرورت تھی، چنانچہ تمام قضاۃ دربار میں بلائے گیے، امام محمد بھی موجود تھے، ہارون نے سب سے پہلے امام محمد سے دریافت کیا، انھوں نے فرمایا کہ یحییٰ بن عبداللہ کو جو امان دیجا چکی ہے، وہ صحیح ہے، اور اس امان کا نقض اور یحییٰ کا قتل کسی طرح جائز نہیں ہے۔ ان کے بعد ہارون، حسن بن زیاد سے مخاطب ہوا، انھوں نے کچھ صاف جواب نہیں دیا، پھر اس نے ابوالبختری وہب بن وہب سے دریافت کیا، انھوں نے ہارون کی مرضی کے مطابق جواب دیا، امام محمد پر عتاب شاہی نازل ہوا، اور وہ عہدۂ قضا سے برطرف کر دیئے گیے،[2] اور انھیں افتا سے بھی روک دیا گیا،[3]

قید و بند

غالباً اسی فتوے کے سلسلہ میں استاد کی سنت کے مطابق انھیں قید و بند کی مشقت بھی اٹھانی پڑی، مناقب کردری میں محمد بن سلام (امام محمد کے خاص شاگرد) کا بیان ہے کہ

طلب محمد للقضاء فحبس ودکل	امام محمد فیصلہ کے لیے بلائے گئے اور پھر
به فرین حتی لا یطلع علیه احد	قید کر دیئے گیے اور ان کو قید تنہائی دی
ولا یدخل علیه احد وضیق	دی گئی گویا علم فقہ کے افادہ کو محبوس
فی السجن الفقه فرشوت	کر دیا گیا میں نے دربان کو کچھ دے دلا کر

---

[1] کردری ج ۲ ص ۱۶۵ [3] ایضاً و بلوغ الامانی ص ۴

السجان، شو نعظيمة وحلت — ان کے پاس ایک تھیلی درہم لیکر پہنچا،

علیہ یکیس من اللہ اھد (ج ۲ ص ۱۴۲)

رہائی اور قاضی القضاۃ کا عہدہ | اتفاق سے اسی زمانہ مین ام جعفر ہارون کی بی بی، کو کوئی جائداد وقف کرنے کا خیال پیدا ہوا، اوس نے امام محمد سے وقف نامہ لکھنے کی درخواست کی، انھون نے یہ کہکر معذرت کردی کہ مجھے فتوی دینے سے روک دیا گیا ہے، ام جعفر نے امام محمد کے معاملہ (غالباً پابندی اٹھا لینے کے بارے مین) ہارون سے گفتگو کی، ہارون نے انھین فتوی کی اجازت دیدی، اور پھر ان کو بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا،[1] اور جس پر غالباً وہ آخر وقت تک فائز رہے،

وفات | امام محمد کے قاضی القضاۃ ہونے کے کچھ ہی دن بعد ہارون کو کسی ضرورت سے رے جانا پڑا، امام محمد کو بھی وہ اپنے ساتھ لیتا گیا، اسی مقام پر ۱۸۹ھ مین ۵۸ برس کی عمر مین امام فقہ نے داعی اجل کو لبیک کہا، اتفاق سے کسائی مشہور امام نحو بھی اس سفر مین ہارون کے ساتھ تھے، انھون نے بھی اسی دن یا دو دن بعد انتقال کیا، ہارون کو ان دونون ائمۂ فن کے پے در پے انتقال کا بڑا رنج ہوا، اور اس نے غایت افسوس مین کہا کہ "فقہ و نحو دونون کو مین نے رے مین دفن کر دیا"[2]

تدفین | جبل طرک جو رے کا مشہور قلعہ ہے اسی مین امام فقہ کو سپرد خاک کیا گیا،[3]

یحیی یزیدی، ہارون کے دربار کا مشہور شاعر اور ادیب تھا اس نے بڑا پُر درد اور دل سوز مرثیہ لکھا ہے، جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

تصرمت الدنیا فلیس خلود	قد نری من بجۃ ستبید
لکل امری منا من الموت منھل	فلیس لہ الا علیہ ورود
الم تر شیئا شاملا بعد البلی	وان الشباب لیس یعود

---

[1] کردری ج ۲ ص ۱۷۵ و بلوغ الامانی ص ۱۰ [2] مناقب کردری ۲ ص ۱۴۹ [3] ایضاً،

امام ذہبی نے ان اشعار کو قاضی ابو خازم عبدالحمید کی طرف منسوب کیا ہے، اور چند اشعار نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ صیرانی نے اس مرثیہ کی نسبت یحیٰی یزیدی کی طرف کی ہے[1]،

اولاد | امام محمد کے نکاح اور اولاد کے متعلق تذکروں میں کوئی تفصیل نہیں ملتی، بعض روایتوں میں آپکے ایک پوتے کا ذکر آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی شادی ہوئی تھی، اور آپنے ایک صاحبزادے بھی یادگار چھوڑی تھی،

حلیہ | بال گھنے، گداز بدن، اور نہایت ہی شکیل وجمیل اور خوش لباس آدمی تھے[2]،

ان کے حسن صورت کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ جب ان کے والد تعلیم کی غرض سے انکو امام صاحب کے پاس لے گئے، تو امام صاحب نے ان کے حسن وجمال کو دیکھکر فرمایا کہ لڑکے کے سر کا بال اتروا دو، اور معمولی کپڑے پہناؤ، ان کے والد نے اس کی تعمیل کی، بال اتر جانے کے بعد، ان کے جمال میں اور چار چاند لگ گیے، چنانچہ اسی ہیئت کو دیکھکر ابو نواس نے یہ اشعار کہے تھے،

حلقوا راسہ لیکسوہ قبحا ۔۔۔ غیرۃ منہم علیہ وشحا

کانہ فی وجھہ صباح لیل ۔۔۔ نزعوا لیلہ وابقوا صبحا

وکیع بیان کرتے ہیں کہ چونکہ محمد بن حسن کم سن اور بہت ہی شکیل وجمیل تھے، اس لیے ہم لوگ حدیث کے درس میں ان کے ساتھ جانا پسند کرتے تھے[3]،

اخلاق وعادات | انسان کے شرف کا اصلی معیار، اخلاق وکردار ہے، اگر اس حیثیت سے اس میں کوئی کمزوری ہے تو وہ غیر معمولی ہوکر بھی معمولی آدمی ہے اور اگر اس اعتبار سے اس میں کوئی خوبی ہے، تو وہ ہماری نظروں میں کتنا ہی ادنی کیوں نہ ہو لیکن حقیقی شرف اسی کو حاصل ہے، امام محمد اپنے

---

[1] خطیب بغدادی؛ جواہر مضیہ ج ۲ ص ۴۴ [2] ترجمہ محمد بن الحسن ص ۶۰ و [3] کردری، ۱۴۱، ۱۴۸، [4] کردری، ۱۴۱، ۱۴۸،

فضل وکمال کے ساتھ، اخلاق وکردار مین بھی اپنے ہم عصرون سے ممتاز تھے، امام ابوحفص نے اون کے اخلاق کا نقشہ ان الفاظ مین کھینچا ہے، کہ "اگر ان کو کوئی دیکھے تو یہ سمجھے کہ یہ صرف علم ہی کے لیے پیدا کیے گیے ہین، (ان مین دوسری کوئی خوبی نہین ہے) لیکن اسی کے ساتھ نہایت صالح، خلیق، مہذب، اور عمدہ روش کے آدمی تھے، ان کی زبان سے کبھی کسی کو، کوئی تکلیف نہین پہنچی، ہر شخص سے مدارات اور محبت ان کا شیوہ تھا،[۱]

علی بن معبد ان کے حسن خلق کا ایک اپنا ذاتی واقعہ بیان کرتے ہین کہ جس زمانہ مین امام محمد رقہ کے قاضی تھے، مجھے رقہ جانے کا اتفاق ہوا، ایک دن مین ان سے ملنے گیا، دروازہ پر پہنچا تو دربان نے روک دیا، مین واپس چلا آیا، پھر دوبارہ ان سے ملنے نہین گیا، ایک روز گذر رہا تھا، دیکھا کہ محمد ابن حسن، قضاۃ کے لباس مین شان وشوکت کے ساتھ گھوڑے پر سوار چلے آرہے ہیں، مجھے روکا اور اپنے ساتھ مکان پر لے آئے، مکان پہنچکر مجھ سے انھون نے کہا کہ آپ اتنے روز سے رقہ مین ہین اور کبھی مجھ سے ملنے نہین آئے، انھون نے گذشتہ واقعہ بتایا، امام محمد نے دربان کا نام پوچھا انھون نے اس خیال سے کہ دربان سزا پائے گا نام نہین بتایا، امام محمد نے تمام دربانون کو بلا کر ہدایت کی کہ جب یہ آئیں تو کوئی نہ روکے، چنانچہ اس کے بعد وہ جس وقت چاہتے ان کے پاس چلے آتے تھے، امام صاحب اور ان کے تلامذہ کو جن مین خود امام محمد بھی تھے، لوگ بعض غلط فہمیون کی بنا پر برا بھلا کہتے تھے، امام محمد کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انھون نے یہ شعر پڑھا اور خاموش ہوگیے

محسودون وشر الناس منزلۃ   من عاش فی الناس یوما غیر محسود[۲]

یہ وہ لوگ ہیں، (امام صاحب اور ان کے تلامذہ) جن پر لوگ حسد کرتے ہیں مرتبہ کے اعتبار سے سب سے کمتر وہ شخص ہے جس پر کوئی حسد نہ کرتے۔

بردباری، حلم وبردباری کے وہ مجسمہ تھے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، مین نے امام محمد

۱؎ کردری ص ۱۴۷، ۱۴۸، ۲؎ بلوغ الامانی ۴۵ ۳؎ کردری ۲ ص ۱۵۴،

جیسا حلیم آدمی نہیں دیکھا، وہ اپنے مزاج کے خلاف بات سنتے اور برداشت کر جاتے تھے،[1]

طلبہ ان سے ہر قسم کے سوالات اور بحث و مباحثہ کرتے تھے، مگر ان کی پیشانی پر بل نہیں آتا تھا، امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ میں نے امام محمد ہی کو ایک ایسا آدمی پایا کہ وہ بحث و مباحثہ کے وقت چین بہ جبین نہیں ہوتے تھے۔

فیاضی | نہایت کشادہ دست، فیاض اور سیر چشم تھے، اوپر ذکر آچکا ہے کہ انھیں اپنے والد سے جو دولت ملی تھی وہ سب انھوں نے اپنی تعلیم پر خرچ کر ڈالی، طلبہ کے ساتھ حسن سلوک کے وقت ان کا یہ وصف اور زیادہ نمایاں ہو جاتا تھا، امام شافعی اور اسد بن فرات کو متعدد بار انھوں نے اسّی اسّی دینار بطور امداد دئے تھے، بسا اوقات اپنے پاس کچھ نہ ہوتا تو دوسروں کے ذریعہ اہل احتیاج کی ضرورت رفع کرا دیا کرتے تھے، اسد بن فرات فقہ کی تکمیل کے بعد جب اپنے وطن قیروان واپس جانے لگے، تو ان کے پاس زاد سفر نہیں تھا، امام محمد کو معلوم ہوا تو انھوں نے کسی شاہزادہ کو (غالباً ابن یا مامون) لکھا، اس نے دس ہزار کی رقم خزانۂ شاہی سے دلوا دی اور ان کے سفر خرچ کا انتظام ہو گیا،[2]

محمد بن سماعہ کا بیان ہے کہ امام شافعی کو متعدد بار مالی دقتیں پیش آئیں، اور ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ امام محمد نے اپنے احباب و اصحاب سے بڑی بڑی رقمیں ان کے لیے جمع کرائیں،[3]

اس وصف میں امام محمد کے بہت کم لوگ شریک نظر آتے ہیں۔

بذلہ سنجی | اپنے حلم و سنجیدگی کی وجہ سے کوئی نا ملائم یا غیر مہذب الفاظ اپنی زبان سے نہیں نکالتے تھے، کبھی کبھی مزاح کے جملے کہہ دیا کرتے تھے، کوئی مسجد گر پڑ کر خراب ہو گئی تھی، لوگوں نے امام ابو یوسف سے اس کے بارے میں فتوی پوچھا، انھوں نے کہا وہ مسجد کے حکم میں ہے، ایک روز ادھر

---

[1] کردری ج ۲ ص ۱۵۴ [2] معالم الایمان ج ۱ ص ۵ [3] مناقب کردری ج ۲ ص ۱۵۰،

امام محمد کا گذر ہوا، مسجد پر ان کی نظر پڑی ۔۔۔ کہ کوڑے کرکٹ سے اٹی ہوئی ہے، یہ دیکھکر انھون نے مزاحاً فرمایا یہ ابو یوسف کی مسجد ہے۔[1]

جرأت و حق گوئی | آپ کے صحیفۂ اخلاق کا ایک نمایان باب جرات و حق گوئی بھی تھا جب کبھی حق بات کے اظہار کا موقع آجاتا تو آپ اس مین کسی کی رو رعایت اور مداہنت نہین کرتے تھے، یحیٰی طالبی کا ذکر اوپر آچکا ہے، ہارون نے اس سلسلہ مین بڑی کوشش کی کہ اس کی مرضی کے مطابق وہ فتوی دیدین لیکن انھون نے اس کے شاہانہ دبدبہ و وقار کی پروا کیے بغیر، پوری جرات کے ساتھ حق کا اظہار کیا۔

ایک روز امام محمد دوسرے علماء کے ساتھ ہارون کے محل مین بیٹھے ہوئے تھے، اتفاق سے اسی وقت ہارون رشید بھی آگیا، تمام حاضرین اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوگئے، لیکن امام محمد نے اپنی جگہ سے جنبش بھی نہین کی، تھوڑی دیر بعد ہارون نے امام محمد کو تخلیہ مین بلایا، امام محمد اندر گیے، تو ہارون نے ان سے کہا کہ بنو تغلب (نصاریٰ) کو نقض عہد کرنے مین قتل کرانا چاہتا ہون، امام محمد نے فرمایا کہ حضرت عمر رضؓ نے انھین امان دی ہے، اس لیے نقض عہد کی کوئی گنجایش نہین ہے، ہارون نے کہا کہ حضرت عمر رضؓ نے اس شرط پر امان دی تھی کہ وہ اپنے بچون کا بپتسمہ (عیسائی بنانا) نہ کرین، لیکن انھون نے اس کی خلاف ورزی کی ہے، امام محمد نے فرمایا کہ انھون نے بپتسمہ کے باوجود انھیں امان دی تھی، اس ہارون نے کہا کہ حضرت عمر رضؓ کو ان سے جنگ کا موقع نہ مل سکا، امام محمد نے فرمایا کہ اگر ایسا ہے تو اس کے بعد حضرت عثمان رضؓ اور حضرت علی رضؓ کو ان سے جنگ کرنا چاہیئے تھا، حالانکہ ان لوگون نے ان سے کوئی تعرض نہین کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضؓ نے ان سے بلا شرط صلح کی تھی، اس پر ہارون بہت خفا ہوا اور ان کو محل سے باہر نکلوا دیا، بعض روایتون مین ہے کہ جب وہ لاجواب ہوگیا تو اس نے پوچھا کہ میرے

---

[1] مناقب کردری ص ۱۵۰ ج ۲ یہ اس وقت کا واقعہ ہے، جب امام محمد اس سے پہلے ایک بار ہارون کے مورد عتاب بن چکے تھے، اور امام جعفر کی کوشش سے ہارون اور ان کے درمیان صفائی ہو چکی تھی بلوغ ص ۴۲،

آنے پر آپ میری تعظیم کے لیے کیوں کھڑے نہیں ہوئے، امام محمد نے جواب دیا کہ یہ خدام کا کام ہے، علماء کے درجہ سے یہ چیز فروتر ہے، آپ کے ابن عم (حضرت ابن عباسؓ) نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ لوگ اس کی تعظیم کے لیے اسٹیچو کی طرح کھڑے رہیں، تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے[1]،

جب امام محمد تخلیہ سے باہر آئے، تو حاضرین نے جنھیں یہ خیال تھا کہ آج عدم تعظیم کی بنا پر امام محمد کو کوئی سخت سزا ملیگی، پوچھا کیا ہوا، امام محمد نے پوری گفتگو دہرائی تو لوگ ان کی جرات پر حیرت زدہ رہ گیے[2]۔

اس روایت سے امام محمد کی جرات وحق گوئی کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے نزدیک حقوق عباد مین مسلم اور غیر مسلم مین کوئی فرق نہیں ہے، یہی وجہ تھی کہ ہارون کو خاموش اور اپنے ارادہ سے باز رہنا پڑا،

ایک مرتبہ ہارون نے کسی شخص کے بارے مین کوئی امان لکھوائی، غالباً اس خیال سے دوسرے سے لکھوائی کہ ضرورت کے وقت اس سے انکار کی گنجایش نکل سکے، چنانچہ اسنے اس امان کے بارے مین امام محمد سے فتوی پوچھا کہ مین نے اسے اپنے ہاتھون سے نہین لکھا ہے، دوسرے سے لکھوایا ہے، تو کوئی شخص اگر قسم کھائے کہ وہ کوئی خط یا تحریر اپنے ہاتھ سے نہ لکھے گا لیکن اگر دوسرے سے لکھوائے، تو اس کی قسم ٹوٹے گی یا نہین، امام محمد نے اپنی ذکاوت سے مسئلہ کی نوعیت کو سمجھ لیا، فرمایا کہ وہ قسم کھانے والا شخص عوام مین ہے تو جب تک وہ نیت نہ کرے اس کی قسم نہین ٹوٹیگی، لیکن اگر بادشاہ ہے تو قسم ضرور ٹوٹ جائیگی، اس لیے کہ بادشاہ کے حکم سے جو چیز لکھی جائیگی وہ بادشاہ ہی کی ہوگی، اس پر ہارون بہت برافروختہ ہوا[3]

---

[1] کردری ۲ ص ۱۶۲ [2] بلوغ الامانی ص ۴۲ [3] ایضاً وکردری ج ۲ ص ۱۶۴،

سازش کا شبہہ | انہی تمام واقعات کی بناپر ہارون کو یہ شبہہ پیدا ہو گیا تھا کہ ہمارے خلاف جو آئے دن طالبیون کی سازش ہوا کرتی ہے، اس مین امام محمد کا ہاتھ ہے، چنانچہ اس نے حکم دیا کہ ان کی کتابون کا جائزہ لیا جائے کہ ان مین اس قسم کے باغیانہ خیالات تو نہین پائے جاتے، امام محمد کو جب معلوم ہوا تو انھون نے محمد بن سماعہ سے جو ان تمام واقعات مین ان کے ساتھ تھے، کہا کہ فوراً گھر پر جا کر میری کتابون کو محفوظ کر لو، ورنہ ہو سکتا ہے کہ ایسی کوئی چیز ان مین شامل کر دی جائے جو ان مین موجود نہ ہو، چنانچہ انھون نے ایسا ہی کیا، اس کے بعد جب ہارون کے سامنے یہ کتابین پیش ہوئین تو ان مین بجز حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل کی حدیثون کے اور کوئی چیز نہین ملی، اس پر ہارون نے کہا کہ اس سے زیادہ تو ان کے فضائل ہمارے پاس موجود ہین، یہ کوئی گرفت کی بات نہین ہے[۲]۔

زہد و عبادت | نہایت صالح، عابد اور شب زندہ دار تھے، رات دن مین ایک ثلث قرآن تلاوت کر ڈالتے تھے[۳] انھون نے رات کو تین حصون مین تقسیم کر لیا تھا، ایک حصہ مین درس و تدریس کا مشغلہ رہتا، دوسرے حصہ مین آرام فرماتے اور تیسرے حصہ مین بارگاہ قدس مین سجدہ ریز ہوتے تھے[۴] شیخ عبداللہ اپنے والد سے روایت کرتے ہین، کہ مین نے بارہا کوشش کی کہ جس خضوع و خشوع کے ساتھ امام محمد معمولاً نماز ادا کرتے ہین، مین ایک ہی بار اس طرح پڑھ لون، لیکن مین اس سے عاجز رہا[۵]، بکر بن محمد العمی فرماتے تھے کہ محمد بن سماعہ اور عیسیٰ بن ابان (دونون اپنے وقت کے شیخ اور محدث تھے) نے حسن و خوبی سے نماز پڑھنا امام محمد سے سیکھا تھا[۶]، محمد بن کامل المکرزی فرماتے ہیں کہ مین نے زہد و ورع مین امام محمد کو بہت زیادہ بلند پایہ پایا[۷]، قتیبہ ابن سعید فرماتے ہین کہ مین نے انھین کثیر العبادۃ پایا[۸]، امام شافعی فرماتے ہین کہ مین نے محمد بن حسن جیسا زاہد اور پرہیزگار

---

[۱] عام خلفائے عباسیہ مختلف اسباب کی بناپر اس چیز کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ [۲] کردری ج ۲ ص ۱۶۳ و بلوغ الامانی ص ۲۴ [۳] کردری ج ۲ ص ۱۶۲ [۴] ایضاً [۵] کردری ج ۲ ص ۱۶۲ [۶] ترجمہ امام محمد امام ذہبی ص ۵۹ [۷] کردری ص ۱۶۲ [۸] ایضاً ۱۵۳

نہین دیکھا،[1]

آخرت کا خوف | نہایت رقیق القلب اور آخرت کے خوف سے لرزان رہتے تھے، وفات سے کچھ دیر پہلے آپ پر بیحد گریہ طاری ہوا، لوگون نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ جس وقت مین بارگاہ قدس میں کھڑا کیا جاؤن گا، اور مجھ سے سوال ہوگا کہ مقام رَے تک کون سی چیز لائی ؟ رضاے الٰہی کی جستجو اور تلاش یا جہاد فی سبیل اللہ تو مین اس وقت کیا جواب دوں گا،[2] (یعنی اس مین سے کوئی چیز بھی نہین) اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ اسلاف کسی نیک مقصد کے بغیر گھر سے باہر نکلنا پسند نہین کرتے تھے، عہدۂ قضا کی وجہ سے ہارون کے ساتھ ان کو رے جانا پڑا تھا مگر وہ دل سے اس کو پسند نہین کرتے تھے۔

علم و فضل | امام محمد کے صحیفۂ زندگی میں تمام انسانی اوصاف بدرجۂ اتم موجود تھے، لیکن علم و فضل کے نقوش ان مین سب سے زیادہ نمایان اور ظاہر تھے،

ان کے علم و فضل کا صحیح اندازہ تو ان کی کتابون کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، لیکن اس کا موقع ہر شخص کو کہان نصیب ہو سکتا ہے، اس لیے دوسرون نے ان کی زندگی پر جو روشنی ڈالی ہے، اسے یہان نقل کیا جاتا ہے، اس آئینہ مین ان کی علمی تصویر کا کچھ نہ کچھ عکس نظر آ جائے گا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہین کہ اگر امام محمد کی صحبت نصیب نہ ہوئی ہوتی تو مجھ پر علم کا دروازہ نہ کھلتا،[3] وہ کسی مسئلہ پر تقریر کرتے تو ان کی فصاحت لسانی کی وجہ سے معلوم ہوتا تھا کہ قرآن مجید ان ہی کی زبان مین نازل ہوا ہے،[4] فرماتے تھے کہ مین نے ان سے ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر علم حاصل کیا ہے،[5] امام احمد بن حنبل سے دریافت کیا گیا کہ آپ نے یہ دقیق مسائل کہان سے حاصل کیے ہیں فرمایا کہ محمد بن حسن کی کتابون سے،[6] امام مزنی کے سامنے کسی نے کہا قال محمد، انھون نے پوچھا کون محمد!

---

[1] بلوغ الامانی ص ۵۷ [2] جواہر مضیہ ج ۲ ص ۴۲ و کردری [3] جواہر مضیہ ج ۲ ص ۴۲ [4] بلوغ الامانی ۵۵۔
[5] ترجمہ امام محمد ص ۵ و تاریخ بغداد

قائل نے کہا محمد بن حسن، انھوں نے فرمایا،

مرحبا بمن یملأ الآذان سمعًا — مرحبا اوس شخص پر جو کان کو سماع اور

والقلب فہمًا[1] — قلب کو فہم سے بھر دیتا تھا،

امام ابوحفص فرماتے ہیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ صرف علم کے لیے پیدا کیے گیے ہیں[2]،

محمد بن سلام فرماتے ہیں کہ میں نے امام محمد کی کتابون کے حصول پر دس ہزار درہم صرف کیے، اگر مجھے پہلے ان کتابون کی اہمیت کا اندازہ ہوگیا ہوتا تو میں دوسری طرف متوجہ ہی نہ ہوا ہوتا[3]، امام ذہبی لکھتے ہین کہ امام ابویوسف کے بعد فقہ کی ریاست امام محمد کی طرف منتہی ہوگئی تھی، ان سے ائمۂ کرام نے تفقہ حاصل کیا ہے[4]۔

امام مزنی امام محمد کے تلامذہ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ خدا کی قسم جب وہ کسی مسئلہ پر گفتگو کرتے تھے، تو کان کو بھر دیتے تھے، اور فقہا پر علم کے دروازے کھول دیتے تھے[5]، ان کے اصحاب نے اس تعریف پر تعجب کا اظہار کیا تو انھوں نے فرمایا کہ جتنی تعریف میں نے کی ہے، امام شافعی اس سے زیادہ ان کی تحسین کرتے تھے[6]، قاضی کامل المروزی فرماتے تھے کہ میں نے امام محمد جیسا عمدہ املا کرانے والا نہین دیکھا[7]،

علم کی ذمہ داری کا احساس | علم دین مین اخلاص اور اس کی ذمہ داری کا احساس اس کی روح ہو، اگر یہ چیز نہ ہو تو علم صاحبِ علم کے لیے وبال اور باعث عذاب ہے، امام محمد کے صحیفۂ زندگی میں یہ وصف بہت نمایان ہے کہ انھین علم دین مین اخلاص اور اس کی ذمہ داری کا پورا پورا احساس تھا، بہت کم سوتے تھے، رات کا زیادہ حصہ درس و تدریس اور مطالعہ و تصنیف مین گذرتا، گرمیون مین کرتا اتار دیتے،

---

[1] ترجمہ امام محمد صفحہ ۵ و تاریخ بغداد [2] بلوغ ۵۵ [3] کردری جلد ۲ صفحہ ۱۵۲ [4] بلوغ الامانی ص ۵، [5] ایضاً ۸، [6] ایضاً ۵۵ [7] کردری ج ۲ ص ۱۵۲،

اور اپنے سامنے ایک طشت مین پانی رکھ لیا کرتے تھے، جب غنودگی طاری ہونے لگتی، تو بدن پر چھینٹے دیتے تھے) لوگون نے آپ سے اس کم خوابی اور زحمت کشی کی وجہ دریافت کی، تو فرمایا کہ

کیف انام وقد نامت عیون المسلمین توکلا علینا ویقولون اذا وقع لنا امر رفعناہ الیہ فیکشفہ لنا فاذا نمت ففیہ تضییع الدین[1]،	مین کیسے سو سکتا ہون جب عام مسلمان ہم پر اعتماد اور یہ خیال کرکے سو رہے ہیں کہ جب ہمارے سامنے کوئی معاملہ یا نیا مسئلہ پیش آئے گا تو ان کے (امام محمد) پاس لیجائیں گے، وہ اسے واضح کردین گے تو اگر میں سو جاؤن تو اس سے دنیا کا نقصان ہوگا۔

یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالےٰ نے علم کے تمام دروازے ان کے لیے وا کر دیئے تھے،

قرآن کی تلاوت اس میں تدبر و تفکر اور استخراج مسائل

قرآن کے حافظ تھے، روزانہ ایک ثلث قرآن تلاوت کا معمول تھا[2]، قرآن مین تدبر و تفکر اور اس سے استخراج مسائل، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کی درسگاہ کی خاص خصوصیت تھی، امام محمد مین وہ خصوصیت بدرجۂ اتم موجود تھی، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:-

استخرجت من کتاب اللہ نیفا والف مسئلۃ[3]	میں نے قرآن سے ایک ہزار سے کچھ زیادہ مسئلے مستنبط کیے ہیں،

ابو عبید فرماتے ہیں، مین نے امام محمد سے بڑھکر کتاب اللہ کا عالم نہین دیکھا[4]۔ اسی طرح کا ایک مقولہ امام شافعی سے بھی منقول ہے،[5] ما رأیت اعلم بکتاب اللہ من محمد بن حسن (کردری ۲ ص ۱۵۶)

[1] کردری ج ۲ ص ۱۵۱ [2] ترجمہ محمد بن حسن ص ۵ [3] کردری ۲ ص ۱۵۱ [4] تاریخ بغداد ج ۲ ص ۵، [5] ایضاً

حدیث | امام محمد نے اس وقت کے تمام ممتاز شیوخ حدیث سے سماع اور استفادہ کیا تھا خصوصیت سے امام مالک کی روایتون کے وہ بہترین حافظ و امین سمجھے جاتے تھے، ان کی روایتون کے درس کے لیے انھون نے ایک خاص دن مقرر کر لیا تھا، اسد بن فرات کا بیان ہے کہ امام مالک کی وفات کے بعد جس دن امام محمد ان کی مرویات کا درس دیتے تھے، اس دن اس قدر ہجوم ہوتا تھا کہ راستہ بند ہو جاتا تھا،[1] حدیث و آثار مین ان کی دقت نظر اور وسعت معلومات کا صحیح اندازہ اس فن مین ان کی تصنیفات ہی سے کیا جا سکتا ہے، جس کی تفصیل تصنیفات کے باب مین آئے گی،

غلط فہمی | امام صاحب اور ان کے تلامذہ کے متعلق عام طور پر یہ غلط فہمی تھی کہ وہ حدیث کے مخالف اور قیاس کے دلدادہ ہین، چنانچہ امام محمد بھی اس سوء ظنی کا شکار تھے، اسی وجہ سے اکثر منقول پسند طبیعتیں ان سے گریز کرتی تھین، محمد بن سماعہ کا بیان ہے کہ مین عیسیٰ بن ابان (شیوخ حدیث مین تھے) کو برابر امام محمد کے درس مین شریک ہونے کی ترغیب دیا کرتا تھا، لیکن وہ کہا کرتے تھے کہ جس درس مین حدیث کی مخالفت کی جاتی ہو اسمین مین شریک نہین ہو سکتا، ایک روز کسی طرح محمد بن سماعہ انھین امام محمد کے درس مین لے آئے، اور ان سے کہا کہ عیسیٰ بن ابان جنھین حدیث مین بڑا درک ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ حدیث کی مخالفت کرتے ہیں، امام محمد نے اون سے فرمایا کہ آپ لوگون کو غلط فہمی ہے کہ ہم حدیث کے مخالف ہیں، جب تک آپ ہم سے حدیث کا سماع نہ کر لین۔ اس وقت تک آپ کو یہ فیصلہ نہ کرنا چاہیے تھا، حدیث کے بارے مین جو کچھ آپ کو پوچھنا ہو پوچھیے، عیسیٰ بن ابان نے احادیث کے کچھ ابواب و مضامین کے متعلق سوالات کیے، امام محمد نے تمام کا یکے بعد دیگرے جواب دیا، اور ان کے دلائل و شواہد، ناسخ و منسوخ کی پوری توضیح کی محمد بن سماعہ کا بیان ہے کہ عیسیٰ بن ابان جب درس سے اٹھے، تو انھون نے مجھ سے کہا کہ میرے اور

---

[1] شذرات الذہب ج ۲ [2] معالم الایمان ۲ ص ۵،

اس روشنی (امام محمد) کے درمیان ایک پردہ حائل تھا، جو آج اٹھ گیا۔[1]

اس کے بعد سے عیسیٰ بن ابان کو امام محمد سے اس قدر تعلق خاطر ہوا کہ وہ حلقۂ اصحاب مین داخل ہو گیے، اور امام محمد کی کتاب الحجج جو انھون نے شیوخ مدینہ کے رد مین لکھی تھی، اہل مدینہ تک عیسیٰ بن ابان ہی کے ذریعہ پہنچی۔

خود امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس غلط فہمی کو دور کر دیا ہے، وہ فرماتے ہین، کہ "مین نے امام محمد کی کتابون کو ساٹھ دینار صرف کر کے حاصل کیا پھر ان مین غور کیا تو ہر مسئلہ کی حدیث سے تائید پائی،[2]

قیاس کے مقابلہ مین حدیث کو ترجیح حدیث کو قیاس کے مقابلہ مین بہرحال ترجیح ہے، امام صاحب اور ان کے اصحاب و تلامذہ سب اس کے قائل تھے، لیکن انھون نے حدیث احاد کے قبول کرنے کے کچھ شرائط و حدود مقرر کر دیئے تھے، انہی شرائط کی بنا پر لوگون نے ان کی طرف سے بہت سی بدگمانیان قائم کر لی تھین، لیکن اگر ان کے منشاء و مقصد پر غور کیا جائے تو بدگمانی کی کوئی بات باقی نہین رہ جاتی، چنانچہ امام صاحب نے متعدد بار اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی، عقود الجمان وغیرہ مین امام صاحب کے بہت سے اقوال منقول ہین، امام جعفر صادق سے جو انھون نے گفتگو کی تھی، اس مین بھی اس خیال کا اظہار کیا تھا،

امام محمد کی طرف سے بھی یہ بدگمانی تھی اس لیے انھون نے متعدد جگہ اس غلط فہمی کو دور کیا ہے، اس بحث مین کہ نماز مین قہقہہ ناقض وضو ہے یا نہین، لکھتے ہین۔

لولا ما جاء من الآثار کان	اگر حدیث و آثار سے ثابت نہ ہوتا تو قیاس
القیاس ما قال اہل المدینۃ	کا فیصلہ وہی ہوتا، جو اہل مدینہ کہتے ہین،

---

[1] کردری ج ۲ ص ۱۵۰، [2] بلوغ الامانی ص ۲۲

ولکن لاقیاس مع اثر ولا ینبغی الا ان ینقاد للآثار[1]

لیکن حدیث و اثر کی موجودگی میں قیاس کوئی چیز نہیں ہے ہم کو صرف آثار ہی کی پیروی کرنی چاہیئے،

روایت میں احتیاط | قبول روایت میں امام محمد کی سختی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ اہل عدل کے متعلق فرماتے تھے کہ ایسے اہل عدل جن کا عقیدہ ہے کہ جو کاذب ہے وہ صرف فاسق ہے ان کی روایت قبول کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ اہل ہوی کی روایت قبول کرلیجائے، جن کا عقیدہ ہے کہ جو کاذب ہے وہ کافر ہے[2]

کذب سے کوئی کافر نہیں ہوتا مگر اس زمانہ مین جھوٹی روایتون کی بہتات اور ان کے قبول کرنے مین عدم اعتنا کی بنا پر امام محمد کی یہ سختی اور احتیاط بالکل درست تھی،

اپنی کتابون کی روایت میں قیود | عموماً ایسا ہوتا ہے کہ لوگ روایت کے منشا و مقصد کو نہیں سمجھتے لیکن روایت کرنا شروع کر دیتے ہیں، جس کی وجہ سے بہت سی غلط باتین رواج پا جاتی ہیں، امام محمد نے اسی وجہ سے اپنی کتابون کی روایت کرنے مین یہ قیود لگا دی تھین،

لا یحل لاحد ان یروی عن کتبنا الا ما سمع او علم مثل ما علمنا[3]

ہماری کتابون کی روایت کا حق صرف اس شخص کو ہے جو براہ راست سنے یا ہماری طرح (منشا و مقصد کا) علم رکھتا ہو۔

فقہ | امام محمد کی شہرت اور ان کا اصلی شرف و امتیاز فقہ سے وابستہ ہے، دوسرے علوم میں تو اور اہل فن کی طرف بھی رجوع کیا جاتا تھا، لیکن اقلیم فقہ کے وہ اس وقت تنہا تاجدار تھے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے تفقہ حاصل کیا تھا، اسد بن فرات امام مالک رحمہ اللہ کے شاگرد جنھوں نے

---

[1] بلوغ ص ۲۲ [2] ایضاً [3] کردری ج ۲ ص ۱۵۲،

فقہ مالکی کی بنیاد رکھی تھی، امام محمد کے سامنے زانوے تلمذ تہ کر چکے تھے، امام احمد بن حنبل کا قول اوپر نقل کیا جاچکا ہے کہ وہ فرماتے تھے فقہ کے تمام دقیق مسائل میں نے امام محمد سے اخذ کیے ہیں، امام محمد کی ذات کو ائمۂ اربعہ کی فقہ کا مخرج قرار دینا بیجا نہ ہوگا، اور اس میں تو کسی شبہ کی گنجایش نہیں ہے، کہ مذاہب اربعہ میں جتنی ندوین و تصنیف ہوئی، امام محمد کی کتابوں کی روشنی میں ہوئی، امام مالک امام محمد کے استاذ ہیں، لیکن فقہ میں علما، امام محمد کو امام مالک سے افقہ سمجھتے تھے، یحیٰی بن صالح سے جو شیوخ بخاری میں ہیں، پوچھا گیا کہ آپ نے امام مالک اور امام محمد دونوں بزرگوں کی رفاقت کی ہے، ان میں کون زیادہ افقہ تھا، انھوں نے فرمایا کہ محمد بن حسن افقہ من مالک، امام محمد امام مالک سے زیادہ فقیہ تھے[1]،

امام شافعی رحمہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے میری مدد فرمائی کہ حدیث میں ابن عیینہ، اور فقہ میں امام محمد کا تلمذ نصیب ہوا[2] فرماتے تھے کہ میں نے امام محمد جیسا فقیہ نہیں دیکھا، میں فقہ میں انکا سب سے زیادہ ممنون ہوں[3] ان کا قول ہے کہ میں نے فقہا میں امام محمد جیسا فقہ میں بصیرت رکھنے والا کسی کو نہیں پایا، جن مسائل کے اسباب و علل کی تلاش سے اکابر عاجز رہ جاتے تھے وہ ان مسائل کو آسانی سے حل کر دیتے تھے[4] فرمایا کرتے کہ میں نے فتاویٰ کا اتنا بڑا عالم نہیں دیکھا گویا وہ اسی لیے پیدا ہوے تھے[5] ایک مرتبہ کسی نے امام شافعی سے مسئلہ دریافت کیا اور انھوں نے جواب دیا، سائل نے ان سے کہا کہ فقہا آپ کی راے سے اختلاف رکھتے ہیں، امام نے فرمایا کہ تم نے محمد بن حسن کے علاوہ کسی فقیہ کو دیکھا بھی ہے، میں نے ان کے جیسا گداز بدن کے ذکی آدمی نہیں دیکھا، ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میں نے امام محمد کی صحبت اٹھائی ہے، اب ان کے مقابلہ میں کسی فقیہ کی راے وزنی ہو سکتی ہے کہ میں اس کی پرواہ کردوں[6]،

---

[1] بلوغ ص ۱۴ [2] جواہر مضیہ ۲ صفحہ ۴۲ و ۵۲۶ [3] ترجمہ امام محمد ذہبی صفحہ ۵۵ و کردری ۲ صفحہ ۱۵۰ [4] بلوغ ص ۵۵ [5] ایضاً ۵۶

تفریع مسائل | امام ابوحنیفہ نے جس فقہ کی تخم ریزی کی تھی اس کی آبیاری اور نشو ونما مین تین بزرگون امام ابویوسف، امام محمد اور امام زفر نے خاص طور سے حصہ لیا تھا، لیکن ان مین سے بھی ہر ایک کی خصوصیت جدا جدا تھی، امام مزنی نے ہر ایک کی خصوصیات پر بڑی اچھی راے دی ہے کسی نے ان سے اہل عراق کے بارے مین سوال کیا، تو انھون نے فرمایا

ابوحنیفۃ سیدھم وابویوسف	امام ابوحنیفہ اہل عراق کے سردار ہیں، امام
اتبعھم للحدیث ومحمد بن	ابویوسف ان سب سے زیادہ متبع حدیث
حسن اکثرھم تفریعاً وزفر	ہیں، اور امام محمد نے ان سب سے زیادہ
احدھم قیاساً[1]	مسائل کی تفریع کی ہے، امام زفر سب سے
	زیادہ قیاس تھے،

فقہ مین امام محمد کی اصلی خصوصیت یہی تفریع اور تولید مسائل ہے، تفریع کا مطلب یہ ہے کہ مستنبط مسائل کی علت مشترکہ تلاش کر کے اوس کی روشنی مین دوسرے مسائل پیدا کیے جائیں، تفریع مسائل ہر شخص کا کام نہین ہے، اس کے لیے دینی علوم میں تبحر، ادب و لغت سے واقفیت اور غیر معمولی ذہانت کی ضرورت ہے، امام محمد مین یہ تمام خصوصیتین بدرجۂ اتم موجود تھین، جن کی تفصیل اوپر آچکی ہے

اجتہاد و استنباط | اجتہاد و استنباط یعنی براہ راست قرآن و حدیث سے مسائل پیدا کرنا، یہ تفریع سے زیادہ مشکل کام ہے، استنباط مسائل کے لحاظ سے امام محمد کو اجتہاد کا درجہ حاصل تھا، اور استنباط و اجتہاد کے لیے فقہا نے جو قیود و شرائط لگائے ہیں وہ ان پر پورے اترتے تھے، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے کو صاحب مذہب نہین بلکہ تبع امام ابوحنیفہ ہی کہتے رہے۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۷۶،

اوپر ذکر آچکا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں نے ایک ہزار سے زاید مسئلے براہ راست قرآن سے مستنبط کیے ہیں، ابو علی فارسی فرماتے ہیں کہ اہل بصرہ کو البیان والتبیین، کتاب الحیوان، کتاب سیبویہ اور کتاب العین پر فخر ہے لیکن ہمیں (یعنی اہل کوفہ کو) ان ۲۵ ہزار مسئلوں پر ناز ہے جنھیں امام محمد نے مستنبط کیے ہیں،، ان کے اجتہاد و استنباط کا پورا اندازہ ان کی کتابوں کے مطالعہ ہی سے ہوسکتا ہے،

معاملات سے واقفیت پیدا کرنے کے سلسلہ میں کد و کاوش

معاملات کے بیشتر مسائل کا مدار عرف اور تعامل پر ہے، لیکن یہ چیزیں ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں، آج جو چیز بھی عرف عام اور فقہا کی اصطلاح میں عموم بلوی (عام تعامل) میں داخل ہے ضروری نہیں کہ وہ عرف و تعامل کل بھی باقی رہے، کسی زمانہ میں نبیذ سے وضو کے جواز و عدم جواز کا سوال تھا لیکن آج سوڈا واٹر کی قسم کی چیزوں کے متعلق سوال کیا جاتا ہے، اس لیے ایک مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ عرف قدیم اور عرف جدید سے واقف اور اس پر پوری نظر رکھتا ہو، امام محمد کی یہ خاص خصوصیت تھی کہ وہ معاملات کے عرف و تعامل کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور ان سے واقفیت پیدا کرنے کے لیے خود اہل حرفہ اور پیشہ وروں کے پاس جاتے تھے، حسن بن شہوب فرماتے ہیں کہ

رأیت محمداً یذهب الی الصباغین ویسأل عن معاملاتهم وما یدیرونها فیما بینهم۔	میں نے امام محمد کو دیکھا کہ وہ رنگریزوں کے پاس خود جاتے اور ان سے مل کر انکے معاملات اور معاملات میں وہ جو کچھ تبدیلی پیدا کرتے رہتے تھے اس کے متعلق معلومات حاصل کرتے تھے،
(کردری ج ۲ ص ۱۵۲)	

ایک مجتہد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن و حدیث پر اس حیثیت سے نظر رکھے کہ کون سی آیت یا حدیث منسوخ اور کون ناسخ ہے، اور اس بات کا بھی پورا علم ہو کہ قرآن و حدیث

ہیں جو چیزیں حرام یا حلال کی گئی ہیں، ان کی علت مشترکہ کیا ہے، تاکہ دوسری چیزیں جن کی حلت یا حرمت کے متعلق کوئی تصریح نہیں ہے، ان پر حلال یا حرام ہونے کا حکم لگایا جا سکے، امام محمد اس حیثیت سے بھی قرآن وحدیث پر مجتہدانہ نظر رکھتے تھے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، مین نے امام محمد جیسا ناسخ ومنسوخ اور حلال وحرام اور ان کی علتون کا جاننے والا نہیں دیکھا۔[1]

اہل اجتہاد کے بارے مین ان کی رائے

اہل اجتہاد کے خطاد صواب کے بارے مین امام محمد نے اپنے تلامذہ کو یہ اصول لکھوادیا تھا کہ جب کسی مسئلہ کی حلت وحرمت میں مجتہدین کا اختلاف ہوتا ہے، اور ایک ہی چیز کو ایک مجتہد حرام اور دوسرا حلال بتاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک صحیح اور حق تو ایک ہی ہوگا، یہ نہین ہوسکتا کہ ایک ہی وقت مین کوئی چیز حلال وحرام دونون ہو، اب جو مجتہد اپنے اجتہاد میں مصیب ہوگا اسے اپنے خلوص اور فرض کی ادائیگی، کدوکاوش، اور اصابت رائے کا اجر ملے گا، اور جو مصیب نہ ہوگا اس کو بھی اپنے خلوص اور محنت کا اجر ملے گا، لیکن ماجور ہونے کا یہ مطلب نہین ہے کہ اس کا قول اللہ تعالیٰ کے نزدیک حق بھی ہے۔

اس اصول کے اعلان کرنے کے بعد آپ نے تلامذہ سے فرمایا کہ اس بارے مین امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف اور میری سب کی ایک ہی رائے ہے۔[2]

جو لوگ امام صاحب اور ان کے اصحاب پر مصوبہ[3] ہونے کا الزام لگاتے ہیں، اس اصول سے ان کے الزام کی پورے طور پر تردید ہو جاتی ہے۔

دوسرے علوم

ان دینی علوم کے علاوہ ادب ولغت، ریاضی اور نحو مین بھی انھین پورا تبحر حاصل تھا، جواہر مضیہ مین ہے کہ وہ عربیت، نحو، اور ریاضی مین ماہر امام تھے (جلد ۲ صفحہ ۴۳) امام ابوبکر رازی فرماتے ہین کہ مین ابوعلی فارسی (مشہور نحوی) سے امام محمد کی جامع کبیر پڑھا کرتا تھا، وہ اکثر فرماتے تھے

---

[1] کردری ج ۲ ص ۱۵۰، بلوغ الامانی ص ۵۵ [2] ترجمہ امام محمد ذہبی ص ۵۳ بلوغ الامانی ۴۶، ۴۷ [3] یعنی وہ لوگ جو دونون صورتون کی تصویب کرتے تھے۔

کہ مجھے حیرت ہے کہ محمد بن حسن کو فن نحو مین کس قدر ید طولیٰ حاصل تھا، جمہور علماء اور خصوصاً امام ابن تیمیہ نے ان کی عربیت کا بجد اعتراف کیا ہے، فرائض کے مسائل مین انھون نے جو تدقیق و تفصیل کی ہے، اس سے ان کی ریاضی دانی کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے،

فصاحت و بلاغت | گو وہ عربی النسل نہین تھے لیکن ان کی فصاحت و بلاغت اور عربیت کا تمام ائمۂ فن کو اعتراف تھا، امام شافعی جن کی عربی دانی مسلم ہے فرماتے ہیں کہ محمد بن حسن کی فصاحت زبان کی وجہ سے اگر مین یہ کہون کہ قرآن ان ہی کی زبان مین نازل ہوا ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ ایک دوسرا مقولہ ہے کہ مین نے ان کے جیسا فصیح نہین دیکھا[1]، فرماتے تھے کہ مین پہلی بار جب ان کی خدمت مین حاضر ہوا تو ایک اختلافی مسئلہ پوچھا، انھون نے مسئلہ کی توضیح شروع کی، تو مین اس خیال مین تھا کہ وہ زبان کی کوئی غلطی ضرور کرین گے لیکن وہ تیر کی طرح صفائی سے نکل گیے، اور کوئی معمولی سی غلطی بھی نہین کی[2] جب وہ مسائل پر گفتگو کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قرآن کا نزول ہو رہا ہے[3]،

مسلک | امام محمد کے زمانہ سے پہلے ہی عجمیون کے اثر سے مسلمانون مین بھی ذات و صفات وغیرہ کے بارے مین بہت سے فرقے پیدا ہو گئے تھے، ان مین معتزلہ، خوارج، شیعہ، مرجیہ، قدریہ اور جہمیہ وغیرہ بہت زیادہ مشہور تھے، ہر فرقہ نے اپنے خیالات اور نظریات کو ثابت کرنے کے لیے قرآن و حدیث کی آڑ لی تھی اور اسی کو اپنا ماخذ قرار دیا تھا، اس لیے فقہا و محدثین کو بھی اپنے درس مین ضمناً ان مسائل پر بحث اور رد و قدح کرنی پڑتی تھی، چونکہ ان مسائل مین سے ہر مسئلہ کی بنیاد قرآن کی کوئی آیت یا حدیث نبوی ہی تھی، اس لیے اس بارے مین ہر فقیہ و ہر محدث کی راے ایک نہین ہو سکتی تھی، اس بنا پر خود علما مختلف جماعتون مین بٹ گیے تھے، اور ہر جماعت اپنی راے کو صواب اور دوسرے کی راے کو ناصواب کہتی تھی، بلکہ بسا اوقات

---

[1] بلوغ الامانی ۶۳ [2] کردری ج ۲ ص ۱۵۶ [3] ایضاً ۱۶۸ و تاریخ بغداد

اس اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے کو فاسق فاجر اور مبتدع بھی ٹھہراتی تھی۔

لیکن ان میں بعض مسائل بالکل فروعی اور انہیں بھی اختلاف نزاع لفظی یا غلط فہمی پر مبنی تھا، مثلاً اس مسئلہ میں کہ قرآن حادث ہے یا قدیم، علمار کے درمیان بڑی معرکہ آرائیاں ہوئیں، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے، تو یہ اختلاف سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن قدیم ہے، اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ خدا کی صفت کلام جس کا ایک مظہر قرآن ہے کلام الٰہی کی حیثیت سے وہ قدیم ہے، لیکن یہ قرآن جو ہمارے سامنے کاغذ پر لکھا ہوا موجود ہے، وہ مخلوق وحادث[1] ہے اور اس میں کوئی عقلی اور شرعی قباحت نہیں ہے۔

جو لوگ اس کے مخلوق وحادث ہونے کے قائل ہیں، اس سے ان کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح خدا کی صفت خلق اور صفت علم کے مظاہر (انسان وحیوان) مخلوق وحادث ہیں، اسی طرح اسکی صفت کلام کا مظہر یہ قرآن ہے، اسلئے ایک مظہر کی حیثیت سے وہ بھی حادث ومخلوق ہے ورنہ اس کی اصل صفت کلام تو قدیم ہے، اس میں کوئی قباحت نہیں ہے دونوں رایوں کا حاصل ایک ہی ہے، صرف طریقۂ تعبیر میں فرق ہے۔

امام محمدؒ کے سامنے بھی یہ مسائل پیش کیے گیے، لیکن امام صاحب کی طرح انھوں نے بھی ہمیشہ ان مسائل میں یا تو اعتدال کی راہ اختیار کی یا سلف صالحین کی طرح تحقیق وتدقیق سے گریز کرتے رہے، اسی اعتدال اور گریز کا نتیجہ تھا کہ بعض لوگوں نے امام صاحب کی طرح انؒ پر بھی جہمی ومرجی وغیرہ ہونے کا الزام لگایا، لیکن یہ الزام صرف غلط فہمی کی بنا پر تھا، اس لیے ہم ایسی روایتیں نقل کرتے ہیں، جن سے اس الزام کی تردید ہو جائیگی۔

---

[1] بعض لوگوں نے بہت زیادہ مبالغہ سے کام لیا ہے اور اس کے حروف والفاظ کی قدامت کے بھی قائل ہیں، لیکن ان کا خیال عقلی وشرعی کسی حیثیت سے صحیح نہیں ہے۔

امام محمد قرآن کو قدیم ہونے کے قائل تھے۔ ابو سلیمان جوزجانی فرماتے ہیں، کہ میں نے امام محمد کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ۔

من قال القرآن مخلوق فلا	جو شخص قرآن کے مخلوق ہونے کا قائل ہو
تصلوا خلفه[1]	اس کے پیچھے نماز نہ پڑھو۔

لیکن قدیم سے انکی مراد وہی ہے، جس کی اوپر تشریح کی گئی ہے۔

ذات وصفات کے بارے میں جو احادیث صحیح طریقہ سے مروی ہیں، ان کے بارے میں فرماتے تھے کہ

ان هذه الاحاديث قد رواتها من	ذات وصفات کے بارے میں جو احادیث
الثقات فنحن نرويها ونؤ	صحیح سند سے مروی ہیں، ہم ان کی روایت
بها ولا نفسرها۔[2]	کرتے ہیں، ان پر ایمان رکھتے ہیں لیکن
	ان کی تفسیر و توضیح نہیں کرتے،

اس بارے میں ایک دوسری روایت اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح ہے، فرماتے ہیں،

اتفق الفقهاء كلهم من الشرق	مشرق سے مغرب تک تمام فقہا اس بات
الى الغرب على ان الايمان	پر متفق ہیں کہ قرآن اور ان احادیث پر جن کو
بالقرآن والاحاديث التى	ثقات نے روایت کیا ہو اور اللہ عزوجل کی
جاء بها الثقات عن رسول	صفات پر بغیر کسی تفسیر و تشبیہ و توصیف
الله صلى الله عليه وسلم وفى صفة الرب	کے ایمان رکھنا چاہیئے جو شخص ان چیزوں
عزوجل من غير تفسير	کی تفسیر و توضیح کرتا ہے، وہ رسول اللہ
ولا وصف ولا تشبيه فمن	صلی اللہ علیہ وسلم کے اور سلف کے طریقہ
فسر اليوم شيئا من ذلك	سے علحدہ روش اختیار کرتا ہے اس لیے

[1] بلوغ الامانی ص ۵۳ [2] ایضاً، [3] ایضاً

فقد خرج مما علیہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم وفارق الجماعۃ فانہم لم یصفوا ولم یفسروا ولکن افتوا بما فی الکتاب والسنۃ ثم سکتوا فمن قال بقول جہم فقد فارق الجماعۃ لانہ قد وصفہ بصفۃ لاشئ۔ (بلوغ الامانی

کہ وہ اس کی توصیف و تفسیر نہیں کرتے تھے جو کچھ کتاب و سنت مین تھا، اس کے مطابق فتوی دیتے تھے پھر خاموش ہو جاتے تھے۔ جس شخص نے جہم بن صفوان کی طرح بات کی وہ سلف کی جماعت سے خارج ہو گیا، اس لیے کہ جہم اللہ تعالی کو ان اوصاف سے متصف کرتا تھا، جس کی کوئی حقیقت نہین ہے۔

ایک روایت مین کہ وہ اپنے مسلک کی توضیح کرتے ہوے فرماتے تھے کہ

مذہبی ومذہب الامام (ابی حنیفۃ) وابی بکر ثم عمر، ثم عثمان، ثم علی رضی اللہ عنہم واحد (مناقب کردری ۲ ص ۱۶۲)

میرا اور امام صاحب کا اور خلفاے راشدین سب کا مسلک ایک ہی ہے۔

بلوغ الامانی مین حافظ زاہد الکوثری نے حسن بن زیاد سے جو روایت نقل کی ہے اس مین امام ابو یوسف کا نام بھی ہے،

ان روایات سے پورے طور پر واضح ہو گیا ہوگا کہ ان کو اعمال وعقائد مین کتاب وسنت کے اتباع اور سلف صالحین کے اسوہ کا کتنا خیال تھا، لیکن اس اتباع اور سلفیت کے باوجود بعض لوگ امام صاحب اور ان کے تلامذہ کے بارے میں اچھی راے نہین رکھتے تھے، امام محمد کو جب اس کی اطلاع ہوتی تھی، تو ان کے بارے مین یہ شعر پڑھتے اور خاموش رہتے تھے۔

محسدون وشر الناس منزلة   من عاش فی الناس یوماً غیر محسود

ائمہ اور علماء کی رائے

کسی شخص کی سوانح حیات کی تکمیل کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے متعلق اس کے معاصرین کے خیالات اور رائے معلوم کیجائے، تاکہ اس آئینہ خانہ میں اس کی زندگی کے پورے خدوخال دیکھے جاسکیں۔

امام محمد کے فضل وکمال پر ان کے معاصرین ائمہ اور علماء ہم زبان ہیں، اگر ان کے اقوال کو جمع کیا جائے تو ایک چھوٹا سا رسالہ تیار ہو جائے، اس لیے ہم صرف چند ممتاز بزرگون کے اقوال نقل کرتے ہین،

امام صاحب اور امام مالک نے ان کے متعلق جو رائے دی تھی اس کا ذکر اوپر آچکا ہے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے بھی بہت سے اقوال نقل کیے جاچکے ہیں، دو چار اور مقولے جو نقل نہین ہوئے ہین وہ یہان درج کیے جاتے ہیں۔

وہ فرماتے تھے کہ اگر فقہا انصاف سے کام لین تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا، کہ انھون نے امام محمد جیسا فقیہ نہین دیکھا، (بلوغ ۵۵) دوسرا مقولہ ہے کہ مین نے محمد بن حسن جیسا فقیہ نہین دیکھا، ربیع کہتے ہیں کہ امام شافعی نے امام محمد کے بارے مین فرمایا،

مارایت اعقل ولا افقہ ولا	مین نے امام محمد جیسا عاقل، فقیہ، زاہد،
ازھد ولا اورع ولا احسن	متقی، خوش تقریر اور بحث و نقد کرنے والا
نطقا وکلا ایرادا من محمد بن الحسن[1]	نہین دیکھا۔

امام ابراہیم حربی فرماتے ہین کہ مین نے امام احمد بن حنبل سے پوچھا کہ آپ کو ایسے دقیق مسائل کہان سے معلوم ہوئے فرمایا مین نے محمد بن حسن کی کتابون سے اخذ کیا ہے،[3]

---

[1] بلوغ الامانی ص ۵۰، ترجمہ امام ذہبی ص ۵۲ [2] تہذیب الاسماء امام نودی [3] ترجمہ امام محمد ذہبی۔

مولانا عبدالحئی رحمہ اللہ نے امام احمد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب کسی مسئلہ مین تین آدمیون کی راے متفق ہو جائے تو پھر کسی مخالف کا قول مسموع نہ ہوگا، لوگون نے دریافت کیا کہ وہ تین آدمی کون ہیں، آپ نے فرمایا کہ ابوحنیفہ، ابویوسف، اور محمد بن الحسن[1]،

تعدیل | ابوعبید کا قول ہے کہ مین نے محمد بن الحسن جیسا عالم نہیں دیکھا[2]، علی بن المدینی جو جرح و تعدیل کے امام ہیں، امام محمد کے بارے مین ان کی راے دریافت کی گئی، تو فرمایا کہ صدوق ہیں[3]، (یعنی ان کی روایت قابل قبول ہے)

محدث ابوسلیمان جوزجانی کو ایک بار امام احمد نے لکھا کہ اگر آپ امام محمد کی کتابون سے روایت کرنا چھوڑ دیتے تو ہم آپ کے پاس استفادۂ حدیث کے لیے حاضر ہوتے[4]، انھون نے ان کے خط کے پشت پر لکھدیا کہ آپ کا آنا نہ تو ہمین بلند کر دے گا، اور نہ نہ آنا پست کر دے گا، کاش میرے پاس امام محمد کی کتابون کا اتنا ذخیرہ ہوتا کہ مین صرف انہی کی روایتیں بیان کرتا[5]،

ذہبی نے لکھا ہے کہ امام شافعی نے حدیث مین امام محمد سے احتجاج کیا ہے[6]، میزان مین لکھتے ہیں،

کان محمد بن حسن من بحور العلم والفقہ قویا فی مالک[7]	امام محمد علم اور فقہ کے سمندر تھے، اور امام مالک کی مرویات مین قوی تھے،

محدث دار قطنی جو امام صاحب اور ان کے تلامذہ کے بارے مین بڑی سخت راے رکھتے ہیں، انھیں بھی امام محمد کے فضل و کمال کا اعتراف کرنا پڑا ہے؛ "غرائب مالک" مین رفع یدین عند الرکوع کے بارے مین فرماتے ہیں، کہ

---

[1] مقدمۂ موطا امام محمد [2] بلوغ الامانی ص ۵۵ [3] تاریخ بغداد و تعجیل المنفعہ [4] غالباً اس وقت امام حنبل امام محمد کے علم و فضل اور ان کی کتابون سے واقف نہیں ہوے تھے [5] مناقب کردری ج ۲ ص ۱۵۲، [6] بلوغ الامانی ص ۵۶ [7] امام ذہبی کا یہ لکھنا صحیح نہیں ہے، کہ (دیکھیے ص ۱۴۹)

حدث به عشرون نفراً من	اس حدیث کو بیس ائمۂ ثقات نے بیان
الثقات الحفاظ منهم محمد	کیا ہے، ان بیس میں امام محمد، یحیٰی بن سعید
ابن الحسن الشيباني، يحيى بن	عبداللہ بن مبارک، عبدالرحمٰن بن مہدی
سعيد القطان وعبد الله بن	اور ابن وہب وغیرہ ہیں،
المبارك وعبد الرحمن بن	
مهدي وابن وهب وغيرهم[1]	

دوسری روایت ہے کہ

لا يستحق محمد عندي الترك[2]	میرے نزدیک امام محمد (روایت میں)
	چھوڑنے کے قابل نہیں ہیں۔

عبداللہ بن علی فرماتے ہیں، کہ میں نے اپنے والد سے امام محمد کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا صدوق سچے ہیں، امام ذہبی لکھتے ہیں:۔

انتهت اليه رياسة الفقه	عراق میں امام ابو یوسف کے بعد فقہ کی
بالعراق بعد ابي يوسف وتفقه	ریاست امام محمد پر ختم ہوگئی اور ان سے
به الائمة (ترجمه امام محمد ذهبي ص)	ائمہ نے تفقہ حاصل کیا،

خطیب نے امام محمد کے بارے میں جو جرح نقل کی ہے، اس کے متعلق ہم مولانا حبیب الرحمٰن

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) وہ صرف امام مالک کی روایتوں میں قابل استناد ہیں، اس لیے کہ امام مالک جن سے انھوں نے تھوڑی مدت استفادہ کیا ان کے بارے میں وہ قوی ہو سکتے ہیں، تو امام صاحب جن کی روایت اور علوم کی تفصیل میں انھوں نے اپنی عمر ختم کر دی ان کے بارے میں کیونکر وہ قوی بلکہ اقوی نہ ہوں گے [1] حاشیہ ترجمہ امام محمد ص ۵۰ [2] ایضاً اصل کتاب ص ۵۸ - [3] کردری ج ۲ ص ۱۵۰،

خان شروانی مرحوم کا تبصرہ نقل کر دیتے ہیں، اس سلسلہ میں اس سے جامع توجیہ نہیں کی جاسکتی، فرماتے ہیں،

"خطیب نے امام محمد کی بابت جرح بھی نقل کی ہے، جس مین بعض سخت ہیں، مگر قریباً ڈیڑھ ہزار برس کے زمانہ مین اکابر امت نے جو فیصلہ امام محمد کی عظمت کے بارے مین کیا ہے، ظاہر ہے کہ اس کے مقابلہ مین کوئی جرح قائم نہین رہ سکتی، خطیب کا قول ہے کہ جو قول مین آخر مین نقل کرون، وہی میری رائے ہے (تذکرۃ الحفاظ)

چنانچہ محمویہ کا خواب جو سب سے آخر مین نقل کیا ہے اس سے امام محمد کی تعدیل کا فیصلہ خود خطیب کے اصول کے مطابق بھی ہو جاتا ہے (معارف ۱۹۳۳ء اگست)

جرح کی غیر معتبر روایات

اس اعتراف فضل وکمال کے باوجود انہی بزرگون کی سند سے رجال وتذکرہ کی کتابون مین امام محمد کے بارے مین بعض ایسی روایتین بھی مروی ہیں، جو ان کے صحیفۂ زندگی کا بدنما داغ معلوم ہوتی ہیں، لیکن اگر ان روایتون کو اصول روایت و درایت پر پرکھا جائے تو مشکل ہی سے کوئی روایت درجۂ استناد تک پہنچیگی، بفرض محال کوئی روایت اس معیار پر پوری اتر بھی جائے تو اس کو اگر وقت نظر سے دیکھا جائے گا تو اس کی تہ مین کوئی نہ کوئی فقہی وکلامی اختلاف ضرور کارفرما ہوگا، اسی فقہی اور کلامی اختلاف کا نتیجہ تھا کہ ائمۂ اربعہ تک کو نشانۂ ملامت اور سزا وار تحقیر ٹھہرایا گیا، اور ان کے متعلق آج تک کتابون مین ایسی روایتین موجود ہیں، جن کی نسبت ایک معمولی انسان کی طرف بھی نہیں کی جاسکتی" خصوصیت سے امام صاحب اور ان کے تلامذہ کے بارے مین عام طور پر یہ مشہور تھا کہ "وہ اہل الرائے ہیں، یعنی عقل کو نقل پر ترجیح دیتے ہیں، وہ مرجی اور جہمی ہین وغیرہ وغیرہ!

اس لیے امام محمد کے بارے مین بھی انہی روایتون کا مشہور ہو جانا کوئی تعجب خیز نہیں ہے، لیکن جن ائمہ کی سند سے یہ روایتین بیان کی گئی ہیں، ہم ان کے متعلق یہ خیال نہین کرسکتے کہ انھون نے کوئی ایسی بات زبان سے نکالی ہوگی یا ان سے کوئی ایسا عمل سرزد ہوا ہوگا جو ان کے مرتبہ سے

فروتر ہو، اس وجہ سے ہم کو ان کے قبول کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

علامہ زاہد الکوثری نے تانیب الخطیب اور بلوغ الامانی مین ان تمام غلط روایتون پر جو امام صاحب اور ان کے تلامذہ کے بارے مین مشہور ہیں، بڑی تفصیل سے تنقید کی ہے، جو حصہ امام محمد سے متعلق ہے ہم اس کا خلاصہ یہان نقل کرتے ہیں۔

امام مالک کی طرف روایت منسوب ہے، کہ ایک روز انھون نے درس مین تلامذہ سے فرمایا کہ اہل عراق کی تکذیب نہ کرو، نہ تصدیق، بلکہ ان کو اہل کتاب کے درجہ مین رکھو، امام محمد بھی اس مجلس مین موجود تھے، جب امام مالک کی نظر ان پر پڑی تو وہ بہت شرمندہ ہوئے[1]، علامہ زاہد الکوثری نے اس روایت پر کوئی جرح نہین کی ہے، حالانکہ یہ روایت اس لیے صحیح نہین ہو سکتی کہ یہ معلوم ہے کہ امام ابوحنیفہ جب دوبارہ دیار نبویؐ کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے، تو امام مالک نے ان سے استفادہ و مذاکرہ کیا، اور جب تک وہ وہان رہے، بسا اوقات رات رات بھر مسجد نبویؐ مین یہ سلسلہ جاری رکھا، قاضی عیاض نے لکھا ہے کہ لیث بن سعد نے ایک دن امام مالک کو بنیذ پیتے ہوے دیکھا تو پوچھا کہ آپ بنیذ پی رہے ہیں، امام مالک نے فرمایا کہ مین نے ابوحنیفہ کے ساتھ بنیذ پی ہے، پھر لیث سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اے مصری وہ فقیہ تھے[2]،

فضائل ابوحنیفہ مین عبدالعزیز الدراوردی سے روایت ہے کہ

ان مالکا کان ینظر فی کتب ابی حنیفۃ وینتفع بھا (بلوغ ۱۹)	امام مالک امام ابوحنیفہ کی کتابون کا مطالعہ کرتے تھے اور ان سے فائدہ اٹھاتے تھے

اس استفادہ و تعلم اور اعتراف فضل و کمال کے باوجود اہل عراق کے بارے مین، جن مین امام صاحب بھی تھے، امام مالک کا کوئی ایسی بات کہنا جس سے امام صاحب یا ان کے تلامذہ کی اہانت ہوتی

---

[1] بلوغ ۱۲ [2] یہ کتاب چار حصون مین ہے کتب خانہ ظاہریہ دمشق مین اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔

مستبعد معلوم ہوتا ہے۔

امام محمد اور امام شافعی کے بارے مین غلط روایات

امام محمد سے امام شافعی کے استفادہ وتعلم کا ذکر اوپر آچکا ہے، اور امام شافعی نے امام محمد کے فضل وکمال کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور امام محمد نے ان کے ساتھ جو حسن سلوک کیے ہیں، ان کا تذکرہ بھی بہ تفصیل ہو چکا ہے، لیکن اس کے باوجود، ان بزرگون کے بارے مین تذکرہ وتراجم کی کتابون مین بعض ایسی روایتین منقول ہین جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگون مین استاد وشاگرد اور معلم ومتعلم کا تعلق نہین تھا، بلکہ ان مین آپس مین معاصرانہ چشمک تھی، اور دونون ایک دوسرے کے متقابل تھے اس لیے ضروری ہے کہ ان روایتون کو معیار تنقید پر جانچا جائے،

اوپر بیہقی کی سند سے امام رازی نے مناقب الشافعی مین یہ روایت نقل کی ہے کہ جب امام ابو یوسف اور امام محمد نے دیکھا کہ امام شافعی کا حلقۂ اثر بڑھ رہا ہے، اور خلیفہ بھی ان سے متاثر معلوم ہوتا ہے تو ان کو امام شافعی سے حسد پیدا ہوا اور انھون نے ہارون کو کسی بہانہ سے ان کے قتل پر آمادہ کیا، لیکن ہارون نے ایسا نہین کیا،[1]

یہ روایت چند وجوہ کی بنا پر صحیح نہین ہے۔

(۱) تمام اہل تذکرہ متفقہ طور پر لکھتے ہیں کہ امام شافعی پہلی بار ۱۸۴ھ مین عراق آئے، اور اس سے دو سال پہلے ۱۸۲ھ مین امام ابو یوسف کا انتقال ہوچکا تھا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس روایت کی کیا حیثیت ہے، اب رہا امام محمد کا حسد کرنا اور ہارون کو ان کے قتل پر آمادہ کرنا تو یہ بھی درایت اور روایت کسی حیثیت سے صحیح نہین ہے، حافظ ابن حجر جو خود شافعی المسلک ہین اس روایت کے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں، کہ

والذی نقل عن محمد بن الحسن | جو کچھ منافس وغیرہ امام محمد سے امام شافعی کے

---

[1] توالی التاسیس ص ۷۰ وبلوغ الامانی ص ۲۹

فی حق الشافعی لیس بثابت[1] متعلق مروی ہے، وہ اس کا ثبوت نہیں ملتا۔

(۲) امام شافعی جس وقت عراق تشریف لائے تھے، ان کو فقہ مین کوئی دست رس نہین تھی طاؤ جسے انھون نے امام مالک سے براہ راست سماع کیا تھا۔ اس کی بعض روایتیں بھی وہ اپنی کتاب مین امام محمد کے واسطہ سے نقل کرتے ہین۔ اس لیے ان دونون بزرگون مین حسد کی کوئی مشترک وجہ نہین معلوم ہوتی، اور نہ بظاہر معاصرانہ چشمک کی وجہ سمجھ مین آتی ہے

(۳) اور امام محمد کے متعلق معلوم ہے کہ وہ خلفاء و علماء سے زیادہ ملنا پسند نہین کرتے تھے، انھون نے عہدۂ قضا جو ایک خالص دینی کام تھا، اس بنا پر کہ اس کی وجہ سے دربار شاہی سے ان کو منسلک ہونا پڑے گا، قبول کرنے مین تامل کیا تھا۔ ایسے بے نیاز شخص کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ خلفاء کے یہان درخور حاصل کرنے کے لیے ایک مسلم اور پھر عزیز شاگرد کے قتل کی سازش کرے گا بالکل ہی مستبعد بات ہے۔

امام شافعی سے مناظرہ خطیب نے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک بار امام شافعی اور امام محمد سے مناظرہ ہوا، امام محمد کے جسم پر باریک کپڑا تھا، اور ان کی گردن کی تمام رگین پھول گئی تھین اور وہ غصہ مین زور زور سے چیخ رہے تھے، یہانتک کہ ان کے گریبان کے تمام بٹن کھل گیے (ج ۲ ص ۱۷۷)

اس روایت کے الفاظ بتاتے ہین کہ یہ روایت موضوع ہے، چیخنے، رگ پھول جانے اور گریبان کے تمام بٹن کھل جانے مین کیا مناسبت ہے، اس کے علاوہ یہ روایت سند کے اعتبار سے بھی کمزور ہے، اس مین دو راوی دعلج اور آبار ضعیف ہی نہین بلکہ وضاع ہیں، ان . . . . . . کے یہان وضاعین حدیث[2] کا جمگھٹ لگا رہتا تھا۔ اور وضع حدیث ان کا خاص کام تھا، آبار امام حنبل[3] اور ان کے تلامذہ کے بارے مین اس قسم کی روایتین نقل کرنے میں بہت ہی بے باک ہے۔[4]

---

[1] توالی التاسیس ص ۰، بلوغ الامانی ص ۲۹ [2] مثلاً ابوالحسن عطار علی الرصافی وغیرہ [3] بلوغ الامانی ص ۲۱ -

قطع نظر اس سے خود تاریخ خطیب مین دوسری روایت جو اسی صفحہ مین درج ہے اس سے پہلی روایت کی تردید ہو جاتی ہے، ربیع فرماتے ہین کہ مجھ سے امام شافعی نے فرمایا۔

مانا ظرت احدا الا تغیر وجهه ما خلا محمد بن الحسن (ج ۲ ص ۱۷۷)	بجز امام محمد کے مین نے جس سے بھی مباحثہ کیا اس کے چہرہ کا رنگ بدل گیا،

لیکن اس روایت مین بھی دو راوی ابن رازق اور ابو عمرو بن سماک ضعیف ہین۔

اس سلسلہ کی صحیح روایتون مین ناظرت کے بجاے سالت (مین نے پوچھا) یا سئل (پوچھا گیا) کا لفظ ہے، صمیری ربیع کے حوالہ سے روایت کرتے ہین کہ امام شافعی نے فرمایا کہ

ما سالت احدا عن مسئلة الا تبین لی تغیر وجهه الا محمد بن الحسن (بلوغ ۲۵)	مین نے جب بھی کسی سے کوئی مسئلہ دریافت کیا تو اس کا چہرہ بدل گیا بجز محمد بن حسن کے،

حافظ ابن عبد البر کی روایت مین یہ الفاظ ہین۔

سمعت الشافعی یقول ما رأیت احدا سئل عن مسئلة فیها نظر الا رایت الکراهة فی وجهه الا محمد بن الحسن	مین نے امام شافعی سے سنا ہے فرماتے تھے کہ جس سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا مین نے اس کے چہرہ پر ایک گھبراہٹ دیکھی بجز محمد بن حسن کے،

(انتقاء ۶۹)

مناقب کردری مین یہ روایت تقریباً انہی الفاظ مین ہے (ج ۲ ص ۱۵۶)

ان روایتون سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ امام محمد اور امام شافعی مین جو علمی مذاکرے ہوتے تھے ان کی حیثیت مناظرہ کی نہین بلکہ ایک مستفید اور مفید کے درمیان سوال وجواب کی ہوتی تھی،

امام صاحب اور امام مالک مین موازنہ

خطیب نے اپنی تاریخ مین یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ امام محمد اور امام شافعی کے درمیان اس بارے مین بھی گفتگو ہوئی کہ امام ابوحنیفہ اور امام مالک مین علم کے اعتبار سے کون افضل ہے، امام شافعی نے امام محمد سے قسم دیکر پوچھا

هل تعلم ان صاحبي (مالک) کان اعلم بکتاب الله قال نعم قلت کان عالما بحدیث رسول الله صلی الله علیه وسلم قال نعم قال افما کان عاقلا قال نعم قال افما کان صاحبک (ابوحنیفه) جاهلا بکتاب الله وبما جاء رسول الله قال نعم

(تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۷۸)

اس کا تو آپ کو علم ہے کہ میرے استاد امام مالک کتاب اللہ کے سب سے بڑے عالم ہین امام محمد نے اثبات مین جواب دیا پھر پوچھا کہ وہ حدیث کے ممتاز عالم ہین بولے ہان، پھر کہا کیا وہ عقل وفہم میں بڑھے ہوئے نہیں ہیں بولے ہان، پھر کہا کہ ابوحنیفہ اور آپ کے استاذ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ دونوں سے ناواقف نہیں ہیں، بولے ہان۔

اس روایت مین دو راوی وعلج اور علی الابار ہیں، جن کے وضاع ہونے کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، حافظ ابن عبدالبر اور اسحاق شیرازی نے بھی اس روایت کو اپنی کتابون مین جگہ دی ہے لیکن ان مین سے کسی کی روایت مین امام صاحب کے جاہل ہونے کا ذکر نہین ہے، یہ صرف خطیب کی اپچ معلوم ہوتی ہے۔

اس سلسلہ کی جتنی روایتیں ہیں ان سب کے الفاظ مین بیحد اختلاف و اضطراب ہے، جس سے متن کے ضعف کی طرف بھی قوی اشارہ ہوتا ہے، اور سند ومتن کے ضعف سے قطع نظر اگر عقل و درایت کے معیار پر اس روایت کو پرکھا جائے تو اس کے موضوع ہونے مین کوئی شبہ باقی نہین رہتا۔

اگر امام محمد کو یہ علم تھا کہ امام صاحب کتاب وسنت سے جاہل ہین تو پھر امام صاحب سے تلمذ اور

تعلم کی کیا وجہ تھی، کیا کسی جاہل کے سامنے بھی زانوے تلمذ تہ کیا جاتا ہے۔

امام شافعی کا امام محمد کے مقابلہ مین امام مالک کو صاحبی (میرے استاد) کہنا بھی صحیح نہین ہے اس لیے کہ امام شافعی نے صرف آٹھ مہینے امام مالک سے استفادہ کیا تھا لیکن امام محمد مسلسل تین برس تک ان کی خدمت مین رہے، اور سماع حدیث کیا، اور پھر امام شافعی کی روایت سے موطا کا کوئی نسخہ مروی نہین ہے، لیکن امام محمد کی روایت سے موطا کا نسخہ آج بھی موجود ہے، نیز امام محمد نے امام شافعی سے ایک روایت بھی امام مالک کی سند سے نہین کی ہے، لیکن امام شافعی نے امام محمد کے واسطہ سے انکی متعدد روایتین اپنی کتابون مین نقل کی ہیں، ان وجوہ کی بناپر امام مالک کو صاحبی کہنے کا حق تو امام شافعی سے زیادہ امام محمد کو تھا، ظاہر ہے کہ یہ راویون کی خودساختہ روایت ہے اسی لیے روایت کی کوئی کل سیدھی نہین ہے۔

امام محمد دونون امامون کے فیض یافتہ تھے، اس لیے ان دونون بزرگون کے درمیان صاحبی وصاحبک کے لفظ سے موازنہ کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے، اس سلسلہ کی سب سے زیادہ صحیح روایت وہ ہے جسے قاضی ابوالعاصم نے اپنی مبسوط میں نقل کیا ہے۔ روایت ہے۔

ان الشافعی سأل محمدا ایما	امام شافعی نے امام محمد سے پوچھا کہ امام ابوحنیفہ اور
اعلم مالك وابوحنیفة فقال	امام مالک مین کون بڑا عالم ہے؟ امام محمد نے پوچھا کس چیز
محمد بماذا قال بکتاب اللّٰه فقال	مین بولے کتاب اللہ کے علم مین، امام محمد نے
ابوحنیفة فقال من اعلم	کہا کہ ابوحنیفہ، پھر انھون نے پوچھا سنت
بسنة رسول اللّٰه فقال ابوحنیفة	رسول اللہ کو کون زیادہ جانتا ہے، بولے
اعلم بالمعانی ومالك اهدی[۵۲]	ابوحنیفہ سنت کے معانی سے زیادہ واقف تھے

---

[۵۲] یہ کتاب تیس جلدون میں ہے، قاضی صاحب، امام سرخسی صاحب مبسوط کے طبقہ شیوخ مین ہین، ۲؎ تانیب الخطیب

اس روایت کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ دونوں اماموں کے بارے میں امام محمد ایسی ہی متوازن اور صحیح رائے دے سکتے تھے جس کی تائید واقعات سے بھی ہوتی ہے،

یہ بات دوست دشمن سب کو معلوم ہے کہ امام صاحب استنباط مسائل میں سب سے پہلے قرآن کی طرف رجوع کرتے تھے اُن میں اس قدر شدت تھی کہ جب تک تلامذہ قرآن حفظ نہیں کر لیتے تھے وہ انھیں اپنی مجلس درس میں شریک نہیں کرتے تھے، جہاں تک ائمہ حدیث کی روایت وحفاظت کا تعلق ہے، امام مالک یقیناً اس ذخیرہ کے بہت بڑے حافظ وامین تھے، اور اس کے جمع کرنے میں انھوں نے بڑی سعی وجہد سے کام لیا تھا، لیکن بہر حال یہ بات ماننی پڑے گی کہ امام مالک کی نظر احادیث کے الفاظ پر زیادہ اور معانی پر کم تھی، اور امام صاحب کی نظر الفاظ پر کم اور معانی پر زیادہ ہوتی تھی، یہی وجہ ہے کہ امام مالک کے مستنبط مسائل کی تعداد اتنی نہیں ہے جتنی امام صاحب کے مستخرج مسائل کی ہے، کیونکہ استنباط اور استخراج کے لیے ضروری ہے کہ الفاظ سے زیادہ معانی پر نظر رکھی جائے، امام محمد نے اس کے بارے میں جو بات کہی ہے، اس سے زیادہ کوئی منصفانہ بات نہیں کہی جا سکتی۔

امام شافعی اور امام محمد کے بارے میں بعض اور کمزور روایتیں بھی تذکروں میں مذکور ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی معیار صحت پر پوری نہیں اترتی، طوالت کے خیال سے ان کو . . . ہم نظر انداز کرتے ہیں،

امام ابو یوسف اور امام محمد کے اختلافات کی حقیقت

اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ امام محمد عہدۂ قضا قبول کرنے سے گریز کرتے تھے، لیکن امام ابو یوسف مصلحۃً چاہتے تھے کہ وہ اسے قبول کر لیں، چنانچہ انھوں نے یحییٰ برمکی کے ذریعہ امام محمد کو اس طرح مجبور کر دیا کہ انھیں لاچار یہ عہدہ قبول کرنا پڑا، امام ابو یوسف کے اس اقدام سے امام محمد بہت زیادہ کبیدہ خاطر اور ناراض ہوئے اور ان کی یہ کبیدگی اس قدر بڑھی کہ انھوں نے امام ابو یوسف سے تقریباً ترک تعلق کر لیا، لیکن ان کی یہ ناراضگی

بے تعلقی نفسانیت اور حصول اعزاز کے لیے نہین تھی، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ اصول اور مصلحت کی جنگ تھی، یعنی امام محمد اسلاف اور خود امام صاحب کے اتباع کے خیال سے دربارشاہی سے منسلک ہونا نہین چاہتے تھے، لیکن امام ابویوسف اپنے مسلک کی اشاعت کے لیے ان کا اس عہدہ پر فائز ہونا مفید سمجھتے تھے،

دونون بزرگون مین شکررنجی اور وجہ اختلاف اتنی ہی بات تھی، لیکن اس سلسلہ مین تذکرون اور فقہ حنفی کی کتابون کے ذریعہ بے بنیاد اور غلط روایتین رواج پاگئی ہین، اس لیے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ان پر ایک ناقدانہ نگاہ ڈال لیجائے، تاکہ اصل حقیقت واضح ہوجائے،

کردری نے مناقب مین اور سرخسی نے شرح السیر الکبیر مین اس اختلاف کی یہ وجہ بتائی ہے کہ امام محمد کی ذکاوت وذہانت اور ان کی طرف عام رجحان اور ان کے درس کی شہرت کی بنا پر امام ابویوسف ان سے حسد کرتے تھے، اور ان کی شہرت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے رہتے تھے، کہ اگر ہارون رشید کو، ان کے ان اوصاف کی اطلاع ہوگئی اور اس نے امام محمد کو دربار شاہی سے منسلک کرلیا تو ان کی عزت کم ہوجائیگی[1]، چنانچہ یہی چیز دونون آدمیون مین اختلاف اور منافرت کا سبب ہوئی، سرخسی ایک محقق آدمی ہین، ان کی کتاب مین ایسی غلط روایت کا داخل ہوجانا بہت تعجب خیز معلوم ہوتا ہے، لیکن غالبًا یہ روایت ان کو اس وقت پہنچی تھی جب وہ قیدخانہ مین تھے، اور قیدخانہ کی کھڑکی سے طلبہ کو املا کراتے تھے، اس لیے ان کو تحقیق کا موقع نہ ملا ہو، اور روایت کتاب مین داخل ہوگئی ہو، اس روایت کی اگر کوئی بنیاد ہوتی تو کم از کم مخالفین کی کتابون مین اس کا تذکرہ ضرور ہوتا، لیکن سرخسی اور کردری کے علاوہ کسی نے اپنی کتاب مین اس روایت کو جگہ نہین دی ہے،

اگر ذرہ تامل سے کام لیا جائے تو خود عقل اس کے قبول کرنے سے ابا کرتی ہے، اس لیے امام

---

[1] مناقب کردری ص ۱۶۶ بلوغ ص ۳۰،

ابو یوسف اور امام محمد کا تعلق معاصرانہ نہین بلکہ استاد و شاگرد کا تھا، اور اس تعلق مین رشک و حسد خصوصاً برگزیدہ ہستیون مین بے معنی سی بات ہے، اور پھر امام ابو یوسف بغداد مین قاضی تھے، اور امام محمد کی مجلس درس کوفہ مین تھی، اس بعد مسافت کے باوجود، امام محمد کی ذکاوت یا ان کی طرف عام رجحان کا اثر، امام ابو یوسف کی شخصیت پر کیا پڑ سکتا تھا۔ جب کہ دونون کے فخر و اعزاز کی نوعیت بالکل جدا تھی،

یہ روایت اس نقطۂ نظر سے بھی قابل غور ہے کہ امام ابو یوسف کو امام محمد سے رشک و حسد کب پیدا ہوا، عہدۂ قضا قبول کرنے سے پہلے یا اس کے بعد؟ اگر یہ جذبہ بعد مین آیا تو پھر روایت کا یہ ٹکڑا کہ "امام ابو یوسف، ہارون سے ان کے اوصاف مخفی رکھنا چاہتے تھے، کیسے صحیح ہو سکتا ہے، اس لیے کہ عہدۂ قضا قبول کرنے کے بعد تو بارہا امام محمد کو براہ راست ہارون سے، مسائل پر گفتگو کرنے کا موقع ملا ہوگا، جیسا کہ واقعات سے پتہ بھی چلتا ہے، اور بعض روایتون مین ہے کہ خود ہارون ہی نے ان کو اس عہدہ کے لیے منتخب کیا تھا، اگر یہ روایت صحیح تسلیم کر لی جائے، تو رشک و حسد کی روایت بالکل ہی بے معنی ہو جاتی ہے، اس لیے کہ ہارون کو اس سے پہلے ان کے علم و فضل کی اطلاع مل چکی ہوگی، پھر اس نے ان کا انتخاب کیا ہوگا، تو پھر اخفا کے کیا معنی ہوے، اور اگر امام ابو یوسف کو رشک و حسد عہدۂ قضا قبول کرنے سے پہلے پیدا ہوا تو پھر انھون نے ان کے قاضی مقرر کیے جانے کی کوشش کیون کی، جب کہ یہ چیز ہارون سے درخور کا ذریعہ ہو سکتی تھی،

یہ عجیب بات ہے کہ امام سرخسی اور کردری نے امام محمد کے جن اوصاف کے اخفا کو امام ابو یوسف سے ان کے اختلاف کا سبب قرار دیا ہے، امام ذہبی نے انھی اوصاف کے اظہار و اعلان کو انکی رنجش کا سبب بتایا ہے، محمد بن سماعہ کا جو امام محمد کے محبوب شاگرد ہیں، بیان ہے کہ امام محمد اور امام ابو یوسف مین رنجش کا سبب یہ ہوا کہ قاضی ابو یوسف سے رقہ کے قاضی کے انتخاب کے سلسلہ مین

مشورہ کیا گیا، انھون نے فرمایا کہ میری نگاہ مین امام محمد سے زیادہ بلند مرتبہ اور اس منصب کے لیے کوئی دوسرا موزون نہین ہے، ان کے اسی مشورہ پر امام محمد کو کوفہ سے بغداد بلایا گیا، بغداد آنے کے بعد وہ سیدھے امام ابویوسف کے پاس پہنچے، اور ان سے اس انتخاب کی وجہ دریافت کی، امام ابویوسف نے کہا کہ یہ مشورہ مین نے ہی سوچکر دیا کہ کوفہ و بصرہ اور تمام مشرق مین ہمارے مسلک حنفی کی کافی اشاعت ہوچکی ہے، اگر آپ قاضی ہوکر شام چلے جائین گے، تو وہان بھی آپ کے ذریعہ اس کی اشاعت ہوگی، امام محمد نے اس کو کچھ زیادہ پسند نہین کیا اور فرمایا کہ اگر انتخاب کی یہی وجہ ہے تو کیا یہ کام اس وقت مین انجام نہین دے رہا ہون[1]، اور بعض روایتون مین ہے کہ انھون نے امام ابویوسف سے فرمایا کہ آپ کی عنایت اور استادانہ شفقت سے مجھے توقع ہے کہ آپ مجھے اس آزمایش مین نہ ڈالین گے[2] اس گفتگو کے بعد امام ابویوسف ان کو یحیٰی برمکی کے پاس لے گیے، اور اس سے کہا کہ یہ امام محمد آپ کے سامنے موجود ہین ان سے (قضا) کے معاملات طے کر لیجیے، چنانچہ یحیٰی برمکی نے امام محمد سے کچھ ایسا اصرار کیا اور دباؤ ڈالا کہ وہ عہدۂ قضا قبول کرنے پر مجبور ہو گیے[3]،

امام محمد غالباً امام صاحب کے اتباع کی وجہ سے اس عہدہ کو پسند نہین کرتے تھے، اور چونکہ اس کا وسیلہ امام ابویوسف ہوے تھے، اس لیے امام محمد ان سے کبیدہ خاطر ہو گیے، چنانچہ امام ذہبی یہ روایت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہین،

وکان ذلک سبب فساد الحال	امام ابویوسف اور امام محمد کے درمیان
بین ابی یوسف و محمد بن الحسن[4]	اختلاف اور شکر رنجی کا سبب یہی واقعہ ہوا،

یہ تھی واقعہ کی اصل صورت جسے راویون کی دست اندازیون نے بالکل مسخ کر دیا تھا، اور ...... جو دونون بزرگون کے صحیفۂ زندگی پر ایک بدنما داغ معلوم ہوتا تھا۔

---

[1] ترجمہ امام محمد ذہبی ص ۲۶ [2] کردری ج ۲ ص ۱۵۶، [3] ترجمہ امام محمد ص ۵۶ [4] ایضاً۔

امام ابو یوسف کے لیے ثقہ کا لفظ کیون استعمال کیا

اس قسم کی ایک روایت سرخسی نے شرح السیر الکبیر مین بھی نقل کی ہے، کہ اس کتاب کی تصنیف کے وقت چونکہ ان دونون بزرگون مین اختلاف پیدا ہو چکا تھا، اس لیے انھون نے اس کتاب مین جہان ان سے روایت کی ہے، ان کا نام نہین لیا ہے، بلکہ اخبرنی الثقہ (ایک سچے اور ثقہ راوی نے مجھ سے بیان کیا) کے الفاظ لکھے ہیں،

یہ روایت بھی اسی نقطۂ نظر سے قابل غور ہے کہ اگر امام محمد کو ایسی ہی شدید منافرت تھی کہ ان کی اہمیت کم کرنے کے لیے روایت مین انکا نام لینا بھی پسند نہیں کرتے تھے، تو پھر ثقہ کے لفظ کے استعمال کو انھون نے کیسے پسند کیا، جبکہ اس لفظ سے ان کی اہمیت کم ہونے کے بجاے، اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، اس لیے کہ محدثین کا دستور ہے کہ وہ اکثر احتراماً اپنے مشائخ کا نام لینے کے بجائے، انکے القاب، کنیت یا کسی مخصوص صفت کا تذکرہ کر دیا کرتے ہین، اس لیے امام محمد کے اس لفظ ثقہ کے استعمال کو منافرت یا اہانت پر نہین بلکہ اعزاز و احترام پر محمول کرنا چاہیے،

امام ابو یوسف کے جنازہ مین کیون شریک نہین ہو سکے

عام تذکرون مین ہے کہ ان دونون آدمیون میں اس قدر شدید اختلاف تھا کہ امام محمد امام ابو یوسف کے جنازہ تک مین شریک نہ ہوسے، چنانچہ امام ابو یوسف کی لونڈیان رو رو کر یہ شعر پڑھ رہی تھین،

الیوم یرحمنا من کان یحسدنا الیوم نتبع من کانوا لنا تبعا[1]

یہ بات معلوم ہے کہ امام ابو یوسف کا انتقال بغداد مین ہوا، اور اس وقت امام محمد رقہ مین قاضی تھے، ظاہر ہے کہ رقہ (شام) سے بغداد (عراق) کی مسافت کچھ کم نہین ہے، اور وہ زمانہ تار برقی اور ریل اور ہوائی جہاز کا نہ تھا۔ اس لیے یہ ممکن بلکہ یقین ہے کہ امام محمد رقہ مین موجود رہے ہون گے، جہان وہ ایک روز میں بھی ان کی وفات کی اطلاع نہین پہونچ سکتی تھی، اس لیے جنازہ مین شرکت کا

[1] مناقب کردری ج ۲ ص ۱۶۶

کیا سوال ہو سکتا تھا۔

یہ تمام روایات اس تصور کا نتیجہ ہین کہ ان دونون بزرگون مین کوئی نفسانیت یا جاہ واقتدار کی جنگ تھی لیکن اگر ان کے درمیان اس قسم کی باتین ہوتین تو ارباب رجال انکی تعدیل و توثیق کے بجاے ان ہی باتون کو سبب قرار دیکر ان پر جرح و تنقید کرتے، مگر کسی ایک شخص نے بھی اس حیثیت سے انپر کوئی جرح نہین کی ہے،

تصنیفات

تدوین و تالیف کے لحاظ سے امام محمد اپنے تمام ہم عصرون مین ممتاز تھے، ان کے اقران و معاصرین مین سے کسی ایک شخص نے اتنی کثیر اور مفید تصانیف نہین چھوڑی ہیں، ان تصانیف کی افادیت واہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ائمہ اربعہ کے مسلک کے سلسلہ مین تدوین فقہ کا جو کچھ بھی کام ہوا وہ امام محمد کی کتابون یا ان کے تفریع کردہ مسائل کی روشنی مین ہوا، اور جب تک فقہی تحزب و تعصب نہین پیدا ہوا تھا اس وقت تک ہر مسلک کے فقہا اور علما ان کی کتابون سے یکسان فائدہ حاصل کرتے رہے،

اوپر ذکر آچکا ہے کہ اسد بن فرات نے امام محمد سے کس جانکاہی اور دلسوزی کے ساتھ فقہ کی تحصیل کی تھی، چنانچہ فقہ کا یہ ذخیرہ لیکر عراق سے وطن واپس جانے لگے تو راستہ مین مدینہ منورہ مین اتر پڑے، وہان امام مالک کے اصحاب و تلامذہ کے سامنے امام محمد کے تفریع کردہ مسائل کو پیش کیا، اور امام مالک کے قول سے ان مسائل کی تائید و تطبیق چاہی، اہل مدینہ نے انھین مصر جانے کا مشورہ دیا، باختلاف روایت وہ ابن وہب اور ابن قاسم کے پاس مصر پہنچے، ابن وہب نے ان مسائل کے جواب دینے سے معذوری ظاہر کی، لیکن ابن قاسم جو امام مالک کے تلامذہ مین سب سے

زیادہ ان سے مستفید ہوے تھے، انھون نے اپنی بصیرت کے مطابق جواب دیا چنانچہ اسد نے امام محمد کی فقہی تبویب کے مطابق ساٹھ جلدون مین ان تمام مسائل کو جمع کیا، اور ان کتابون کا نام اسدیہ رکھا، اسد کے یہی جمع کردہ مسائل مالکی فقہ کی مشہور کتاب مدونہ کی تدوین وتالیف کے لیے مشعل راہ ہوے،

امام شافعی جس وقت عراق گیے گو وہ امام مالک کے درس حدیث مین شریک ہو چکے تھے، لیکن فقہ مین اب تک انھین کوئی دسترس نہین تھی، چنانچہ انھون نے ساٹھ دینار صرف کرکے امام محمد کی کتابین نقل کرائین، اور کچھ عاریۃً لے کر استفادہ کیا، اس کے علاوہ ایک مدت تک اون کے درس مین شریک ہوتے رہے، اس کے بعد ان کو فقہ مین درک حاصل ہوا، جیسا کہ ان کا خود بیان ہے، کہ فقہ مین امام محمد کا سب سے زیادہ ممنون احسان ہون، گو امام شافعی خود مجتہد ہین اور انکی فقہ کا ایک خاص نہج ہے، لیکن بہرحال اس سے انکار نہین کیا جاسکتا کہ ان کے فقہی اجتہاد اور تدوین مین امام محمد کی ذات کو بڑا دخل ہے۔

امام احمد بن حنبل کے متعلق تمام اہل تذکرہ نے لکھا ہے کہ ان سے دریافت کیا گیا، کہ آپ نے یہ دقیق مسائل کس سے حاصل کیے ہین تو آپ نے فرمایا کہ امام محمد کی کتابون سے،

غرض فقہ مین فروع کی جتنی تالیف وتدوین ہوئی ان سب کا سلسلہ کسی نہ کسی حیثیت سے امام محمد کی ذات تک ضرور منتہی ہوتا ہے،

کثرت تصانیف امام محمد کی تصنیفات کی صحیح تعداد بتانا مشکل ہے، مولانا عبدالحئی صاحب نے النافع الکبیر مین ایک روایت نقل کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تصنیفات کی تعداد ۹۹۹ ہے، لیکن یہ تعداد مبالغہ سے خالی نہین معلوم ہوتی، طاش کبری زادہ نے مفتاح السعادۃ مین لکھا ہے کہ امام محمد جو کتابین لکھنا چاہتے تھے۔ ان سے ان کی فہرست مانگی گئی، تو انھون نے جو فہرست دی، اس مین ایک ہزار کتابون کے نام درج تھے، اگر وہ زندہ رہتے تو یہ تعداد پوری کر دیتے، چنانچہ

اسی لیے کہا گیا کہ ان کی زندگی بھی رحمت تھی اور موت بھی، اس لیے کہ اگر وہ زندہ رہتے اور یہ تمام کتابیں مکمل کر دیتے تو اس سے استفادہ کرنے والے تھک جاتے، اس سے معلوم ہوا کہ انھون نے ایکہزار کتابین لکھیں نہین بلکہ لکھنا چاہتے تھے

عام ارباب تذکرہ اور خصوصاً ابن ندیم نے جن کتابون کا ذکر کیا ہے، ان کی تعداد ۲۳ سے متجاوز نہین ہے، اب ہم تفصیل سے ہر کتاب کی اہمیت اور اس کی خصوصیات پر بحث کرتے ہیں،

موطاے امام مالک | دوسری صدی مین حدیث کے جتنے مجموعے مرتب ہوے ان مین ترتیب و تدوین کے لحاظ سے موطا امام مالک سب سے زیادہ جامع اور اہم ہے، یہی وجہ تھی کہ اس وقت تمام عالم اسلام سے تشنہ کامان حدیث موطا کے سماع کے لیے امام مالک کی خدمت مین جوق در جوق آتے تھے، اور اکثر اہل علم امام مالک سے جو کچھ سنتے تھے، اسے تحریر مین لاتے جاتے تھے، ظاہر ہے کہ ہر شخص کے سماع اور تحریر مین کچھ نہ کچھ فرق ہوتا تھا، اسی وجہ سے تھوڑی کمی و بیشی کے ساتھ موطا کے متعدد نسخے تیار ہو گیے، اور ہر صاحب نسخہ نے اپنے حلقہ مین اپنے ہی نسخہ کو رواج دیا، سیوطی نے تنویر الحوالک مین ان کی تعداد چودہ اور شاہ عبد العزیز صاحب نے بستان المحدثین مین سولہ بتائی ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب نے ۳ نسخون کا ذکر کیا ہے، (مسوی ص ۱۲) ان ہی نسخون مین ایک نسخہ امام محمد کی روایت سے بھی مروی ہے، لیکن ان تمام نسخون مین کچھ نہ کچھ فرق موجود ہے اور خصوصیت سے امام محمد کے مدونہ نسخہ مین اور زیادہ فرق ہے۔

موطاے امام محمد | موطا کے جتنے نسخے موجود ہیں، ان مین یحییٰ بن یحییٰ مصمودی کا مروی نسخہ سب سے زیادہ معتبر سمجھا جاتا ہے، ہندوستان مین یہی نسخہ زیادہ مروج ہے، اور زرقانی وغیرہ نے شرح بھی اسی کی لکھی ہے، لیکن بعض وجوہ سے امام محمد کا روایت کردہ نسخہ اس سے بھی زیادہ معتبر اور افادیت کا حامل ہے، اب ہم ان وجوہ کی تفصیل کرتے ہین۔

(۱) یحییٰ بن یحییٰ امام مالک کی خدمت مین صرف چند ماہ رہے، انھون نے ابھی موطا کا

ل مفتاح السعادۃ ص ۱۰۸

سماع ختم بھی نہیں کیا تھا کہ امام مالک دنیا سے رخصت ہوگئے، اور امام مالک کے بعد ان کے تلامذہ سے سماع کی تکمیل کی، امام محمد امام کے مخصوص تلامذہ میں نہیں ہیں، لیکن وہ تین برس تک امام کی خدمت میں رہے، اور ان سے ... سے زیادہ حدیثیں سماع کیں، اس لیے اس اصول کے ماتحت کہ قلیل الملازمت کی روایت سے ... طویل الصحبت کی روایت قوی ہوتی ہے، امام محمد کے نسخہ کو یقیناً ترجیح ہونی چاہئے،

(۲) یحییٰ کے روایت کردہ موطا میں کثرت سے مسائل فقہیہ اور امام مالک کے اجتہادات مذکور ہیں، بہت سے تراجم ابواب ایسے ہیں جن کے تحت کوئی حدیث نہیں ہے، لیکن موطائے امام محمد کی یہ خصوصیت ہے کہ کوئی ترجمہ ایسا نہیں ہے جس کے تحت مرفوع یا موقوف روایت نہ ہو، اور ظاہر بات ہے کہ حدیث کی جس کتاب میں رائے واجتہاد کا شمول ہوگا، اس کے مقابلہ میں حدیث کی وہ کتاب جو نفس حدیث پر مشتمل ہوگی اس کو ضرور افضلیت ہوگی،

(۳) یحییٰ کے نسخہ میں صرف امام مالک کی روایتیں مروی ہیں، لیکن امام محمد کے نسخہ میں دوسرے شیوخ کی روایتیں بھی شامل ہیں، اور ظاہر بات ہے کہ اس زیادتی میں افادیت کا پہلو نمایاں ہے،

موطائے امام محمد کی فنی خصوصیت اور ان کا طریقۂ روایت

امام محمد نے موطا میں جو طریقۂ روایت اختیار کیا ہے، اور جن فنی خصوصیات کا لحاظ کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) وہ پہلے ترجمۃ الباب یعنی مضمون کی سرخی قائم کرتے ہیں، پھر اسی کے ذیل میں امام مالک سے کوئی مرفوع یا موقوف روایت درج کرتے ہیں اور وہ لفظ حدیث کے بجائے عموماً لفظ اثر استعمال کرتے ہیں۔ اور اس سے مرفوع اور موقوف دونوں طرح کی روایتیں مراد ہوتی ہیں۔

(۲) ہر عنوان کی ابتداء باب یا کتاب سے اور کبھی کبھی لفظ ابواب سے کرتے ہیں، جس جگہ نسخوں کا اختلاف دکھلانا مقصود ہوتا ہے وہاں لفظ فصل لکھ دیتے ہیں۔

(۳) ایک مضمون کی ایک یا چند حدیثیں نقل کرنے کے بعد بہ نأخذ یا بہذا نأخذ کہہ کر اپنے

مسلک کی طرف اشارہ کر دیا کرتے ہیں۔ اور جو حدیثیں ان کے مسلک کے موافق نہیں ہوتیں ان کی طرف بھی اشارہ کرتے جاتے ہیں۔

(۴) عام طور پر وہ لفظ اخبرنا اور حدثنا میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ جیسا کہ متاخرین کا طریقہ ہے، وہ اپنے شیوخ سے جتنی روایتیں کرتے ہیں ان میں زیادہ تر لفظ اخبرنا استعمال کرتے ہیں۔ اگرچہ اوپر کے لوگ آخری لفظ حدثنا استعمال کرتے ہیں۔

(۵) اپنی رائے ظاہر کرنے کے بعد کبھی کبھی امام صاحب کی رائے کا ذکر بھی "وھو قول ابی حنیفہ" کہکر کر دیا کرتے ہیں۔ امام صاحب کی رائے کے ساتھ ان کے استاد ابراہیم نخعی اور کبھی کبھی والعامۃ من فقہائنا کہکر کوفہ و عراق کے عام فقہا کی رائے کا ذکر بھی کر دیا کرتے ہیں۔

(۶) وہ بہت سے مسائل کے سلسلہ میں ہذا احسن یا جمیل و مستحسن وغیرہ الفاظ استعمال کرتے ہیں، اس سے ان کی مراد موکدہ یا سنت غیر موکدہ ہوتی ہے، اور جہاں وہ ینبغی کا لفظ استعمال کرتے ہیں، اس سے ان کی مراد سنت موکدہ یا واجب ہوتی ہے۔ اور ربما اوقات لا باس کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں، اس سے ان کی مراد اس حکم کا جواز ہوتا ہے۔

(۷) غیر مستند احادیث کے لیے وہ لفظ بلغنا استعمال کرتے ہیں۔ ایسی حدیث کو اصطلاح میں بلاغیات کہا جاتا ہے ہر محدث کی بلاغیات کو محدثین قابل استناد نہیں سمجھتے مگر امام محمدؒ کی بلاغیات کے بارے میں صاحب رد المحتار لکھتے ہیں۔

ان بلاغاتہ مستندۃ ‏ ‏ ‏ ‏ ان کی بلاغیات مستند ہوتی ہیں۔

(۸) موطا کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ اس میں کوئی موضوع روایت نہیں ہے البتہ کچھ ضعیف روایتیں ضرور ہیں۔ مگر انکا ضعف متابعت کی وجہ سے دور ہو جاتا ہے یعنی وہ روایتیں چونکہ متعدد طریقوں سے مروی ہیں اس لیے اگر کوئی طریقہ اسناد کمزور ہو تو دوسرا قوی طریقہ اسناد

اس کے ضعف کو دور کر دیتا ہے یا پھر ایسا ہوتا ہے کہ وہی روایت دوسری کتب حدیث مین کسی دوسرے صحیح طریقے سے مروی ہوتی ہے جس سے اس کا ضعف باقی نہین رہتا[1]۔

کتاب الآثار | حدیث و آثار میں امام محمدؒ کی دوسری تصنیف کتاب الآثار ہے، اس میں احادیث نبویؐ کم اور آثار صحابہ و تابعین کثرت سے ہیں، غالباً اسی لیے اس کا نام کتاب الآثار پڑا ہے۔ اس کتاب مین کل ۶ ۶ مرفوع ۷ ۲ موقوف و مرسل حدیثین ۲۱ بلاغیات اور سات سو اٹھارہ آثار صحابہ و تابعین ہیں۔ ان کے علاوہ امام ابو حنیفہؒ اور خود امام محمدؒ کے اقوال ہین، اس کتاب کی چند خصوصیتین یہ ہیں۔

(۱) اس مین کثرت سے اپنے شیخ الشیوخ ابراہیم نخعیؒ سے امام ابو حنیفہ کے واسطہ سے روایت کرتے ہیں، امام ابو حنیفہ کے علاوہ صرف پندرہ شیوخ سے روایتین کی ہیں۔

اس کتاب کی نقل روایت کا محدثین نے اور خاص طور سے فقہا نے ہمیشہ اہتمام رکھا۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس کتاب کے رواۃ کی جرح و تعدیل پر مستقلاً دو رسالے لکھے تھے۔ ایک کا نام الایثار بمعرفہ الآثار ہے اور دوسرے کا نام معلوم نہ ہو سکا۔

کتاب الحجج | فن حدیث و آثار مین یہ ان کی تیسری تصنیف ہے، اس کا پورا نام کتاب الاحتجاج علی اہل المدینہ ہے۔

امام محمد گو امام مالکؒ کے شاگرد تھے اور ان سے موطا کا سماع کیا تھا۔ مگر اس کے باوجود انکو امام مالکؒ اور علمائے مدینہ کے بعض خیالات اور رایون سے اختلاف تھا، اس کتاب مین انھون نے انہی باتون کا جواب دیا ہے اور ان کے خلاف حجت قایم کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کے متعدد قلمی نسخے مدینہ منورہ وغیرہ کے کتب خانون مین ہیں، ہندوستان مین

---

[1] یہ پوری تفصیل مولانا عبد الحئی فرنگی محلیؒ کے مقدمۂ موطا سے لی گئی ہے۔

اس کا کچھ حصہ طبع ہو چکا ہے گو اس قت بہت ہی کم یاب ہے، ۱۹۴۵ء میں حضرۃ الاستاد جناب سید سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ سورت جانے کا اتفاق ہوا تھا وہاں اس کا مطبوعہ حصہ مفتی مہدی حسن[1] صاحب کے کتب خانے میں موجود تھا، راقم کو وہیں اس نسخے کو دیکھنے کا موقع ملا جس سے ان کے شیوخ کی فہرست بھی تیار کی تھی وہ فہرست تو گم ہو گئی مگر حافظہ میں اتنی بات محفوظ ہے کہ اس میں انھوں نے تقریباً ۸۰ شیوخ سے روایتیں کی ہیں، اتنے شیوخ سے انھوں نے کسی اور کتاب میں روایت نہیں کی ہے۔ یہ کتاب دارالمصنفین کے کتبخانہ میں موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مستند روایتوں کا ایک مجموعہ بھی امام محمدؒ نے مرتب کیا تھا جو مسند ابو حنیفہ اور نسخہ محمد کے نام سے مشہور ہے۔

حدیث و آثار کی مذکورۂ بالا کتابوں کے علاوہ فقہ میں ان کی متعدد مبسوط و غیر مبسوط کتابیں ہیں انھوں نے فقہ میں جو کتابیں لکھیں یا املا کرائیں وہ دو طرح کی ہیں، ایک کو فقہا ظاہر الروایۃ کہتے ہیں، دوسری کو غیر ظاہر الروایۃ کہتے ہیں، یعنی پہلی قسم کی کتابوں کی روایتیں عام طور پر مشہور و معروف ہیں۔ اور دوسری قسم کی کتابوں کی روایتیں غیر معروف و غیر مشہور ہیں۔ ظاہر الروایۃ میں ان کی چھ کتابوں کا شمار ہوتا ہے، مبسوط، جامع صغیر، جامع کبیر، السیر الصغیر، السیر الکبیر، زیادات۔

مبسوط، یہ کتاب اسم با مسمیٰ ہے، یعنی فقہ میں امام محمد کی سب سے ضخیم اور مبسوط کتاب ہے، جو ابھی تک طبع نہیں ہو سکی ہے، اس کے متعدد قلمی نسخے استنبول اور مصر کے کتب خانوں میں موجود ہیں، پوری کتاب چھ جلدوں میں ہے جس کی مجموعی ضخامت تین ہزار صفحات سے زیادہ ہے، اس میں دس ہزار سے زیادہ مسائل مذکور ہیں۔ مسائل کے بیان میں عموماً آثار و احادیث سے ان کے دلائل کا ذکر بھی کرتے جاتے ہیں۔ ان میں جو آثار و احادیث ہیں اگر ان کو علیحدہ کر لیا جائے تو ایک مختصر مجموعہ حدیث

---

[1] موصوف اس وقت دار العلوم دیو بند کے مفتی ہیں۔

وآمادہ تیار ہو جائے، اس کتاب کے بارے میں بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد حکیم نام کے ایک عیسائی یا یہودی نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس نے کہا کہ جب تمہارے محمد اصغر کی کتاب ایسی ہے تو تمہارے محمد اکبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کتاب کیسی ہوگی؟

(۲) الجامع الکبیر | فقہ میں امام محمد کی یہ دوسری اہم تصنیف ہے، اس کتاب کے متعدد قلمی نسخے استنبول کے مختلف کتبخانوں میں موجود ہیں، اس کتاب کے متعدد راوی ہیں جن میں ایک علی بن معبد بن شداد ہیں، اس میں بہت ہی اہم اور نادر مسائل پر گفتگو کی گئی ہے، یہ کتاب روایت و درایت دونوں کا بہترین مجموعہ ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ علمائے فقہ کے ان اقوال سے کیجئے، ابن شجاع کہتے ہیں۔

اسلام میں فن فقہ پر ایسی کتاب نہیں لکھی گئی، امام ابو بکر الرازی اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ فن نحو کے بعض ماہرین جیسے ابو علی فارسی وغیرہ سے میں جامع کبیر پڑھتا تھا تو وہ کتاب کے مصنف کی نحوی مہارت پر حیرت کرتے تھے۔

عربی ادب ولغت کے امام اخفش اور علامہ شریف النقیب وغیرہ نے بھی اس کتاب کی عربیت کی تعریف کی ہے، اسی طرح امام ابن تیمیہ نے بھی اس کی عربیت کا اعتراف کیا ہے غرض جمہور علما کا متفقہ فیصلہ ہے کہ یہ کتاب جس طرح فقہ میں حجت ہے اسی طرح عربیت میں بھی حجت ہے اس کتاب کی اہمیت ہی کے پیش نظر اس کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں جو۔۔۔ ممتاز فقہائے مجتہدین نے لکھی ہیں۔

(۳) الجامع الصغیر، | فقہ میں امام محمد کی یہ تیسری تصنیف ہے، اس کتاب میں ۱۵۳۲ مسائل ہیں جن میں صرف دو قیاسی مسئلے ہیں بقیہ تمام کا ماخذ حدیث نبوی و آثار سلف ہیں، یہ کتاب مولانا عبد الحی صاحبؒ کے حاشیہ کے ساتھ چھپ گئی ہے، اس کتاب کی بھی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں۔ مولانا عبد الحی صاحبؒ نے کتاب پر حاشیہ کے ساتھ ایک مقدمہ بھی "النافع الکبیر لمن یطالع الجامع الصغیر" کے نام سے لکھا ہے، جس میں اس کی تمام خصوصیات اور شراح کے نام تفصیل سے لکھ دیئے ہیں

اس کی وجہ تصنیف یہ ہے کہ جب امام محمد مبسوط کی تالیف سے فارغ ہو گیے تو امام ابو یوسف نے ان سے یہ فرمایش کی کہ وہ ایک ایسی کتاب لکھیں جس مین ان روایتون کو جمع کر دین جو مین نے . . . امام صاحب کے واسطہ سے ان کو کو سماع کرائی ہیں۔ چنانچہ انھون نے یہ کتاب مرتب کرکے امام ابو یوسف کے سامنے پیش کر دی، امام ابو یوسف نے دیکھا تو فرمایا کہ "میری روایات کو بڑے عمدہ طریقہ سے انھون نے محفوظ رکھا ہے، صرف تین مسئلون مین غلطی کی ہے" امام محمد نے جب سنا تو فرمایا کہ مین نے غلطی نہین کی ہے، بلکہ وہ خود اپنی روایت بھول گئے ہیں، بعض اہل تذکرہ کہتے ہیں کہ امام ابو یوسف اپنی جلالت علم کے باوجود اس کتاب کو حضر و سفر میں برابر ساتھ رکھتے تھے۔

(۴) السیر الصغیر فقہ مین ان کی یہ چوتھی کتاب ہے، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے سیر و مغازی پر اپنے تلامذہ کو جو کچھ املا کرایا تھا۔ اس کو ان کے متعدد تلامذہ نے کتابی شکل مین جمع کر دیا تھا ان ہی مین امام محمد کی یہ کتاب بھی ہے اسی کتاب کا رد امام اوزاعی نے لکھا تھا اس کا جواب امام ابو یوسف نے بھی دیا تھا۔ اور امام محمد نے بھی، امام ابو یوسف کا جواب کتابی شکل مین الرد علی سیر الاوزاعی کے نام سے چھپ گیا ہے اور امام محمد کا یہ جواب السیر الکبیر کے نام سے اہل علم مین متداول ہے۔

(۵) السیر الکبیر۔ یہ کتاب امام اوزاعی کے جواب مین لکھی گئی تھی، مگر اب یہ سیر و مغازی کا بہترین ذخیرہ شمار کی جاتی ہے، اس مین آپ کو جہاد و قتال اور صلح و جنگ کے طریقے۔ اس کے مواقع، دوسری قومون سے مسلمانون کے تعلقات اور تجارت اسلام مین ان کے حقوق اور دوسرے معاملات پر بحث کی گئی ہے، اسلام کے بین الاقوامی نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔

یہ کتاب امام محمد کی آخری تصنیفات مین شمار ہوتی ہے قوت استدلال اور وقت نظر کے اعتبار سے ان کی یہ کتاب سب مین ممتاز ہے۔ ہارون رشید کو اس کتاب سے حد درجہ دلچسپی تھی، اس نے اپنے دونون لڑکون امین اور مامون کو اس کا سماع کرایا تھا۔ اس کی متعدد شرحین لکھی گئی ہیں،

جن مین سب سے زیادہ مقبول عام امام سرخسی متوفی ۴۹۰ھ کی شرح ہے، یہ شرح مع متن حیدرآباد مین چھپ گئی ہے، اس کتاب کے متعدد قلمی نسخے استانبول کے کتبخانون مین موجود ہیں، اس کا سب سے قدیم قلمی نسخہ مکتبۃ الفاتح مین ہے، اس کتاب کا ترکی مین ترجمہ بھی ہوچکا ہے۔

(۶) زیادات — فقہ مین ان کی چھوٹی کتاب زیادات اور زیادۃ الزیادات ہیں ان دونون کتابون کو الجامع الکبیر کا ضمیمہ سمجھنا چاہیے، کیونکہ اس مین جن مسائل کا تذکرہ رہ گیا تھا، وہ ان مین پورا کردیا گیا ہے، یہ کتابیں اپنی گہرائی اور دقت نظری کے اعتبار سے ان کا بڑا کارنامہ شمار ہوتی ہیں۔ علمائے فقہ نے انکی بھی شرحیں لکھی ہیں، غالباً یہ اب تک چھپی نہین ہیں ان کے متعدد قلمی نسخے استانبول کے کتبخانہ میں ہیں

بعض لوگ ان دونون کتابون کو ظاہر الروایۃ مین شمار نہین کرتے مگر یہ صحیح نہیں ہے ان مین بیشتر کتابین چھپ گئی ہیں اور جو علحدہ سے نہین چھپی ہیں انکو بھی مطبوعہ ہی سمجھنا چاہئے، اس لیے کہ امام سرخسی نے ان تمام کتابون کا خلاصہ اپنی مشہور کتاب مبسوط مین لے لیا ہے۔

غیر ظاہر الروایۃ — ان مشہور اور معروف الروایہ کتابون کے علاوہ ان کی متعدد غیر معروف الروایۃ کتابین بھی ہین ان مین سے (۱) ایک رقیات کے نام سے مشہور ہے، اس مین ان مسائل کو جمع کردیا گیاہے، جو انھون نے رقہ کے قضا کے زمانہ مین مستنبط کئے تھے، اس کے راوی اور جامع ان کے مشہور شاگرد محمد بن سماعہ ہیں۔

(۲) دوسری کتاب کیسانیات ہے، اس کے راوی شعیب بن سلیمان الکیسانی ہیں ان ہی کے نام پر اس کتاب کا نام پڑگیا ہے۔ اس کو الامالی بھی کہا جاتا ہے، اس کتاب کا ایک ٹکڑا حیدرآباد کے کتبخانہ آصفیہ مین موجود ہی دائرۃ المعارف کی طرف سے اس کے چھپنے کا انتظام ہو رہا تھا، مگر سقوط حیدرآباد کے بعد ان قیمتی ذخائر کے چھپنے کی کیا امید کی جاسکتی ہے۔

(۳) تیسری کتاب جرجانیات ہے، اس کے راوی ان کے شاگرد علی بن صالح الجرجانی ہیں، اور انہی کے نام کی نسبت سے اس کا نام جرجانیات پڑا ہے۔

(۴) چوتھی کتاب ہارونیات ہے اس کے بارے مین نام کے علاوہ کچھ نہین معلوم۔

(۵) پانچوین کتاب کتاب النوادر ہے جس کے راوی ابراہیم بن رستم ہین،

(۶) ان کی ایک کتاب کتاب الکسب کے نام سے مشہور ہے، جس کو وہ نا تمام چھوڑ کر انتقال کر گئے، کچھ لوگون نے ان سے خواہش کی کہ زہد و ورع پر ایک کتاب تصنیف کر دین، اس کے جواب مین انھون نے کہا کہ مین نے کتاب البیوع تصنیف کر دی ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اصل زہد و ورع تو حصول رزق مین حلال حرام کا لحاظ ہے اور یہ سب باتین بیع و شرا مین بیان کر دی گئی ہین، مگر جب ان لوگون کا اصرار بڑھا تو انھون نے یہی کتاب لکھنی شروع کی مگر تکمیل سے پہلے ہی رفیق اعلیٰ سے جا ملے، امام سرخسی نے اس کی شرح بھی لکھی ہے۔

(۷) ایک کتاب چند سال پہلے کتاب المخارج والحیل کے نام سے مصر سے شایع ہوئی ہے جس کے بارے مین یہ لکھا ہے کہ یہ امام محمد کی تصنیف ہے، مگر یہ صحیح نہین ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مصر ہی کے ایک کتبخانہ مین ایک کتاب اسی نام سے موجود ہے، جس کو امام ابویوسف کی تصنیف بتایا گیا ہے، اصل مین کسی نے بعد مین ان ائمہ کو بدنام کرنے کے لئے ان کے نام سے یہ کتاب لکھکر منسوب کر دی ہے، اور دروغ گو را حافظہ نباشد اس لئے اس کو کسی نے امام ابویوسف کی طرف اور کسی نے امام محمد کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ یہ کتاب خود ان ائمہ کے زمانہ ہی مین انکی طرف منسوب کی جانے لگی تھی، چنانچہ امام محمد کے مشہور شاگرد محمد بن سماعہ کا بیان اوپر گذر چکا ہے، وہ کہتے ہیں کہ مین نے امام محمد سے خود سنا ہو کہ کتاب المخارج والحیل کے نام سے جو کتاب لوگون مین متداول ہے

هذا الکتاب لیس من کتبنا و انما — اس کا شمار ہماری کتابون میں نہین ہے

القی فیہا۔ — اس کو کسی نے گھڑ لیا ہے۔

ان کے علاوہ بھی بعض کتابون کے نام ابن ندیم نے لکھے ہین، کتاب اجتہاد الرائے، کتاب الاستحسان، کتاب الخصال، کتاب الرد علما اہل المدینہ، کتاب اصول الفقہ وغیرہ، مذکورہ بالا تفصیل سے یہ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ طبقہ تبع تابعین مین سب سے زیادہ تحریری یادگارین انہی نے چھوڑی ہین۔

امام زُفرؒ

امام ابوحنیفہ کے تیسرے ممتاز شاگرد اور معروف مجتہد امام زفر بن ہذیل ہیں، یہ اپنے علم و فضل اور ملکۂ اجتہاد میں امام ابو یوسف اور امام محمد سے کم نہ تھے، بلکہ قیاس میں تو یہ صاحبین سے کچھ آگے ہی تھے، عام تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ احد هم قیاساً امام صاحب کے تلامذہ میں قیاس کرنے میں سب سے زیادہ تیز تھے، لیکن اس استعداد و صلاحیت کے باوجود اتنے مشہور نہیں ہوئے جتنے کہ صاحبین ہوئے، اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ صاحبین میں ملکۂ اجتہاد کے ساتھ قوت تحریر اور تصنیف و تالیف کی صلاحیت بھی تھی، اور انھوں نے اپنی تحریری یادگار بھی چھوڑی تھیں، اس لئے دنیا نے ان کے علم و فضل کو زیادہ جانا، اور امام زُفر اس نعمت سے یا تو محروم تھے، یا انھوں نے اس کو اختیار ہی نہیں کیا، اسلئے وہ کوئی ایسی تحریری یادگار نہیں چھوڑ گئے کہ دنیا ان کے فضل و کمال کا پورا اندازہ کرتی۔

امام زفر اس حیثیت سے بھی امام صاحب کے تلامذہ میں ممتاز ہیں کہ ان کو امام صاحب نے اپنی زندگی ہی میں درس و تدریس کی اجازت دے دی تھی، جب کہ امام ابو یوسف اور امام محمد کو ان کی زندگی میں اس کی اجازت نہیں مل سکی تھی۔

علم و فضل کے ساتھ زہد و اتقا اور استغنا و بے نیازی میں بھی امام صاحب کا پرتو ان پر پڑا تھا، چنانچہ حکومت کے شدید اصرار بلکہ سختی کے باوجود انھوں نے عہدۂ قضا قبول نہیں کیا، اس جرم میں انکا گھر گرا دیا گیا، ان کو روپوشی کی مصیبت بھی اٹھانی پڑی، مگر اس سب کے باوجود انھوں نے اپنے کو اس آزمائش میں ڈالنا پسند نہیں کیا۔

نام و نسب | زفر نام، ابوالہذیل کنیت تھی، بصرہ[1] آبائی وطن تھا، ان کے والد ہذیل اموی دور میں

---

[1] بعض لوگوں نے ان کو اصبہانی لکھا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔

اصبہان کے والی تھے یہیں ۱۱۰ھ میں ان کی ولادت ہوئی[۱]

خاندان | ان کا سلسلۂ نسب عدنان سے مل جاتا ہے، انکا خانوادہ بصرہ کے ممتاز عربی خانوادوں میں تھا، کردری نے لکھا ہے، من بیت شریف، غالباً اسی امتیاز کی وجہ سے یزید بن عبدالملک نے ان کے والد کو اصبہان جیسے اہم مقام کا والی (گورنر) مقرر کر دیا تھا، ان کے ایک بھائی صباح بن ہذیل بنو تمیم کے صدقات کی وصولی کے عامل مقرر کیے گئے تھے،

امام زفر کی اہلیہ بصرہ کے ممتاز محدث خالد بن حارث کی بہن تھیں، ان کی والدہ البتہ عجمی النسل تھیں، چنانچہ انھوں نے صورت ماں کی اور سیرت باپ کی پائی تھی، حجاج بن ارطاۃ کہا کرتے تھے، اللسان عربی لا الوجہ ان کا چہرہ تو عربوں جیسا نہیں ہے، مگر زبان عربوں جیسی ہے۔

تعلیم و تربیت، | امام زفر کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں تذکرے خاموش ہیں البتہ ان سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ ان کی تعلیم کا آغاز محدثین کی آغوش میں ہوا مگر ان کی ذہانت اور طباعی محض تحدیث روایت پر اکتفا نہ کر سکی اور انکو امام ابوحنیفہ کے درس فقہ تک کھینچ لائی، امام طحاوی کے واسطہ سے یہ روایت تذکروں میں درج ہے کہ امام زفر ابتداءً محدثین کی خدمت میں تحصیل علم کے لیے، جایا کرتے تھے، ایک دن ایک مسئلہ ایسا پیش آ گیا کہ جسے ان کے شیوخ حل نہ کر سکے، وہ ناچار امام صاحب کی خدمت میں آئے اور مسئلہ دریافت کیا، امام صاحب نے اس کا جواب دیا مگر امام زفر اس سے مطمئن نہیں ہوئے، اور کتاب و سنت سے اس کی دلیل پوچھی، امام صاحب نے اپنے دستور کے مطابق فرمایا کہ یہ مسئلہ فلاں حدیث سے ماخوذ ہے، اور اس کے عقلی دلائل

---

[۱] کردری ج ۲ ص ۱۸۷، لمحات النظر ص ۴ [۲] علامہ زاہد الکوثری نے تاریخ اصبہان کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ اصبہان کے والی مقرر تھے وہیں امام زفر کی ولادت ہوئی مگر کردری نے لکھا ہے کہ یہ بصرہ کے والی تھے، تاریخ اصبہان ہمارے سامنے موجود نہیں ہے لیکن شذرات الذہب وغیرہ سے پہلے بیان کی تائید ہوتی ہے اس لئے اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔

یہ ہیں، پھر امام صاحب نے فرمایا کہ اگر مسئلہ کی صورت یہ ہو تو پھر جواب کیا ہوگا؟ امام زفر نے کہا کہ اس صورت کا سمجھنا تو میرے لئے پہلی صورت سے بھی زیادہ دشوار ہے، امام صاحب نے اس کا بھی جواب عنایت فرمایا اس کے بعد امام صاحب نے کچھ اور مسائل پر روشنی ڈالی، امام زفر کا بیان ہے کہ میں امام صاحب کی مجلس سے بہت خوش خوش واپس ہوا اور اپنے اصحاب حدیث کے سامنے ان مسائل کو رکھا کہ وہ ان کا جواب دیں مگر وہ کسی مسئلہ کا کوئی جواب نہیں دے سکے، میں نے پھر تمام مسائل کے جوابات اور ان کے دلائل ان کے سامنے بیان کئے تو وہ حیرت زدہ ہو گئے اور پوچھا کہ یہ باتیں تمھیں کہاں سے معلوم ہوئیں، میں نے بتایا کہ امام ابو حنیفہ کی مجلس درس میں، اس کے بعد سے میں اپنے ساتھیوں میں راس الحلقہ سمجھا جانے لگا،[1] اس واقعہ کے بعد سے وہ بالالتزام امام ابو حنیفہ کی مجلس درس میں شامل ہونے لگے اور تقریباً بیس برس تک ان کی خدمت اور رفاقت میں رہے۔

امام ابو حنیفہ کی مجلس درس میں عجیب کشش اور اس کی یہ عجیب خصوصیت تھی کہ جو ایک بار اس میں شریک ہو گیا، پھر کیا مجال کہ وہ اس کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ جائے امام ابو یوسف، امام محمد، اور امام زفر یہ تمام حضرات پہلے کسی اور حلقہ درس میں شریک تھے مگر جب وہ امام صاحب کی خدمت میں آئے تو پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے امام ابو یوسف کے شیوخ کی فہرست سو سے زیادہ ہے اور اس سے کچھ زیادہ امام محمد کے شیوخ ہیں، خود امام زفر کے شیوخ کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے، مگر جو محبت شیفتگی اور عقیدت ان لوگوں کو امام صاحب سے تھی وہ کسی سے نہیں تھی، اس میں امام صاحب کے علم و تفقہ اور ان کے مجتہدانہ درس کے ساتھ ان کے عام اخلاق و کردار اور زہد و تقوی کا بھی بڑا دخل تھا، خصوصیت سے طلبہ کے ساتھ وہ جس شفقت، حسن سلوک اور مساوات کے ساتھ پیش آتے تھے اور انکے لئے جو دلسوزی کرتے تھے، اس کی مثال دوسری جگہ کم ملتی ہے۔

---

[1] لمحات النظر ص ۶۔

امام زفر امام صاحب کی زندگی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

جالست اباحنیفۃ اکثر من عشرین سنۃ فلم ار احداً انصح واشفق الناس منہ وانہ یبذل نفسہ للّٰہ تعالیٰ اما عامۃ النہار فانہ کان مشغولاً بالمسائل وحلہا و تعلیمہا فاذا قام من المجلس عاد مریضاً او شیع جنازۃ او واسی فقیراً او واصل اخاً او سعی فی حاجتہ فاذا کان اللیل خلا للتلاوۃ والعبادۃ والصلوٰۃ فکان ھذا سبیلہ حتی توفی[1]

میں بیس برس سے زیادہ امام صاحب کی خدمت میں رہا ہوں میں نے ان سے زیادہ کسی کو عام انسانوں کا خیرخواہ، مخلص اور شفیق نہیں دیکھا وہ صرف خدا ہی کے لیے اپنی جان کھپایا کرتے تھے کوئی دوسرا جذبہ نہیں ہوتا تھا۔ قریب قریب پورے دن وہ مسائل کے حل اور ان کی تعلیم و تدریس میں لگے رہتے تھے ... جب مجلس درس سے اٹھتے تھے تو کسی مریض کی عیادت کے لیے جاتے یا کسی جنازہ میں شرکت کرتے یا کسی محتاج کی امداد و اعانت کرتے یا کسی سے ملاقات کیلئے جاتے، یا پھر کسی کی کوئی اور ضرورت پوری کرنے لگ جاتے تھے جب رات ہو جاتی تو پھر ذکر و تلاوت اور نماز کیلئے اپنے کو یکسو کر لیتے تھے، پوری زندگی انھوں نے اسی طریقہ پر گذاری۔

امام زفر کے دوسرے شیوخ | اوپر ذکر آچکا ہے کہ امام زفر ابتداءً کوفہ کے دوسرے شیوخ حدیث سے استفادہ کرتے تھے، اس کے بعد ان کو امام صاحب سے شرف تلمذ حاصل ہوا، امام صاحب کے علاوہ جن شیوخ

[1] مناقب کردری صفحہ ۱۰۸ ج ۲،

انھوں نے استفادہ کیا ان کی تعداد کافی ہے چند مشاہیر کے نام یہ ہیں۔

سلیمان بن مہران معروف بہ اعمش، یحیی بن سعید محمد بن اسحاق صاحب المغازی یحیی بن ایوب اللیثی

اسمٰعیل بن ابی خالد، ایوب سختیانی زکریا بن ابی زائدہ، سعید بن ابی عروبہ"۔

نہایت ذہین اور ذکی تھے اس لئے اپنے تمام اساتذہ کی نظروں میں بہت محبوب رہے، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی انھیں بہت عزیز رکھتے تھے

امام صاحب کا طریق تعلیم اور امام زفر

امام ابو حنیفہؒ کا طریقہ، درس وتدریس عام شیوخ سے مختلف تھا دوسرے شیوخ عموماً اپنی معلومات طلبہ کو املا کرا دیتے تھے، یا پھر زبانی تحدیث روایت کر دیتے تھے مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا درس مجتہدانہ اور تمرینی ہوتا تھا۔ وہ طلبہ کے سامنے مسائل پیش کرکے انھیں سے جواب لیتے تھے اور پھر ان ہی سے دلائل پوچھتے تھے، جب تلامذہ اپنی معلومات پیش کر لیتے تھے تو امام صاحب اپنی معلومات ان کے سامنے رکھتے، اس بحث وتمحیص کے بعد جو اصول وفروع طے ہو جاتے تھے، ان کو قلمبند کر لیا جاتا تھا،[۱] اس طریقہ درس کا نتیجہ تھا کہ امام صاحب کے تلامذہ میں جتنے ممتاز مجتہدین اور فقہا پیدا ہوئے کسی امام کے تلامذہ میں نہیں ہوئے۔

شیوخ کی رائے۔

امام صاحب امام ابو یوسف اور امام زفر دونوں کو تمام تلامذہ میں ممتاز حیثیت دیتے تھے، ایک بار فرمایا کہ میرے چھتیس ۳۶ اصحاب ایسے ہیں جن میں ۲۸ قاضی ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور چھ مفتی بن سکتے ہیں اور دو آدمی یعنی ابو یوسف اور زفر، قاضیوں اور مفتیوں کی تعلیم وتربیت کا کام کر سکتے ہیں۔[۲]

استاد کا احترام

امام زفر امام صاحب کا غایت درجہ احترام کرتے تھے، فرماتے تھے کہ امام صاحب کی زندگی میں میں ان سے اختلاف کرتا تھا، مگر اب ہمت نہیں پڑتی جب ان کی شادی ہوئی تو امام صاحب کو

---

[۱] مناقب کردری ج ۱ ص ۵۰۔ [۲] مناقب کردری ج ۲ ص ۱۴۲۔

انھون نے مدعو کیا اور خطبہ کی خواہش ظاہر کی اور لوگون سے مخاطب ہو کر کہا کہ "یہ اپنے علم و فضل اور شرف کے لحاظ سے امام المسلمین ہیں"، بعض لوگون کو یہ اعزاز برا معلوم ہوا اور ان سے کہا کہ تمھارے خاندان اور قوم کے ممتاز لوگ موجود ہیں ان سے خطبہ کی خواہش نہین کی، امام زفر نے فرمایا کہ اگر میرے والد بھی موجود ہوتے تو مین ان پر بھی امام صاحب کو ترجیح دیتا۔[1]

درس و تدریس، امام صاحب نے اپنی زندگی ہی مین ان کو درس و تدریس کی اجازت دے دی تھی، مگر انھون نے استاد کی موجودگی مین غالباً درس و تدریس کا مشغلہ جاری نہین کیا۔ بلکہ ان کی وفات کے بعد یہ سلسلہ جاری کیا، یہ نہین معلوم ہو سکا کہ انھون نے کوفہ مین کتنے دنون تک درس و تدریس کا سلسلہ قائم رکھا، مگر بہر حال انھون نے کچھ دن یہان درس دیا پھر بصرہ منتقل ہو گئے۔

بصرہ مین مجلس درس بصرہ کی فضا اس وقت امام صاحب کے تلامذہ کے لئے نہایت غیر موزون تھی۔ گو وہان امام صاحب کے متعدد و ممتاز تلامذہ موجود تھے، مگر کسی نے درس و تدریس کا سلسلہ جاری کرنے کی ہمت نہین کی۔

یوسف بن خالد بصری، امام صاحب کے خاص شاگرد تھے جب وہ امام صاحب کی خدمت سے وطن واپس ہونے لگے تو امام صاحب نے ان سے کہا تھا کہ بصرہ مین بہت سے صاحب علم و فضل ہیں، وہان جاکر کسی کھمبے[1] سے لگ نہ بیٹھنا، یعنی درس و تدریس کا سلسلہ نہ جاری کر دینا ورنہ یہ کہنے لگنا کہ ابو حنیفہ نے یہ اور یہ کہا ہے، ورنہ جلد ہی مسند درس اٹھا دینی پڑے گی، مگر انھون نے امام صاحب کی ہدایت پر عمل نہین کیا اور بصرہ پہنچتے ہی مسند درس قائم کر دی، نتیجہ وہی ہوا جس کی امام صاحب نے پیشین گوئی کی تھی، یعنی ان کو جلد ہی مسند درس اٹھا دینی پڑی، اس وقت بصرہ مین عثمان بن مسلم امام بصرہ

---

[1] مناقب کردری ج ۲ ص ۱۸۴ [1] اس وقت دینی علوم کی درسگاہیں مسجدین ہوتی تھیں، یہ اسی طرف اشارہ ہے کہ مسجد کے کسی کھمبے سے لگ کر مسند درس نہ بچھا دینا۔

تھے، یہ ان کی خدمت میں جانے لگے مگر ان سے وہاں بھی خاموش نہیں رہا گیا۔ اور انھوں نے امام صاحب کے اقوال ان کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیئے جس کے نتیجہ مین شیخ عثمان کے تلامذہ نے ان کو زد و کوب تک کیا،[1]

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بصرہ مین امام صاحب اور ان کے تلامذہ سے لوگون مین کتنی نفرت پھیلی ہوئی تھی، انہی حالات مین امام زفر بصرہ جاتے ہیں۔

امام صاحب لوگون کی نفسیات اور ان کی سیاست اور رجحان سے خوب واقف تھے، اسی لیے انھون نے یوسف بن خالد کو اہل بصرہ کے بارے مین آگاہ کر دیا تھا، مگر وہ اس کو نہ سمجھ سکے جس کے نتائج ان کے حق مین اچھے نہیں ہوئے، امام زفر خود بھی ذہین اور موقع شناس تھے، اور پھر امام صاحب کی اس ہدایت سے بھی واقف تھے، اس لئے جب وہ بصرہ گئے تو انھوں نے پہلے حلقۂ درس نہیں قائم کیا بلکہ شیخ عثمان بن مسلم کی مجلس درس میں شرکت کرنے لگے کچھ روز وہ چپ چاپ درس میں شریک ہو کر سنتے رہے، اس کے بعد انھون نے ان کے اصول و فروع پر نظر ڈالی تو بہت سے مسائل کے سلسلہ میں اصل و فرع اور ماخذ و ماخوذ میں تضاد نظر آیا، امام زفر ان مسائل کا تذکرہ ان کے تلامذہ سے کرتے اور پھر بدلائل ان کی غلطی واضح کرتے وہ تلامذہ اس کا ذکر شیخ سے کرتے اور ان سے اپنی رائے سے رجوع کرنے کے لیے اصرار کرتے تھوڑے دن کے بعد نتیجہ یہ ہوا کہ امام زفر سے استفادہ کرنے والون کا ہجوم ہوا اور ان کو ایک الگ حلقۂ درس قائم کرنا پڑا، ابو اسد کہتے ہیں کہ ان کے درس میں اتنا ہجوم ہوا کہ وہاں کے اکثر حلقہائے درس ٹوٹ گئے۔[2]

امام زفر بہت دقیق النظر اور باریک بین تھے، اس لئے بعض تلامذہ ان کا درس سمجھ نہیں پاتے تھے، اور اس سے اکتا جاتے تھے، عمر بن زجاج کہتے ہیں کہ جب ہم لوگ امام زفر کے پاس جاتے تھے تو بہت تیار ہو کر جاتے تھے، مشہور محدث وکیع بن الجراح، امام صاحب کے تربیت یافتہ ہیں، امام کی وفات کے

---

[1] لمحات النظر ص ۱۰، [2] اتنا ہی نہیں ہوا بلکہ اسی اختلاف کی وجہ سے ان کو بے دین اور مبتدع و مخترع ٹھہرایا گیا [3] کردری ج ۲ ص ۱۸۷۔

بعد بغرض استفادہ صبح کو امام زفر کے پاس اور شام کو امام ابو یوسف کے پاس جایا کرتے تھے۔

لیکن امام ابو یوسف چونکہ عہدۂ قضا اور دوسری ذمہ داریوں کی وجہ سے مشغول رہتے تھے جسکی وجہ سے ان کو استفادہ کا موقع کم ملتا تھا، اس لیے انھوں نے اب صرف امام زفر ہی کے پاس اپنی آمد ورفت محدود کر لی ان کے بارے میں فرماتے تھے کہ

الحمد لله الذی جعلك خلفاً	خدا کا شکر ہے کہ آپ کو اس نے امام کا
لنا عن الامام ولکن لا یذهب	جانشین بنایا اگرچہ امام صاحب کی غیر موجودگی کی حسرت
عنی حسرة الامام (کردری ج ۲ ص ۱۸۵)	کسی طرح دل سے نہیں جاتی۔

تلامذہ ان کی عمر نے زیادہ وفا نہیں کی پھر بھی جتنے دنوں انھوں نے درس دیا ان سے ایک خلق کثیر فیضیاب ہوئی چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں۔

عبداللہ بن مبارک، محمد بن حسن، وکیع بن الجراح، سفیان بن عیینہ، ہلال بن یحییٰ، حسن بن زیاد، محمد بن عبداللہ انصاری، فضل بن دکین، ابراہیم بن سلیمان، بشر ابن قاسم، محمد بن وہب، حافظ خالد بن حارث وغیرہ۔

عہدۂ قضا حافظ ابن عبدالبر اور عبدالقادر قرشی نے لکھا ہے کہ امام زفر بصرہ کے قاضی بھی بنائے گئے تھے اور اہل بصرہ کو امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کے مسلک سے جو کچھ اختلاف تھا، اور جو غلط فہمی تھی وہ ان کے قاضی ہی ہونیکے بعد ختم ہوئی۔ مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ وہ بصرہ یا کسی اور جگہ کے قاضی مقرر کیے گئے، عدم صحت کے وجوہ یہ ہیں۔

(۱) سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ سوار بن عبداللہ ۱۳۸ھ سے لیکر ۱۵۶ھ تک بصرہ کے قاضی رہے، اور امام زفر کی وفات ۱۵۸ھ میں ہوئی ہے اس لیے ان کے عہدۂ قضا کے تقرر کا زمانہ

۱؎ الانتقاء ص ۱۷۳۔

زیادہ سے زیادہ دو برس ہوسکتا ہے مگر اس مدت میں وہ منصب درس پر متمکن نظر آتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کی عمر کا اور کوئی حصہ نہیں بچتا جس مین یہ عہدہ قبول کر سکتے ہوں (۲) بعض روایتوں میں ہے کہ قاضی سوار کے بعد ان کے لڑکے عبداللہ اس عہدہ پر مامور ہوئے اگر یہ روایت صحیح ہے تو پھر امام زفر کے بارے مین عہدۂ قضا قبول کرنے کی روایت بالکل ہی بے بنیاد ہے، بصرہ کے قیام کے زمانہ مین ان سے وہان کے اہل علم سے جو علمی مباحثے ومناظرے ہوئے اور ان کے لئے بصرہ کی فضا ہموار ہوئی اس کی وجہ سے حافظ ابن عبدالبر کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ یہ عہدۂ قضا ہی کا نتیجہ ہوسکتا ہے (۳) تیسری بات یہ کہ عہدۂ قضا قبول نہ کرنے کے سلسلہ مین جو صریح روایتین موجود ہیں ان کی موجودگی میں مذکورہ روایت بالکل ہی موضوع معلوم ہوتی ہے. کردری لکھتے ہیں :-

اکرہ زفر علی ان یلی القضاء فابیٰ	امام زفر کو مجبور کیا گیا کہ وہ عہدہ قضاء قبول کرلیں لیکن انھون نے انکار کیا۔

ظاہر ہے کہ حکومت کی کسی پیشکش کو ٹھکرا دینا کچھ آسان نہین تھا، چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

هدم منزله واختفی مدة ثم خرج واصلح منزله ثم هدمه ثانیاً واختفی کذالک حتی عفی عنه	ان کا گھر گرا دیا گیا اور وہ مدتوں روپوش رہے پھر آکر انھون نے اپنا مکان درست کرایا پھر دوبارہ گرا دیا گیا وہ مدتوں روپوش رہے پھر جاکے ان کو معاف کیا گیا۔

ظاہر ہے اس واضح بیان کے بعد ان کے عہدۂ قضاء قبول کرنے کی روایت کے عدم صحت مین کیا شبہ رہ جاتا ہے۔

پھر امام صاحب اور ان کے تلامذہ کے عہدہ قضاء نہ قبول کرنے کا واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہین ہے۔ بلکہ یہ ایک غیر معمولی عزم وارادہ ہمت وجرات اور عدیم المثال کردار کا ثبوت ہے۔ ان کی اس قربانی

---

[1] کردری ج ۲ ص ۲۰۹،

اور ایثار نفسی نے دین اور اہل دین کے وقار کو بلند کیا، حکومت کے غلط رخ کو بڑی حد تک موڑا اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ امام صاحب اور امام زفر جیسے اولوالعزم بزرگوں ہی کی قربانی نے امام ابو یوسف اور دوسرے بزرگون کے لیے حکومت کی فضا سازگار بنائی کہ وہ حکومت مین رہکر دینی مقاصد بروئے کار لا سکے، پھر یہ بات بھی قابل قدر ہے کہ کوئی معمولی لیاقت کا آدمی اس عہدہ سے انکار کرتا تو تو زیادہ تعجب انگیز نہین تھا۔ اس لیے کہ اس وقت کے سلاطین و وزراء تک بھی اچھے خاصے دین کے عالم ہوتے تھے، ان کے سامنے ان کی لیاقت اور علمی صلاحیت کا ہر وقت امتحان ہوا کرتا تھا اور پھر وہ حکومت تقریباً شخصی حکومت تھی، جس کے لیے حبس و قتل ایک معمولی بات تھی، اس لیے ہر شخص اس کے قبول کرنے کی جرأت کر بھی نہین سکتا تھا، مگر امام صاحب اور ان کے تلامذہ نے اپنی غیر معمولی صلاحیت کے باوجود ایک دینی مقصد کی خاطر اس سے انکار کیا تھا، خود امام زفر کے متعلق امام صاحب نے فرمایا کرتے تھے کہ قاضی بننا تو معمولی بات ہے، یہ تو قاضیوں کی تربیت اور تادیب کر سکتے ہیں۔

شادی غالباً ان کی دو شادیاں ہوئی تھین، ایک ممتاز محدث خالد بن حارث کی بہن سے، دوسری ان کے بڑے بھائی کی بیوہ سے، غالباً یہ نکاح صرف انھون نے بیوہ کی پرورش کی خاطر کر لیا تھا۔

وفات۔ بہت کم عمری یعنی کل ۴۸ سال کی عمر مین وفات پائی، وفات کے وقت امام ابو یوسف موجود تھے، انھون نے آخری وصیت کی خواہش ظاہر کی، انھون نے کہا کہ یہ سامان میری بیوی کے لیے ہے، اور یہ تین ہزار درہم میرے بھتیجے کے لیے ہیں، پھر فرمایا کہ نہ تو مجھ پر کسی کا کوئی حق ہے اور نہ میرا کسی پر کوئی حق ہے[1]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔

---

[1] مناقب کردری ج ۲ ص ۱۸۷

اخلاق وعادات | اپنے زہد و اتقاء، اخلاق وکردار کے لحاظ سے بھی اپنے معاصرین مین ممتاز تھے، ان کی وفات کے بعد لوگون مین یہ عام چرچا تھا کہ محض آخرت کی باز پرس کے خوف سے ان کا انتقال ہوا،[1] حالانکہ ان کی زندگی بالکل بے داغ تھی، خود فرماتے تھے کہ مین نے اپنے بعد کوئی ایسی چیز نہین چھوڑی جس کی باز پرس کا مجھ خوف ہو[2]،

ابراہیم بن سلیمان کہتے ہیں کہ جب ہم لوگ امام زفر کی خدمت میں بیٹھتے تو کسی کی یہ مجال نہین تھی کہ وہ دنیاوی باتون کا تذکرہ کر سکتا اور اگر کوئی شخص دنیا کا تذکرہ چھیڑ ہی دیتا تو وہ مجلس سے اٹھ جاتے تھے،[3]

امام صاحب کے شاگردون مین داؤد طائی مشہور صاحب زہد و تقوی بزرگ گذرے ہین، ان سے اور امام زفر سے بہت زیادہ بھائی چارہ تھا، حسن بن زیاد کہتے ہیں کہ داؤد صرف عبادت مین مشغول ہو گئے مگر امام زفر علم و عبادت دونون کے جامع تھے[4]

یحیٰی بن اکثم فرماتے ہیں کہ میرے والد امام صاحب کے بعد امام زفر کی مجالس مین اسلئے زیادہ جانا پسند کرتے تھے کہ وہ علم کے ساتھ صاحب ورع وتقوی بھی تھے،[5] خود فرماتے تھے مین نے دنیا مین رہنے کی کبھی بھی خواہش نہین کی، اور نہ میرا دل کبھی دنیا کے مزخرفات کی طرف مائل ہوا،[6]

علم وفضل | علم وفضل مین ان کو جو امتیاز حاصل تھا اس کا کچھ تذکرہ اوپر آچکا ہے، اس سلسلہ مین ائمۂ فقہ وحدیث کے چند اقوال اور نقل کئے جاتے ہیں۔

امام ابو حنیفہ نے ایک بار ایک مجمع مین فرمایا کہ

هو امام من ائمة المسلمين و	وہ ائمہ مسلمین کے ایک امام اور دین کی
علم من اعلام الدين	سربلندی کے ایک نشان ہیں۔

[1] مناقب کردری ج ۲ ص ۱۸۳ [2] ایضاً ص ۱۸۲ [3] ایضاً ص ۱۸۳ [4] مفتاح السعادہ [5] مناقب ص ۱۸۴ [6] کردری ج ۲ ص ۱۸۳

دوسرے ائمہ نے بھی ان کے علم وفضل کا اعتراف کیا ہے۔ عثمان بن ابی شیبہ کہتے تھے کہ مین نے اپنے والد سے ان کے علم وفضل کے بارے مین پوچھا تو فرمایا کہ اس زمانہ کے سب سے بڑے فقیہ ہین۔

ان کے اندر فقہ و حدیث کا بڑا اچھا امتزاج تھا، لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ تمھارے پاس جو احادیث ہون وہ میرے سامنے پیش کرو مین رطب ویابس الگ کر دوں گا[1]

امام صاحب کے تلامذہ کے بارے مین عام طور سے یہ غلط فہمی تھی کہ وہ قیاس کو حدیث و آثار پر ترجیح دیتے ہین لیکن یہ ایک صریح بہتان تھا، امام زفر فرماتے تھے کہ احادیث و آثار کی موجودگی مین ہم لوگ قیاس کو ترک کر دیتے ہیں[2]

علم حدیث مین انھون نے اپنی تحریری یادگارین چھوڑی ہیں۔ ان کا تذکرہ آگے آئے گا۔

مجتہد کی حیثیت سے امام صاحب کے دوسرے مخصوص تلامذہ امام ابو یوسف اور امام محمد کی طرح امام زفر کو بھی لوگون نے مجتہد مطلق قرار نہین دیا ہے، امام ابو یوسف کے حالات مین ہم اس کی پوری توضیح کر آئے ہیں، اس لیے اس کا اعادہ تحصیل حاصل ہے، امام زفر کے متعلق جن لوگون نے یہ خیال قائم کیا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ امام زفر نے ایک بار فرمایا تھا کہ مین امام صاحب کی زندگی مین اختلاف کیا کرتا تھا، لیکن اب اختلاف سے ڈرتا ہون، اس لیے کہ ان کی زندگی مین اختلافی مسائل ان کے سامنے پیش ہوتے تھے، تو رد و کد کے بعد اکثر ان کی راے کو ترجیح دینی پڑتی تھی، مگر اب اس کی کوئی شکل باقی نہین ہے، یہ بات اپنے موقع و محل کے لحاظ سے صحیح ہے مگر ان کو مقلد محض قرار دیکر ان کے تمام مجتہدات کو نظر انداز کر دینا صریح ظلم ہے، اوپر ذکر آچکا ہے کہ امام صاحب خود اپنے تلامذہ سے فرمایا کرتے تھے کہ میرے کسی قول پر اس وقت تک فتویٰ نہ دو جب تک کہ اس کا ماخذ معلوم نہ ہو جائے، جب امام صاحب خود اپنے تلامذہ کو تقلید محض سے منع کرتے تھے، تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ جس بات سے انھون نے

---

[1] مناقب کردری ص ۱۸۳ [2] ایضاً

اپنے تلامذہ کو سختی سے منع کیا ان کے تلامذہ اسی کو اپنا شعار بنا لیتے پھر امام صاحب نے اپنے درس وتدریس کا طریقہ ہی ایسا رکھا تھا کہ ان میں اجتہاد واستنباط کی صلاحیت لامحالہ پیدا ہو جاتی تھی ان تمام باتوں کے باوجود ان کے تلامذہ میں سے کوئی مجتہد مطلق پیدا نہ ہو اور ان سے کم درجہ کے لوگ اس مرتبہ پر فائز کر دیئے جائیں یہ انتہائی زیادتی کی بات ہے۔ خاص طور پر امام زفر کے مجتہد مطلق ہونے کے بعض اور دلائل بھی ہیں۔

امام زفر کے تقریباً سترہ اجتہاد کردہ مسئلے ایسے ہیں جن میں وہ بالکل منفرد ہیں، اور فقہ حنفی میں ان کے مطابق فتوے دیئے جاتے ہیں، ان مسائل کو الاشباہ والنظائر کے شارح اور مشہور فقیہ احمد حموی نے ایک رسالہ میں جمع کر دیا ہے، اس رسالہ کی متعدد شرحیں اور تلخیصیں کی گئی ہیں۔

اسی طرح ابوزید دبوسی نے اپنی کتاب تاسیس النظر میں ایک باب میں خاص طور سے ان مسائل سے بحث کی ہے، جن میں امام زفر نے امام صاحب سے اصولی یا فروعی اختلاف کیا ہے، اس کی تمام تفصیلات علامہ زاہد الکوثری نے امام زفر کے سوانح حیات میں کی ہیں، آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ

ان کے مخصوص مجتہدات کی طرف اتقانی زرکشی اور علامہ بزدوی وغیرہ نے بھی اشارہ کیا ہے۔

اس کے بعد وہ پھر لکھتے ہیں۔

فان کان شان المجتهد المطلق الانفراد بمسائل فی الاصول والفروع فها هو زفر له انفرادات فی الناحیتین علی ان الموافقة	اگر مجتہد مطلق کی شان یہی ہے کہ وہ بعض اصولی اور فروعی مسائل میں منفرد ہو تو دونوں حیثیتوں سے امام زفر منفرد ہیں، اور بعض اصولی یا فروعی مسائل میں انکے

کالامام فی الرای فی بعض مسائل الاصول والفروع عن علم بادلتها لا تخل بالاجتهاد المطلق اصلاً۔

دلائل و مآخذ کی واقفیت کے ساتھ امام صاحب کی ہمنوائی کرنا بھی اجتہاد مطلق کے بغیر ممکن نہین ہے۔

امام صاحب ان کے بارے مین فرماتے ہیں کہ "اقیس اصحابی" "میرے اصحاب میں سب سے زیادہ قیاس کرنے والے"

امام غزالی سے کسی نے اصحاب ابو حنیفہ کے بارے مین پوچھا تو انھون نے امام ابو یوسف اور امام محمد کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد فرمایا "زفر سب سے زیادہ دقیقہ سنج تھے"

تصنیف امام زفر اپنے علم و فضل کے لحاظ سے امام صاحب کے خاص تلامذہ امام ابو یوسف اور امام محمد سے کم تر نہین تھے۔ مگر ان مین تصنیف و تالیف کا وہ مادہ یا تو فطرۃً کم تھا یا انھون نے اس مشغلہ کو اختیار ہی نہین کیا اس لیے نہ تو ان کے خیالات اتنے زیادہ پھیل سکے جتنے ان دونون بزرگون کے پھیلے، اور نہ ان کو وہ شہرت ہوئی جو صاحبین کو ہوئی،

مناقب کردری مین ہے۔

کان زفر قلیل الکتابة یحفظ بالسمع حسن القیاس

امام زفر لکھتے بہت کم تھے، وہ جو کچھ سنتے تھے اسے حافظہ میں محفوظ کر لیتے تھے، اور بہترین قیاس کرتے تھے۔

حاکم نے حدیث مین ان کی دو کتابون کا تذکرہ کیا ہے، لکھتے ہیں۔

ان لزفر نسختین فی الحدیث احداهما روایة ابی وهب

حدیث مین امام زفر کے دو مجموعے ہیں۔ ایک کے راوی ابو وہب اور دوسرے کے

والاخری روایتہ شذ ادین حکم[1]   راوی شد ادین حکم ہیں۔

بے فائدہ کلامی مسائل سے گریز | اوپر ذکر آچکا ہے کہ اس زمانہ مین فلسفہ کے اثر سے علما مین بہت سے ایسے مباحث اور لفظی اختلافات پیدا ہو گئے تھے، جن کی حیثیت دین مین تو کچھ نہین تھی، مگر سوء اتفاق سے ...... وہ اس وقت توحید و آخرت کے مسائل کی طرح اہم ہو گئے تھے، اور جو لوگ ان کلامی مسائل اور فلسفیانہ موشگافیون سے اپنے دامن کو بچائے رکھنے کی کوشش کرتے تھے، ان کے دامن پر بھی لوگ دو چار چھینٹین ڈال ہی دیتے تھے، امام صاحب اور ان کے تقریباً تمام اصحاب و تلامذہ ایسے غیر ضروری مسائل و مباحث سے گریز کرتے تھے مگر پھر بھی لوگون نے ان کی طرف ایسی باتین منسوب کر دین، جن سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا، اسوقت قرآن کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے کا مسئلہ عام طور سے موضوع بحث بنا ہوا تھا، اور اس کے بارے مین عموماً لوگ ائمہ سے سوالات کرتے تھے، امام زفرؒ گوان لایعنی باتون سے بہت گریز کرتے تھے مگر پھر بھی کبھی کبھی زبان کھولنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا، ایک روز کسی نے قرآن کے بارے مین پوچھا انھون نے جواب دیا،

القرآن کلام اللہ   قرآن کلام الٰہی ہے۔

یہ نہایت عاقلانہ جواب تھا، مگر سائل کا مقصد کچھ اور تھا، اس لیے اس نے فوراً ہی پھر پوچھا کہ کیا وہ مخلوق ہے؟ امام زفرؒ نے ذرا تند مگر ہمدردانہ لہجے مین فرمایا کہ

> اگر تم ان دینی مسائل کے سوچنے اور غور کرنے مین مشغول ہوتے جن مین مین مشغول ہون تو وہ میرے لیے بھی مفید ہوتا اور تمھارے لیے بھی اور جن مسائل کی فکر مین تم پڑے ہوے ہو وہ تمھارے لیے مضر ہیں، اللہ تعالیٰ کے لیے وہ چیزین ثابت کرو جن سے وہ خوش ہو، اور جن چیزون کا تم کو خدا نے مکلف نہین بنایا ہے، اس مین اپنی جان ناحق

---

[1] معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۶۴۔

نہ کھیاؤ۔

ایک بار حسن بن زیاد سے کسی نے کہا کہ "امام زفر بہت قیاس تھے"، انھوں نے کہا کہ یہ جاہلوں کی بات ہے، وہ عالم تھے، پھر اس شخص نے کہا کہ امام زفر نے علم کلام میں غور و خوض کیا تھا؟ حسن نے کہا سبحان اللہ کیا سطحی بات تم نے کی اہمارے اصحاب کے بارے میں سوال کرتے ہو کہ انھوں نے علم کلام میں غور و خوض کیا تھا، یا نہیں، وہ اس سے بڑی چیز کے حامل تھے، وہ علم و فضل کی کان تھے، جس کو عقل نہیں ہوتی اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے علم کلام میں غور کیا، اور ہمارے اصحاب تو۔

کانوا اعلم بحدود اللہ[1] وہ حدود اللہ سے خوب واقف تھے۔

مقصد یہ تھا کہ ان کا مشغلہ یہ نہیں تھا کہ وہ اُن مسائل میں جو نہ تو دنیا کی زندگی میں مفید ہوں اور نہ آخرت میں اپنا وقت ضائع کریں بلکہ وہ حدود اللہ کی پاسبانی اور . . . نگہبانی میں اپنی زندگی کھپاتے تھے جو صرف اُن ہی کے لیے نہیں بلکہ پوری مخلوق خدا کے لیے دونوں جہان میں مفید ہیں۔

جرح و تعدیل | عام محدثین نے امام زفر کی روایا کو قابل قبول قرار دیا ہے اور ان کی توثیق و تعدیل کی ہے، امام ذہبی لکھتے ہیں "فقیہ، زاہد اور صدوق تھے، انکی توثیق بہت سے لوگوں نے کی ہے، ابن معین بھی انکی توثیق کرتے تھے۔

حافظ ابن حجر نے لسان میں فضل بن دکین کا قول نقل کیا ہے، ثقۃ ما مونا اسی طرح کے الفاظ حافظ ابن معین سے بھی نقل کیے گئے ہیں ابن حبان نے بھی ان کو ثقات میں شمار کیا ہے۔

اس توثیق و تعدیل کے ساتھ بعض محدثین او ارباب رجال نے ان پر نقد و جرح بھی کیا ہے مثلاً ابن مہدی قاضی شواکر وغیرہ، لیکن جیسا کہ ہم امام محمد کے حالات میں لکھ آئے ہیں کہ جو لوگ ایک ہزار برس سے زیادہ سے متبوع و مطاع چلے آتے ہوں اور جن کے علم و فضل پر امت کا ایک بہت بڑا طبقہ اعتماد کرتا چلا آتا ہو ان کے بارے میں اگر دو چار آدمیوں کی رائیں اچھی نہ بھی ہوں تو اس سے ان کی شخصیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اگر ان منفرد راویوں پر کوئی حکم لگایا جائے تو پھر مشکل سے کوئی ممتاز محدث یا فقیہ ثقہ رہ جائے گا۔

---

[1] لمحات ص ۱۷۔

امام اوزاعی

امام اوزاعی اُن ائمہ تبع تابعین میں ہیں جن کا شمار دوسری صدی کے ممتاز مجتہدین مثلاً امام ابو حنیفہ، امام مالک، سفیان ثوری وغیرہ کے زمرہ میں ہوتا ہے۔ ان کی عظمت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ دوسری صدی ہجری میں فقہ و حدیث کے جو مکاتب فکر پیدا ہوئے، ان میں ایک کے بانی یہ امام اوزاعی بھی ہیں، انھوں نے تقریباً پوری زندگی شام میں بسر کی، اس لیے زیادہ تر یہیں ان کے مسلک و فتاوے کی ترویج و اشاعت ہوئی اور یہیں سے یہ مسلک اندلس میں پہنچا۔

شام بنو امیہ کا سب سے بڑا سیاسی مرکز تھا، اس لیے اموی حکومت پر بھی ان کے علم و فضل اور فقہ و فتاوے کا اثر پڑا تھا، غالباً اسی وجہ سے حکومت نے ان کے سامنے عہدۂ قضا پیش کیا، مگر انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

۱۳۲ھ میں جب مشرق سے بنو امیہ کا سیاسی اقتدار ختم ہوا تو اس خاندان کے بعض حوصلہ مند افراد مغرب اقصیٰ پہنچے اور اندلس کی حکومت میں ایک نئی جان ڈالی، ان ہی کے ذریعہ امام اوزاعی کا مسلک اندلس آیا، اور ایک مدت تک اس پر اہل اندلس کا عمل رہا۔ شام میں تقریباً دو صدی تک اور اندلس میں تقریباً ایک صدی یعنی حاکم بن ہشام متوفی ۲۰۶ھ کے عہد تک یہ مسلک زندہ رہا، اس کے بعد مشرق میں حنفی و شافعی اور مغرب میں مالکی و حنبلی مسلکوں نے اس کی جگہ لے لی، اور بالآخر آہستہ آہستہ اس مسلک کا تعامل ختم ہو گیا، فقہ و حدیث کی کتابوں میں اب بھی ان کے مجتہدات کا ذکر ملتا ہے، ان کے سوانح حیات کی پوری تفصیل ملاحظہ ہو۔

ابتدائی حالات

امام اوزاعی کا نسبی تعلق یمن کے قبیلہ بنو ہمدان یا بنو حمیر سے تھا، مگر ان کا خاندان وہان سے ترک وطن کر کے شام چلا آیا، اور یہان دمشق کے قریب ایک بستی اوزاع[۱] مین بود و باش اختیار کرلی، اسی نسبت سے ان کو اوزاعی کہا جاتا ہے،

بچپن کا نام عبد العزیز تھا، بعد مین انھون نے اسے تبدیل کر کے عبد الرحمن رکھا، اور اسی نام سے وہ مشہور رہین، ان کی کنیت ابو عمرو اور والد کا نام عمرو تھا،[۲]

شام کے مشہور شہر بعلبک مین سنہ ۸۵ھ مین ان کی ولادت ہوئی، ابھی بچے ہی تھے کہ سر سے والد کا سایہ اٹھ گیا، اور یہ یتیم ہو گئے، ماں نے نہ جانے کن کن مصیبتون اور تکلیفون کے ساتھ ان کی پرورش کی، حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ان کا نشو و نما کسی ایک جگہ نہین ہوا، بلکہ ان کی والدہ (غالباً معاشی پریشانیون کی وجہ سے) ان کو شہر بہ شہر لیے پھرتی تھیں، بہت دنون تک ادھر ادھر کی خاک چھاننے کے بعد خدا نے نہ جانے کیا صورت پیدا کر دی کہ بیروت مین قیام پذیر ہو گئین،

امام ذہبی نے لکھا ہے کہ ان کی ولادت بعلبک مین ہوئی اور پرورش کرک[۳] میں ہوئی، اس کے بعد ان کی والدہ ان کو کرک سے لیکر بیروت چلی آئیں، اور یہین اقامت گزین ہو گئین، بہر حال بیروت

---

۱ بعض ارباب تذکرہ نے لکھا ہے کہ اوزاع یمن کے قبیلہ ذو الکلاع کی ایک شاخ کا نام ہے، یمن سے ترک وطن کر کے جب یہ لوگ شام آئے تو جہان یہ آباد ہوے اسی مقام کا نام اوزاع پڑ گیا، مگر مین نے سمعانی کے بیان کو ترجیح دی ہے، حافظ ذہبی نے ان کے بارے مین لکھا ہے کہ اصلاً من سبی السند ان کا خاندانی تعلق سندھ سے تھا اس اعتبار سے ان کو ہندوستانی کہنا چاہئے مگر راقم کو اس بیان پر شک ہے اس لئے کہ اس کی تائید کسی دوسرے بیان سے نہین ہوتی، راقم نے اس کی تردید مین ایک مفصل مضمون لکھا ہے جو معارف اپریل ۵۶ء مین چھپ گیا ہے، جو لوگ اس کی تفصیل چاہتے ہون وہ مضمون دیکھ لین، ۲ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۹۲ سمعانی نے لکھا لفظ اوزاعی ۳ دمشق کے پاس ایک گاؤن تھا، اس نام کے دوسرے مقامات بھی ہیں ۴ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۹۲ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ انھون نے آخری عمر مین بیروت مین سکونت اختیار کر لی تھی، مگر دوسرے تذکرہ نگارون نے وہی لکھا ہے جس کو مین نے اختیار کیا ہے،

پہنچنے کے بعد غالباً ان کو کچھ اطمینان نصیب ہوا، تو ان کی تعلیم و تربیت کا آغاز ہوا،

ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور بچپن کے دوسرے حالات و کوائف کا ذکر تذکرون مین بہت ہی کم بلکہ قریب قریب نہین ملتا ہے، اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔

جو بچے خوشحال اور فارغ البال گھرانون مین پیدا ہوتے ہیں یا کم از کم ان کو اپنے والدین کا سایۂ عاطفت ہی نصیب ہوتا ہے، ان کا بچپن ایک خاص نہج سے گزرتا ہے، ان کی تعلیم ایک خاص نظم و ترتیب اور تربیت ایک خاص معیار کے مطابق ہوتی ہے، ایسے بچے آگے چل کر جب کسی ممتاز حیثیت کے مالک ہوتے ہین تو ان کے بچپن اور ان کی تعلیم و تربیت کے واقعات سینکڑون آدمیون کو یاد ہوتے ہیں، اس لیے سوانح نگارون کو ان کے ابتدائی حالات معلوم کرنے مین کوئی دقت محسوس نہین ہوتی، مگر امام اوزاعی اس طرح کی تمام نعمتون سے محروم تھے، نہ تو وہ کسی خوشحال گھرانے مین پیدا ہوئے، نہ ان کے والد کا سایہ ان کے سر پر تھا، حتیٰ کہ ان کو سن شعور تک کسی ایک جگہ رہنا بھی نصیب نہین ہوا، ان کی ولادت کہین ہوئی، بچپن کسی اور جگہ گذرا، اور جوانی کے ایام کہین اور بسر ہوئے، ایسی صورت مین ان کے بچپن کے حالات اور تعلیم و تربیت کے ابتدائی واقعات پردۂ اخفا مین ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہین۔

تعلیم اور اساتذہ

مگر اس کے باوجود ان کی انشاپردازی، فصاحت و بلاغت اور تحریر و تقریر کی بے پناہ قوت و صلاحیت سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت ایسے ماحول اور ایسے اساتذہ کی صحبت مین ہوئی جو ان حیثیتون سے ممتاز تھے،

اہل تذکرہ نے ان کے زمانہ طالب علمی کے جو دو ایک واقعے بیان کیے ہیں اور ان کے جن اساتذہ کا تذکرہ کیا ہے، ہم اسے یہان نقل کرتے ہین۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ یہ اپنی والدہ کے ساتھ بیروت مین سکونت پذیر ہو گئے تھے، یہ بیروت

ہی میں تھے کہ ایک بار ان کو یمامہ جانے کا اتفاق ہوا، یمامہ میں اس وقت ممتاز محدث یحییٰ بن کثیر کی مجلس درس برپا تھی، اس میں شریک ہونے لگے، ان کو یحییٰ کی مجلس ایسی پسند آئی کہ اسی کے ہو رہے، کچھ دنوں کے بعد (غالباً ان کی صلاحیت کے اندازے کے بعد) استاذ نے ہدایت کی کہ وہ بصرہ جا کر محمد بن سیرین اور شیخ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہما سے سماع حدیث کریں، استاذ کے حکم کے بموجب وہ بصرہ روانہ ہو گئے، مگر یمامہ سے بصرہ پہنچنا کچھ آسان نہ تھا، یمامہ اور بصرہ کے درمیان کئی سو میل کی مسافت تھی، پھر امام اوزاعی کو نہ تو سواری میسر تھی اور نہ بھرپور زاد راہ، نہ جانے وہ کس کس طرح اور کتنے دنوں میں افتاں و خیزاں بصرہ پہنچے، وہاں پہنچتے ہی یہ اندوہ ناک خبر ملی کہ جن بزرگوں سے سماع حدیث کے لئے وہ اتنی دور سے پاپیادہ آئے ہیں، ان میں سے ایک یعنی امام حسن بصری واصل بحق ہو چکے ہیں، اور دوسرے امام محمد بن سیرین صاحب فراش ہیں، اس خبر سے ان کو جو رنج ہوا ہوگا، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے، مگر سوائے صبر کے چارۂ کار کیا تھا۔

وہ ابن سیرین کی خدمت میں پہنچے تو دیکھا کہ وہ بستر مرگ پر پڑے ہیں، ایسی حالت میں وہ سماعِ حدیث سے تو بہرہ مند نہیں ہو سکتے تھے، اس لیے انھوں نے اپنی سعادت اسی میں سمجھی کہ جو مہلت بھی میسر ہے، اس میں حضرت ابن سیرین کی خدمت میں حاضر ہو جایا کریں، چنانچہ وہ جب تک وہاں رہے برابر ان کی عیادت کے لیئے جاتے رہے، ممکن ہے اس اثنا میں انھوں نے ان سے زبانی کوئی حدیث سنی ہو، جیسا کہ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے، مگر عام ارباب تذکرہ لکھتے ہیں کہ ان کو محمد بن سیرین سے سماع حدیث حاصل نہیں ہے۔[1]

انھوں نے تابعین کی ایک کثیر تعداد سے حدیث نبوی کی سماعت کی ہے، حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے،

---

[1] البدایہ والنہایہ۔

ادرک خلقا من التابعین — تابعین کی ایک کثیر تعداد کی انھوں نے صحبت اٹھائی ہے۔
(البدایہ ج ۱۰ ص ۱۱۶)

اہل تذکرہ نے ان کے جن اساتذہ کا ذکر کیا ہے ان میں سے چند ممتاز تابعین اور تبع تابعین کے نام یہ ہیں۔

عطا بن ابی رباح، قتادہ، نافع مولی ابن عمر، امام زہری، محمد بن ابراہیم، شداد بن ابی عمار، قاسم بن مخیمرہ، ربیعہ بن یزید وغیرہ،

امام زہری اور یحیی بن ابی کثیر کے بارے میں امام اوزاعی کا خود بیان ہے کہ ان دونوں اماموں نے (غالباً) زبانی سماع حدیث کے بعد مجھے اپنے اپنے صحیفے (جن میں ان کی مرویات لکھی ہوئی تھیں) دیے اور فرمایا کہ

اروھا عنی — میرے واسطے سے تم اس کی روایت کرو۔[1]

یعقوب بن شیبہ نے یحیی بن معین کا قول نقل کیا ہے کہ وہ امام زہری سے امام اوزاعی کی روایت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے، مگر ابن شیبہ . . . . یہ قول نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

"زہری سے امام اوزاعی کی روایت خاص چیز ہے۔"[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن شیبہ نے ابن معین کی اس رائے کو قبول نہیں کیا ہے۔

درس و افتا | بعض سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ یہ تیرہ برس کی عمر میں مسند درس و افتا پر بیٹھ گئے تھے، مگر اس روایت میں یا تو مبالغہ ہے یا غلط فہمی کی بنا پر عمر غلط درج ہو گئی ہے جو حافظ ابن کثیر نے لکھی ہے کہ ۱۱۳ھ سے جب کہ ان کی عمر پچیس برس کی تھی انھوں نے فتوی دینا شروع کر دیا تھا،[2]

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۴۱ [2] البدایہ ج ۱۰ ص ۱۱۶

یہ تو پتہ نہیں چلتا کہ انھوں نے باقاعدہ اپنی کوئی مجلس درس قائم کی تھی اگر تمام ارباب تذکرہ لکھتے ہیں کہ دینی مسائل مین اہل شام ان ہی کی طرف رجوع کرتے تھے، ہقل بن زیاد جو انکے خاص شاگرد ہیں ان کا بیان ہے کہ

افتی الاوزاعی فی سبعین الف مسئلۃ بحدثنا واخبرنا[1]

انھون نے ستر ہزار مسئلون کا جواب حدیث کی روشنی مین دیا،

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی کوئی خاص مجلس درس تو قائم نہین تھی، مگر دوسرے طریقون سے اہل علم ان سے استفادہ وروایت کرتے تھے، محاسن المساعی مین ہے کہ وہ نماز فجر کے بعد خاص ضرورت کے علاوہ کسی سے بات چیت نہین کرتے تھے بلکہ ذکر الٰہی مین مشغول رہتے تھے، تلامذہ انتظار مین رہتے تھے، جب سورج نکل آتا تھا تو استاذ وتلامذہ فقہ وحدیث کے مذاکرہ مین لگ جاتے تھے، ثم یتومون فیتذاکرون فی الفقہ والحدیث (ص ۷۲)

ان سے روایت کرنے والون مین متعدد اکابر ائمہ ہیں، چند نام یہ ہین،

امام مالک، امام شعبہ، سفیان ثوری، عبد اللہ بن مبارک، یحییٰ بن سعید القطان، ابن ابی الزناد[2]، ہقل بن زیاد، ابو اسحاق الفزاری وغیرہ،

امام اوزاعی کو یہ فخر حاصل ہے کہ امام زہری اور قتادہ نے بھی جو ان کے استاذ اور ائمہ تابعین کے سرخیل ہیں، ان سے روایت کی ہے[3]

فضل وکمال | ان کے فضل وکمال کا اعتراف تمام اکابر ائمہ فقہ وحدیث نے کیا ہے، یحییٰ بن معین فرماتے تھے، ائمہ تو چار ہیں، امام ابو حنیفہ، امام مالک، سفیان ثوری اور امام اوزاعی[4]،

---

[1] البدایہ ج ۱۰ ص ۱۱۶ [2] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۳۹ [3] البدایہ ج ۱۰ ص ۱۱۶ [4] ابھی تک امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے مسلکون کی شہرت نہین ہوئی تھی، بلکہ اسلامی مملکت کی بیشتر آبادی ان ہی ائمہ کے فقہ وفتاوے پر عامل تھی،

عبدالرحمن بن مہدی کا قول ہے کہ اس وقت حدیث میں چار امام ہیں، امام اوزاعی، امام مالک، سفیان ثوری اور حماد بن زید[1] ان ہی کا قول ہے کہ شام میں امام اوزاعی سے زیادہ سنت نبوی کا جاننے والا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ امام شافعی کا بیان ہے کہ میں نے حدیث میں ان سے زیادہ سمجھدار اور فقیہ آدمی نہیں دیکھا[2]، سفیان بن عیینہ ان کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ اپنے زمانہ کے امام ہیں، ابو اسحاق فزاری کا قول ہے کہ میں نے امام اوزاعی اور سفیان ثوری جیسا صاحبِ علم وفضل نہیں دیکھا[3]، ابوزرعہ رازی فرماتے تھے، امام اوزاعی اپنے علم وفضل اور کثرتِ روایت کی بنا پر اہل شام کے مرجع بن گئے تھے، اور اہل شام ان ہی سے فتاوے لیتے تھے،

اوپر ذکر آچکا ہے کہ انھوں نے تقریباً ستّر ہزار مسائل کا جواب حدیث وآثار کی روشنی میں دیا تھا، امیہ بن زید سے کسی نے پوچھا کہ مکحول[4] کے مقابلہ میں اوزاعی کا کیا درجہ ہے، انھوں نے کہا کہ اوزاعی کا رتبہ ہمارے نزدیک مکحول سے زیادہ ہے، پوچھا کہ مکحول نے تو صحابہ کرامؓ کو دیکھا تھا، فرمایا کہ ہاں رویت صحابہ کا فضل انھیں ضرور حاصل تھا، مگر یہ فضل اضافی ہے۔ امام اوزاعی میں جو فضل وکمال ہے وہ ان کا ذاتی ہے[5]، دوسری روایت میں ہے کہ ان میں علم وعبادت اور اظہار حق ہر چیز جمع تھی،

امام مالک فرماتے تھے کہ امام اوزاعی ان ائمہ میں ہیں جن کی اقتدا کیجا سکتی ہے (البدایہ ج ۱، ص ۱۱۶)

امام نووی ان کے فضل وکمال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وقد اجمع العلماء علی امامتہ	امام اوزاعی کی امامت، جلالت شان، علو
الاوزاعی وجلالتہ وعلو	مرتبت اور فضل وکمال پر سب کا اتفاق ہے
مرتبتہ وکمال فضلہ	

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۶، ص ۲۳۹ ان کے حالات کتاب میں درج ہیں۔ [2] ایضاً ص ۲۴۲ [3] ایضاً۔
[4] مشہور تابعی ہیں۔ [5] تہذیب الاسماء ج اص ۲۹۹-۳۰۰

اس کے بعد انھون نے لکھا ہے کہ ان کے علم و فضل، زہد و تقویٰ اور اظہار حق مین ان کی جرات و ہمت کے بارے میں سلف کے اقوال مشہور و معروف ہیں۔[1]

حافظ ابن کثیر نے ان کے علم و فضل کی تصویر ان الفاظ مین کھینچی ہے،

خلفا، وزرا اور تجار وغیرہ کے کسی طبقہ مین بھی ان سے زیادہ صاحب علم و فضل اور فصیح و بلیغ، متقی و پرہیزگار آدمی نہین دیکھا گیا، فقہ و حدیث، سیرت و مغازی اور دوسرے اسلامی علوم مین نہ صرف اپنے اہل وطن پر بلکہ تمام ممالک اسلامیہ پر ان کی سیادت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا، زبان و ادب کا ذوق بھی ان مین فطری تھا، ان کی تحریر و تقریر دونون نہایت فصیح و بلیغ ہوتی تھین، ان کی زبان سے جو بات بھی نکلتی لوگ حسن بیان اور فصاحت کی وجہ سے اس کو لکھ لیتے تھے، اور وہ تحریر بطور نمونہ اپنے پاس رکھتے تھے، دربار خلافت مین بھی ان کی تحریرین بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھین، خصوصیت سے عباسی خلیفہ منصور کو ان کی تحریر بہت پسند تھی، ایک بار اس نے اپنے خاص کاتب سے کہا کہ حکومت کی طرف سے جو خطوط و فرامین ملک کے دوسرے حصون مین بھیجے جاتے ہین۔ ان مین تمھین امام اوزاعی کی تحریر سے مدد لینی چاہیے تاکہ ان خطوط کی زبان فصیح و بلیغ سمجھی جائے۔ کاتب نے کہا کہ امیرالمومنین! پوری مملکت مین اس وقت ایک آدمی بھی ایسا نہین ہے جو ان کی تحریر کا چربہ اتار سکے یا اس کی تقلید کر سکے،[2]

ان کے علم و فضل کا تذکرہ ان کی تصنیفات کے ضمن مین بھی آئے گا۔

عقائد مین ان کا مسلک اس زمانہ مین جبر و قدر کے مسائل عام طور پر رائج ہو گیے تھے، خاص طور پر ایمان کے بسیط و مرکب ہونے کی بحثین عام طور پر اہل علم کا موضوع بحث تھین، امام اوزاعی اس بارے مین عام محدثین اور سلف کا مسلک رکھتے تھے، فرماتے ہیں کہ ہمارے اسلاف ایمان و عمل مین

---

[1] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۹۹۔ ۳۰۰ [2] البدایہ ص ۱۱۷ ج ۱۰

میں تفریق نہیں کرتے تھے، عمل ایمان سے ہے اور ایمان عمل سے، ایمان ایک جامع لفظ ہے، تو جو اپنی زبان سے ایمان کا اقرار کرے، قلب مین اس کی معرفت رکھے، اور عمل سے اس کا ثبوت دے، اس نے ایک کڑا تھام لیا جو ٹوٹ نہین سکتا، فقد استمسک بالعروۃ الوثقی، لا انفصام لھا،

اور جو شخص زبان سے تو ایمان کا اظہار کرے، مگر نہ تو اس کا قلب اس کی معرفت کا لذت شناس ہو اور نہ وہ عمل سے اس کا ثبوت دے تو ایسے شخص کا ایمان خدا کے یہان مقبول نہین، آخرت مین وہ ناکامیاب ہوگا،

مناظرہ | امام اوزاعی بحث ومباحثہ اور مناظرہ ومجادلہ سے دور رہتے تھے، مگر جب اس کی ضرورت آجاتی تھی، تو اثبات حق کے لیے مناظرہ بھی کر لیا کرتے تھے، پہلی صدی کے آخر مین یونانی فلسفہ کے اثر سے بہت سے فرقے پیدا ہوگیے تھے انہین ایک فرقہ قدریہ بھی تھا، دوسری صدی کی ابتدا مین اس کا بڑا زور تھا، ان کا خیال تھا کہ تقدیر کوئی چیز نہین، خدا پیدا کر دینے کے بعد پھر اس مین کوئی تبدیلی پیدا کرنے پر قادر نہین ہے، انسان بالکل مختار مطلق ہے، وہ جو چاہے کرے، اس کے لیے محض اس کی مشیت اور اس کا ارادہ کافی ہے۔

ہشام بن عبد الملک متوفی ۱۲۵ھ سے لوگون نے ایک قدری کی شکایت کی، اس نے اس کو بلوایا اور کہا کیا بات ہے کہ تمھارے بارے مین لوگ چہ می گوئیان کر رہے ہیں، بولا کہ اگر لوگ میری شکایت کرتے ہین تو اس کا فیصلہ تو اسی وقت ہو سکتا ہے جب مجھے کوئی قائل کرنے کہ مین جو کچھ کہتا ہون وہ غلط ہے، اگر کوئی مجھے قائل کر دیتا ہے تو آپ کو میری طرف سے پوری اجازت ہے کہ میرا سر قلم کر دین ہشام نے کہا بات معقول ہے، ہشام نے امام اوزاعی کو بلوا کر عرض کیا کہ آپ ہماری طرف سے اس سے گفتگو کیجیے، امام اوزاعی نے قدری سے فرمایا کہ تین یا چار باتیں تم سے پوچھنا چاہتا ہون تم ان مین انتخاب کر لو، اس نے کہا آپ تین سوال کر سکتے ہیں، فرمایا هل قضی الله علی ما نھی ؟ کیا خدا نے جس چیز سے روکا ہے، اس کے خلاف بھی فیصلہ کرتا ہے؟ بولا کہ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہین ہے، پھر پوچھا کہ خدا نے جو حکم دیا ہے، اس کے درمیان

خود حائل بھی ہو جاتا ہے، بولا یہ تو پہلے سوال سے بھی زیادہ سخت ہے، اس کا بھی میرے پاس کوئی جواب نہیں، پھر سوال کیا کہ جن چیزوں کو اس نے حرام کیا ہے، اس کے استعمال کی بھی اجازت دیتا ہے، کہا یہ اور بھی مشکل ہے، امام اوزاعی نے فرمایا امیر المومنین! میں نے تین باتیں پوچھیں، تینوں کے جواب سے عاجز رہا آپ اب خود فیصلہ کرلیں، ہشام نے اس کو وہی سزا دی، جس کا وہ مستحق تھا، پھر الگ ہشام نے امام اوزاعی سے پوچھا کہ اگر وہ ایک ہی سوال کی اجازت دیتا، تو آپ اس سے کیا پوچھتے، فرمایا میں اس سے پوچھتا کہ تمھاری اور خدا کی مشیت برابر درجہ کی چیز ہے، یا کم درجہ کی، اس کا جو وہ جو جواب دیتا، اس کے عقیدہ کے خلاف ہوتا، پھر انھوں نے اپنے سوالات کی تفصیل بتائی۔

خلافت کی اہلیت | غیر معمولی علم و فضل کے ساتھ حکمرانی و انتظام ملکی کی صلاحیت بہت کم جمع ہوتی ہے، مگر یہ دونوں خوبیاں بیک وقت ان میں موجود تھیں، ایک بار امام اوزاعی اور سفیان ثوری امام مالک کے پاس گیے، وہاں سے واپس ہوئے تو امام مالک نے ان کے متعلق فرمایا کہ سفیان علم میں بڑھے ہوئے ہیں، اور اوزاعی علم کے ساتھ انتظام ملکی کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں، امام ذہبی نے لکھا ہے،

وکان یصلح للخلافۃ — وہ خلیفہ بنائے جانے کے لائق تھے۔

امام مالک فرماتے تھے انہ یصلح للامامۃ یہ امامت کے لائق تھے، ابو اسحاق فزاری فرماتے تھے کہ اس زمانہ میں اگر خلفاء کے انتخاب کا اختیار امت کو دیدیا جائے، تو میں امام اوزاعی کو منتخب کروں گا، (محاسن المساعی صفحہ ۱۱)

امیر شکیب ارسلان لکھتے ہیں کہ

امام اوزاعی عالم تھے۔ مگر وہ عام علماء کی طرح نہیں تھے۔ بلکہ ان کے علم و عمل میں مطابقت تھی، انھوں نے حفظ و روایت اور فکر و نظر ہی تک اپنی توجہ مبذول نہیں رکھی بلکہ امت کے ہر کام سے دلچسپی لی، انھوں نے عبادت و ریاضت کرکے محض اپنی ذات ہی کی نجات کی راہ نہیں ڈھونڈھی

بلکہ عدل و انصاف کے پھیلانے اور مخلوق خدا کی بھلائی اور راحت رسانی کی فکر بھی کی، امام کثرت عبادت اور ورع و زہد کے ساتھ اس حدیث پر بھی عامل تھے۔

عدل ساعة خير من عبادة الف شهر[1]	ایک گھڑی کا عدل و انصاف ہزار مہینہ کی عبادت سے بہتر ہے۔

سیرت و کردار سیرت و کردار مین صحابہ و تابعین کا نمونہ تھے، زہد و قناعت، سخاوت و فیاضی، حق گوئی و بیباکی، وعظ و پند اور امت کی خیر خواہی یہ سب ان کے نمایان اوصاف تھے،

بچپن سے انھون نے فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی تھی مگر زہد و قناعت کا حال یہ تھا کہ خود کبھی دربار خلافت کا رخ نہین کیا، خلفاے بنو امیہ کے یہان بھی معزز و محترم تھے اور خلفاے عباسیہ مین بھی ان کا وقار اور اعزاز تھا، مگر کبھی کسی سے کوئی مدد نہین لی، خلفاے بنو امیہ نے ان کو متعدد جاگیرین دی تھین، نیز دربار خلافت کی طرف سے مختلف اوقات مین تقریباً ستر ہزار دینار کے عطیے ان کی خدمت مین پیش کیے گیے، مگر انھون نے نہ تو کبھی ان جاگیرون کے کسی چپہ سے فائدہ اٹھایا اور نہ نقد رقم کا ایک حبہ اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ کیا، بلکہ یہ ساری جائداد اور پوری رقم فقرا و مساکین اور جہاد فی سبیل اللہ مین لگا دی، اور خود ہمیشہ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی جب انتقال ہوا تو سارا اثاث بیت سات دینار سے زیادہ کا نہ تھا۔

جرات و حق گوئی جرات و حق گوئی ان کی سیرت کا سب سے نمایان وصف تھا، اس سلسلہ مین امیر شکیب ارسلان نے جو کچھ لکھا ہے، اس کو ہم یہان نقل کرتے ہین۔

"امام اوزاعی نے خلفاء و امراء کے سامنے جس جرات و حق گوئی کا ثبوت دیا ہے، اس کی مثال تاریخ اسلام مین بہت کم ملیگی، لبنان کے عیسائیون کے بارے مین، وہان کے امیر صالح بن علی کو انھون نے جو خط لکھا اس کو غور سے پڑھیے، بنو امیہ کے بارے مین عبد اللہ بن علی سے انھون نے

---

[1] محاسن المساعی ص ۹ ۔

جو گفتگو کی، اس کو سامنے رکھیے منصور کو انھون نے جو ناصحانہ خطوط لکھے، ان پر ایک نظر ڈال لیجئے اُن سب مین آپ کو ان کا یہ وصف نمایان نظر آئے گا۔

ولعمری لو کان العلماء الذین من	خدا کی قسم اگر علماء امت مین امام اوزاعی
نمط الاوزاعی عددا کبیرا فی	کی روش اختیار کرنے والونکی ایک معتد بہ تعداد
الاسلام لما قد کان اسرع الفساد	موجود رہا کرتی تو اسلامی معاشرہ مین
الی المجتمع الاسلامی ولما کانت	نہ تو اتنی جلدی فساد پیدا ہو جاتا اور نہ اسلامی
انحطت دولۃ الاسلام بعد ذالک	حکومت غیر معمولی عروج کے بعد اتنی
العلو فی الارض وانما کانت آفتہ	جلد زوال پذیر ہوتی، اس امت کی ساری
ھذہ الامۃ، فساد امرائھا	مصیبت امرا کا بگاڑ اور علما کی بزدلی ہے،
وجبن علمائھا (ص ۱۵)	(صفحہ ۱۵)

امام اوزاعی نے جن جن مواقع پر امرا اور خلفا کے سامنے جرات وحق گوئی کا ثبوت دیا ہے اس کی تفصیل ملاحظہ ہو، بنو امیہ کی حکومت سے امام اوزاعی کا کوئی خاص لگاؤ نہین تھا، مگر جس ظلم وتشدد کے ساتھ وہ شام سے جلاوطن کیے گئے تھے، غالباً وہ امام کو پسند نہین تھا، ممکن ہے کہ انھون نے اس بارے مین کچھ اظہار خیال بھی کیا ہو، عبداللہ بن علی جس نے شام سے بنو امیہ کا خاتمہ کیا تھا، جب اس کو بنو امیہ کی طرف سے کچھ اطمینان ہوا تو اس نے ان تمام لوگون کا صفایا کرنا شروع کیا، جن کو اموی حکومت سے کسی درجہ مین بھی ہمدردی تھی، اس سلسلہ مین امام اوزاعی کی بھی تلاش ہوئی، یہ کئی دن چھپے رہے، مگر پھر جرات کر کے خود دربار مین حاضر ہو گئے، فرماتے ہیں کہ جس وقت مین دربار مین داخل ہوا تو دیکھا کہ عبداللہ ایک تخت پر متمکن ہے، اور اس کے ہاتھ مین ایک نیزہ ہے، اس کے اردگرد بہت سے جلاد نما سپاہی ننگی تلوارین لیے کھڑے ہیں، مین نے پہنچکر سلام کیا، اس نے سلام کا جواب دینے کے

بجائے اپنے نیزہ کو زمین پر پٹکتے ہوئے کہا، اوزاعی! ہم نے ان ظالموں (بنو امیہ) سے ملک اور اس کے باشندوں کو نجات دلانے میں جو جنگ کی ہے، یہ جہاد ہے کہ نہیں؟ امام اوزاعی کے لیے یہ بڑا سخت وقت تھا، مگر انھوں نے نہایت ہی حکیمانہ جواب دیا۔ فرمایا کہ میں نے یحییٰ بن سعید کے واسطہ سے یہ حدیث نبوی سنی ہے کہ

تمام اعمال کا مدار نیت پر ہے، ہر شخص اپنے اعمال میں جیسی نیک و بد نیت کرے گا، ویسا ہی اسے اجر ملے گا۔

مقصد یہ تھا کہ اگر تمھاری نیت صرف ملک گیری کی تھی تو تم کو اس کا اجر ملے گا، اور اگر اعلائے کلمۃ اللہ مقصود تھا تو پھر جہاد کا ثواب ملے گا۔

یہ غیر متوقع جواب سنکر ابن علی غصہ سے بیتاب ہو گیا، اور اسی غصہ میں اپنے نیزہ کو زمین پر ایک بار پھر تیزی سے پٹکا اور معًا دوسرا سوال یہ کیا کہ

یا اوزاعی ما تقول فی دماء بنی امیۃ۔ — اے اوزاعی! بنی امیہ کے خون کے بارے میں کیا خیال ہے؟ (یعنی ان کا قتل کرنا جائز ہے یا حرام)

آپ نے اپنی طرف سے کوئی جواب دینے کے بجائے نہایت ہی متانت کے ساتھ ایک حدیث پھر سنائی، وہ حدیث یہ ہے۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ مسلمان کا خون کرنا تین حالتوں میں جائز ہو سکتا ہے، قصاص میں یا شادی کے بعد زنا میں یا پھر ارتداد کے بعد"،

یہ جواب بھی اس کی توقع کے بالکل خلاف تھا، اسی لیے اس نے اس دفعہ اور زیادہ غصہ کا اظہار کیا، پھر پوچھا کہ اچھا

"بنو امیہ کے مال کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے"؟

آپ نے فرمایا "ان کے پاس جو دولت تھی اگر وہ حرام ذریعہ سے ان کے ہاتھ میں آئی تھی تو بہرحال وہ تمھارے ہاتھ میں پہنچکر حلال تو نہیں ہو سکتی اور اگر وہ حلال تھی تو تم اس کو اسی طریقہ سے لے سکتے ہو جس طرح شریعت نے اجازت دی ہے"۔ یہ جواب سنکر وہ بالکل آگ بگولہ ہو گیا، امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ میں اس جواب کے بعد متوقع تھا کہ ابھی وہ میرے قتل کا حکم دیدے گا مگر اب اس نے ترہیب کے بجائے ترغیب سے کام لینا شروع کیا، اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیوں اگر آپ کو عہدۂ قضا سونپ دیا جائے تو کیا ہرج ہے؟ انھوں نے کہا کہ آپ کے اسلاف نے اس ذمہ داری سے مجھے سبکدوش رکھا تو میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اسی روش پر قائم رہیں۔

اس سوال و جواب کے بعد اس نے ان کو واپس جانے کی اجازت دیدی، امام اوزاعی دربار سے رخصت ہو کر ابھی کچھ ہی دور گئے تھے کہ عبد اللہ کا ایک قاصد لپکا ہوا ان کے پاس پہنچا، امام اوزاعی نے دیکھا تو سمجھے کہ وہ غالبًا میرے قتل کا پروانہ لا رہا ہے، چاہا کہ فورًا سواری سے اتر کر دو رکعت نماز ادا کر لیں[1]، چنانچہ انھوں نے نماز کی نیت باندھ لی، قاصد انتظار کرتا رہا، جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو اس نے دو سو دینار کی ایک تھیلی پیش کی، اور کہا کہ یہ امیر نے آپ کے لیے بھیجا ہے، امام اوزاعی کا بیان ہے کہ میں نے خوف کی بنا پر یہ رقم لے لی، مگر گھر پہنچنے سے پہلے پوری رقم صدقہ کر دی،[2]

منصور کو ناصحانہ خطوط | خلفاے عباسیہ میں منصور حد درجہ خود رائے، جابر اور متشدد واقع ہوا تھا اسی نے عہدۂ قضا نہ قبول کرنے پر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو کوڑے لگوائے اور قید کر دیا، اسی نے طلاق مکرہ میں اس کی مرضی کے خلاف فتوی دینے پر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو سر بازار رسوا کیا اور

---

[1] قتل سے پہلے دو رکعت نماز ایک صحابی حضرت خباب بن ارت کی سنت ہے [2] البدایہ والنہایہ ص ۱۱۸ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۲-۱۶۳،

ان کا ایک ہاتھ بازو سمیت اکھڑوا لیا، اسی نے سفیان ثوری جیسے برگزیدہ بزرگ کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں، یہ سب واقعات امام اوزاعی کے سامنے تھے، مگر اس کے باوجود وہ حق گوئی و بیباکی سے باز نہیں آئے

منصور اپنی خودرائی اور جبر و استبداد کے باوجود غالباً اپنی سیہ کاری کو چھپانے کے لیے اس بات کا خواہش مند رہتا تھا کہ امام اوزاعی اس کے دربار میں آکر اسے نیک مشورے دیں، مگر امام اوزاعی بغیر طلب کے نہ کبھی دربار میں آئے، اور نہ بغیر کسی شدید ملی ضرورت کے کوئی تحریر لکھی، پہلی بار منصور جب شام آیا، اور امام اوزاعی سے ملاقات ہوئی، تو انھوں نے اس کو بہت سی نصیحتیں کیں، جب واپس ہونے لگے، تو انھوں نے منصور سے کہا کہ مجھے سیاہ لباس[1] پہننے سے معاف رکھا جائے، اس نے اجازت دیدی، جب وہ دربار سے رخصت ہوگئے، تو اپنے ندیم خاص ربیع کو ان کے پاس بھیجا، اور کہا کہ میرا نام ظاہر نہ کرنا بلکہ اپنی طرف سے دریافت کرنا کہ سیاہ لباس وہ کیوں ناپسند کرتے ہیں، ربیع کے دریافت کرنے پر فرمایا کہ سیاہ لباس نہ تو احرام میں استعمال کیا جاتا ہے، نہ تجہیز و تکفین میں اور نہ شادی کے موقع پر تو پھر اس کی کیا ضرورت[2] ہے۔

ایک بار منصور نے انکو خط ایک لکھا اور یہ آرزو کی کہ کوئی خیر خواہانہ مشورہ دیجیے، اس کے جواب میں انھوں نے نہایت مختصر اور بلیغ خط لکھا، اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں،

اما بعد! فعلیک یا امیر المؤمنین:	امیر المومنین آپ اپنے اوپر خدا کا تقوی
بتقوی اللہ عزوجل وتواضع	لازم کر لیجیے، اور تواضع اختیار کیجیے، خدا
یرفعک اللہ تعالیٰ یوم یضع	تعالیٰ آپ کو اس دن بلند کرے گا جس دن
المتکبرین فی الارض بغیر الحق	ان متکبرین کو جو ناحق زمین پر بڑے بنتے ہیں

[1] سیاہ لباس عباسی حکومت کا سرکاری لباس تھا، اس وقت دربار میں اس لباس کو نہ پہننے کے معنی حکومت سے بغاوت کے تھے۔ [2] حسن المساعی مرتبہ امیر شکیب ارسلان ص ۱۱۹۔

واعلم ان قرابتك من رسول الله صلی الله علیہ وسلم لن تزید حق الله الا وجوباً۔ | ذلیل کرائے گا، اور اچھی طرح غور کر لیجئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی قرابت خدا کے یہان حق سے زیادہ آپ کو کچھ نہ دلائیگی۔

اس خط مین امام اوزاعی نے منصور کی تین کمزوریون کی طرف توجہ دلائی ہے، جنھون نے اس کو حد درجہ مستبد بنا دیا تھا، یعنی خوف خدا کی کمی، حکومت کا غرور، اور نسلی شرف،

اگر کوئی اہم دینی یا ملی ضرورت پیش آجاتی تھی تو بغیر طلب بھی اس کو خط لکھ کر اس کی طرف متوجہ کرتے تھے۔

ابراہیم بن علی اور محمد بن حسن نے منصور کے خلاف جب علم بغاوت اٹھایا، تو منصور نے سرحدی مسلمانون سے بھی مدد مانگی، انھون نے مدد نہین دی، چونکہ وہ رومی حکومت کے بالکل زد مین تھے (غالباً) رومی حکومت نے منصور کی خفگی سے فائدہ اٹھا کر انھون نے بہت سے سرحدی مسلمانون کو قید کر لیا، اور منصور کے پاس لکھا کہ اگر آپ چاہین تو فدیہ دیکر مسلمان قیدیون کو چھڑا سکتے ہین، منصور چونکہ ان سے ناخوش تھا اس لیے اس نے انکار کر دیا، امام اوزاعی کو جب اس کی اطلاع ہوئی کہ ہزارون مسلمان رومیون کے ہاتھ قید و بند کی مصیبت جھیل رہے ہیں، اور منصور کو رہا کرنے کی کوئی فکر نہین ہے، تو انھون نے ایک لمبا سخت خط لکھا جس مین منصور کی ذمہ داری ذکر کر کے مسلمان قیدیون کی رہائی کی طرف توجہ دلائی اس خط کو مع ترجمہ ہم یہان نقل کرتے ہیں،

اما بعد، فان الله تعالیٰ استرعاک الله هذه الامة لتکون فیها | اما بعد! اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس امت کا ذمہ دار اور نگہبان اس لیے بنایا ہے کہ آپ

لہ حسن المساعی مرتبہ امیر شکیب ارسلان ص ۲۰۔

بالقسط قائما وبنيه صلى الله
عليه وسلم فی خفض الجناح والرفقة
متشابها واسأل الله تعالى ان
يسكن على امير المومنين دهماء
هذه الامة ويرزقه رحمتها فان
سائحة المشركين التي غلبت
عام اول وموطئهم حريم
المسلمين واستنزالهم العواتق
والذرارى من المعاقل والحصون
كان ذلك بذنوب العباد وما
عفا الله اكثر فبذنوب العباد
استنزلت العواتق والذرارى
من المعاقل والحصون، لا
يلقون لهم ناصرا ولا عنهم
مدافعا كاشفات رؤسهن
واقدامهن فكان ذالك
بمرأى لله ومسمع وحيث ينظر
الى خلقه اعراضا عنهم
فليتق الله يا امير المومنين!

اس میں انصاف قائم کریں، اور مسلمانوں کے
ساتھ محبت اور شفقت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم
کی سنت سے مشابہت پیدا کریں میں اللہ
تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ مسلمانوں پر اس وقت
جو مصیبت آئی ہے، اس میں وہ آپ کو اطمینان
نصیب کرے اور ان پر رحم کرنے کی توفیق
عطا فرمائے اس سال کی ابتدا میں رومی مشرکین
کو جو غلبہ ہوا ہے، اس میں انھوں نے مسلمانوں
کے گھروں کو روند ڈالا ہے، ان کی عورتوں
اور بچوں کو، ان کے گھروں اور قلعوں سے
نکالکر ذلیل کیا ہے، یہ سب بندوں کے گناہوں
کا نتیجہ ہے، اگرچہ خدا نے ان کے گناہوں
کو بہت کچھ معاف کردیا ہے، (ورنہ اور بڑی
مصیبت آتی) تو بندوں کے گناہوں ہی کا
نتیجہ ہے کہ عورتیں اور بچے اپنے گھروں
اور پناہ گاہوں سے اس طرح نکالے گئے،
کہ نہ ان کا کوئی مددگار ہے، اور نہ ان کی
طرف سے کوئی مدافعت کرنے والا ہے عورتوں
کی بے بسی کا حال یہ ہے کہ ان کے سر اور

وليتبع بالمقاداة بهم من الله سبيلا
وليخرج من حجة الله فان الله
تعالى قال لنبيه "وما لكم لا تقاتلون
في سبيل الله والمستضعفين من
الرجال والنساء والولدان"
وقد بلغني عن رسول الله صلى الله
عليه وسلم انه قال انى اسمع بكاء
الصبي في الصلاة فاتجوز فيها
مخافة ان تفتتن" فكيف تخليتهم
يا امير المومنين في ايدى العدو
يمتهنونهم ويتكشفون منهم
مالا يحله الا نكاح وانت
راعي الله والله تعالى فوقك
وسوف يبين منك يوم نضع الموازين
القسط ليوم القيامة فلا
تظلم نفس شيئا وان كان
مثقال حبة من خردل اتينا
بها وكفى بنا حاسبين .

پیر ننگے ہیں، اور یہ سب ہمارے دیکھتے او
سنتے ہو رہا ہے، اور جس وقت خدا تعالے
اپنی اور ان کی عزت کی تخلیق پر نگاہ ڈالے گا،
تو امیر المومنین اس بارے میں آپ کو خدا
سے ڈرنا چاہیئے، اور ان کا فدیہ دے کر خدا کے
غضب سے بچنے کا کوئی راستہ ڈھونڈنا چاہیے
اور اس کی حجت سے کوئی مفر تلاش کرنا چاہیے
اس لیے کہ اللہ تعالی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم
سے کہا ہے، کہ تم کو کیا ہو گیا ہے، کہ تم اللہ
کے راستہ میں لڑتے نہیں اور کمزور مرد ،
عورتیں ، بچے اس بستی سے نکلنے کی دعا کرتے ہیں،
مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد
گرامی پہنچا ہے، کہ آپنے فرمایا کہ اگر نماز میں
بچے کی رونے کی آواز سنتا ہوں تو اس کو
مختصر کر دیتا ہوں کہ اوس کی ماں پریشان
نہ ہو، ان احکام کی موجودگی میں امیر المومنین
مسلمانوں کو ان کے دشمنوں کے ہاتھ میں
چھوڑ دینا کیسے جائز ہو سکتا ہے، کہ وہ ان کو
تکلیف دیں، اور ان کی بے حرمتی کریں، آپ

خدا کے راعی ہیں، اور خدا تعالیٰ آپ کے اوپر راعی
ہے، وہ آپ سے اس دن اس ذمہ داری کا پورا
پورا حق چاہے گا، اس نے کہا ہے کہ جس دن
ہم انصاف کی ترازو لگائیں گے، اس دن کسی
پر کوئی ظلم نہ ہوگا، اگر کوئی رائی کے برابر بھی
برائی کریگا تو ہم اس کو سامنے لائیں گے، اور
ہمارا حساب کافی ہے،

اہل تذکرہ بیان کرتے ہیں کہ اس خط کا اثر یہ ہوا کہ اس نے فوراً فدیہ دے کر مسلمانوں کو رہا کر لینے کا حکم دیا،

فلما وصل کتابہ امر بالفداء جس وقت یہ خط پہنچا، اسی وقت اس نے فدیہ دیکر مسلمانوں کو چھڑا لینے کا حکم دیا،

اس خط کی اہمیت کا پورا اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب منصور کی مستبدانہ روش کو بھی نگاہ میں رکھا جائے۔

غیر مسلم رعایا کے ساتھ عدل کی تاکید ان کا یہ طرز عمل صرف مسلمانوں ہی کے ساتھ نہیں تھا، بلکہ غیر مسلموں پر بھی وہ اسی طرح شفیق و رحیم رہتے تھے، اس سلسلہ میں امیر شکیب ارسلان کا بیان ملاحظہ ہو، امام اوزاعی ضروری سمجھتے تھے کہ اسلام نے انسان کو جو بنیادی حقوق دیے ہیں وہ ان کو دین و مذہب کی تفریق کے بغیر دیے جائیں چنانچہ امیر صالح بن علی نے جب جبل لبنان کے نصاریٰ پر ظلم کیا تو انھوں نے سخت نکیر کی اور اس کو خط لکھا، وہ اس آیت قرآنی پر عامل تھے، لا یجرمنکم شنئان قوم علیٰ ان لا تعدلوا اسی طرح جب اہل قبرس کا معاملہ پیش ہوا تو اس میں بھی بد اخلاقی کی

غرض یہ کہ ان کی روش سے صاف طور پر معلوم ہوتا تھا کہ اسلام عدل و انصاف اور انسانی حقوق کی حفاظت کرنے والا دین ہے اور ظلم و تعدی سے اس کو نفرت ہے (ص ۱۴)

ایک بار منصور نے ان کو بلا بھیجا، دور سے آنا تھا، اس لیے دیر ہوگئی، دربار میں پہنچے، تو منصور نے کہا میں دیر سے منتظر تھا، آپ نے اس کا تو کوئی جواب نہیں دیا لیکن یہ پوچھا کہ آپ نے کس لیے یاد کیا ہے، بولا کچھ اخذ و استفادہ کرنا چاہتا ہوں، ارشاد ہوا، میں تیار ہوں مگر اس شرط کے ساتھ کہ میں جو کچھ کہوں اسے آپ بھول نہ جائیں، بولا یہ کیسے ممکن ہے کہ میں آپ کے ارشادات کو بھلا دوں، جب کہ میں نے خود ہی اس کے لیے آپ کو تکلیف دی ہے، فرمایا ہاں اس کو آپ سن تو لیں گے مگر اس پر عمل نہ کریں گے، ان کا یہ انداز گفتگو منصور کے حاجب ربیع کو برا معلوم ہوا، اور ان کو تنبیہ کرنی چاہی، مگر منصور نے اس گستاخی سے یہ کہکر اسے روک دیا کہ تم کو معلوم نہیں ہے، کہ یہ درس و افادہ کی مجلس ہے، شاہی دربار نہیں، جب امام اوزاعی کو پورا اندازہ ہوگیا کہ منصور میں اس وقت جذبہ نصیحت پذیری کی موجود ہے، اور ان کی باتوں کو بڑی توجہ سے سن رہا ہے، تو اس کے سامنے چند احادیث نبوی بیان کیں پہلی حدیث مکحول کے واسطہ سے یہ بیان کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، کہ جب کسی بندے کو خدا کے دین کی کوئی بات معلوم ہوتی ہے اور وہ اس کو قبول کر کے، اس کی قدر کرتا ہے، تو اس کے لیے وہ خدا کی ایک نعمت ہوتی ہے، جو خاص طور پر اس کے لیے بھیجی گئی ہے، اور اگر وہ ٹھکرا کر اس کی ناقدری کرتا ہے، تو اس کے اوپر وہ ایک حجت ہوتی ہے، اور اس ناقدری کی وجہ سے وہ اپنے گناہوں میں بھی اضافہ کر لیتا ہے اور خدا کا غضب بھی بڑھ جاتا ہے"

اس حدیث کے سنانے کا مقصد یہ تھا کہ جو باتیں میں کہوں اس کی قدردانی تمھارے لیے مفید ہوگی، اور اگر ناقدری کروگے تو دنیا و آخرت دونوں جگہ تم نقصان اٹھاؤگے۔

پھر دوسری حدیث یہ سنائی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو حاکم رعیت پر ظلم

ذریادتی کر کے چین کی نیند سوتا ہے، خدا اس کے اوپر جنت حرام کر دے گا۔

یہ حدیث سنانے کے بعد آپنے ایک لمبی تقریر کی جس کا ایک ایک جملہ حرز جان سنانے کے قابل ہے، عام فائدہ کے لیے ہم یہان چند جملے نقل کرتے ہیں۔

"امیر المومنین! جس نے حق بات کو ناپسند کیا، اس نے خدا کو ناپسند کیا، اسلئے کہ اللہ سراسر حق ہی ہے، ہو الحق المبین۔ امیر المومنین جس چیز نے لوگون کے دلون کو آپ کی طرف مائل کیا، اور انھون نے آپ کو اپنا حاکم بنایا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت نسبی تھی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امت کے لیے نہایت ہی مہربان، رحیم، ہمدرد اور غم خوار تھے، آپ کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ لوگون پر حق (خدا کا حق ہو یا بندون کا) نافذ کرین، ان کے درمیان انصاف کرین، ان کی غلطیون سے چشم پوشی کرین (اس بات پر اس ماحول کو سامنے رکھکر غور کرنا چاہیے، جس مین ادنی سی غلطی پر گردن زدنی کا حکم ہو جایا کرتا تھا) ان کے اوپر اپنا دروازہ کھلا رکھین، یہ نہ ہو، کہ آپ کے دروازہ پر پہرہ دار بیٹھے رہیں، اور لوگ آپ تک نہ پہنچ سکین، آپ کو عوام کی خوشحالی سے مسرت ہو، اور ان کی بدحالی سے رنج، آپکے زیر حکومت عرب وعجم، مسلم و کافر سبھی ہیں، ان مین سے ہر ایک کا یہ حق ہے کہ آپ انکے ساتھ انصاف کرین، پھر سوچیے کہ یہان گروہ در گروہ ایسے لوگ ہیں۔ جنھین آپ سے کوئی نہ کوئی شکایت ہے اور ان پر کوئی نہ کوئی ظلم آپ کی طرف سے ہوا ہے۔

امیر المومنین! مکحول سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ مین ایک چھڑی رہا کرتی تھی، جس پر آپ ٹیک لگا کر چلا کرتے تھے، اور ہاتھ مین ہونے کی وجہ سے منافقین پر ایک رعب بھی طاری رہتا تھا، چنانچہ ایک دن حضرت جبرئیل آئے، اور کہا کہ اے محمد! کیا یہی چھڑی ہے جس سے آپنے اپنی امت کا سر کچلدیا اور ان کو خوف زدہ کر دیا ہے؟ آپ سوچیے کہ اس شخص کا خدا کے یہان کیا حال ہوگا جس نے لوگون کے چہرے خون آلود کیے، ان کا خون بہایا، ان کی

بستیان اجاڑ دین، ان کو جلا وطن کیا، اور ان پر رعب جمایا،

امیرالمومنین اپنے نفس کو اپنے فائدہ ہی کے لیے راضی کریجیے، اور اسکے لیے اپنے رب امان حاصل کیجیے۔

امیرالمومنین! اگر حکومت وسلطنت آپ سے پہلے گذرنے والون کے ساتھ رہنے والی ہوتی تو وہ آپ تک نہ پہنچتی، اور یہ آپ کے پاس بھی باقی نہین رہیگی جس طرح دوسرون کے پاس باقی نہین رہی، آپ نے اس آیت لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَۃً وَلَا کَبِیْرَۃً، کی تفسیر اپنے نانا صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی سنی ہے، آپ نے فرمایا کہ صغیرہ سے مراد تبسم اور کبیرہ سے مراد ضحک یعنی کھلکر ہنسنا ہے۔ تو پھر کیا وہ مظالم خدا کے یہان لکھے ہوے نہ ہون گے، اور ان کا بدلہ نہ ملے گا، جو آپ کے ہاتھون اور زبان کے ذریعہ ہوئے ہیں،

امیرالمومنین! حضرت عمرؓ کو کتنا احساس ذمہ داری تھا، اس بارے مین یہ روایت مجھے ملی ہے، فرمایا۔

لو ماتت سخلۃ علی شاطئ	اگر ایک بکری کا بچہ (بغیر میری دیکھ بھال)
الفرات لخشیت ان اسئال عنہا	کے فرات کے کنارے مرجائے، تو مجھے ڈر ہے
	کہ مجھ سے اس کی باز پرس ہوگی،

تو پھر اسکے بارے مین آپ سے کتنی زبردست باز پرس ہوگی، جو آپ کے سامنے آپ کے عدل سے محروم رہا، امیرالمومنین! اس آیت یا داؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الھوی کی تفسیر آپ کے دادا (آنحضرتؐ) نے کیا فرمائی، یہ فرمائی، کہ خدا تعالےٰ کہتا ہے کہ اے داؤد! اگر تمھارے سامنے دو آدمی فیصلہ کرانے کے لیے آئین اور ایک کی طرف تمھارا میلان ہو اور اس سے تمھین محبت ہو تو تمھارے دل مین یہ خیال نہ ہو کہ کاش اسی کے موافق فیصلہ ہو اور وہ اپنے فریق کے مقابلہ مین کامیاب ہو، اگر ایسا کروگے، تو مین نبوت کی ذمہ داری تم سے واپس لے لون گا، ظاہر ہے کہ اس کے بعد نہ تمھاری خلیفۃ الارض

تبع تابعین ۱

کی حیثیت باقی رہیگی، اور نہ کوئی دوسرا شرف (کیونکہ یہ سب نبوت کے طفیل مین ہے) اے داؤد! مین نے جن لوگون کو بندون کے پاس رسول بنا کر بھیجا ہے، ان کو ان کا اسی طرح گلہ بان ہونا چاہیے، جس طرح اونٹ کے گلہ بان ان کی گلہ بانی کرتے ہیں، ان کے علم کا تعلق دیکھ بھال اور نگرانی سے ہے، اور ان کی نرمی کا تعلق حکمرانی سے ہے، تاکہ شکستہ دلوں کے زخم پر پھایا رکھیں اور مجبورون اور ناتوانون کی ضروریات پوری کرین،

امیرالمومنین! آپ پر ایک ایسی ذمہ داری ڈالی گئی ہے، کہ اگر وہ آسمان وزمین اور پہاڑون پر ڈالی جاتی تو وہ اس کے اٹھانے سے انکار کردیتے، مجھ سے یزید بن یزید فقیہ شام نے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو زکوٰۃ کی وصولی پر مقرر کیا، کچھ دنون کے بعد دیکھا کہ وہ گھر پر موجود ہے، آپ نے پوچھا کہ کیا چیز مانع ہوئی، کہ تم وصولی پر گئے نہین، تم کو معلوم نہین کہ تم کو اس کام کا اجر جہاد کے برابر ملے گا، اس نے کہا ایسا نہین ہے، آپنے فرمایا کیوں اس نے کہا کہ مجھے یہ حدیث نبویؐ پہنچی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ قیامت کے دن ہر والی اور حاکم بلایا جائے گا۔ اور اس کو آگ کے پل پر کھڑا کردیا جائے گا۔ جس کی وجہ سے اس کے جسم کے اعضا ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں گے، اس کے بعد پھر وہ واپس لایا جائے گا۔ اور اس سے حساب کتاب ہوگا، اگر اس نے اپنی ذمہ داری بخوبی انجام دی ہے، تو بچ جائے گا۔ ورنہ پھر وہ پل اس کو جہنم مین پہنچا دے گا،

حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ یہ روایت کس نے بیان کی ہے، اس نے کہا: ابو ذرؓ اور سلمانؓ نے، آپ نے ان دونون صاحبون سے اس روایت کے بارے مین دریافت کرایا، انھون نے کہا کہ ہم نے یہ روایت آنحضرت صلعم سے سنی ہے۔ حضرت عمرؓ نے یہ روایت سن کر ایک سرد آہ کھینچی، اور فرمایا کہ افسوس عمر کو بھی اس سے گذرنا ہوگا۔

امام اوزاعی کی اس تقریر کا منصور پر اس قدر اثر ہوا، کہ وہ منہ پر رومال ڈال کر زور زور

سے رونے لگا، امام اوزاعی فرماتے ہین کہ اس کے گریۂ بے اختیار نے مجھے بھی رلادیا، جب اس کے آنسو کچھ تھمے تو امام اوزاعی نے پھر اپنی تقریر شروع کی، فرمایا:

امیر المومنین آپ کے دادا حضرت عباس رضؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مکہ اور طائف کی امارت کی خواہش کی تو آپ نے فرمایا کہ اے میرے چچا! "امارت جس کا حق ادا نہ کیا جائے اس سے الگ تھلگ رہنا زیادہ بہتر ہے" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے جو محبت اور تعلق خاطر تھا اسی کی بنا پر انھون نے ان کو امارت سے دور رہنے کا مشورہ دیا، اس لیے آپ خدا کے یہان اس کے وبال سے ان کو بچا نہین سکتے تھے، جب یہ آیت نازل ہوئی وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْن تو آپ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ اپنی پھوپھی اپنی صاحبزادی حضرت صفیہؓ اور حضرت فاطمہؓ کو مخاطب کرکے فرمایا!

انی لست اغنی عنکم من اللہ	مین خدا کے یہان تم کو بچا نہ سکون گا، ہو شیار
شئیا الا لی عملی ولکم عملکم[1]	کہ میرے لیے میرا عمل ہے اور تمھارے لیے تمھارا عمل،

حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے کہ لوگون کے معاملات کی ذمہ داری وہی شخص اٹھا سکتا ہے، جو اچھی رائے اور پختہ عقل رکھتا ہو، لوگون کی دیکھ بھال کرتا ہو، اس سے برائی نہ پیدا ہوتی ہو، وہ بے دینی پر لپکتا نہ ہو۔ اور خدا کے معاملہ مین لومۃ لائم سے ڈرتا نہ ہو، پھر آپ نے فرمایا حاکم کئی طرح کے ہوتے ہین، ایک تو وہ مضبوط، قوی ارادہ حاکم جو اپنے کو بھی قابو مین رکھے، اور اپنے کارندون کو بھی تو یہ مجاہد فی سبیل اللہ ہے، جس پر خدا کی رحمت سایہ افگن رہتی ہے، دوسرے وہ کمزور حاکم جو اپنے اوکو تو قابو رکھتا ہو مگر اس کے عمال اور کارندے اس کی کمزوری کی وجہ سے نفس پروری مین منہمک ہو جائیں، تو یہ ہلاکت دنیا ہی کے کنارے کھڑا ہوا ہے، بس اللہ ہی اس کو بچا سکتا ہے، تیسرے وہ حاکم جو عمال پر

---

[1] بخاری شریف مین یہ روایت ذرہ اور تفصیل کے ساتھ آئی ہے۔

تو کڑی نگاہ رکھتا ہے۔ مگر خود نفس کا بندہ ہے تو یہ اس ظالم چرواہے کی طرح ہے، جس کے بارے میں آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے، شَرُّ الرِّعَاءِ الْحُطَمَةُ بدترین چرواہا وہ ہے جو جانوروں پر ظلم کرتا ہو۔

مجھے حضرت عمرؓ کا یہ قول بھی معلوم ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اے اللہ! اگر تو یہ جانتا ہے کہ اگر دو فریق میرے پاس آئیں اور میں ان میں سے اس شخص کی طرف مائل ہو جاؤں جو حق سے دور ہو خواہ میرا رشتہ دار ہو یا اجنبی تو مجھے ایک لمحہ کی بھی مہلت نہ دے۔

امیر المومنین! سب سے سخت چیز قیام حق اور خدا کے یہاں سب سے معزز چیز تقویٰ ہے جو شخص اللہ کی اطاعت کے ذریعہ عزت چاہتا ہے، اللہ اس کو بلندی و عزت دیتا ہے، اور جو شخص اللہ کی نافرمانی کرتا ہے، اور عزت کا خواہاں ہوتا ہے، خدا اسے پست اور ذلیل کر دیتا ہے، والسلام علیک

امام اوزاعی کہتے ہیں کہ یہ تقریر کرنے کے بعد میں مجلس سے اٹھ گیا، منصور نے پوچھا کہ یہاں سے کہاں جانے کا قصد ہے، بولے وطن! اگر آپ اجازت دیں، منصور نے کہا آپ کو اجازت ہے، میں آپ کا مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے ایسی قیمتی نصیحتیں کیں، میں ان کو انتہائی خوشی سے قبول کرتا ہوں، خدا مجھے ان پر عمل کی توفیق دے اور میری مدد کرے، وہو حسبی ونعم الوکیل، میں امید کرتا ہوں کہ آپ آئندہ بھی اسی طرح اپنی زیارت سے سرفراز کرتے رہیں گے، امام اوزاعی یہ کہکر رخصت ہوئے کہ انشاء اللہ ایسا ہی کروں گا، منصور نے حکم دیا، کہ آپ کو سفر خرچ دے دیا جائے، چنانچہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا مگر آپ نے اسے قبول نہیں کیا۔ اور فرمایا:

ماکنت لا بیع نصیحتی بعرض	میں اپنی نصیحت کو دنیا کی ایک حقیر متاع
عن الدنیا ولا بکلها	کیا، پوری دنیا کے بدلہ بھی نہیں بیچ سکتا،

راوی کا بیان ہے کہ منصور کو چونکہ ان کے طرز عمل سے واقفیت تھی، اس لیے ان کے رد کر دینے سے

کبیدہ خاطر نہیں ہوا،

اس نصیحت نامہ کے ایک ایک لفظ سے امام کے خلوص، للٰہیت اور حق گوئی کا پتہ چلتا ہے، آپ کی للٰہیت اور خلوص ہی کا نتیجہ تھا، کہ منصور جس کے استبداد و جبر کا ایک زمانہ شکار ہو چکا تھا، وہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، اس مین منصور کی کوئی ایسی کمزوری نہین ہے، جس کا ذکر نہ کیا گیا ہو، مگر جو کسی شخص کی معمولی بات سننا گوارا نہ کرتا ہو، وہ اپنی کمزوریان اس شخص کی زبان سے سنتا، اور ان کے دور کرنے کا وعدہ کرتا ہے، جس کے بارے مین معلوم تھا، کہ وہ عباسیون کی حکومت کو پسند نہین کرتا۔

انھون نے حکومت کے بعض ایسے معاملات مین دخل اندازی کی ہے، جس کی توقع اس زمانہ مین نہین کیجا سکتی تھی، اوپر مسلمانون کے فدیہ دے کر، ہا کرانے اور لبنان کے عیسائیون پر ظلم سے باز رکھنے کا ذکر آچکا ہے، وہ غالباً حضرت عمر بن عبد العزیز رضؓ کا زمانہ واپس لانا چاہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ فرمایا کرتے تھے کہ مین نے ہوش وحواس کی حالت مین حضرت عمر بن عبد العزیز رضؓ کو دیکھا ہے[1]۔

عبادت وتقویٰ عبادت وتقویٰ مین بھی وہ ممتاز تھے، نماز نہایت ہی خشوع وخضوع سے پڑھتے تھے، خصوصیت سے رات کا بیشتر حصہ ذکر و نوافل مین گزرتا تھا، فرماتے تھے کہ جو لوگ رات کی نمازون مین جتنا طویل قیام کرین گے، اللہ تعالیٰ اسی نسبت سے قیامت کے قیام کو ہلکا کر دے گا، اپنے اس قول کے ثبوت مین وہ قرآن کی اس آیت کو پیش کرتے تھے۔

وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا إِنَّ هٰؤُلَاءِ يُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُونَ وَرَاءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيلًا (دھر-۲)	اور کسی وقت رات کو سجدہ کر اسکو اور پاکی بول اس کی بڑے رات تک یہ لوگ چاہتے ہیں جلدی ملنے والے کو اور چھوڑ رکھا ہے اپنے پیچھے ایک بھاری دن کو۔

---

[1] تاریخ الصغیر بخاری ص

حج کے لیے سفر کیا تو زیارت حرمین کا ذوق و شوق اتنا غالب رہا کہ پورے سفر حج مین بے خبر ہو کر ایک دن نہین سوئے، نیند کا زیادہ غلبہ ہوا تو کجاوے سے ٹیک لگا لی یا لیٹ پوٹ لیا، ابن عساکر کا قول ہے کہ امام اوزاعی کثرت عبادت اور نماز کی خوبی مین ممتاز تھے۔

ولید بن مسلم کا قول ہے کہ عبادت مین امام اوزاعی سے زیادہ کوشش و اہتمام کرنے والا مین نے کسی کو نہین دیکھا۔[1]

رات کے وقت نماز مین اس قدر روتے تھے کہ مصلیٰ تر ہو جاتا تھا، ایک بار ایک عورت ان کی اہلیہ سے ملنے آئی، اس نے دیکھا کہ مصلےٰ کا ایک حصہ تر ہے، پوچھا کہ کیا مصلےٰ پر کسی بچے نے پیشاب کر دیا ہے، نیک بخت بولین۔

هذا من اثر دموع الشیخ من بکائه	یہ شیخ کے آنسوؤن سے تر ہو گیا ہے، یہ
فی سجوده هکذا یصبح کل یوم	روزانہ سجدون مین اسی طرح رویا کرتے ہین۔

ابو مسہر کا قول ہے کہ۔

کان اوزاعی یحیی اللیل قراءتاً	اوزاعی روتے اور نماز مین قرآن کی تلاوت
و بکاءً[2]	مین رات ختم کر دیا کرتے تھے،

مگر ان کی یہ رقیق القلبی رات کی تنہائیون تک محدود تھی، مجمع عام مین وہ بڑے ضبط سے کام لیتے تھے، بدایہ مین ہے کہ "ان کو مجلس مین روتے ہوئے کبھی نہین دیکھا گیا، مگر جب وہ تنہائی مین ہوتے تھے، تو اس قدر روتے تھے کہ ان کے حال پر رحم آتا تھا۔

نہایت خاموش اور سنجیدہ آدمی تھے، کبھی قہقہہ لگا کر نہین ہنستے تھے، اور نہ مذاق و ہنسی کرتے تھے۔

---

[1] البدایہ ص ۱۱۶ ج ۱۰ - [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۱،

خشوع | خضوع وخشوع کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے اوپر خدا کی عظمت و برتری اور احساس ذمہ داری اور قیامت کی باز پرس کی ایک مستقل کیفیت طاری ہو جائے، نماز سے اس کیفیت کا تعلق ضمنی یا بطور مشق کے ہے، امام اوزاعی پر یہ کیفیت ہمہ وقت طاری رہتی تھی، بشر بن منذر کہتے تھے کہ

وکان من شدۃ الخشوع کانہ اعمی[1] | شدت خشوع کی وجہ سے یہ اندھے معلوم ہوتے تھے،

اوپر ان کی رقت قلبی کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے وہ بھی اسی خشوع قلب کا نتیجہ تھی، ایک بار کسی نے ان سے خشوع کی تعریف پوچھی تو فرمایا کہ آنکھوں اور بازؤں کو جھکاؤ اور رقتِ قلب کا نام خشوع ہے[2]

امر بالمعروف | امت مسلمہ کی سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ اس کو برائی سے روکا جائے اور بھلائی کی ترغیب دی جائے، اللہ تعالیٰ نے دست و بازو، زبان و قلم، قوت و اقتدار اور مال و دولت یا اس کے علاوہ جو بھی صلاحیت عطا کی ہے، ان کو اسی راہ مین لگا دینا ایمان کی سب سے بڑی علامت ہے، امام اوزاعی اس وصف مین صحابہ و تابعین کا نمونہ تھے،

ان کو اللہ تعالیٰ نے زبان و قلم کی جو صلاحیت عطا کی تھی، اس کو انھون نے اسی مقصد مین پورے طور سے لگا دیا تھا، ان کے تمام معاصرین کا بیان ہے کہ

وکان انصح للامۃ[3] | امت کے سب سے بڑے خیر خواہ تھے۔

انھون نے امرار و خلفا سے جو مکالمے کیے اور ان کو جو خطوط لکھے ہیں وہ اسی جذبۂ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا نتیجہ تھے اس کی تفصیل اوپر آچکی ہے۔

ہر طبقہ میں ان کی عزت تھی | اپنے ان ہی اوصاف و محاسن اور سیرت و کردار کی وجہ سے ہر طبقہ مین

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۷۱ [2] ایضاً [3] تہذیب ج ۶ ص ۲۵۶

معزز ومحترم تھے، حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ

کان الاوزاعی فی الشام معظماً مکرماً امرہ اعز عندھم من امر السلطان (ص ۱۲۰)

امام اوزاعی شام میں اس قدر معزز ومکرم تھے کہ ان کا حکم اہل شام کی نظر میں بادشاہ وقت کے حکم سے زیادہ قابل قدر اور محترم تھا۔

شام کے بعض امراء نے ان کے بارے میں کوئی سخت قدم اٹھانا چاہا تو ان کے ہم نشینوں نے مشورہ دیا کہ ان کو نہ چھیڑو ورنہ۔

واللہ لو امر اھل الشام ان یقتلوک لقتلوک (ص ۱۲۰)

خدا کی قسم اگر اہل شام کو وہ تمہارے قتل کا حکم دیدیں تو وہ تم کو قتل کر دیں گے۔

امام اوزاعی کی وفات کے بعد شام کے امیر نے آپ کی تدفین کے بعد کہا کہ خدا آپ کے حال پر رحم فرمائے، مجھے جس نے امارت سپرد کی ہے (یعنی منصور) میں اس سے بھی زیادہ آپ سے ڈرتا تھا۔[1] بقیہ بن ولید کہتے تھے کہ ہم لوگوں کو امام اوزاعی کے ذریعہ آزماتے تھے، اور اگر کوئی شخص ان کے بارے میں اچھی رائے رکھتا تھا تو ہم اس کے بارے میں سمجھتے تھے کہ انہ ھو صاحب سنۃ یہ متبع سنت ہے۔

امام اوزاعی حج کے لیے تشریف لے گئے تو سفیان ثوری نے جو پہلے سے وہاں موجود تھے، بستی سے باہر نکل کر ان کا استقبال کیا اور ان کے اونٹ کی نکیل پکڑے ہوئے آگے آگے پیدل چل رہے تھے، اور یہ کہتے جاتے تھے۔

طرقوا للشیخ[2]۔

شیخ کے لیے راستہ دے دو۔

بیش قیمت اقوال فرمایا کہ جب تم کو کوئی حدیث نبوی صحیح طریقہ سے مل جائے تو پھر اس میں چون وچرا کی گنجایش نہیں ہے، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ کہتے تھے وہ اللہ کے مبلغ کی حیثیت سے

---

[1] تہذیب ج ۱۰ ص ۱۲۰۔ [2] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۴۱۔

کہتے تھے۔ (یعنی اس کو اللہ ہی کا پیغام سمجھنا چاہیئے)

سلف صالحین یعنی صحابہؓ وتابعین کے اقوال واعمال کو اپنے اوپر لازم کر لو، اگرچہ لوگ اس میں تمہارا ساتھ نہ دیں، اس کے مقابلہ میں اور کسی شخص کی رائے کو خواہ وہ کتنے ہی اچھے اور دلفریب پیرایے میں کیوں نہ پیش کی گئی ہو، کوئی اہمیت نہ دو، اور اس کے قبول کرنے سے پرہیز کرو، اس سے دین بھی واضح اور روشن رہے گا، اور تم بھی راہ راست پر قائم رہوگے۔

فرماتے تھے:

العلم ما جاء عن اصحاب محمد	حقیقی علم وہ ہے جو صحابہ کرام سے ثابت اور
وما لم یجئ عنهم فلیس بعلم	منقول ہو اور جو ان سے ثابت نہ ہو وہ علم نہیں ہے

ولید کا بیان ہے کہ میں نے امام اوزاعی سے خود سنا ہے، وہ کہتے تھے کہ "دنیا میں انسان عمر کی جتنی گھڑیاں گزار رہا ہے، وہ سب اس کے سامنے ترتیب سے پیش کی جائیں گی، تو زندگی کی جو ساعت اللہ کی یاد سے غفلت میں گزر رہی ہے اس پر نفس کو سخت افسوس ہوگا۔

ان کا معمول تھا کہ وہ فجر کی نماز کے بعد کسی سے بات چیت نہیں کرتے تھے، لیکن اگر کوئی شخص کوئی بات پوچھتا تھا تو اس کا جواب ضرور دیتے تھے۔

ایک عیسائی نے ایک مٹکا شہد ہدیۃً دیا، اور کہا کہ آپ ایک خط شہر بعلبک کے والی کو (مالی مدد کے لیے) لکھ دیجئے، آپنے اس سے کہا کہ اگر خط لکھوانا چاہتے ہو تو اس کی شرط یہ ہے کہ یہ شہد واپس لے لو ورنہ میں شہد تو قبول کر لوں گا مگر خط نہیں لکھ سکتا، وہ راضی ہوگیا۔ آپنے شہد واپس کر دیا، اور اس کی امداد کے لیے خط لکھ دیا، اور اس کی مدد ہوگئی۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی مقصد کے حصول یا سفارش کے لیے جو ہدیے پیش کیے جاتے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔

فرمایا کرتے کہ سلامتی اور عافیت کے دس اجزا ہیں، جن میں ۹ کے برابر تو خاموشی ہے، اور اسی کا ایک جز لوگون سے بے نیازی ہے۔

ایک بار اپنے ایک شاگرد سے فرمایا کہ جو شخص موت کو زیادہ یاد کرتا ہے، اس کو ہر معاملہ مین آسانی میسر آتی ہے، اور جو شخص یہ جان لے کہ گفتگو بھی ایک عمل ہے (جس کی بازپرس ہوگی) تو وہ بات چیت کم کرے گا۔

ان کے ایک شاگرد کا بیان ہے کہ امام اوزاعیؒ کہا کرتے تھے کہ "ایک زمانہ ایسا آئیگا جس مین سب سے زیادہ کمی مونس و غمخوار بھائی کی۔ حلال پیسے اور اتباع سنت کی ہوگی"[1]

فرماتے تھے کہ سلف صالحین کا حال یہ تھا کہ صبح صادق کے وقت یا اس سے کچھ پہلے ہی سے وہ ذکر و عبادت مین مشغول ہوجاتے تھے، جب طلوع آفتاب کا وقت ہوتا تھا تو سب لوگ جمع ہوکر پہلے قیامت اور اس کی ہولناکی کے بارے مین بات چیت کرتے تھے، پھر تعلیم دین کا چرچا ہوتا تھا۔

فرماتے تھے کہ پانچ باتیں تمام صحابہؓ اور تابعین مین مشترک تھین۔

(۱) اجتماعیت (۲) اتباع سنت (۳) تعمیر مساجد (۴) تلاوت قرآن پاک (۵) جہاد فی سبیل اللہ۔

فرماتے تھے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو ذلیل کرنا چاہتا ہے تو اس مین بحث و مباحثہ اور جدال و مناظرہ کا دروازہ کھول دیتا ہے اور علم و عمل کے دروازے ان کے لیے بند کر دیتا ہے۔

حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ دونون کی محبت ایک مومن ہی کے قلب مین جمع ہوسکتی ہے۔

جو شخص علماء کے شاذ و نادر اقوال پر عمل کرے گا وہ ایک دن اسلام کے دائرہ سے نکل جائیگا، فرمایا کہ برا ہو غیر عابد فقہا اور حرام چیزون کو شبہہ کی بنا پر حلال کر دینے والوں کا، جس شخص نے دین مین کوئی

---

[1] یہ ایک حدیث نبوی کی تفسیر ہے۔ [2] حسن المساعی ص ۱۰۸

بدعت ایجاد کی، اس کا ورع وتقویٰ سلب ہوا۔

فرماتے تھے جو واعظ خدا کی رضا کے لیے وعظ نہیں کہتا۔ اس کی باتیں دل سے اس طرح نکل جاتی ہیں جس طرح پتھر کے اوپر سے پانی، فرمایا مومن بات کم کرتا ہے۔ اور عمل زیادہ۔ اور منافق عمل کم کرتا ہے۔ اور بات زیادہ۔

فرماتے تھے کہ سنت نبوی پر جم جاؤ۔ اور اہل سنت کا جو موقف ہے۔ وہی تم اختیار کرو جس چیز سے وہ رکے تم بھی رکو، سلف صالح کے راستہ پر چلو، ایمان بغیر زبان کی شہادت کے استوار اور درست نہیں ہوتا۔ اور ایمان و قول بغیر عمل کے درست نہیں ہوتے، اور یہ تینوں چیزیں حسب سنت بوی، نیت کے بغیر درست نہیں ہوتیں کسی نے پوچھا کہ اس حدیث اکثر امتی وخولا فی الجنۃ اہل البلہ میں اہل البلہ سے کون لوگ مراد ہیں۔ فرمایا

الذین یعرفون الخیر ولا یعرفون الشر — جو صرف بھلائی ہی جانتے ہیں برائی و شر سے وہ واقف ہی نہیں،

ان کا فقہی مسلک اوپر ذکر آچکا ہے۔ کہ وہ ایک علٰحدہ مکتب فقہ کے بانی تھے، ان کے فقہی مسلک کی پوری تفصیل اور اس کے امتیازات کی فہرست تو نہیں تیار کیجا سکتی، اس لیے کہ نہ تو ان کی مرویات ہی جمع ہو سکیں، اور نہ ان کے فقہی مجتہدات ہی مرتب کیے جا سکے، کتاب الرد علی السیر الاوزاعی میں امام ابو یوسف نے ان کی بہت سی فقہی رایوں کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر ان کا تعلق ایک خاص موضوع سیر و غزوات سے ہے، صاحب حسن المساعی نے چند عام مسائل کا تذکرہ کیا ہے، جن میں وہ دوسرے ائمہ سے اختلاف رکھتے ہیں، ان کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) بنیذ سے وضو کے جواز کے قائل تھے، امام ابو حنیفہ کا یہی مسلک ہے، دوسرے ائمہ کو اس سے اختلاف ہے، مگر اس اختلاف کا دار و مدار بنیذ کی تعریف پر ہے، اہل عراق اس کی جو تعریف کرتے ہیں، اس سے یہ اختلافات ختم ہو جاتے ہیں۔

(۲) پانی کم ہو یا زیادہ ہین اگر تنی نجاست پڑ جائے، جس سے کوئی تغیر واقع نہ ہو تو ان کے نزدیک وہ پاک ہے۔ اس مسئلہ مین امام ابوحنیفہ کی رائے اس سے مختلف ہے۔

(۳) کتے اور سور کے جھوٹھے کو وہ پاک سمجھتے تھے، یعنی وہ پیا بھی جا سکتا ہے، اور اس سے وضو بھی کیا جا سکتا ہے، اگر یہ دونون کھانے مین منہ ڈالدین تو اس کا کھانا حرام نہین سمجھتے تھے، امام زہری اور امام مالک کی بھی یہی رائے ہے، امام ابوحنیفہ اور دوسرے ائمہ کی رائے اس سے مختلف ہے۔

(۴) سجدۂ سہو میں ان کا مسلک یہ تھا کہ اگر نماز مین کوئی کمی ہوئی ہے تو سجدۂ سہو سلام سے پہلے کرنا چاہئے، اور اگر زیادتی ہوئی ہے، تو سلام کے بعد، امام مالک اور ایک روایت مین امام احمد کی بھی یہی رائے ہے۔

(۵) نماز مین کوئی شخص بھول کر کھا پی لے تو اسکی نماز باطل ہو جاتی ہے، خواہ نماز فرض ہو یا نفل، کیونکہ ایسا بے کار فعل جو نماز کی جنس سے نہین ہے، اس مین عمد اور نسیان دونون برابر ہے،

(۶) اگر جوتے اور چمڑے کے موزے کے نچلے حصہ مین نجاست لگ جائے، اور اس کو اس طرح زمین پر رگڑ دیا جائے کہ اس کی نجاست دور ہو جائے۔ تو اس سے نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ ایک روایت کے مطابق امام احمد کی بھی یہی رائے ہے، ان کے سامنے یہ حدیث ہے، اذا وطی احدکم بنعلہ الاذی فان التراب لہ طہور۔

(۷) نماز عیدین مین استفتاح یعنی ثنا وغیرہ کا پڑھنا، تکبیرات زوائد کے بعد ہونا چاہئے، اس رائے مین یہ تمام ائمۂ اربعہ سے منفرد ہیں، دوسرے ائمۂ استفتاح کے بعد تکبیر زوائد کہتے ہیں۔

(۸) غسل جمعہ فجر سے پہلے بھی کیا جا سکتا ہے، دوسرے ائمہ کے یہان اس کا استحباب طلوع سورج کے بعد شروع ہوتا ہے۔

(۹) رمضان مین قصداً مباشرت کرنے والا اگر کفارہ ادا کر دے تو اس پر قضا نہین ہے،

اگر بھول کر جمع کرنے تو اس پر قضا ہے کفارہ نہین۔

(۱۰) قربانی کے چمڑے کو فروخت کر کے اس کی چلنی اور دوسری استعمال کی چیزین خریدی جا سکتی ہین، اور ان کا استعمال ہو سکتا ہے، دوسرے ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ فروخت کرنے کے بعد قیمت کا صدقہ کر دینا ضروری ہے۔

کتاب المغنی لابن قدامہ مین دوسرے ائمہ کے ساتھ ان کے مسلک کا تذکرہ بھی ملتا ہے، اگر اس سے ان کی فقہی رایون کو علیحدہ کر لیا جائے، تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔

ان کا فقہی مسلک کتنی مدت تک زندہ رہا اور اس کے زوال کے اسباب کیا ہوئے

اوپر یہ بھی ذکر آچکا ہے کہ امام اوزاعی کا یہ مسلک شام مین دو صدی تک اور اندلس مین تقریباً ایک صدی تک زندہ رہا، مگر اس کے بعد کچھ داخلی اور خارجی اسباب ایسے پیدا ہوئے جس کی بنا پر یہ فنا ہو گیا، کن اسباب کی بنا پر یہ مسلک زندہ نہ رہ سکا اس کی کچھ تفصیل یہان کی جاتی ہے۔

امام اوزاعی کا ذہن کچھ قدرۃً بھی محدثانہ طرز فکر سے زیادہ ہم آہنگ تھا، اور ان کی تعلیم و تربیت بھی حدثنا و اخبرنا ہی کے ماحول مین ہوئی تھی، یہی وجہ ہے کہ جب ان سے پیش آمدہ مسائل مین استفسار کیا جاتا تھا۔ تو وہ حدیث نبوی اور آثار صحابہ کی روشنی مین سادہ طور سے ان کا جواب دیتے تھے، زیادہ تدقیق و تفتیش اور فرضی قیاس آرائی کو پسند نہین کرتے تھے، اوپر ذکر آچکا ہے کہ انھون نے ستر ہزار مسائل کا جواب حدیث و آثار کی روشنی مین دیا تھا، جب تک مسلمانون مین سادہ اسلامی زندگی کا رواج رہا، اس وقت تک ان کے مسلک پر تعامل باقی رہا۔ مگر جب فقہا کی ژرف نگاہی اور باریک بینی کا دور شروع ہوا اور انھون نے مسائل کی تخریج و تفریع کی بھرمار کر دی تو امام اوزاعی کا سادہ اور ٹھیٹھ مسلک انکی دقت پسندی کے آگے نہ ٹھہر سکا، اور ان کا خالص محدثانہ مکتب فکر فقہی مکتب فکر کے سامنے شکست کھا گیا[1]

(دیکھیے حاشیہ ص ۲۲۴ پر)

اسی کے ساتھ کچھ سیاسی اسباب بھی ایسے پیدا ہوئے جنھوں نے ان کے مسلک کو ختم کرنے میں مدد دی تھی

امام اوزاعی کے مسلک کی ترویج اور اس کے زوال کے اسباب پر عام مورخین اور تذکرہ نگاروں نے جو روشنی ڈالی ہے، وہ یہاں پیش کی جاتی ہے، قدما میں لسان الدین بن الخطیب نے اور متاخرین میں علامہ کرد علی اور خضری نے قدرے تفصیل سے لکھا ہے،

امام ذہبی لکھتے ہیں۔

کان اھل الشام ثم اھل الاندلس علی مذھب الاوزاعی مدۃ من الدھر ثم فنی العارفون بہ۔	اہل شام پھر اہل اندلس امام اوزاعی کے مسلک پر ایک مدت تک عامل رہے پھر اس کے جاننے والے ختم ہو گئے۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ذہبی کے نزدیک اس مسلک کے اختتام کا سبب یہ ہے کہ اس کے جاننے والے باقی نہیں رہے تھے، مگر اس کے جاننے والے کیوں باقی نہیں رہے؟ اس کا جواب اس بیان میں نہیں ہے۔

حافظ ابن حجر تہذیب میں لکھتے ہیں:

والیہ فتوی الفقہ لاھل الشام	اہل شام فقہی مسائل میں ان ہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔

دوسری جگہ اسی کتاب میں ہے۔

حاشیہ ص ۲۲۳) اس دور میں دوسرے محدثانہ مکاتب فکر مثلاً سفیان ثوری، داؤد ظاہری، اسحاق بن راہویہ، ابن جریر وغیرہ کا بھی یہی حشر ہوا، ان مسلکوں کی شکست سے امت کو سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ مسلمانوں کا تعلق اصل ماخذ یعنی کتاب و سنت سے کم ہو گیا اور براہ راست کتاب و سنت سے اجتہاد کا دروازہ ہی بند ہو گیا۔ ؎ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۴

كانت الفقهاء والفتيا بالاندلس على رأى الاوزاعى الى زمن الحكم بن هشام المتوفى سنة ۲۵۶ (ج ۲ ص ۲۳۶)	اندلس مین امام اوزاعی کے مسلک کے مطابق ---- حکم بن هشام متوفی ۲۵۶ھ کے زمانہ تک فقہا فتوی دیتے اور عمل کرتے رہے

اس بیان سے بھی اس مسلک کے زوال پر تو کوئی روشنی نہین پڑتی مگر اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ دوسری صدی کے نصف آخر تک اندلس -------- مین فیصلے اس مسلک کے مطابق ہوتے تھے،

حافظ ابن کثیر نے اپنی تاریخ مین بڑی تفصیل سے امام اوزاعی کے حالات لکھے ہیں، مگر اس بارے مین انھون نے کچھ نہین لکھا ہے، البتہ اپنی ایک دوسری کتاب مین اتنا لکھا ہے کہ

وقد كان اهل الشام على مذهب الاوزاعى نحوا من مائتى سنة	اہل شام دو سو برس تک امام اوزاعی کے مسلک پر عامل رہے ۔

اس بیان سے ایک دوسرا گوشہ واضح ہو گیا، وہ یہ کہ شام مین دو سو برس تک ان کا مسلک چلا، شیخ کرد علی نے کچھ اور زیادہ وضاحت کی ہے، یہ علم نہین ہو سکا کہ ان کا ماخذ کیا ہے ۔

يعمل بمذهبه فى الشام نحو مائتى سنة وآخر من عمل بمذهبه احمد بن سليمان قاضى الشام وعمل اهل الاندلس بمذهبه اربعين سنة ثم تناقص بمذهب الامام مالك ۳	شام مین تقریباً دو صدی تک ان کے مسلک پر عمل باقی رہا، شام کے آخری قاضی جنھون نے ان کے مسلک پر عمل کیا وہ احمد بن سلیمان تھے، اہل اندلس محض چالیس ہی برس ان کے مسلک پر عمل کر سکے تھے کہ امام مالک کے مسلک سے یہ شکست کھا گیا ۔

۱ کتاب مین ۲۵۶ھ اس کی وفات درج ہے مگر صحیح ۲۰۶ھ ہے، ابن اثیر نفح الطیب وغیرہ ۲ اختصار علوم الحدیث ص ۹۶
۳ خطط الشام ج ۴ ص ۲۵

کردعلی کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ اندلس میں محض چالیس برس ان کا مسلک زندہ رہا، مگر یہ صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ دوسرے تذکرہ نگارون نے یہ مدت زیادہ بیان کی ہے، اوپر حافظ ابن حجر کا بیان گذر چکا ہے، آگے علامہ خضری کا بیان آتا ہے۔

قاضی احمد سلیمان جن کو شیخ کردعلی نے شام میں مسلک اوزاعی کا آخری مفتی و قاضی قرار دیا ہے، ان کے بارے مین امام ذہبی کا بیان ملاحظہ ہو۔ وہ ۳۴۷ھ کے حوادث کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہین کہ

انه مات مفتی دمشق علی مذهب الاوزاعی القاضی ابو الحسن احمد ابن سلیمان جذلم[1] وکانت له حلقة کبیرة بالجامع۔	اسی سنہ مین امام اوزاعی کے مسلک کے مفتی قاضی ابو الحسن احمد بن سلیمان جزلم نے انتقال کیا، جامع دمشق میں انکا بہت بڑا حلقہ درس تھا،

اس بیان سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ اس مسلک کے مطابق چوتھی صدی کے نصف تک فتوے دیئے جاتے رہے، اور اسی مسلک کے علما کا عہدۂ قضا پر تقرر ہوتا رہا۔ اس کے بعد سرکاری طور پر ان کا مسلک ختم ہوگیا۔ مگر اس بیان کے آخری ٹکڑے ”حلقۃ کبیرۃ“ سے پتہ چلتا ہے کہ شام مین اس کے بعد بھی اس مسلک کا چرچا رہا ہوگا، کیونکہ ان کے انتقال کے بعد یکایک تو یہ مسلک ختم نہین ہوگیا ہوگا۔

خضری نے التشریع الاسلامی میں اس مسئلہ کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتے ہیں۔

وکان اهل الشام یعملون بمذهبه ثم انتقل مذهب الاوزاعی الی	اہل شام بہت دنون تک ان کے مسلک پر عمل کرتے رہے، پھر انکا مسلک بنو امیہ کے ان

(بقیہ تحا

[1] حیدرآباد کی مطبوعہ تاریخ ذہبی میں جزلم کے بجائے حزام ہے۔ مگر امیر شکیب ارسلان نے پوری تحقیق کے بعد لکھا ہے کہ یہ لفظ حزام نہین بلکہ جذلم ہے (حسن المساعی ص ۵)

الاندلس مع الداخلین ابھامن اعقاب بن امیة ثم اضمحل اما مذھب الشافعی فی الشام وامام مذھب مالک فی الاندلس وذالک فی منتصف القرن الثالث (ص ۲۷)

لوگون کے ذریعہ اندلس پہنچا جنھون نے اندلس مین جاکر اپنی حکومت قائم کی، پھر شام مین امام شافعی کے مسلک کے آگے اور اندلس مین امام مالک کے مسلک کے سامنے یہ کمزور پڑ گیا اور اور یہ تیسری صدی کے نصف مین ہوا۔

شام کے بارے مین تو عام ارباب تذکرہ لکھتے ہین کہ وہان دو سو برس تک امام اوزاعی کا مسلک زندہ رہا، مگر اندلس کے بارہ مین انھون نے کسی مدت کی تعیین نہین کی ہے، اس کے لیے ہم اندلس کے سب سے قابل وثوق مورخ لسان الدین ابن الخطیب کا بیان نقل کرتے ہین:

> اہل اندلس اور اہل شام ابتدا مین امام اوزاعی کے مسلک کے پیرو تھے۔ مگر اندلس کے تیسرے اموی حکمران حکم بن ہشام کے زمانہ مین فقہ وفتادی کی مسند مالکی فقہا نے سنبھال لی، پھر آہستہ آہستہ مالکی مسلک کا وہان عام چرچا ہوا، اور اندلس اور قرطبہ دونوں جگہ یہی مسلک رواج پذیر ہوگیا، اور اس مسلک کے فروغ کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ حکم نے خود اس مسلک کو اختیار کر لیا تھا۔

اس تبدیلی مسلک کا سبب کیا ہے؟ مصنف نے لکھا ہے کہ اس بارے مین دو مختلف رائین ہین۔ عام اہل علم کا خیال یہ ہے کہ

ان سببہ رحلة علماء الاندلس الی المدینة فلما رجعوا الی الاندلس وصفوا فضل مالک وسعة علمہ وجلالتہ

اس تبدیلی کا سبب یہ ہوا کہ بہت سے علمائے اندلس تحصیل علم اور سماع حدیث کے لیے مدینہ منورہ گئے، وہان امام مالک کی مجلس درس برپا تھی، اس مین شریک ہو کر، جب

قدرہ فاعظموہ (ص ۵۰ ج ۲)

اندلس واپس ہوئے تو امام مالک کے فضل وکمال اور جلالت علم کا عام چرچا ہوا، چنانچہ اہل اندلس ان کی عظمت کے قائل ہو گئے، (اور ان کا مسلک اختیار کر لیا)

(۲) دوسری رائے یہ ہے کہ جب علمائے اندلس امام مالک کی خدمت مین پہنچے تو انھون نے یہان کے اموی حاکم کے عدل وانصاف اور سیرت وکردار کی تعریف کی ...

...... امام مالک چونکہ عباسی حکومت کو اس کے ظلم وتشدد کی وجہ سے پسند نہین کرتے تھے اس لیے ان کو اس خبر سے بڑی خوشی ہوئی اور فرمایا کہ

نسأل اللہ تعالیٰ ان یزین حرمنا بملککم... فنمت المسئلۃ الی ملک الاندلس مع ما علم من جلالۃ مالک ودینہ فحمل الناس علی مذھبہ (ص ۱۵۹)

ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ ہمارے حرم (مکہ) کو تمھارے حکمران کے (عدل وانصاف) سے مزین کر دے... یہ بات جب اندلس کے حکمران تک پہنچی اور ساتھ ہی وہ امام مالک کی جلالت علم اور ان کے دین وتقوی سے واقف ہوا تو اس نے امام اوزاعی کے مسلک کو ترک کر دیا، اور امام مالک کے مسلک کے اختیار کر لینے پر اہل اندلس کو آمادہ کیا۔

پہلی رائے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس تبدیلی مسلک کا سبب صرف علمی اور دینی تھا، مگر دوسری رائے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلک کی تبدیلی صرف علمی نہین تھی، بلکہ اس مین کچھ سیاسی مصلحت بھی پوشیدہ تھی، صاحبِ نفح الطیب نے پہلی رائے کو ترجیح دی ہے، اور دوسری رائے کو ضعیف بتایا ہے

(تبع تابعی)

مگر میرے نزدیک دوسری رائے قابل ترجیح ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر فقہ و فتاوے کی تاریخ پر نظر ڈالین تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کوئی فقہی مسلک کسی ملک مین اسی وقت رواج پذیر ہوا ہے جب اس کو حکومت نے اپنایا ہے، محض عوام کے حسن ظن یا ان کی خواہش کی بنا پر بہت کم کوئی تبدیلی ہوئی ہے، یہ بات ضرور ہے کہ اس مین کچھ علمی اور دینی اسباب بھی معاون ہوتے ہین جن مین ایک سبب کا ذکر راقم نے اوپر کیا ہے۔ یعنی فقہ مین ان کا خالص محدثانہ طرز فکر،

اوپر کے تمام بیانات سے حسب ذیل باتین معلوم ہوتی ہین۔

(۱) شام مین امام اوزاعی کا مسلک دوسو برس تک زندہ رہا۔

(۲) خضری کے بیان کے مطابق اندلس مین ان کا مسلک بنو امیہ کے ذریعہ پہنچا،

(۳) کرد علی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اندلس مین مسلک اوزاعی صرف چالیس برس زندہ رہا۔ مگر نفح الطیب کے بیان اور بنو امیہ کی حکومت کے قیام کی تاریخ ۱۳۸ھ اور حکم بن ہشام متوفی ۲۰۶ھ کے دور حکومت مین قضاۃ کے تقرر کی روشنی مین دیکھا جائے تو یہ مدت کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے یعنی کم سے کم پون صدی

(۴) شام مین امام اوزاعی کے مسلک کی جگہ حنفی و شافعی مسلک نے لی، اور اندلس مین مالکی مسلک نے۔

مسلک اوزاعی کے مشہور علماء

اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ شام مین تقریبًا دو صدیوں تک امام اوزاعی کا مسلک زندہ رہا، ظاہر ہے کہ اس مدت مین سیکڑون آدمی ان کے اجتہادات و استنباطات سے واقف ہوئے ہون گے، یہ تفصیل تو نہین ملتی کہ عہدۂ قضا کی تقریون مین ان کے مسلک کا کتنا خیال کیا جاتا تھا، مگر بعض واقعات سے اندازہ ہوتا ہے، کہ شام مین قضاء و افتاء پر ان کے مسلک کا کافی اثر تھا، اور اس کے مطابق قاضیون کا تقرر بھی ہوتا تھا۔ جیسا کہ امام ذہبی نے لکھا ہے، کہ مذہب اوزاعی کے مشہور مفتی اور قاضی احمد بن سلیمان تھے، جن کا انتقال ۳۴۷ھ مین ہوا، کرد علی نے لکھا ہے

کہ یہ آخری قاضی تھے جھنوں نے مسلک اوزاعی پر شام مین عمل کیا۔ (ص ۵)

امیر شکیب ارسلان نے لکھا ہے کہ فقہ اوزاعی کے ایک عالم ان کے اجداد مین امیر نعمان ابو الحسام ابن الامیر ہتوفی ۳۲۵ھ ہین جن کے بارے مین اہل تذکرہ لکھتے ہیں:

کان اعلم اهل زمانه بفقه الاوزاعی،

انھون نے فقہ اوزاعی پر ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کا نام ہے الاقوال الصحیحۃ فی اصول حدیث الاوزاعی (ص ۴۴)

ان کے علاوہ دو اور ممتاز علماء کا نام تذکرون مین آتا ہے، ایک فقہ و فتاوی کے سب سے معتبر ناقل ولید بن یزید، دوسرے عباس بن ولید (حسن المساعی ص ۳۲ نیز اعلام الموقعین)

تصنیف | تعجب ہے کہ ارباب تذکرہ مین کسی نے بھی ان کی تصنیف کا ذکر نہین کیا ہے، مگر ابن ندیم نے ان کی دو کتابون کا نام لیا ہے، (۱) کتاب السنن فی الفقہ (۲) کتاب المسائل فی الفقہ، ان کے علاوہ انھون نے ایک کتاب جس کا ذکر تذکرون مین نہین ملتا امام ابو حنیفہ کے "مسائل سیر و مغازی" کے رد مین لکھی تھی جسکے جواب مین امام ابو یوسف نے ایک کتاب الرد علی السیر الاوزاعی لکھی، اور امام محمد نے السیر الکبیر مین جا بجا اس کے جوابات دیئے ہیں۔

یہ علم نہیں ہو سکا کہ امام اوزاعی کی کتاب دنیا کے کسی کتب خانہ مین موجود ہے یا نہین مگر امام شافعی نے یہ پوری کتاب اپنی کتاب الام جلد ۷ مین نقل کر دی ہے، اور امام ابو یوسف کی کتاب لجنۃ المعارف النعمانیہ کی طرف سے چھپ کر منصۂ شہود پر آگئی ہے اس سے بھی امام اوزاعی کی کتاب کی حیثیت اور سیر و مغازی مین انکے علم و نظر کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

سیر و مغازی کے جو مسائل امام ابو حنیفہ اپنے درس مین املا کراتے تھے، تلامذہ ان مسائل کو مرتب کر لیا کرتے تھے، خصوصیت سے امام محمد نے ان مسائل کا جو مجموعہ السیر الصغیر کے نام سے مرتب کیا تھا، وہ بہت مقبول ہوا، یہ مجموعہ جب امام اوزاعی کی خدمت مین پہنچا تو انھون نے پوچھا یہ کتاب کس کی تصنیف ہے؟ بتایا گیا کہ امام محمد عراقی کی، بولے اہل عراق نے سیر و مغازی کے

موضوع پر تصنیف کیون شروع کر دی؟ اس لیے کہ ان کو سیر و مغازی کا کوئی علم نہین ہے، (یہ علم صحابہ کے ذریعہ پہنچا ہے) اور صحابہ تو شام کے ایک حصہ اور حجاز مین پہنچے تھے، عراق تو بہت بعد مین فتح ہوا ہے[1]۔

چنانچہ امام اوزاعی نے ان مسائل کی تردید مین ایک کتاب لکھ ڈالی جب یہ کتاب امام ابو یوسف اور امام محمد تک پہنچی تو انھون نے اس کا جواب دیا[2]،

امام اوزاعی نے امام ابوحنیفہ سے سینکڑون مسائل مین اختلاف کیا ہے، امام ابو یوسف نے اپنی کتاب مین ان تمام مسائل مین امام صاحب کی پوری وکالت کی ہے، اور ان کے اقوال کی ترجیح کے لیے عقلی و نقلی دلائل کا انبار لگا دیا ہے، مگر پھر بھی بعض مسائل مین انھون نے اپنے امام اور استاذ کے مقابلہ مین امام اوزاعی کے قول کو ترجیح دی ہے، یا اس کی طرف رجوع کر لیا ہے، ان مسائل کا تذکرہ طوالت کا سبب ہو گا' اہل علم کے لیے اس کتاب کے ص ۲۱، ۲۲، ۴۳، ۷۰، ۹۰ وغیرہ کا مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔

وفات | امام اوزاعی کی وفات بڑے دردناک طریقہ سے ہوئی، یہ بیروت مین تھے، ایک دن حمام مین غسل کے لیے گیے، صاحب حمام لاعلمی مین باہر سے دروازہ بند کر کے کہین چلا گیا، اندر آگ جل رہی تھی اور باہر سے ہوا جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا' اس لیے اسی حالت مین وہ جان بحق ہو گئے، جب صاحب حمام واپس آیا اور اس نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ آپ کا داہنا ہاتھ سر کے نیچے ہے اور قبلہ رو فرش زمین پر مردہ پڑے ہیں[3] یہ حادثہ عظمیٰ صفر یا ربیع الاول ۱۵۷ھ مین پیش آیا۔

آپ کی وفات تو بیروت شہر مین ہوئی مگر تدفین بیروت کے باہر ایک موضع خنتوس مین ہوئی،

---

[1] السیر الکبیر ص ۴، [2] مقدمہ الرد علی السیر الاوزاعی ص ۲ [3] بعض تذکرون مین ہے کہ آپ کی اہلیہ نے لاعلمی مین دروازہ بند کر دیا تھا۔

اس بستی[4] کے بارے مین ابن خلکان نے اپنے زمانہ کا حال لکھا ہے کہ اس بستی کے تمام باشندے مسلمان ہین، اور بستی کے خواص تو امام اوزاعی سے واقف ہین، مگر عوام صرف اتنا جانتے ہین کہ یہان ایک بزرگ کی قبر ہے، ان کی موت پر بعض شعرا نے مرثیے بھی کہے، مرثیہ کا ایک شعر یہ ہے۔

عرضت له الدنیا فاعرض مقلعا　　　عنها بزهد ه ایما اقلاع

دنیا ان کے سامنے پیش کی گئی مگر انھون نے زہد و قناعت کی وجہ سے اس سے ہمیشہ گریز کیا۔

ان کے زہد و قناعت کا اندازہ اس سے کرنا چاہیے کہ جب انتقال ہوا تو پورا اثاث بیت چند درہم سے زیادہ کا نہین تھا۔

حلیہ ابن خلکان نے ان کا حلیہ یہ بتایا ہے، میانہ قد، گندمی رنگ، ہلکی داڑھی، جس مین مہندی کا خضاب لگا ہوتا تھا۔[5]

---

[4] ابن خلکان ج ۱ ص ۳۹۳ [5] اس بستی کے آثار مین بجز ایک کنوین کے اور کچھ باقی نہیں ہے۔

ابن جُریج

ابن جریج نے آنکھ کھولی تو صحابہؓ کی ایک معتدبہ تعداد موجود تھی، اگر وہ ان کی صحبت اختیار کرتے تو ان کا شمار زمرۂ تابعین مین ہوتا، مگر ابتدا مین ان کو شعر و ادب سے دلچسپی تھی اس لئے وہ ان سے کسب فیض نہ کر سکے، اس بناپر ان کو تبع تابعین مین شمار کیا گیا ہے۔

ان کا شمار تبع تابعین کے اس زمرہ مین ہوتا ہے جنھون نے تفسیر و حدیث کی تدوین و ترتیب مین حصہ لیا، خاص طور پر علم تفسیر مین یہ اپنے معاصرین مین ممتاز تھے۔ تفسیر طبری مین سیکڑون روایات ان کے واسطہ سے ملین گی، یہ ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد عطا بن ابی رباح کے خاص شاگرد تھے۔

نام و نسب عبدالملک نام، ابوالولید اور ابوخالد کنیت تھی، ان کا آبائی وطن روم تھا۔[1] اسی وجہ سے بعض لوگ انھین رومی عیسائی کہتے ہین،[2] بعثت نبویؐ کے بہت پہلے سے مکہ مین متعدد رومی غلام خاندان موجود تھے۔ غالبًا ان ہی مین ابن جریج کا خاندان بھی تھا، انھین ۸۰ھ مین ان کی ولادت ہوئی۔

تعلیم و تربیت مکہ مین اس وقت شعر و ادب اور حدیث و فقہ کا عام چرچا تھا۔ ابتدا مین ان کو شعر و ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی اور جوانی کا پورا زمانہ اسی وادی مین گذار دیا، عمر کے ڈھلنے کا زمانہ آیا تو کسی نے علوم دینیہ کی طرف توجہ دلائی۔ اس کے بعد پوری زندگی اسی کی نذر کر دی۔

---

[1] تاریخ بغداد جلد ۱۰ صفحہ ۴۰۱ ، [2] فجر الاسلام کے مصنف نے بھی انھین اہل کتاب تبع تابعین شمار کیا ہے۔ [3] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۲۶۔

مکہ میں اسوقت حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ممتاز شاگرد عطاء بن ابی رباح کا چشمۂ فیض جاری تھا حدیث نبویؐ کے سماع کے لیے سب سے پہلے ابن جریج انہی کی خدمت مین حاضر ہوئے۔ خود بیان کرتے ہیں کہ مین عطاء بن ابی رباح کی خدمت مین یہ جذبہ لے کر حاضر ہوا کہ مین بھی ان کا مرتبہ حاصل کر دن۔ اتفاق سو اس وقت ان کی خدمت مین عبداللہ بن عبیدؒ بھی موجود تھے۔ انھون نے مجھ سے پوچھا کہ قرآن حفظ کر لیا ہے۔ مین نے نفی مین جواب دیا۔ بولے جاؤ پہلے قرآن پڑھ لو پھر علم (حدیث) کا قصد کرو۔ مین واپس آکر قرآن کی تعلیم مین لگ گیا کچھ دنون بعد پھر انکی خدمت میں حاضر ہوا، اتفاق سو اس دن بھی عبداللہ موجود تھے، پوچھا کہ پورا قرآن مستحضر ہو گیا؟ میں نے اثبات میں جواب دیا، انھون نے دوسرا سوال یہ کیا کہ فرائض بھی سیکھے ہین، بولا نہین، انھون نے کہا جاؤ پہلے فرائض کی تحصیل کرو۔ پھر واپس آؤ چنانچہ مین واپس چلا گیا۔ اور کچھ دنون کے بعد واپس آیا، تو مجھے عطا کی صحبت مین کسب علم کی اجازت ملی۔ اور پھر سترہ برس تک ان کی خدمت مین رہا۔

اس واقعہ سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت عطا ہر کس و ناکس کو اپنے درس مین شریک نہین کرتے تھے، بلکہ اس کے لئے انھون نے کم از کم قرآن کے حفظ اور درس کے عام مفہوم و معنی کے استحضار کو ضروری قرار دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے درس کی سب سے بڑی خصوصیت جیسا کہ ابن سعد نے لکھا ہے۔ قرآن کی تفسیر اور اس کے دقائق معانی کی تعلیم تھی، ظاہر ہے کہ جو شخص قرآن سے بالکل نابلد ہو وہ ان کے درس سے کیا فائدہ اٹھا سکتا تھا؟

دوسرے اس واقعہ سے ابن جریج کے شوق و انہماک کا پتہ چلتا ہے کہ ان کو دو دو بار مجلس درس سے واپس کیا گیا مگر ہر بار ان کا جذبۂ شوق کم ہونے کے بجائے بڑھتا ہی رہا۔ اور پھر اسی شوق نے انہین سترہ برس تک اپنے استاد سے جدا نہ ہونے دیا۔ اتنی مدت ان کی خدمت مین رہنے کے بعد بھی ان کے جذبۂ طلب کو تسکین نہین ہوئی اور سات برس تک مکہ کے دوسرے ممتاز شیخ عمرو بن دینار کی

لہ یہ حضرت عبید بن عمر کے لڑکے اور عطاء کے شاگرد تھے۔ لہ شذرات ج ا ص ۸۸۴ تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۴۰۲

خدمت میں رہے، اور پھر مکہ سے نکل کر انھوں نے مدینہ، بصرہ، بغداد، یمن، شام اور مصر کی خاک چھانی اور وہاں کے تمام ممتاز شیوخ سے استفادہ کیا۔ ان کے مخصوص شیوخ تفسیر وحدیث کے نام یہ ہیں۔

اساتذہ | عطاء بن ابی رباح، امام زہری، صالح بن کیسان، عمرو بن دینار، نافع مولی بن عمر، ہشام بن عروہ، موسیٰ بن عقبہ، امام جعفر صادق، یحییٰ بن سعید الانصاری، امام اوزاعی، لیث بن سعد وغیرہ ہم۔

علم وفضل | ان کے علم وفضل کے بارے میں ائمہ نے جو رائیں دی ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اس لحاظ سے معروف تھے۔ ان کے شیخ عطاء بن ابی رباح ان کو اہلِ حجاز کا سردار کہتے تھے[1]۔ امام احمد انکو "علم کا ظرف" کہتے تھے[2]۔ امام ذہبی نے انھیں امام، حافظ حدیث اور احد الاعلام (بڑوں میں ایک تھے) لکھا ہے۔ امام نووی نے لکھا ہے کہ ان کے فضائل ومناقب بیشمار ہیں۔

علم تفسیر | علم تفسیر میں جو صحابہ ممتاز تھے ان میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا نام سرفہرست ہے۔ تابعین میں ان کے جو تلامذہ علم تفسیر میں مشہور ہوئے ان میں عطاء بن ابی رباح بھی ہیں۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ ابن جریج ان کے بہت ہی محبوب اور چہیتے شاگرد تھے، اور سترہ برس تک ان کی خدمت میں رہے تھے، ظاہر ہے کہ علم تفسیر کا جو سرمایہ عطاء بن ابی رباح کو حضرت ابن عباسؓ سے ملا تھا اس سے ابن جریج کو بھی وافر حصہ ملا ہوگا۔ مگر تعجب ہے کہ ارباب تذکرہ انکی اس خصوصیت کا کوئی ذکر نہیں کرتے، البتہ علوم تفسیر کی کتابوں میں ان کی قرآن فہمی کے بارے میں کچھ اشارات ملتے ہیں۔

امام ذہبی نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ نسلاً رومی تھے۔ ارباب تذکرہ جب کسی کے بارے میں رومی یا قبطی لکھتے ہیں تو اس سے عموماً عیسائی ہی مراد لئے جاتے ہیں، یعنی ان کی وطنی نسبت کو ان کی دینی نسبت کے مرادف سمجھا جاتا ہے۔ غالباً اسی بنا پر صاحب فجر الاسلام نے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۴۰۴ [2] ایضاً

لکھا ہے کہ یہ نصرانی تھے کیونکہ طبری نے نصاریٰ کے بارے مین جو روایتین اپنی کتاب مین درج کی ہیں، ان مین بیشتر ابن جریج ہی کے ذریعہ مروی ہین [1]۔

علم تفسیر مین گو یہ ترجمان القرآن حضرت ابن عباسؓ کے مدرسۂ فیض سے مستفیض ہوئے تھے، مگر ان کی تفسیر پر مفسرین نے زیادہ اعتماد کا اظہار نہیں کیا ہے۔ امام سیوطی نے لکھا ہے۔

ان ابن جریج لم یقصد الصحۃ	ابن جریج نے تفسیر مین زیادہ صحت کا اہتمام
وانما روی ما ذکر فی کل آیۃ	نہین کیا وہ ہر آیت کی تفسیر مین غلط صحیح
من الصحیح والسقیم [2]	ہر طرح کی روایتین نقل کر دیتے ہیں۔

عموماً علمائے امت اہل کتاب مفسرین کے بارے مین اسیطرح کی رائے دیتے ہیں، اسکی وجہ یہ ہو کہ ان حضرات کا ماخذ عموماً اسرائیلیات ہوتا تھا جسکا سارا تار پود قصہ و افسانہ ہوتا تھا جن مین صحت سند کا کوئی لحاظ کیا جاتا تھا، او نہ درایت ہی سے کوئی واسطہ ہوتا تھا۔ ایسے لوگ جب مسلمان ہوئے تو اسلامی روایات کے بارے مین بھی ان کی یہ ذہنیت کسی نہ کسی حد تک باقی رہی جس کی وجہ سے غلط روایات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اسلامی علوم مین شامل ہوگیا۔ خصوصیت سے علم تفسیر کے سلسلہ مین جو قصے و افسانے احادیث نبویؐ کے نام سے اور جو غلط روایات رواج پذیر ہوئین، اسس مین انہی اہل کتاب تابعین و تبع تابعین کا زیادہ ترہا تھا

بہرحال سقم و غلطی کے باوجود علم تفسیر مین ابن جریج کا ایک درجہ و رتبہ ہے۔ تمام مفسرین انکی رائے نقل کرتے ہیں، خاص طور سے علامہ طبری نے تو بیشمار جگہ ان کے اقوال نقل کئے ہیں۔ اور ان کی مرویات سے استدلال کیا ہے۔ افسوس ہے کہ فن تفسیر مین ان کی کوئی تحریری یادگار موجود نہیں ہے، جس سے اس فن مین ان کے مرتبہ کا آسانی سے اندازہ لگایا جائے۔

فن قرأت مین بھی ان کو مہارت تھی۔ ابن حبان نے ان کا شمار قراء اہل حجاز مین کیا ہے،

---

[1] فجر الاسلام ص ۲۴۷ [2] اتقان ج ۲ ص ۱۸۵۔

علم حدیث مین ابن جریج نے ممالک اسلامیہ کے تقریباً تمام مشہور ائمہ سے استفادہ کیا تھا، خاص طور سے عطا ابن ابی رباح اور عمرو بن دینار کی خدمت مین وہ برسون رہے تھے۔ اسی لیے اس فن مین بھی ان کا ایک مرتبہ ہے، ان کی روایات کو ائمۂ حدیث نے قبول کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل فرماتے تھے کہ "ابن جریج نے عطار سے جو روایتین کی ہیں، ان مین انھون نے غلطی نہین کی ہے، خود ان کے استاد عطار کو بھی ان پر بڑا اعتماد تھا۔ کسی نے پوچھا کہ آپ کے بعد مسائل مین ہم کس کی طرف رجوع کیا کرین، بولے کہ ابن جریج کی طرف، پھر کہا کہ یہ اہل حجاز کے بہترین نوجوان ہیں[1]۔

ابن مدینی کہتے تھے کہ حدیث نبوی کی روایات کا دارومدار چھ آدمیون پر ہے۔ پھر ان چھ آدمیون کا علم ان لوگون کے درمیان سمٹ گیا جنھون نے علم حدیث کی تدوین کی اور ان مدوین کرنے والون مین ایک ابن جریج بھی ہیں[2]،،

بعض معاصر ائمہ نے ان پر جرح بھی کی ہے اور ان کی مرویات کو ضعیف قرار دیا ہے۔

یحیٰی بن سعید قطان سے کسی نے پوچھا کہ ان کی روایات کیسی ہیں؟ فرمایا کہ ضعیف۔ پھر پوچھا کہ وہ جب اخبرنی کے لفظ سے روایت کرین تو فرمایا کہ یہ کوئی چیز نہین ہے، ان کی مرویات بہرحال ضعیف ہیں[3]،

ابوزرعہ رازی نے بھی ان کی تضعیف کی ہے۔ امام مالک ان کو حاطب اللیل (ہر غلط و صحیح روایات کا جامع) کہتے تھے، مگر ان کے بارے مین جرح کے جو الفاظ منقول ہیں، ان مین کسی حد تک مبالغہ معلوم ہوتا ہے، فن حدیث مین ان کے مرتبہ کی تعیین کے لیے یحیٰی بن معین امام جرح و تعدیل اور امام ذہبی کی رائیں زیادہ محتاط اور صحیح معلوم ہوتی ہیں۔

ابن معین فرماتے ہیں کہ ابن جریج نے جو روایتین تحریر کی مدد سے بیان کی ہیں وہ قابل اعتماد ہیں[4] مقصد یہ ہے کہ ان کی زبانی مرویات زیادہ قابل اعتماد نہین ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہوگی کہ ان کا حافظہ معمولی

---

[1] تہذیب ج ۱ [2] ایضاً [3] جن الفاظ سے ائمہ روایت کرتے ہیں ان مین ایک اخبرنی بھی ہے [4] تہذیب ج ۲ ص ۴۰۶

درجہ کا تھا۔ اس لیے ان کو زبانی روایتیں اچھی طرح یاد نہیں رہتی تھیں۔ یحییٰ بن سعید جنکی جرح اوپر گذر چکی ہے تحریری روایت کے بارے میں یہی ابن معین کے ہمخیال تھے۔[1]

امام ذہلی کہتے تھے کہ ان کی زبانی روایتیں وہی قابل وثوق ہیں جن میں یہ حدثنی یا سمعت کے الفاظ استعمال کریں۔[2]

ان تمام رایوں کو پیش نظر رکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ائمہ نے حدیث نبوی کی جمع و ترتیب میں کس قدر احتیاط برتی ہے اور ضعیف و کمزور روایتوں کو اس پاکیزہ ذخیرہ سے علحدہ کرنے میں کتنا اہتمام کیا ہے۔ اگر کسی مسلّم امام حدیث سے بھی اس بارے میں کوئی لغزش ہوجاتی تھی، تو اس کی لغزش کو واضح کرنے میں انھوں نے کبھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی ہے۔

فقہ | ابن حبان نے ان کو فقہائے اہل حجاز میں شمار کیا ہے۔ امام نووی نے لکھا ہے کہ شافعی طرز فقہ کی داغ بیل جن ائمہ نے امام شافعی سے پہلے ڈالی ان میں ابن جریج کا بھی شمار ہے۔ امام نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ امام شافعی نے فقہ میں جن لوگوں سے استفادہ کیا تھا۔ ان میں مسلم خالجی بھی شامل تھے جو ابن جریج کے تربیت یافتہ تھے۔[3]

تصنیف | ان کا شمار ان ائمہ میں ہوتا ہے جنھوں نے علوم دینیہ کی تدوین و ترتیب میں حصہ لیا، ارباب تذکرہ نے ان کی کسی کتاب کا نام نہیں لیا ہے۔ البتہ ابن ندیم نے لکھا ہے کہ ان کی متعدد تصانیف ہیں۔ ان کی ایک کتاب "کتاب السنن" ہے۔ اس کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ اس طرز پر لکھی گئی ہے جس پر عام کتب سنن لکھی گئی ہیں۔ یعنی ہر ہر باب جدا جدا ہے، مثلاً باب طہارت، باب صلوٰۃ، وغیرہ۔[4] ان کی ایک تفسیر کی کتاب کا ذکر کشف الظنون میں بھی ہے۔

ان کی تصانیف کے بارے میں عام اہل تذکرہ امام احمد کی یہ رائے نقل کرتے ہیں کہ

---

[1] تہذیب ج ۶ ص ۴۰۴ [2] ایضاً۔ [3] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۹۰ [4] ابن ندیم

اول من صنف الکتب ابن جریج وابن ابی عروبہ (تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۹۸) | سب سے پہلے جن لوگوں نے الگ الگ عنوانات پر کتابیں تصنیف کیں ہیں ابن جریج اور ابن ابی عروبہ سب سے مقدم ہیں۔

مگر ہمارے سامنے اسلامی علوم کی جمع وتدوین کی جو تاریخ ہے اس کی روشنی میں یہ رائے صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ ان بزرگوں سے بہت پہلے سے تمام اسلامی علوم تفسیر، حدیث وغیرہ پر تصنیف و تدوین کا کام شروع ہو گیا تھا۔ اس بارے میں یا تو ابن عماد کی یہ رائے صحیح ہے کہ

اول من صنف الکتاب بالحجاز (ش ج ۲ ص ۲۲۲) | حجاز میں سب سے پہلے ابن جریج نے جمع وتدوین کا کام شروع کیا۔

یا پھر یہ کہا جائے کہ ابتداءً جن لوگوں نے حدیث اور فقہ پر کتابیں لکھیں ان میں موضوع وعنوان کی تقسیم نہیں تھی۔ بلکہ جس کو تفسیر، حدیث اور فقہ کا جو ذخیرہ جس طرح مل گیا اس نے اسے اسی طرح مرتب کر دیا، ابن جریج کا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے اس میں فنی ترتیب قائم کر کے موضوع کے اعتبار سے حدیث نبوی کو جمع کیا، چنانچہ خود بھی کہا کرتے تھے کہ میری طرح کسی نے علم کی تدوین نہیں کی[1]

ان کی تصانیف کے بارے میں ائمہ نے جو رائیں دی ہیں وہ بھی قابلِ ذکر ہیں، یحییٰ بن سعید کہتے ہیں "ابن جریج کی کتابیں کتب امانت ہیں"[2]

انکی کتابیں ان کی زندگی ہی میں مشہور ہو چکی تھیں۔ اور لوگ ان سے استفادہ کرنے کیلئے دور دور سے سفر کرتے تھے۔

خالد بن نزار کہتے ہیں کہ میں ۱۵۰ھ میں وطن سے اس ارادہ سے نکلا کہ ابن جریج کی کتابیں حاصل کروں مگر جب منزلِ مقصود پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ چند دن پہلے ان کا انتقال ہو چکا۔[3]

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۴۰۷ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۵۲ ص ۲۷۴۔ [3] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۴۰۳

عادات واخلاق ان کے اوپر خشیت ربانی کی کیفیت ہر وقت طاری رہتی تھی مشہور محدث عبدالرزاق کا بیان ہو کہ جب میں ان کو دیکھتا تھا۔ تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ خدا سے ڈرتے ہیں۔ میں نے ان کے جیسا بہتر نماز ی نہین دیکھا[۱] ظاہر ہے کہ نماز کی روح خشوع وخضوع اور خشیت الٰہی ہے جس کے اوپر یہ کیفیت ہمہ وقت طاری رہتی ہو وہ نماز مین سراپا خشیت کیون نہ بن جاتا ہوگا؟ ان کی اسی خشیت الٰہی کا اثر تھا کہ وہ شب زندہ دار ہوگئے تھے۔ امام مالک ان کی شب بیداری کی وجہ سے ان کو صاحب اللیل (رات میں عبادات کرنے والا) کہا کرتے تھے[۲]

روزے سے بے انتہا شغف تھا۔ پورے سال روزے رہتے تھے، ہر ماہ مین صرف تین دن روزے وہ چھوڑ دیا کرتے تھے[۳]

طبیعت بہت رقیق اور اثر پذیر پائی تھی۔ یمن کے زمانۂ قیام مین حج کی سعادت سے محروم رہے تھے، ایک دن عمرو بن ابی ربیعہ کے چند اشعار یاد آگئے۔ جن مین طول ہجر کی شکایت تھی۔ ان اشعار کا یاد آنا تھا کہ فوراً زیارت حرمین کے لیے کمربستہ ہوگئے۔ اسی وقت اپنے استاد معن بن زائدہ کے پاس آئے اور ان سے اپنے ارادہ کا اظہار کیا۔ استاد نے کہا کہ تم نے پہلے کیون نہ اطلاع دی۔ انھون نے اتنی جلدی قصد کر لینے کا سبب بتایا تو استاد نے جلدی جلدی ان کے لئے سامان سفر کا انتظام کیا اور وہ دیار محبوب کی زیارت کے لیے روانہ ہوگئے[۴]

علم کے حصول کا مقصد ایک بار متعدد ائمہ کا مجمع تھا۔ امام اوزاعی بھی موجود تھے۔ ولید بن مسلم نے پوچھا کہ آپ حضرات نے علم کس کے لئے حاصل کیا ہے سب نے کہا کہ اپنی ذات کے لیے، مگر ابن جریج بولے کہ مین نے علم لوگون کے فائدہ کے لیے حاصل کیا ہے[۵]

۱؎ صفوۃ الصفوۃ جلد ۲ صفحہ ۲۳۔ ۲؎ تذکرۃ الحفاظ۔ ۳؎ شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۲۶

۴؎ تہذیب التہذیب جلد ۱۰ صفحہ ۴۰۲۔

نفاست طبع | خوشبو کے استعمال کے عادی تھے۔ اس کے ساتھ خضاب کا بھی استعمال کرتے تھے۔

وفات | زندگی کے بیشتر ایام انھوں نے جوار حرم میں گذارے مگر آخر عمر میں بصرہ چلے گئے، اور وہاں پہنچ کر سلسلۂ درس شروع کر دیا۔ مگر عمر نے وفا نہ کی اور شروع ذوالحجہ ۱۵۰ھ میں انتقال ہوگیا۔[1]

اولاد | دو صاحبزادے یادگار چھوڑے۔ دونوں صاحب علم و فضل تھے۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۱۵۳-۵۷

امام اسحاق بن راہویہ

تابعین کے فیض تربیت سے جو لوگ بہرہ ور ہوئے اور ان کے بعد علوم دینیہ کی اشاعت و ترویج کی انہی میں امام المسلمین اسحاق بن راہویہؒ بھی ہیں۔ ان کا شمار ان اساطین امت میں ہوتا ہو جنھوں نے دینی علوم خصوصاً تفسیر و حدیث کی بے بہا خدمات انجام دی ہیں۔ اور اپنی تحریری یادگاریں بھی چھوڑی ہیں۔

نام و نسب۔ نام اسحاق اور ابو یعقوب کنیت تھی۔ والد کا نام ابراہیم تھا۔ مگر راہویہ[1] کے نام سے مشہور تھے۔ عام طور پر ارباب رجال ان کا پورا سلسلۂ نسب بیان نہیں کرتے۔ دولابی نے ان کا پورا سلسلۂ نسب بیان کیا ہے۔ جس کو صاحب تہذیب نے نقل کیا ہے (ج ا ص ۲۱۸)

ان کا اصلی وطن مرو (ایران) تھا۔ کسی وجہ سے قیام نیشاپور میں تھا[2]

تعلیم و تربیت ۱۶۱ھ یا ۱۶۳ھ میں ولادت ہوئی[3] ابتدائی تعلیم کے بعد حدیث کی طرف توجہ کی۔ سب سے پہلے امام وقت عبداللہ بن مبارک کی خدمت میں گئے مگر ان کی کم سنی استفادہ میں مانع تھی، پھر دوسرے شیوخ حدیث کی مجالس درس میں شریک ہوئے۔ اور ان سے استفادہ کیا۔ اس وقت ممالک اسلامیہ میں دینی علوم کے جتنے مراکز تھے۔ وہ سب ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور تھے۔ مگر ابن راہویہ

---

[1] عبداللہ بن طاہر امیر خراسان نے ایک بار ان سے دریافت کیا کہ آپ ابن راہویہ کے نام سے کیوں مشہور ہیں؛ اس نام سے آپ کو مخاطب کیا جائے تو آپ برا تو نہیں مانیں گے؟ بولے کہ میرے والد کی ولادت راستہ میں ہوئی تھی جس کی وجہ سے اہل مروان کو راہوی کہنے لگے یعنی راہی عربی میں آکر راہویہ ہوگیا۔ میرے والد اس لفظ کو اپنے لئے پسند نہیں کرتے تھے لیکن مجھے پسند ہے۔ [2] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۵۵، [3] تہذیب جلد ۲ ص ۲۱۷ [4] سنہ وفات میں اختلاف ہے اس اختلاف کی وجہ ان کی تاریخ ولادت میں بھی ہوگیا ہے، مگر زیادہ صحیح یہ ہے کہ ۱۶۱ھ میں ولادت ہوئی اور ۲۳۸ھ میں وفات پائی۔

نے ان تمام مقامات کا سفر کیا اور وہاں کے تمام ممتاز محدثین و علماء سے استفادہ کیا، خطیب بغدادی نے اس سلسلہ میں عراق، حجاز، یمن، مکہ اور شام وغیرہ کا نام لیا ہے۔ مگر ان مقامات کی حیثیت محض ایک شہر کی نہیں تھی بلکہ یہ مملکت اسلام کے بڑے بڑے صوبے یا علاقے تھے جن میں سیکڑوں علمی مراکز تھے اور بیشمار جگہوں پر فقہ و حدیث کی مجلسیں برپا تھیں، اس لئے ان مرکزی مقامات کی نہ جانے کتنی بستیوں کی خاک چھانی ہوگی، ان کے اساتذہ کے چند نام یہ ہیں:

سفیان بن عیینہ مکہ، جریر بن عبدالحمید موسیٰ، اسمٰعیل بن علیہ بصرہ، وکیع بن جراح، یحییٰ بن آدم، ابو معاویہ، ابو اسامہ کوفہ، عبدالرزاق بن ہمام، عبداللہ بن وہب، عبداللہ بن مبارک خراسان، یہ ان کے چند مشاہیر اساتذہ کے نام دئے گئے ہیں، ورنہ یہ تعداد اس سے بہت زیادہ ہے۔

تفسیر | انکو ابتدا ہی سے علم حدیث سے شغف تھا اور اسی کے حصول میں انھوں نے سب سے زیادہ محنت و کوشش کی، مگر تفسیر و فقہ وغیرہ میں بھی ان کو دسترس تھی، خطیب نے لکھا ہے کہ وہ حدیث و فقہ کے جامع تھے، جب وہ قرآن کی تفسیر بیان کرتے تھے تو اس میں بھی سند کا تذکرہ کرتے تھے۔ ابو حاتم اس بارے میں کہتے ہیں کہ حدیث کے سلسلہ روایت اور الفاظ کا یاد کرنا تفسیر کے مقابلہ میں آسان ہے۔ ابن راہویہ میں یہ کمال ہے کہ وہ تفسیر کے سلسلہ سند کو بھی یاد کر لیتے ہیں[۲]۔

قوت حافظہ اور حدیث سے شغف و اعتناد | اس کد و کاوش کے ساتھ خدا نے قوت حافظہ بھی غیر معمولی دیا تھا، بیشمار احادیث زبانی یاد تھیں، کئی کئی ہزار احادیث تلامذہ کو وہ اپنی یادداشت سے لکھا دیا کرتے تھے اور کبھی کتاب دیکھنے کی ضرورت نہیں پیش آتی تھی، خود کہتے تھے۔ کہ میں جو کچھ سنتا ہوں اسے یاد کر لیتا ہوں اور جو کچھ یاد کر لیتا ہوں پھر نہیں بھولتا۔ فرماتے تھے، ستر ہزار حدیثیں ہر وقت میری نظروں کے سامنے رہتی ہیں۔ ابو ذرعہ مشہور محدث کہتے تھے کہ ان کے جیسا قوت حفظ رکھنے والا نہیں دیکھا گیا[۳]۔

---

[۱] تہذیب ج ۱، ص ۲۱۸۔ [۲] تاریخ بغداد،

ان سے ایک بار کہا گیا کہ لوگون کا خیال ہے کہ آپ کو ایک لاکھ حدیثین زبانی یاد ہین، فرمایا کہ مین ایک دو لاکھ کچھ نہین جانتا مگر مین نے آج تک جتنی حدیثین سنی ہین وہ سب یاد ہیں۔ ابو داؤد خفاف جوان کے تلامذہ مین ہین کہتے تھے کہ ایک بار گیارہ ہزار حدیثین انھون نے املا کرائیں۔ اور پھر ان کو دوبارہ دہرایا تو ایک حرف کا فرق نہین تھا۔[1]

حدیث سے شغف کا نتیجہ | خداداد استعداد وصلاحیت اور قوتِ حافظہ کے ساتھ حدیث سے ان کے شغف وانہماک نے جلد ہی ان کو تبع تابعین کے زمرہ مین ایک ممتاز حیثیت کا مالک بنا دیا۔ بڑے بڑے ائمۂ حدیث ان کے فضل وکمال کے معترف اور ان کے جلالت علم کے قائل ہوگئے۔

ابن خزیمہ کہتے تھے کہ اگر وہ تابعین کے زمانہ مین ہوتے تو اپنے علم وفضل کی بناپر اس زمرہ مین بھی ایک ممتاز حیثیت حاصل کرتے۔

امام احمد بن حنبل کے سامنے جب کوئی شخص ابن راہویہ کہتا تھا تو ان کو برا معلوم ہوتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ خراسان کے علاقہ مین ان کے زمانہ مین ان کے جیسا صاحب علم آدمی نہین پیدا ہوا۔ گو ہمارے اور ان کے درمیان بہت سے مسائل مین اختلاف تھا۔ مگر یہ کوئی نئی بات نہین ہے۔ اختلاف تو ہر زمانہ کے اہل علم مین ہوا ہے۔[2]

مقصد یہ تھا کہ اختلاف کی بناپر کسی کے فضل کا اعتراف نہ کرنا صحیح نہین ہے۔ یحییٰ بن یحییٰ ایک ممتاز محدث تھے۔ ان کے پاس جب ابن راہویہ آتے تھے تو وہ ان کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ ان کے قریب کے لوگون کو تعجب ہوتا تھا۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ وہ تو آپ سے عمر مین بھی چھوٹے ہیں۔ ان کی اتنی عزت افزائی کیون کرتے ہیں؟ انھون نے کہا کہ

اسحاق اکثر علماً منی وانا اسن منہ[3] — اسحاق علم مین مجھ سے بڑے ہیں اور مین عمر مین ان سے بڑا ہون

---

[1] تاریخ بغداد [2] اسلیے کہ اسمین ایک اہانت کا پہلو تھا [3] تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۰۹۔

انہی کا قول ہے کہ اسحاق کے پاس علم کا ایک خزانہ ہے[1] محمد بن یحیٰی الذہلی بیان کرتے ہیں کہ ایک بار

۱۹۹ھ میں اسحاق بن راہویہ کے ساتھ رصافہ گیا، یہاں پر تمام معاصر ائمہ حدیث مثلاً احمد بن حنبل، یحییٰ

ابن معین وغیرہ جمع تھے۔ مگر اس مجلس کے صدر نشین اسحاق بن راہویہ بنائے گئے[2]۔

درس وتدریس | اس بارے میں اہل تذکرہ کچھ زیادہ معلومات نہیں فراہم کرتے۔ مگر جستہ جستہ واقعات

سے اس پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ تحصیل علم اور سماع حدیث کے بعد ان کا قیام زیادہ تر نیشاپور میں رہتا تھا،

گو یہ جگہ اسلامی مملکت کے مرکزی مقامات سے بہت دور تھی۔ پھر اس زمانہ میں سفر کی دقتیں بھی وہاں

تک پہنچنے میں مانع تھیں۔ مگر اس کے باوجود صدہا تشنگان علم اس چشمۂ علم سے سیراب ہوئے۔ خصوصیت

سے خراسان کے علاقہ میں ان کا علم کافی پھیلا۔ خطیب کا بیان ہے کہ ان کا علم خراسانیوں میں خوب پھیلا؛ ابن

ابن جریر کا بیان ہے کہ مشرق میں جن لوگوں نے سنت کو زندہ کیا ان میں اسحاق بن راہویہ بھی ہیں[3]۔

ان سے جن لوگوں نے اکتساب فیض کیا ان میں امام بخاری۔ امام مسلم، امام ترمذی، ابوداؤد، نسائی

اور امام احمد بن حنبل۔ یحییٰ بن معین وغیرہ کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ ان تمام ائمہ نے اپنی اپنی کتابوں میں اسحاق

ابن راہویہ کی مرویات نقل کی ہیں،

امام ذہبی نے لکھا ہے کہ ان کبار ائمہ کے علاوہ خلق کثیر نے ان سے روایت کی ہے۔

یحییٰ بن آدم ان کے شیوخ میں ہیں، مگر انھوں نے ان سے تقریباً دو ہزار روایتیں نقل کی تھیں،

طریقۂ درس | عام طور پر ائمۂ حدیث کا طریقۂ درس یہ ہوتا تھا کہ جو کچھ انہیں املا کرانا ہوتا تھا اسے وہ پہلے

سے لکھ کر لے جاتے تھے۔ مگر بہت سے ائمۂ حدیث کو اپنے حفظ پر اتنا اعتماد ہوتا تھا کہ وہ زبانی املا کراتے تھے،

ان ہی لوگوں میں اسحاق بن راہویہ بھی تھے، اوپر ذکر آچکا ہے کہ بسا اوقات وہ کئی کئی ہزار روایتیں ایک

مجلس میں زبانی املا کرا دیتے تھے۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۶، [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۳۷۶۔

کہتے تھے کہ (جو ذخیرۂ حدیث میرے پاس ہے ان مین) ایک لاکھ حدیثوں کے موقع و محل سے اس طرح واقف ہون کہ وہ گویا میری آنکھون کے سامنے ہین۔ ان مین سے ستر ہزار تو مجھے مع معانی حفظ ہیں، اور چار ہزار مزوّرہ حدیثین مجھو یاد ہیں۔ لوگون نے پوچھا کہ مزورہ حدیثون سے آپ کی کیا مراد ہے؟ انھون نے کہا کہ وہ جھوٹی اور موضوع روایتین جنھین مین نے اس لئے یاد کرلیا ہے کہ جب وہ روایتین صحیح احادیث کے ساتھ مختلط ہوکر میرے سامنے آئین تو ان مین جتنا حصہ کذب اور وضع کا ہو اسے الگ کردون اور صحیح حدیث کا جتنا حصہ ہے اسکو علیحدہ کردون۔

ان کی اس خدمت کی اہمیت کا اندازہ پورے طور پر اسی وقت ہوسکتا ہے جب دوسری صدی کے اس فتنہ کی تاریخ کو سامنے رکھا جائے جس کے ذریعہ ہزارون بے سروپا روایتین احادیث نبوی کے نام سے لوگون مین رواج پا گئی تھین۔ اور نہ جانے کتنی موضوع روایتین زبان زد خاص و عام ہوگئی تھین، اس فتنہ کے مقابلہ کے لئے ائمۂ حدیث نے جو کد وکاوش اور جدوجہد کی اور اس کے لئے دکھ سہے اس کا صحیح اندازہ تو یحیی بن معین، عبدالرحمن مہدی، ابن المدینی، احمد بن حنبل وغیرہ کے حالات سے ہوگا۔ مگر اس صدی کے دوسرے ائمہ کے سوانح حیات مین بھی اس قسم کی کوششون کی کوئی نہ کوئی جھلک ملتی ہے، اسی طرح کی کوشش حضرت اسحٰق بن راہویہ نے بھی کی تھی۔

اہل علم سے مذاکرہ اجتہادی مسائل مین ارباب علم کے درمیان ہمیشہ مذاکرہ و مباحثہ ہوتا رہا ہے، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، یہ دونون بزرگ اسحاق بن راہویہ کے معاصر تھے۔ اس لئے ان مین بھی بعض دینی مسائل مین مذاکرے ہوئے ہین اُن مین سے اہل تذکرہ نے خصوصیت سے دو مسئلون کا ذکر کیا ہے،

ایک مسئلہ یہ تھا کہ مکہ کے اندر جو مکانات ہین ان پر ان کے رہنے والون کا حق ملکیت بھی ہے یا نہین۔ اگر ہے تو وہ ان کو کرایہ وغیرہ پر اٹھا سکتے ہین یا نہیں اور اگر نہین ہے تو پھر ان کو بیع کرنے یا کرایہ دینے کا اختیار ہے یا نہین، امام شافعی ملکیت کے قائل تھے۔ اور اسحاق بن راہویہ مکہ کی سرزمین پر کسی کی

ملکیت تسلیم نہین کرتے تھے۔

اتفاق سے ایک بار مکہ مین ان دونون بزرگون کا اجتماع ہوگیا۔ امام احمد بھی موجود تھے۔ اسحاق بن راہویہ چونکہ اس مسئلہ مین بہت سخت تھے اس لیے انھون نے امام شافعی کے سامنے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے اختلاف کیا۔ اور اپنے اس اجتہاد پر قرآن کی اس آیت سے استدلال کیا۔

للفقراء المہاجرین الذین اخرجوا من دیارھم۔ — ان فقیر مہاجرین کے لیے جن کو ان کے گھرون سے نکالا گیا۔

ان کا استدلال یہ تھا کہ اس آیت مین دیار کی نسبت ان کے مالکون کی طرف کی گئی ہے۔ پھر حدیث سے انھون نے حجت قائم کی۔ وہ یہ کہ فتح مکہ کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرے وہ مامون ہے۔ پھر فرمایا کہ ابوسفیان کے مکان میں داخل ہو جائے اس کو امن ہے۔ . . . . . پھر فرمایا کہ عقیل نے تو ہمارے لئے کوئی مکان نہین چھوڑا[1] (جس مین ہم ٹھہر سکین)

حضرت عمرؓ کے اسوہ سے استدلال کرتے ہوئے امام شافعی نے فرمایا کہ انھون نے جیل خانے کے لیے کچھ لوگون سے ان کے مکانات خرید لئے تھے۔

اسحاق بن راہویہ نے یہ دلائل سن کر فرمایا کہ مگر بعض تابعین میرے خیال کی تائید کرتے ہیں، اس پر امام شافعی نے فرمایا کہ مین تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول پیش کرتا ہون۔ اور آپ تابعین کی رائے سے استدلال کرتے ہین۔ اسحاق بن راہویہ نے پھر قرآن کی اس آیت کو استدلال میں پیش کیا۔

---

[1] حضرت عقیلؓ حضرت علیؓ کے چھوٹے بھائی تھے جب آنحضرتؐ اور حضرت علیؓ وغیرہ مکہ سے ہجرت کر گئے تو حضرت عقیلؓ نے اپنا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مکان فروخت کر ڈالا، یہ اسی طرف اشارہ ہے۔

سواء العاکف فیہ والباد　　　　اس مین مقیم و مسافر دونون برابر ہین۔

اس کے جواب مین امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ یہ تو مسجد حرام کے بارے مین ہے۔ مکہ کی عام زمین اس سے مراد نہین ہے۔ اسی طرح ایک اور مسئلہ مین بھی مذاکرہ ہوا، وہ مسئلہ یہ تھا کہ مردہ جانور کی کھال دباغت سے پاک ہو جاتی ہے یا نہین؟ امام شافعی پاکی کے قائل تھے، اور اسحاق بن راہویہ عدم جواز کے۔[1]

عادات و اخلاق | عادات و اخلاق اور زہد و تقویٰ کے اعتبار سے بھی وہ ممتاز تھے، تمام اہل تذکرہ لکھتے ہیں وہ صدق و صفا ورع و تقویٰ مین ممتاز تھے، ان کے تقویٰ اور خشیت الٰہی کے بارے مین یہ آیت مثال کے طور پر پیش کی جاتی تھی،

انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء　　　　خدا کے بندون مین سے اسکو جاننے والے ہی ڈرتے ہین،

ایک بار امیر خراسان علی بن طاہر کے پاس گئے، ہاتھ مین کچھ کھجورین تھین، وہ کھاتے ہوے اس کے سامنے بیٹھ گئے اس نے ان کی اس بے نیازی اور سادگی کو دیکھ کر کہا اگر تم نے یہ کسی ریا کی وجہ سے نہین کیا ہے تو دنیا مین تم سے زیادہ بے ریا مین نے نہین دیکھا۔[2]

اس سادگی کے باوجود زندگی زیادہ تر عسرت ہی مین بسر ہوتی تھی، وہ ہمیشہ مقروض رہتے تھے، ایک بار تیس ہزار درہم ان پر قرض ہو گئے یحییٰ بن یحییٰ نوجوان کے علم و فضل کے قائل تھے، علی بن طاہر امیر خراسان کو ایک رقعہ لکھا، کہ ان کا قرض ادا کر دیا جائے، چنانچہ اس نے ان کا قرض ادا کر دیا،[3]

وہب بن جریر فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اسحٰق بن راہویہ صدقہ اور عمر کو جزائے خیر دے کہ انھون نے مشرق مین سنت کو زندہ کیا،[4]

ابن حبان کہتے تھے کہ اسحاق بن راہویہ نے سنت نبوی کی ترویج کی جھوٹی روایتون کو احادیث نبوی سے الگ کیا۔ اور جن لوگون نے سنت کی مخالفت کی ان کا پورا مقابلہ کیا،

تصنیف | انھون نے اپنی تحریری یادگارین بھی چھوڑی ہیں، مگر اس وقت ان کے موجود ہونے کا

---

[1] طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۴۳ [2] ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۴ [3] طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۴۳ [4] ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۴

کوئی علم نہین ہے، ابن حبان نے تو صرف اتنا لکھا ہے۔

وصنف الکتب — انھون نے بہت سی کتابین تصنیف کی ہین۔

مگر اس کی کوئی تفصیل نہین بیان کی۔

ابن ندیم نے البتہ ان کی دو تصنیفات کا تذکرہ کیا ہے۔

(۱) کتاب السنن فی الفقہ۔

(۲) کتاب التفسیر۔

امام سیوطی نے لکھا ہے کہ تابعین کے بعد جن لوگون کے فن تفسیر کو زندہ کیا ان مین اسحاق بھی ہین،

وفات | ،، برس کی عمر مین ۲۳۶ھ مین وفات پائی۔

ان کی قبر آج بھی زیارت گاہ خلائق ہے۔ ابن حجر نے لکھا ہے۔ کہ ان کی قبر مشہور ہے۔ اور لوگ اس کی زیارت کو جاتے ہین۔

یہ صاحب مذہب تھے | حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ یہ فقہ مین ایک مسلک کے بانی تھے، جسے اسحاقیہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ان کے الفاظ یہ ہین۔

اسحٰق بن راھویہ قد کان	اسحاق بن راہویہ امام وقت تھے، ایک گروہ
اماماً متبعاً لہ طائفۃ یقلدونہ	ان کی تقلید کرتا تھا اور ان کے مسلک کے
ویجتھدون علی مسلکہ[۲]	مطابق مسائل کا استنباط اور اجتہاد کرتا تھا

اس بات کا علم نہین ہو سکا کہ یہ مسلک کہان پر ان چڑھا، کتنے دنون تک زندہ رہا اور کب فنا ہو گیا،

---

[۱] تہذیب ج ۱ ص ۲۱۹ [۲] اختصار علوم الحدیث ص ۸۹۔

سفیان بن عینیہ

سفیان بن عینیہ کے علم وفضل اور دیانت وتقویٰ کا ہر کہ ومہ معترف ومداح ہے۔ زمرۂ تبع تابعین مین حدیث نبویؐ کی تدوین وترتیب کا کام جن بزرگون نے انجام دیا ان مین سفیان بن عینیہ کا نام سرفہرست ہے۔ ان کا ایک زرین کارنامہ یہ بھی ہے کہ کلام الٰہی کے وہ لفظی ومعنوی رموز ونکات جواب تک سینون مین محفوظ چلے آرہے تھے ان کو وہ صفحۂ قرطاس پر لائے۔ گو اس خدمت مین ان کے دوسرے معاصر بزرگ مثلاً اسحاق بن راہویہ، سفیان ثوری وغیرہ بھی شریک ہیں۔ اور ان مین سے بعض بزرگون کی تفسیرین تو آج تک موجود ہین۔

سفیان بن عینیہ کی تفسیر کے اس وقت موجود ہونے کا تو کوئی علم ہمین نہین ہے۔ مگر بعض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی تک وہ اہل علم مین متداول رہی اور اس کا فیض ہندوستان تک پہنچا تھا، محمد بن ابراہیم دیبلی (سندھ) جو تیسری صدی کے ہندوستانی عالم ہیں ان کے ذکر مین یہ فقرہ ملتا ہے،

یروی کتاب التفسیر لابن عینیہ[۱] یہ ابن عینیہ کی تفسیر کی روایت کرتے تھے،

خاندان | سفیان بن عینیہ غلام خاندان کے ایک فرد تھے۔ ان کے والد کا نام عینیہ اور دادا کا نام ابوعمران[۲] میمون تھا۔ ان کے والد والیٔ کوفہ خالد بن عبداللہ القسری کے عمال مین تھے[۳] مگر ۱۲۰ھ مین ہشام نے خالد کو معزول کر دیا اور ان کے بجائے یوسف بن عمر ثقفی کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔ یوسف کو

---

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۱ ص ۱، [۲] بعض اہل تذکرہ نے ابوعمران انکے دادا کا نام بتایا ہے، (ابن خلکان) اور بعض نے ابوعمران عینیہ کی کنیت بتائی ہے، (تہذیب) [۳] اس بارے میں اہل تذکرہ کے درمیان اختلاف ہے کہ ان کے دادا اعمال حکومت مین تھے یا والد، ابن سعد نے ان کے والد ہی کو لکھا ہے اور زیادہ قرین قیاس یہی ہے اس لئے ہم نے اس بیان کو ترجیح دی ہے،

خالد سے پرانی پرخاش تھی۔ اس لیے اس نے برسر اقتدار آتے ہی خالد کے عمال سے بدلہ لینا شروع کر دیا سفیان کے والد عینیہ بھی عتاب میں آئے مگر وہ کسی طرح چھپ کر کوفہ سے مع اہل وعیال مکہ آگئے اور جوار خدا میں پناہ لی، اور بعد میں یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اس وقت امام ابن عینیہ کی عمر ۱۳ سال تھی، ان کا خاندان اپنے علم وفضل کی وجہ سے ممتاز تھا۔ ان کے نو بھائی تھے جن میں پانچ صاحب علم وفضل تھے۔

ولادت اور تعلیم وتربیت

سفیان بن عینیہ کی ولادت ہشام کے عہد خلافت میں ۱۰۷ھ میں کوفہ میں ہوئی کوفہ اس وقت فقہاء ومحدثین کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ یہاں کی ہر مسجد مدرسہ تھی، اور ہر گھر سے قال اللہ اور قال الرسول کی آواز سنائی دیتی تھی۔ حتیٰ کہ ایوان حکومت کے تاجدار بھی اپنی تمام بے راہ رویوں کے باوجود اس آواز سے مانوس تھے۔ غرض اسی روح پرور ماحول میں امام کا نشو ونما ہوا۔ اور یہیں ان کی تعلیم وتربیت کا آغاز ہوا،

ائمہ میں بیشتر ایسے گذرے ہیں جن کے والدین غریب تھے یا ان کے سن شعور سے پہلے انتقال کر چکے تھے اس لئے ان میں بہت کم ایسے بزرگ ہیں جن کی تعلیم وتربیت کسی خاص نظم وترتیب سے ہوئی ہو۔ مگر امام سفیان بن عینیہ ان خوش قسمت لوگوں میں تھے جن کے والدین زمانہ تعلیم وتربیت میں زندہ تھے اور مالی اعتبار سے مطمئن بھی تھے اس لیے ان کی تعلیم باقاعدہ ہوئی۔

ابھی چار برس کی عمر تھی کہ حفظ قرآن کے لیے بٹھا دیا گیا، ۷ برس کی عمر میں اس سے فارغ ہو گئے حفظ قرآن کے بعد حدیث کی کتابت شروع کرا دی گئی۔ غالباً یہ اس لیے کیا گیا کہ کلام الٰہی کے ساتھ بچپن ہی میں ارشادات نبوی کا کچھ ذخیرہ بھی ان کے سینے میں محفوظ ہو جائے، یہ سلسلہ تقریباً ۱۵ برس کی عمر تک جاری رہا۔ اس عمر کو پہنچ جانے اور والدین کی پوری توجہ کے باوجود اب تک طبیعت میں حصول علم کا پورا شوق نہیں پیدا ہوا تھا۔ اس کے لیے ان کے والد ہمیشہ ان کو نصیحت کرتے اور احساس ذمہ داری دلاتے رہتے تھے، ان کی ایک نصیحت کے الفاظ تذکروں میں محفوظ ہیں۔ انھوں نے ایک دن کہا:

پیارے بیٹے! بچپن کا زمانہ ختم ہوا اور تم اب سن شعور کو پہونچے۔ اب پورے طور سے خیر کی طلب یعنی حصول علم دین میں لگ جاؤ۔ مگر اس راہ میں سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ اہل علم کی اطاعت و خدمت کی جائے۔ اگر تم ان کی اطاعت و خدمت کروگے تو علم و فضل کی دولت سے بہرہ مند ہوگے۔[1]

یہ نصیحت ان کے دل میں گھر گئی خود کہتے ہیں کہ میں نے والد کی اس نصیحت کو زندگی بھر حرز جان بنائے رکھا اور کبھی اس سے سرمو تجاوز نہ کیا۔

اس کی تصریح تو نہیں ملتی کہ یہ نصیحت کہاں کی مکہ میں یا کوفہ میں مگر قرین قیاس یہ ہے کہ نصیحت مکہ ہی میں کی گئی۔ اس لیے کہ ان کا خانوادہ مکہ سے کوفہ ۱۲۰ھ میں گیا۔ جب کہ ان کی عمر ۱۴ یا ۱۵ سال کی تھی اور خود ان کا بیان ہے کہ یہ ۱۲۲ھ سے بالالتزام مکہ کے ائمہ حدیث کی خدمت میں جانے لگے تھے۔ ظاہر ہے یہ التزام و احساس ذمہ داری ان میں پہلے نہیں تھا جب ہی تو ان کے والد نے یہ نصیحت کی تھی۔ اس لئے یہ نصیحت یقیناً مکہ میں کی گئی ہوگی۔

مکہ اس وقت ائمہ تابعین کا گہوارہ تھا۔ امام زہری، عمرو بن دینار، ابن جریج اور بہت سے سرآمد روزگار ائمہ قرآن و سنت کی مجالس درس یہاں برپا تھیں۔ والد کی نصیحت کے بموجب ان ائمہ اور خصوصیت سے امام زہری اور عمرو بن دینار کی مجالس درس میں شریک ہونے لگے۔ اور جب تک مکہ میں رہے ان سے جدا نہیں ہوئے۔[2] ۱۲۶ھ میں عمرو بن دینار کا انتقال ہوگیا جس سے یہ چشمۂ فیض تو بند ہوگیا مگر ابھی دوسرا سرچشمۂ علم جاری تھا کہ نہ جانے کیا اسباب ہوئے کہ یہ مکہ سے پھر کوفہ چلے گئے۔[3]

ذہانت اور شوق جستجو | بچپن ہی سے نہایت ذکی اور ذہین تھے۔ ان ائمہ کی خدمت میں ان کی ذہانت و ذکاوت کو مزید جلا ہوئی اور ان میں ایسی قوت نظری اور قوت تحقیق پیدا ہوگئی کہ

---

[1] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۲۴ [2] تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۷۱، [3] ایضاً ص ۱۸۳۔

بڑے بڑے ائمہ ان کا اعتراف کرنے لگے۔ ابن جریج جو ممتاز تبع تابعین میں ہیں۔ مکہ میں ان کی مجلسِ درس برپا تھی، ایک دن سفیان ان کی خدمت میں گئے۔ ابن جریج کوئی روایت بیان کر رہے تھے جس میں انھوں نے صحابی کے نیچے کے راوی کا نام نہیں لیا بلکہ یہ کہا کہ مجھ سے ایک شخص نے بیان کیا ہے کہ ابن عباسؓ یہ فرماتے ہیں۔ ابن عیینہ کو راوی کے نام نہ لینے کی وجہ سے خلش ہوئی اور انھوں نے اس کی تلاش کی۔ معلوم ہوا کہ وہ راوی ابھی زندہ ہے۔ تحقیق کے بعد وہ دوبارہ ابن جریج کے پاس پہونچے اتفاق سے اس دن بھی وہ اسی روایت کو دہرا رہے تھے جب انھوں نے یہ کہا کہ ایک شخص نے مجھ سے یہ بیان کیا ہے تو یہ بولے۔ ابوالولید اس کے راوی تو عبید اللہ بن ابی یزید ہیں، مقصد یہ تھا کہ آپ تحقیق کر لیتے تو سلسلہ سند کا ابہام دور ہو جاتا۔ ابن جریج یہ سن کر بولے

قد غصت علیہ یا غواص[1] — اے بحر تحقیق کے غواص تم نے ڈوب کر حقیقت دریافت ہی کر لی،

قوت حافظہ | خدا نے قوت حافظہ بھی غیر معمولی عطا کیا تھا۔ اپنی قوتِ حافظہ کے بارے میں خود ہی فرماتے تھے کہ

ماکتبت شیئاً قط الا شیئاً حفظتہ[2] — میں جس چیز کو ضبط تحریر میں لایا وہ مجھے ""

سفیان بن عیینہ کے اساتذہ کی فہرست بڑی لمبی ہے، صرف تابعین میں اسی سے زائد بزرگوں سے انھوں نے کسب فیض کیا تھا[3] چند مشاہیر کے نام یہ ہیں۔

امام زہری، امام شعبہ، مسعر بن کدام، عمرو بن دینار، ابو اسحاق السبیعی، محمد بن عقبہ، حمید الطویل، زیاد بن علاقہ، صالح بن کیسان وغیرہ۔

درس و تدریس | مکہ میں ۵-۶ برس رہنے کے بعد ۱۲۶ھ میں جب کہ ان کی عمر ابھی ۱۹-۲۰ برس

---

[1] تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۸۲، [2] ایضاً ص ۱۷۹، [3] ایضاً۔

کی تھی۔ مکہ سے اپنے آبائی وطن کوفہ چلے آئے۔ یہان بھی ائمۂ تابعین و تبع تابعین کی متعدد مجلسین قائم تھین۔ اور ان سب سے انھون نے استفادہ کیا تھا۔ مگر خاص طور سے وہ مسعر بن کدام کی صحبت مین زیادہ رہے، گو یہ خود اس وقت مرجعِ خلائق تھے، مگر انھون نے ابن عیینہ سے خواہش کی کہ وہ تحدیث روایت کا سلسلہ شروع کرین، سفیان بن عیینہ کے سینہ مین گو امام زہری اور عمرو بن دینار کی مرویات کے خزینے محفوظ تھے، مگر انھون نے کم سنی کی معذرت کی، مسعر بن کدام نے کہا کہ آپ کے پاس امام زہری اور عمرو بن دینار کا سرمایۂ روایات موجود ہو تو پھر آپ کم سنی کی پرواہ نہ کرنی چاہئے، مقصد یہ تھا کہ اس راہ مین عمر کی نہین بلکہ علم و فہم کی ضرورت ہوتی ہے اور اس سے آپ بہرہ ور ہین، غالباً انہی کے مشورے کے بعد انھون نے اپنا سلسلۂ درس شروع کیا۔

کوفہ یہ جس وقت پہونچے اُس وقت وہان سب سے وسیع حلقۂ درس امام ابو حنیفہؒ کا تھا، ان کو یہ فخر حاصل ہے کہ جب امام کو ان کی آمد کا علم ہوا تو انھون نے اپنے تلامذہ اور عام اہل کوفہ سے کہا کہ تمھارے پاس عمرو بن دینار کی مرویات کا حافظ آگیا ہے، چنانچہ لوگ ان کی مرویات سے اخذ و استفادہ کرنے کے لئے ان کے پاس آنے لگے۔ وہ خود کہتے ہین کہ مجھ کو جس نے سب سے پہلے محدث بنایا وہ امام ابو حنیفہ ہین[1]

کوفہ مین اس وقت امام اعمش اور امام شعبہ کے درس کا بھی ہر طرف چرچا تھا۔ مگر جب ابن عیینہ نے درس دینا شروع کیا تو ان ائمہ کے تلامذہ بھی ان کی مجلسِ درس مین شریک ہونے لگے۔ عبداللہ بن داؤد کہتے ہین کہ ہم لوگ امام اعمش کے درس مین شریک تھے کہ کسی نے آکر یہ اطلاع دی کہ سفیان بن عیینہ نے بھی تحدیث شروع کر دی ہے۔ چنانچہ ہم لوگ اعمش کی مجلس سے اٹھے تو ان کے درس مین شریک ہوئے۔ اہل تذکرہ ان کی جلالت علم کے ذکر مین اسی بات کا خاص طور سے

---

[1] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۷۷۔

ذکر کرتے ہیں کہ انھون نے امام اعمش کی زندگی ہی مین اپنی مجلس درس قائم کر دی تھی[1]

امام شعبہ اپنے تلامذہ سے کہا کرتے تھے کہ جس کو عمرو بن دینار کی مرویات مطلوب ہون اس کو ابن عیینہ کے پاس جانا چاہیے[2]

امام اعمش اور امام شعبہ ان کے شیوخ حدیث مین سے ہین۔ مگران دونون بزرگون نے بھی ان سے سماع حدیث کیا تھا، بغدادی نے لکھا ہے کہ ایک بار ابن عیینہ امام اعمش کی مجلس درس مین گئے اور پچاس حدیثین بیان کین، اسی طرح امام شعبہ کے بارے مین لکھا ہے کہ انھون نے ان سے سو روایتین سنی ہین[3]

سفیان بن عیینہ ہر سال زیارت حرمین کے لئے جاتے تھے، ان کے درس مین یون بھی طلبہ کا ہجوم رہتا تھا مگر حج کے زمانہ مین جب کہ سارے ممالک اسلامیہ کی آبادی مکہ مین سمٹ آتی تھی سماع حدیث کے لیے ان کے پاس ایک از د حام ہوتا تھا، بلکہ بہت سے تشنگانِ چشمۂ نبوت تو اسی غرض کے لیے سفر حج کی مشکلین برداشت کرتے تھے۔ امام ذہبی لکھتے ہین۔

فقد کان خلق یحجون والباعث	ایک مخلوق حج کے لیے اسی لئے جاتی تھی
لقاء ابن عیینۃ فیزدحمون علیہ	کہ سماع حدیث کے لیے، ابن عیینہ کی ملاقات
فی ایام الحج[4]	نصیب ہو چنانچہ حج کے زمانہ مین ان کے گرد
	ایک ازدحام ہوتا تھا۔

معاصرین مین ان کا علمی مقام

امام زہری اور عمرو بن دینار کے تلامذہ سارے ممالک اسلامیہ مین پھیلے ہوئے تھے۔ مگر ان ائمہ کے جو تلامذہ سب سے زیادہ قابل وثوق اور معتمد سمجھے جاتے تھے ان مین سفیان بن عیینہ بھی تھے۔ بلکہ بعض حیثیتون سے یہ سب میں ممتاز تھے، ابن المدینی کا

[1] بغدادی ج ۹ ص ۱۷۵، [2] ایضاً ص ۱۸۰، [3] ایضاً ج ۹ ص ۱۷۵، [4] تاریخ بغداد ج ۷ ص ۱۷۵، [5] تذکرہ ج ۱ ص

بیان ہے کہ

مافی اصحاب الزھری اتقن من ابن عیینہ[1] — زہری کے تلامذہ اور اصحاب میں سب سے قابل وثوق ابن عیینہ کی ذات تھی۔

ایک شخص نے ابن المدینی سے پوچھا کہ زہری کے تلامذہ میں مقدم کون ہے؟ بولے: تقدم تو مجھے حاصل ہے مگر ان کے اصحاب میں جن کے سماع میں شک نہیں کیا جاسکتا نہ ان پر کسی نے کلام کیا ہے اور نہ زبان طعن کھولی ہے، وہ سفیان بن عیینہ اور زیاد بن سعد ہیں[2]۔

ان ہی کا بیان ہے کہ میں نے سعید القطان سے پوچھا کہ امام زہری کے فیض یافتوں میں آپ معمر اور سفیان بن عیینہ میں سے کس کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ بولے سفیان کو[3]۔

اسی طرح عمرو بن دینار کی مرویات کے بھی یہ سب سے بڑے امین سمجھے جاتے تھے۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ سفیان عمرو بن دینار کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ یحییٰ بن معین نے ایک دن کہا کہ سفیان عمرو بن دینار کی مرویات کے سب سے بڑے حافظ تھے۔ کسی نے پوچھا کہ حماد بن زید سے بھی زیادہ، بولے ہاں۔ پھر پوچھا کہ اگر عمرو بن دینار کی کسی روایت میں سفیان ثوری اور سفیان بن عیینہ کے درمیان اختلاف ہو جائے تو آپ کس کو ترجیح دیں گے۔ بولے ابن عیینہ کو[4] اوپر امام شعبہ کا قول گذر چکا ہے کہ جس کو عمرو بن دینار کی روایات مطلوب ہوں وہ ابن عیینہ کے پاس جائے، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ تمام حفاظ حدیث کا اس امر پر اتفاق ہے کہ عمرو بن دینار کی مرویات کے سب سے زیادہ قابل وثوق راوی یہی ہیں[5]۔

فن حدیث میں ان کا اصلی مقام | اوپر جو اقوال نقل کئے گئے ہیں ان سے یہ اندازہ تو ہو گیا ہوگا کہ مکہ میں حدیث نبوی کا جو ذخیرہ تھا، اپنے زمانہ میں اس کے یہ سب سے بڑے محافظ سمجھے جاتے تھے مگر

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۱۹، [2] تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۸۰، [3] تاریخ بغداد جلد ۹ صفحہ ۱۸۰، [4] ایضاً
[5] تہذیب ج ۴ ص ۱۱۹

یہ ان کے علم و فضل کا ایک گوشہ تھا۔ حدیث مین ان کے اصلی مقام کو سمجھنے کے لئے ہمعصر علماء کے چند اور اقوال پر نظر ڈال لینی ضروری ہے۔

جہان تک روایتون کی کثرت اور ان کے حفظ اور ضبط تحریر میں لانے کا تعلق ہے، اس مین ان کو کوئی انفرادی امتیاز حاصل نہین تھا۔ ان کی مرویات کی کل تعداد ۲ ہزار بتائی جاتی ہے۔ انھون نے اپنا کوئی مجموعہ بھی نہین چھوڑا۔ اس کے برخلاف اتباع تابعین مین بہت سے بزرگون کے سینون مین ان سے کہین زیادہ روایتیں محفوظ تھین اور ان میں سے بہتوں نے اپنے مجموعہ ہائے حدیث بھی یادگار چھوڑے تھے۔ اتباع تابعین کے زمرہ مین جو چیز ان کو ممتاز کرتی ہے، وہ حدیث نبوی کا فہم تفسیر، حدیث کا ملکہ اور وثوق و اعتماد ہے، ان اوصاف مین کم لوگ ان کے ہمسر تھے۔ احمد بن عبداللہ کا بیان ہے کہ "ان کا شمار حکمائے حدیث مین ہوتا تھا گو کہ ان کی روایتین صرف سات ہزار تھین اور انھون نے کوئی حدیث کا مجموعہ بھی نہین چھوڑا۔"[1]

امام شافعی فرماتے تھے کہ مین نے ان کے جیسا حدیث کی بہتر تفسیر و تشریح کرنے والا نہین دیکھا۔[2] ان ہی کا قول ہے کہ علم مین جتنی پختگی اور وثوق و اعتماد ان کو تھا۔ مین نے کسی دوسرے مین نہین دیکھا۔[3]

عبدالعزیز بن ابی داؤد کہتے ہیں کہ سفیان ثوری کی مجلس مین جب اصحاب حدیث نہین ہوتے تھے تو وہ مرسل روایتوں کے بجائے مسند روایتین بیان کرتے تھے۔ مین جب ان مسند روایتون کو سن کر ان کی مجلس سے اٹھتا تو ابن عیینہ کے پاس جاتا اور ان روایتوں کو ان کے سامنے پیش کرتا۔ وہ کہتے کہ اس مین یہ غلطی اور اس مین یہ خامی ہے۔ پھر مین امام ثوری کے پاس آتا اور ان سے ابن عیینہ کی تنقید کا ذکر کرتا تو فرماتے کہ بھائی ابن عیینہ نے جو کہا ہے،

---

[1] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۲۴ [2] ایضاً [3] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۲۰۔

وہ صحیح ہے[1]

مشہور امام جرح و تعدیل عبدالرحمٰن بن مہدی سے کسی نے پوچھا کہ حدیث میں ابن عیینہ کا مقام کیا ہے، بولے، ان کو حدیث کی تفسیر اور حدیث کے متفرق الفاظ کے جمع کرنے میں مہارت حاصل تھی[2]۔ وہ حدیث کی تشریح میں بے جا تاویل کو پسند نہیں کرتے تھے، خصوصیت سے زجر و توبیخ کے سلسلہ میں ارشادات نبوی کی ایسی تاویل و تفسیر جو بے خوفی پیدا کر دے، غلط سمجھتے تھے، ایک بار فرمایا کہ اس حدیث

من غشنا فلیس منا و حمل علینا — جس نے فریب کیا وہ مسلمان نہیں ہے

فلیس منا۔ — جس نے مسلمانوں پر حملہ کیا وہ مسلمان نہیں[4]

کی تفسیر جو لوگ یہ کرتے ہیں کہ ایسا شخص ہمارے طریقہ اور حسن سیرت پر نہیں ہے وہ غلطی پر ہیں۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ ایسی احادیث جن میں معاصی پر سخت تنقید کی گئی ہو ان کی تفسیر کر کے ان تنبیہات کو ہلکا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تاکہ لوگوں کے اندر گناہوں سے بچنے کا زیادہ سے زیادہ جذبہ پیدا ہو، وہ گناہ کر کے بے خوف نہ ہو جائیں۔

متقدمین میں تو اس طرح کی تاویل کا جذبہ کم تھا۔ مگر متاخرین میں بہت سے لوگوں نے زجر و توبیخ کے سلسلہ میں بہت سے فرمودات نبوی کو اپنی تاویل و موشگافی سے اتنا بے اثر بنا دیا ہے کہ ان کا وہ مقصد ہی فوت ہو گیا جس کیلئے وہ فرمائے گئے تھے۔

ان کی روایتوں کا درجہ تمام ائمہ حدیث نے ان کی مرویات کو قابل وثوق اور لائق اعتنا سمجھا ہے۔ ابن المدینی کہتے ہیں کہ یہ اہل حجاز کی روایتوں کے سب سے بڑے عالم ہیں[1]۔ ابو حاتم کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے ان کا علم حجت ہے۔ ابن قطان کا قول ہے کہ یہ چالیس برس سے

---

[1] تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۸۱ [2] ایضاً ص ۱۸۲ [3] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۲۵ [4] تہذیب ج ۴ ص ۱۲۱۔

حدیث کے امام ہیں۔ عجلی کا بیان ہے کہ ان کی ذات قابلِ وثوق اور قابل اعتماد ہے[۱]، ابن المدینی کا بیان اوپر آچکا ہے کہ ان کی روایتوں میں شک نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ان پر کسی نے کلام کیا ہے[۲]، ان سے کسی نے پوچھا کہ حدیث میں کون شخص سب سے بہتر ہے، بولے مجھے تو ابن عیینہ سے بہتر کوئی آدمی نہیں ملا[۳]۔

جرح۔ اکثر اہل علم نے لکھا ہے کہ حدیث میں ان کی وثاقت اور اتقان و تثبت اتنا مسلّم ہے کہ توثیق و تعدیل سے ان کی ذات مستغنی ہے[۴]، مگر بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ آخری عمر میں ان کا حافظہ کمزور ہو گیا تھا۔ اس لیے ان کی عمر کے آخری دو سالوں میں ان سے جن لوگوں نے سماع حدیث کیا تھا ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا،

یحییٰ بن سعید القطان بیان کرتے ہیں کہ آخری عمر میں میں نے ان سے کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ آپ وہی روایتیں جن کو ایک بار بیان کر چکے ہیں اب بیان کرتے ہیں تو ان میں کچھ نہ کچھ زیادتی یا کمی ہو جاتی ہے۔ بولے پہلا ہی سماع ٹھیک ہے۔ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں، اسی بنا پر یحییٰ بن سعید نے جو ان کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ اعلان کر دیا تھا کہ ۱۹۷ھ کے بعد جن لوگوں نے ابن عیینہ سے سماع حدیث کیا ہے ان کی روایتوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اس لیے کہ آخری دو سالوں میں ضعف حافظہ کی وجہ سے ابن عیینہ کو روایتوں میں اشتباہ پیدا ہو جاتا تھا[۵]۔

اندازہ لگائیے کہ محدثین نے حدیث کی روایت اور اس کی حفاظت میں کتنی چھان بین اور تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے، ابن عیینہ جیسے مشاہیر ائمہ حدیث ہیں جن کی مرویات کو ایک خاص عمر کے بعد محدثین نے قبول نہیں کیا ہے۔

---

[۱] تہذیب الاسماء ج ۴ ص ۱۲۲ ص ۱۱۹ [۲] تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۸۰ [۳] ایضاً ص ۱۸۲۔

[۴] تہذیب ج ۴ ص ۱۲۲ [۵] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۲۰۔

پھر بھی کچھ اہل ہوس یہ کہتے ہیں کہ ذخیرۂ حدیث قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ حالانکہ اگر اس زمین پر سرمایۂ حدیث ناقابلِ اعتماد ہے تو دنیا کی کوئی تحریری دستاویز قابلِ اعتبار نہیں ہو سکتی۔

تفسیر میں ان کا مقام

تابعین کے عہد تک علم تفسیر کوئی الگ فن نہیں بنا تھا۔ نہ اب تک مخصوص طور سے اسی موضوع پر کسی نے کوئی تصنیف کی تھی۔ لیکن اتباع تابعین کے عہد میں جب بہت سے دینی علوم کی داغ بیل پڑی، اور انکی تدوین و ترتیب شروع ہوئی تو علم تفسیر بھی حدیث سے ایک الگ فن قرار پایا اور اس پر بہت سی کتابیں تصنیف ہوئیں۔

زمرۂ اتباع تابعین میں جن بزرگوں کو اس فن میں کوئی خصوصیت حاصل تھی، اور انھوں نے اپنی تحریری یادگاریں بھی چھوڑی ہیں، ان میں سفیان بن عیینہ بھی ہیں۔ ان کی قرآن فہمی کا صحیح اندازہ تو اس وقت لگایا جا سکتا تھا جب کہ ان کی کتاب سامنے ہوتی مگر اس وقت اس کے موجود ہونے کا کوئی علم نہیں ہے۔ ہمعصر علماء نے ان کی قرآن فہمی کے بارے میں جو رائے دی ہے، وہ یہ ہے:۔

امام احمد فرماتے ہیں کہ اہل علم میں ان سے زیادہ قرآن کا جاننے والا میں نے نہیں دیکھا،[1] ابن وہب کہتے ہیں کہ ما رایت اعلم بکتاب اللہ من ابن عیینہ۔ ابن عیینہ سے بڑا کتاب اللہ کا عالم میں نے نہیں دیکھا۔[2] عبدالرحمن بن مہدی سے کسی نے ان کے علم و فضل کے بارے میں سوال کیا۔ انھوں نے بہت سے اوصاف کا تذکرہ کرنے کے بعد یہ بھی کہا کہ

معرفتہ بالقرآن — ان کو قرآن کی معرفت بھی حاصل تھی،[3]

ایک روایت میں ہے کہ انھوں نے کہا کہ قرآن کی معرفت میں وہ سفیان ثوری سے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۲۰ [2] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۲۴ [3] تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۸۲۔

بڑھے ہوئے تھے،[1] ابتدا میں ذکر آچکا ہے کہ ان کی تفسیر تیسری صدی تک اہل علم میں متداول تھی اور اس کا فیض ہندوستان تک پہنچا تھا۔

تفقہ، | یہ اجتہاد و تفقہ کی دولت سے بھی بہرہ ور تھے، ان کے اجتہاد و تفقہ کے اندازہ کے لئے یہ بات کافی ہے کہ فقہ میں یہ امام شافعی کے استاد ہیں۔ امام احمد نے ان کو فقہا میں شمار کیا ہے، امام نووی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ

وھو احد اجداد الشافعیۃ	جن لوگوں نے شافعی طریقۂ تفقہ کی بنیاد
فی طریق الفقہ[2]	رکھی ہیں سفیان بن عیینہ ان کے اجداد میں

مقصد یہ ہے کہ شافعی فقہ میں اجتہاد و استنباط مسائل کے ساتھ حدیث نبوی کا جو حسین امتزاج ملتا ہے اس کے پیدا کرنے میں جن بزرگوں نے حصہ لیا ان میں سفیان بن عیینہ بھی تھے، ورنہ زمانہ کے لحاظ سے یہ امام شافعی سے متقدم تھے۔ بایں ہمہ علم و فضل فتوی دینے سے گریز کرتے تھے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ افتا کا جتنا مادہ ان میں موجود تھا میں نے کم لوگوں میں دیکھا مگر وہ اس سے اتنا ہی گریز بھی کرتے تھے[3]۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ فقہ کا کوئی مسئلہ جب ان کے سامنے آتا تھا تو عموماً میری طرف اشارہ کرکے کہا کرتے تھے، ان سے پوچھو۔[4]

اخلاق و کردار، | علم و فضل کے ساتھ سیرت و کردار میں بھی اسلامی زندگی کی صحیح تصویر تھے، ان کی زندگی نہایت سادہ تھی خصوصاً کھانے پینے میں ان کے ایک شاگرد ان کے یہاں آئے، انھوں نے دیکھا کہ ان کے آگے جو کی دو موٹی روٹیاں رکھی ہوئی ہیں۔ یہ دیکھکر شاید ان کو تعجب ہوا ہوگا اسی لئے فرمایا کہ چالیس سال سے یہی میری غذا ہے[5]۔ اس جو کی روٹی کی اہمیت

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۲۳۹ [2] تہذیب الاسماء ج ا ص ۲۲۵ [3] صفوۃ الصفوۃ ج ا ص ۲۱۶
[4] تہذیب الاسماء ج ا ص ۵۵۔ [5] ایضاً ص ۲۲۸۔

اس وقت زیادہ معلوم ہوگی جب عباسی دور کے تمدن کو سامنے رکھا جائے جس مین لوگ ستو بھی کھجور اور میودن کا استعمال کرتے تھے۔ مگر وہ اپنی سادگی کو بیحد چھپاتے تھے اسی وجہ سے شاید ان کے بارے میں لوگون کو شاید کچھ غلط فہمی تھی، انکے ایک شاگرد کہتے ہیں کہ ایک دن وہ مجھے گھر کے اندر لے گئے اور ایک گوشہ مین بٹھا دیا، اس کے بعد جو کی ایک موٹی روٹی نکالی، پھر فرمایا کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ اسے چھوڑو برسوں سے میری یہی غذا ہے[1] شاید اسی اخفا کی وجہ سے ان کی سیرت ذکر دار کے واقعات بہت کم تذکرون مین ملتے ہیں۔ خود فرماتے ہیں۔ کہ اگر آدمی کے ظاہر و باطن مین توافق ہو تو عدل ہے اور اگر باطن ظاہر سے اچھا ہو تو اس کی افضلیت کا کیا کہنا لیکن اگر ظاہر اچھا اور باطن برا ہو تو پھر یہ ظلم ہے[2] یعنی جو شخص ایسا کرتا ہے وہ اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔

کبھی ایوانِ حکومت کا رخ نہین کیا۔ ایک بار یمن مین وہان کے گورنر معن بن زائدہ سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے ان کو کچھ ہدیہ پیش کیا۔ اسے قبول تو کرلیا مگر پھر کبھی اس کی نوبت نہ آنے دی۔ امام ذہبی لکھتے ہیں کہ

ولم تتلطخ سفیان بعد بجوائزھم — اس کے بعد سفیان کبھی امراء کے تحائف سے ملوث نہین ہوئے۔

صوم وصلوٰۃ سے ان کو جو شغف تھا وہ تو تھا ہی مگر حج کعبۃ اللہ کا تو انھین عشق تھا۔ جب سے ہوش سنبھالا۔ اس وقت سے وفات تک شاید ہی کسی سال اس سعادت سے محروم رہے ہون۔

اہل تذکرہ لکھتے ہین کہ انھون نے ستر حج کئے تھے۔

---

[1] صفوۃ الصفوہ [2] ایضاً

ان کا معمول تھا کہ جب زیارت حرمین کے لئے جاتے تو خدا کی بارگاہ میں یہ دعا کرتے کہ خدایا دوبارہ پھر تو اس سے بہرہ مند کرنا۔ مگر ۱۹۶ھ میں جب آخری بار زیارت کے لیے گئے تو ان کا بیان ہے کہ خدا سے میں اتنی بار دعا مانگ چکا تھا کہ اس سال دعا مانگتے ہوئے مجھے شرم آئی، چنانچہ اسی سال ان کا انتقال ہو گیا۔[1]

حکیمانہ اقوال ان کی سیرت اور کردار کے واقعات اہل تذکرہ نے بہت کم لکھے ہیں مگر دوسروں کی سیرت و کردار کو نشو و نما دینے کے لئے ان کے بہت سے حکیمانہ اقوال کتابوں میں ملتے ہیں، ہم چند اقوال بیان نقل کرتے ہیں۔ اس آئینہ میں ان کی سیرت کے خد و خال بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ فرمایا زہد و تقویٰ صبر اور موت کے انتظار کا نام ہے۔ علم جب تم کو نفع نہ پہنچائے گا تو نقصان پہنچائے گا۔ جس کو عقل زیادہ ملتی ہے۔ عموماً اس کو روزی کم ملتی ہے۔[2] فرمایا کہ جو شخص صرف لوگوں کو دکھاوے کے لئے کوئی کام کرتا ہے تو خدا ایسے شخص پر غضب آلود ہوتا ہے۔

فرمایا کہ ضروریات زندگی کی طلب دنیا کی محبت نہیں ہے۔ فرمایا کہ اگر میرا دن کم عقلوں کی طرح اور میری رات جاہلوں کی طرح غفلت میں گذرے تو پھر میں نے جو علم حاصل کیا ہے وہ بے فائدہ ہے۔

جو لوگ اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان تعلق جوڑنے کا واسطہ ہیں وہ خدا کے یہاں سب سے بلند مرتبہ ہیں یعنی انبیاء اور ان کے بعد علماء۔

فرمایا جو شخص یہ سمجھے کہ میں فلاں سے بہتر ہوں تو اس نے غرور کیا اور ابلیس کو اس غرور ہی نے حضرت آدم کے سامنے سجدہ کرنے سے روکا تھا۔ جو شخص اپنی نفسانی خواہش کی بنا پر کوئی گناہ کرتا ہے تو اس سے توبہ کی امید رکھو اور جو شخص جذبۂ تکبر کے ساتھ کوئی معصیت کرتا ہے۔ تو اس کی

---

[1] تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۸۴ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۷۰۔

لعنت ہے، اس لئے ابلیس نے جذبۂ تکبر ہی سے نافرمانی کی تھی، اس لئے ملعون و مردود ہوا۔ (یعنی محض نافرمانی ہوتی تو اتنی سخت سزا نہ ملتی)

فرمایا کہ جو شخص علم اس لئے حاصل کرتا ہے کہ اس سے لوگوں کو نفع پہنچے اس کا درجہ خدا کے یہاں وہی ہے جو کسی ایسے غلام کا آقا کے یہاں ہوتا ہے جو وہی کام کرتا ہو جس سے آقا خوش ہو۔

فرمایا کہ جب کوئی عالم لاادری (میں نہیں جانتا) کہنا چھوڑ دیتا ہے تو وہ اپنی ہلاکت کا سامان کرتا ہے۔

فرمایا کہ نماز کی توقیر یہ ہے کہ مسجد میں اقامت سے پہلے آؤ۔ اسحٰق بن اسرائیل کہتے ہیں کہ میں نے سفیان کی زبان سے یہ بات سنی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ راہ حق پر چلو اور غلط روی نہ اختیار کرو خواہ راہ حق کے چلنے والے کتنے ہی کم کیوں نہ ہوں۔

فرمایا کہ ایام تین ہیں (کل گذشتہ یہ ہمارا صاحب حکمت اور معلم ہے جو اپنی حکمت آموزی چھوڑ جاتا ہے، آج یہ ایک بچھڑ جانے والا دوست ہے جس کی جدائی بڑی طویل ہے۔ یہ تمھارے پاس آتا رہتا ہے، مگر تم اس کے پاس نہیں جا سکتے، کل آیندہ اس کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ تم اس کو پا سکو گے یا نہیں؟

فرمایا کہ قیامت کے دن تین آدمیوں کو بڑی شدید حسرت و ندامت ہوگی، ایک وہ آقا جس کے غلام کا حسن عمل قیامت کے دن اس سے زیادہ ہوگا۔ دوسرے وہ مالدار جس نے مال جمع کیا مگر اس میں سے ایک چھوٹی کوڑی کسی کو نہ دی، اس کے مال کو جب اس کے ورثہ نے پایا تو راہ خدا میں صدقہ کر دیا، تیسرے وہ عالم جس نے اپنے علم سے نہ خود کوئی فائدہ اٹھایا اور نہ دوسروں کو کوئی فائدہ پہنچایا۔ مگر اس سے دوسروں نے علم حاصل کیا اور اس نے خود بھی فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچایا۔

ایک مجلس مین کوئی رقت آمیز بات ہوئی اس پر یہ رو پڑے، کسی نے پوچھا کہ دوسرے لوگ تو اس بات سے بے قرار نہین ہوئے، آپ کیون اس قدر بے خود ہوگئے۔ بولے جب آنسو گر جاتا ہے تو قلب کو سکون ہو جاتا ہے۔

کسی نے رضاے خداوندی کے بارے مین سوال کیا۔ فرمایا کہ اللہ سے راضی وہ شخص ہے کہ جو جس حال مین ہے، اس کے علاوہ دوسری حالت کی خواہش نہ رکھے۔ احنف بن قیس فرماتے ہین حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے کہ قبل اس کے کہ تمھیں کوئی ذمہ داری سونپی جائے دین کا فہم حاصل کرو، سفیان اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب آدمی کو دین کا فہم حاصل ہو گا تو وہ عہدہ اور سرداری کی طلب نہین کرے گا[1]

وفات | ۱۶۳ھ مین یہ کوفہ سے مستقل طور پر مکہ مکرمہ آ گئے اور عمر کے بقیہ ۳۵ سال ارض پاک مین بسر کئے۔ ۱۹۸ھ مین ان کا انتقال ہوا، اور حرم پاک کے مشہور قبرستان حجون مین سپرد خاک کئے گئے[2]

ابراہیم بن منذر نے ان کی وفات پر بڑا پر اثر و پر درد مرثیہ کہا،

---

[1] یہ تمام اقوال صفوۃ الصفوۃ جلد ۲ صفحہ ۱۳۱ تا ص ۱۳۵ سے لئے گئے ہیں۔ [2] ابن خلکان تاریخ بغداد

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ

حضرت عبداللہؒ بن مبارک زمرۂ تبع تابعین کے گلِ سر سبد ہیں۔ ان کی زندگی اسلام کا مکمل نمونہ اور اس کی چلتی پھرتی تصویر تھی، ان کا جذبۂ دینی اور شوقِ جہاد، ان کی فیاضی اور نرم خوئی، دنیا سے بے رغبتی اور احساسِ ذمہ داری ان کے سوانحِ حیات کے جلی عنوانات ہیں، ان کے ہاتھ میں کوئی مادی طاقت نہیں تھی، مگر انہی اخلاقی صفات کی وجہ سے اسلامی مملکت کے ہر فرد کے دل پر ان کی حکمرانی تھی، ایک بار وہ رقہ آئے، پورا شہر ان کی زیارت کے لیے ٹوٹ پڑا، اتفاق سے ہارون رشید اپنے خدم وحشم کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ محل سے اس کی بیوی یا اس کی لونڈی یہ تماشا دیکھ رہی تھی، اس نے پوچھا کہ یہ ہجوم کیسا ہے، لوگوں نے بتایا کہ خراسان کے عالم عبداللہ بن مبارک آئے ہوئے ہیں، یہ انہی کے مشتاقانِ دید کا ہجوم ہے، اس نے بے ساختہ کہا کہ ”حقیقت میں خلیفۂ وقت یہ ہیں نہ کہ ہارون کہ اس کے گرد پولیس اور فوج کی مدد کے بغیر کوئی مجمع نہیں ہوتا“!

نسب | عبداللہ بن مبارک کے والد مبارک ایک شخص کے غلام تھے۔ ان کی شادی اسی کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ اس وقت تک اسلامی معاشرہ میں عہدِ سعادت کے آثار باقی تھے، اس لیے نسبتِ نکاح کا معیار حسب ونسب نہیں بلکہ لڑکے کی صلاحیت اور اس کا دین وتقویٰ ہوتا تھا، مبارک چونکہ اس حیثیت سے ممتاز تھے اس لیے آقا نے اپنی لڑکی ان سے بیاہ دی، گو اس کی نسبتیں دوسری بڑی بڑی جگہوں سے بھی آرہی تھیں۔ مبارک کی جن خصوصیات کی بنا پر یہ شادی ہوئی، مختصراً ہم اس کا تذکرہ کرتے ہیں۔

مبارک نہایت دیانت دار و محتاط شخص تھے۔ آقا ان کے سپرد جو کام کرتا تھا۔ اس کو وہ نہایت دیانت داری اور اطاعت شعاری کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ آقا نے باغ کی نگرانی ان کے سپرد کر دی تھی، ایک بار اس نے ان سے کہا کہ ایک ترش انار باغ سے توڑ لاؤ وہ گئے۔ اور شیرین انار توڑ لائے، اس نے دوبارہ ان سے شیرین انار لانے کے لیے کہا تو وہ پھر ترش ہی انار توڑ لائے۔ آقا نے غصہ مین کہا تمھین ترش و شیرین انار کی بھی تمیز نہین؟ انھون نے کہا کہ "نہین"۔ اس نے وجہ پوچھی تو بتایا کہ آپ نے مجھے ترش انار کھانے کی اجازت تو دی نہین ہے۔ اس لئے مین اسکو کیسے پہچان سکتا ہون اس نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ بات صحیح ہے۔

مبارک کی اس غیر معمولی دیانتداری اور حق شناسی کا اس پر بہت اثر پڑا اور وہ ان کی بہت قدر و منزلت کرنے لگا۔

مبارک کے آقا کی ایک ناکتخدا لڑکی تھی جس کی . . شادی کے پیغامات ہر طرف سے آرہے تھے، لیکن غالباً وہ ان نسبتوں مین کوئی فیصلہ نہین کر پا رہا تھا۔ اس نے اس بارے مین ایک روز مبارک سے بھی مشورہ کیا کہ مبارک! مین اس لڑکی کی شادی کہان اور کس سے کرون؟ انھون نے کہا کہ

"عہد جاہلیت مین لوگ نسبت مین حسب یعنی عزت و شہرت اور نسب کو تلاش کرتے تھے۔ یہودیون کو مالداری کی جستجو ہوتی تھی اور عیسائی حسن و جمال کو ترجیح دیتے تھے۔ لیکن امت محمدیہ کے نزدیک تو معیار دین و تقویٰ ہے۔ آپ جس چیز کو چاہین ترجیح دین۔"

آقا کو ان کا یہ ایمان افروز اور دانشمندانہ جواب بہت پسند آیا۔ وہ اپنی بیوی کے پاس آیا اور اس سے کہا کہ "میری لڑکی کا شوہر بننے کے لئے مبارک سے بہتر کوئی دوسرا شخص نہین ہے"۔ بیوی بھی نیک بخت تھین، انھون نے بھی اس رائے کو پسند کیا اور آقا کی لڑکی سے ان کی شادی ہو گئی۔

لہ ابن خلکان شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۹۷۔

ولادت اور تعلیم | حضرت عبداللہ بن مبارک اسی باسعادت لڑکی کے بطن سے ۱۱۸ھ میں مرو میں پیدا ہوئے۔ ان کی کنیت ابو عبدالرحمن ہے، ان کا اصلی وطن مرو تھا۔ اس لئے وہ مروزی کہلاتے ہیں یہ مرو جہاں ان کی ولادت ہوئی مسلمانوں کا قدیم شہر ہے، افسوس ہے کہ یہ اس وقت روس کے قبضہ میں ہے۔ اس سرزمین سے جہاں اخلاق و روحانیت کے سینکڑوں چشمے ابلے اور اسلامی علم وتمدن کے صدہا سوتے پھوٹے اب وہاں مادیت ہی کا نہیں بلکہ دہریت کا سیلاب رواں ہے،

ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے متعلق بہت کم معلومات ملتے ہیں لیکن امام ذہبی کے بیان سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ ابتدائے عمر ہی سے طلب علم کے لئے سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے لگے تھے[۱]

اس وقت اسلامی مملکت کے کسی قصبہ اور کسی قریہ میں بھی علماء و فضلاء کی کمی نہیں تھی، مرو خراسان کا ایک معروف شہر تھا، اس کو اچھی خاصی مرکزیت حاصل تھی۔ اس لئے وہاں اہل علم کی کیا کمی ہو سکتی تھی۔ غالباً ابتدائی تعلیم و تربیت وہیں ہوئی۔ اس کے بعد اس زمانے کے عام مذاق کے مطابق علم حدیث کی طرف توجہ کی۔ اس کے لئے انھوں نے شام و حجاز، یمن و مصر اور کوفہ و بصرہ کے مختلف شہروں اور قصبوں کا سفر کیا اور جہاں سے جو جواہر علم ملے انھیں اپنے دامن میں سمیٹ لے گئے،

امام احمد فرماتے ہیں۔

> طلب علم کے لئے عبداللہ بن مبارک سے زیادہ سفر کرنے والا ان کے زمانے میں کوئی دوسرا موجود نہیں تھا، انھوں نے دور دراز شہروں کا سفر کیا تھا، مثلاً یمن، مصر، شام، کوفہ، بصرہ وغیرہ[۲]

ابو اسامہ فرماتے ہیں کہ

مارأیت رجلاً اطلب للعلم فی	میں نے عبداللہ بن مبارک سے زیادہ

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۰۔ [۲] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۸۶۔

الآفاق من ابن المبارک   کسی کو ملک در ملک گھوم کر طلب علم

(ج ا ص ۵۱ ۲ تذکرۃ الحفاظ)   کرنے والا نہیں دیکھا۔

یہ سفر آج کل کا نہین تھا کہ چند لمحون مین انسان نہ جانے کہان سے کہان پہنچ جاتا ہے بلکہ اس زمانے کے سفر کا ذکر ہے، جب لوگ پیدل یا اونٹ یا گدھون کے ذریعہ مہینون مین ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتے تھے۔ پھر راستون کی دشواریان تو الامان، الحفیظ، اور یہ کچھ عبد اللہ بن مبارک ہی کی خصوصیت نہ تھی، بلکہ سبھی اکابر ائمہ نے حصول علم مین دور دور کی خاک چھانی تھی۔

شیوخ کی تعداد

موجودہ زمانہ کی طرح اس وقت علم وفن نہ اس طرح مدون تھا۔ اور نہ ایک جگہ محفوظ، خصوصیت سے علوم دینیہ مین علم حدیث کا ذخیرہ تقریباً تمام ممالک اسلامیہ مین بکھرا ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حدیث کے سب سے پہلے حامل صحابہ کرام تھے۔ صحابہ کرام کی زندگی گوشہ گیری کی نہین بلکہ مجاہدانہ تھی، اس لئے وہ شوق جہاد اور دوسری دینی ضرورتون کی بنا پر تمام امصار وقصبات مین پھیل گیے تھے، وہ جہان پہونچتے تھے، وہان کے باشندے ان سے اکتساب فیض کرتے تھے اور آنحضرت صلعم کے قول وعمل اور آپ کی سیرت کو ان سے معلوم کرکے اپنے سینون اور سفینون مین محفوظ کرتے جاتے تھے، اب جن لوگون کو صرف عملی زندگی کے لئے حدیث نبوی کے ذخیرہ کے معلوم کرنے کی خواہش ہوتی تھی ان کو بہت زیادہ کدوکاوش کی ضرورت نہین تھی ان کے لئے ان کے دیار کے صحابہ کرام اور ان کے بعد وہان کے علماء وفضلاء کی زندگی کا دیکھ لینا بھی کافی تھا۔ مگر جو لوگ اس تمام بکھرے ہوئے جواہر ریزون اور شہ پارون کو یکجا مدون اور مرتب کر دینا چاہتے تھے کہ ان زندہ ہستیون کے اٹھ جانے کے بعد کہین یہ ذخیرہ ضائع نہ ہو جائے، ان کے لئے دور دور کی خاک چھاننی اور شہرون اور قصبون کیلئے زحمت سفر اٹھانی ناگزیر تھی، عبد اللہ بن مبارک ان ہی بزرگون مین تھے، . . . .

خود فرماتے ہیں۔

حملت عن اربع آلاف شیخ قرآت | مین نے چار ہزار شیوخ واساتذہ سے
عن الف منھم | فائدہ اٹھایا، اوران مین سے ایک ہزار سو روایت کی ہے۔

دوسری روایت مین ہے کہ

کتبت عن الف | مین نے ایک ہزار شیوخ کی روایتون کو لکھ لیا ہے۔

یعنی جن لوگون سے تحصیل علم کیا ان کی تعداد تو چار ہزار ہے، مگر ہر شیخ اس قابل نہین ہوتا کہ اس کے علم وروایت کو معیاری قرار دیا جائے اس لئے غایت احتیاط مین صرف ایک ہزار شیوخ کی روایت کو لکھنا پسند کیا اور اسی کو انھون نے دوسرون تک منتقل کیا،

عباس کہتے ہیں کہ ان کے آٹھ سو شیوخ سے تو مجھے ملاقات کا موقع ملا ہے[1]، ان کے بعض ممتاز اساتذہ کے نام لکھے جاتے ہین۔

(۱) امام ابوحنیفہ، یہ امام صاحب کے خاص شاگردوں مین ہیں۔ ان کو امام صاحب سے بڑی محبت اور انسیت تھی۔ فرماتے کہ مجھ کو جو کچھ حاصل ہوا وہ امام ابوحنیفہ اور سفیان ثوری کی وجہ سے حاصل ہوا، ان کے الفاظ یہ ہے۔

لولا ان اللہ تعالی اغاثنی | اگر اللہ تعالیٰ امام ابوحنیفہ اور سفیان
بابی حنیفۃ وسفیان کنت | ثوری کے ذریعہ میری دستگیری نہ کرتا تو

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۲۔

عام آدمیون کی طرح ہوتا۔[5]

مناقب کردری مین ابن مطیع کی روایت ہے کہ مین نے ان کو امام صاحب کے پاس کتاب الرائے کی قرءت کرتے ہوئے دیکھا، ان سے اچھی قرءت کرنے والا مین نے کسی کو نہین دیکھا۔[6]

امام ابوحنیفہ کی شان مین ان کے بہت سے اشعار منقول ہین خطیب نے ان مین سے چند اشعار نقل کیے ہیں۔[7]

(۲) ان کے دوسرے ممتاز شیخ امام مالک ہیں۔ امام مالک سے انھون نے موطا کا سماع کیا تھا، موطا کے متعدد نسخے ہیں، جن مین ایک کے راوی ابن مبارک بھی ہیں۔ امام مالک کے مشہور شاگرد یحییٰ بن یحییٰ اندلسی، امام مالک کی مجلس درس میں ابن مبارک کی ایک آمد کا ذکر ان الفاظ مین کرتے ہیں۔

ابن مبارک ایک بار امام مالک کی خدمت مین گئے تو امام مالک مجلس سے اٹھ گئے اور ان کو اپنے قریب بٹھایا۔ اس سے پہلے امام مالک کسی کے لئے مجلس درس کے لئے نہین اٹھے تھے جب ان کو بٹھا لیا تب درس کا سلسلہ جاری کیا۔ قاری پڑھتا جاتا تھا، جب امام مالک کسی اہم مقام پر پہنچتے تو ابن مبارک سے دریافت فرماتے کہ اس بارے مین آپ لوگون یعنی اہلِ خراسان کے پاس کوئی حدیث یا اثر ہو تو پیش کیجیے، عبداللہ بن مبارک غایت احترام مین بہت آہستہ آہستہ جواب دیتے۔ اس کے بعد وہ وہان سے اٹھے اور مجلس سے باہر چلے گئے (غالبًا یہ بات بھی استاد کے احترام کے خلاف معلوم ہوئی کہ وہ ان کی موجودگی مین کوئی جواب دین) امام مالک ان کے اس پاسِ ادب و لحاظ سے بہت متاثر ہوئے اور تلامذہ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "یہ ابن مبارک خراسان کے فقیہ ہیں۔"[8]

[5] تہذیب التہذیب ترجمہ امام ابوحنیفہ [6] کردری ج ۲ ص ۹۱، [7] تاریخ بغداد ج ۱۱ [8] تہذیب التہذیب ج ۵ ص

یہ واقعہ غالباً ان کی طالب علمی کے زمانہ کا نہیں ہے بلکہ اس وقت کا ہے، جب ان کی شخصیت مشہور و معروف ہو چکی تھی اور وہ ایک فقیہ اور محدث کی حیثیت سے جانے جا چکے تھے، اس لئے امام مالک ان کا اعزاز اسی حیثیت سے کر رہے تھے۔ اور وہ ایک شاگرد رشید کی طرح ان سے پیش آرہے تھے۔

ان ائمہ کے علاوہ ان کے چند معروف و ممتاز شیوخ کے نام یہ ہیں جن میں متعدد کبار تابعین ہیں۔

تابعین:۔ ہشام بن عروہ، سلیمان التیمی۔ یحییٰ الانصاری، حمید الطویل، اسمٰعیل بن ابی خالد، عبدالرحمٰن بن یزید، امام اعمش، موسیٰ بن عقبہ صاحب المغازی، ان تابعین کے علاوہ بیشمار اتباع تابعین سے استفادہ کیا تھا، چند ممتاز ائمہ کے نام حسب ذیل ہیں۔

سفیان بن ثوری، سفیان بن عیینہ، حماد بن سلمہ، مسعر بن کدام، شعبہ بن حجاج، امام اوزاعی، ابن جریج، لیث بن سعد، ابن ابی ذیب، سعید بن عروبہ، صالح بن صالح، عمرو بن میمون، معمر بن راشد وغیرہ۔

مسند درس | خود عبداللہ بن مبارک نہایت ذہنی و ذکی اور غیر معمولی قوت حافظہ کے مالک تھے، پھر ان کے شیوخ میں ہر فن کے استاد بلکہ امام موجود تھے، اس لئے وہ ان کے فیض صحبت اور اپنی صلاحیت سے جلد ہی ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہو گئے۔ اور علم و فن کے صدر نشین بنا دئے گئے۔ اور خلق خدا ان سے مستفید ہونے لگی۔ ان کی زندگی بالکل مجاہدانہ تھی اس لئے کہیں مستقل طور سے جم کر وہ مجلس درس قائم نہیں کر سکے، لیکن ان کا علم سفینہ کا مرہون منت نہیں تھا۔ بلکہ جو کچھ تھا وہ سینہ میں محفوظ تھا۔ اس لئے وہ جہاں کہیں اور جس حالت میں بھی رہتے ان کا علم ان کے ساتھ رہتا تھا گویا ان کی ذات ایک رواں دواں چشمۂ فیض تھی، جس سے تشنگان علم ہر آن اور ہر وقت استفادہ کر سکتے تھے۔ کبھی وہ کوفہ میں ہیں تو کبھی بصرہ میں۔ کبھی بغداد میں ہیں تو کبھی مصر اور رقہ میں، غرض وہ جہاں بھی رہے علم و فن سایہ کی طرح ان کے ساتھ ساتھ رہا،

بڑے بڑے شیوخ اور ان کے بعض اساتذہ تک ان سے سماع حدیث کے مشتاق رہتے تھے۔ حماد بن زید مشہور محدث ہیں۔ ابن مبارک ایک بار ان کی خدمت میں آئے۔ انھوں نے پوچھا کہاں سے آرہے ہو؟ بولے خراسان سے، پوچھا خراسان کے کس شہر سے۔ بولے مرو سے، مرو کا نام سن کر انھوں نے فوراً پوچھا، عبداللہ بن مبارک سے واقف ہو۔ جواب دیا کہ وہ آپ کے سامنے موجود ہے، حماد نے انھیں اپنے سینے سے لگا لیا[1]۔

سفیان ثوری ان کے استاد ہیں، ان سے کسی خراسانی نے کوئی مسئلہ دریافت کیا، انھوں نے فرمایا کہ تمھارے پاس مشرق و مغرب کے سب سے بڑے عالم عبداللہ بن مبارک موجود ہی ہیں، ان سے کیوں نہیں دریافت کرتے[2]۔

تلامذہ | گو کسی خاص جگہ ان کی مسند درس قائم نہیں تھی، مگر ایک خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا تھا۔ اور جہاں وہ جاتے تھے ان کے ساتھ اکتساب فیض کے لیے لوگوں کا ہجوم ہو جاتا تھا۔ ان کے تلامذہ کی صحیح تعداد بتانا مشکل ہے۔ امام ذہبی نے لکھا ہے کہ

حدث عنہ خلق لا یحصون من اہل الاقالیم[3]	ممالک اسلامیہ کے اتنے لوگوں نے ان سے فائدہ اٹھایا ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔

اسی طرح حافظ ابن حجر بعض ممتاز تلامذہ کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں ان سے ایک خلق کثیر نے استفادہ کیا تھا[4]۔

بعض ممتاز اور سرمایۂ ناز تلامذہ کے نام یہ ہیں۔

سفیان ثوری یہ ان کے استاد بھی تھے اور ان سے روایت بھی کرتے ہیں[5]۔ معمر بن راشد،

---

[1] خطیب جلد ۱۱ صفحہ ۱۵۷۔ [2] مناقب کردری جلد ۲ صفحہ ۲۵۰۔ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۳۴ [4] تہذیب ج ۵ ص ۳۸۵ [5] اس زمانہ میں عام دستور تھا کہ اصاغر اکابر سے اور اکابر اصاغر سے (بقیہ حاشیہ ص

ابو اسحاق الفزاری، عبد الرحمن بن مہدی یہ لوگ بھی ان کے استاد تھے، امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ سعید القطان فضیل بن عیاض، ابو داؤد الطیالسی سلیمان المروزی وغیرہ۔

علم حدیث سے شغف | ان کو تمام دینی علوم میں دستگاہ تھی۔ مگر علم حدیث کے حفظ و روایت سے انھیں خاص شغف تھا، جو وقت جہاد اور عبادت سے بچتا تھا۔ وہ اس مبارک کام میں صرف کرتے تھے، بسا اوقات حدیث کا ذکر خیر چھڑ جاتا تو پوری رات آنکھوں میں کٹ جاتی، ایک دن عشا کی نماز کے بعد علی بن حسن سے کسی حدیث کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی۔ ساری رات مسجد کے دروازے پر کھڑے کھڑے گذر گئی اور ان کو احساس بھی نہ ہوا[۱]۔

شغف بالحدیث کا یہ عالم تھا کہ گھر سے باہر بہت کم نکلتے تھے، کسی نے پوچھا کہ آپ ہمہ وقت مکان کے اندر بیٹھے رہتے ہیں وحشت نہیں ہوتی؟ فرمایا کہ وحشت کی کیا بات ہے؟ جب کہ مجھے اس تنہائی میں حضور اکرم اور صحابۂ کرام سے شرف صحبت کی دولت نصیب ہو۔

مقصد یہ تھا کہ میں جب ہر وقت حدیث نبوی اور آثار صحابہ کے مطالعہ اور غور و خوض میں لگا رہتا ہوں تو گویا میں ان کی صحبت میں بیٹھ کر ان سے بات چیت کرتا ہوں اور ان کی نشست و برخاست، رفتار و گفتار کا نقشہ ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے، پھر اس سے زیادہ ایک مسلمان کے لئے انس اور خوشی کی بات کیا ہو سکتی ہے؟

علم حدیث میں ان کا مرتبہ | علم حدیث میں ان کا مرتبہ ایک امام حدیث کا تھا، حدیث کی جتنی متداول کتابیں ہیں ان میں انکی روایات کثرت سے موجود ہیں، ان سے جو روایات مروی ہیں ان کی تعداد بیس اکیس ہزار بتائی جاتی ہے، ابن معین جو مشہور حافظ حدیث اور امام جرح و تعدیل ہیں، فرماتے ہیں کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۳) روایت کرتے تھے کہ ایک روایت کسی معمولی شاگرد کے پاس ایسی ہے جس کا علم استاد کو نہیں ہے اس سے استفادہ کرنے میں شیوخ کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے [۱] تہذیب اور مناقب کردری،

انھوں نے جو روایتیں کی ہیں ان کی تعداد بیس اکیس ہزار ہے۔[1]

لیکن کثرت روایت سے ان کی حدیث دانی کا پورا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، بلکہ اس کیلئے ضرورت ہے کہ ان کے معاصر ائمۂ حدیث اور بعد کے محدثین اور فقہا اور ائمۂ رجال کے خیالات معلوم کئے جائیں، اور اسی آئینہ میں ان کی حدیث دانی کے خط و خال دیکھے جائیں۔

ابو اسامہ کا قول ہے کہ وہ فن حدیث میں امیر المومنین تھے۔ عبد الرحمن بن مہدی جو ائمۂ اسماء الرجال میں ہیں، وہ فرماتے تھے کہ عبداللہ بن مبارک سفیان ثوری سے افضل تھے۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ لوگ آپ کی رائے کو صحیح نہیں سمجھتے، فرمایا کہ عام لوگوں کو ان کے علم کا اندازہ نہیں ہے، میں نے ابن مبارک جیسا کسی کو نہیں پایا، پھر کہا، میرے نزدیک ائمۂ حدیث چار ہیں، سفیان ثوری۔ امام مالک، حماد بن زید اور عبداللہ بن مبارک، ابو اسحاق فزاری کا قول ہے کہ وہ امام المسلمین تھے۔ احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ یہ حافظ حدیث اور اس کے عالم تھے۔ سفیان ثوری گو ابن مبارک کے استاد ہیں مگر ان کے علم و فضل کے معترف تھے۔ ایک بار ان کے سامنے کسی نے ابن مبارک کو یا عالم المشرق اے مشرق کے عالم کے لفظ سے مخاطب کیا، سفیان ثوری موجود تھے انھوں نے اس شخص کو ڈانٹا اور فرمایا کہ ان کو عالم المشرق والمغرب کہو

محدثین میں اگر کسی حدیث کے بارے میں اختلاف ہوتا تو عبداللہ بن مبارک کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ فضالہ فرماتے ہیں کہ فن کے محدثین کی خدمت میں میری آمد و رفت تھی۔ جب کسی حدیث کے بارے میں ان میں اختلاف ہوتا تو وہ لوگ کہتے تھے اچھا اس اختلاف کو طبیب حدیث کے پاس لے چلو، وہی اس کا فیصلہ کریں گے۔ اس طبیب سے مراد عبداللہ بن مبارک تھے۔[2]

حدیث کا احترام | حدیث نبوی ﷺ کا ان کے دل میں بیحد احترام تھا۔ اگر کسی سے اس کے خلاف

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۱۔ [2] یہ تمام اقوال تہذیب الاسماء اور تہذیب التہذیب سے لیے گئے ہیں۔

کوئی حرکت سرزد ہوجاتی تو خفگی کا اظہار کرتے تھے۔ ایک بار کوئی شخص دور سے سفر کرکے سماع حدیث کے لئے ان کے پاس آیا اور اسی وقت سماع کی درخواست کی، انھوں نے انکار کیا، وہ فوراً اٹھکر جانے لگا تو دوڑ کر اس کی سواری کی رکاب تھام لی، اس نے کہا کہ آپ نے حدیث کے سماع سے تو محروم رکھا، مگر میری سواری کی رکاب تھام رہے ہیں، فرمایا کہ ہاں میں اپنی ذات کو تو ذلیل کرسکتا ہوں مگر حدیث نبوی کی توہین مجھے گوارا نہیں[1]

غالباً اس نے بے موقع سوال کیا تھا یا سماع حدیث کا وہ اہل نہیں تھا، اس لئے سماع نہیں کرایا مگر عام انسانی اخلاق صرف کرنے سے گریز نہیں کیا۔

اسی طرح ایک شخص نے راستہ میں ان سے کسی حدیث کے بارے میں سوال کیا۔ انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور فرمایا کہ

لیس ھذا موضع حدیث[2] یعنی یہ موقع حدیث نبوی کی روایت وسماع کا نہیں ہے۔

امام کے بعض اصول حدیث

حضرت عبد اللہ بن مبارک کا عہد حدیث کی تدوین واشاعت کا خاص عہد تھا، اس لئے اس وقت ہر شخص اس خدمت کو اپنے لئے سرمایۂ افتخار سمجھتا تھا اخبرو حدثنا کی آواز گھر گھر گونج رہی تھی۔ ہر شہر بلکہ ہر قصبہ اور ہر بڑی بستی میں درس حدیث کی کئی کئی مجلسیں برپا تھیں لیکن جس قدر یہ سلسلہ عام اور وسیع تھا، اسی قدر حدیث کی نقل وروایت میں افراط وتفریط شروع ہوگئی تھی خصوصیت سے پیشہ ور واعظوں اور قصہ گویوں نے نہ جانے کتنی حدیثیں وضع کرڈالی تھیں، خلافت راشدہ کے زمانے تک حدیث کی روایت پر بڑی پابندی عائد تھی خصوصیت سے حضرت عمرؓ اس بارے میں بہت سخت تھے۔ اور . . . بڑے بڑے صحابہ کو اس پر تنبیہ کرتے رہتے تھے

---

[1] مناقب کردری ج ۲ ص ۱۷۳ [2] ایضاً۔

اور جب تک کوئی اپنی روایت کا دوسرا شاہد پیش نہین کرتا تھا وہ اسے قبول نہیں کرتے تھے، اور نہ اس روایت کو بیان کرنے کی اجازت دیتے تھے، مگر اس عہد راشد کے بعد جب دینی معاملات مین قانونی گرفت ڈھیلی ہوئی تو ہر کس و ناکس نے، روایت و تحدیث شروع کر دی۔ بنو امیہ کے زمانہ مین اس فتنہ نے کافی بال و پر نکالے۔ اس لئے اس وقت جو ائمۂ حدیث اور اس فن کے نبض شناس تھے ان کو اس فتنہ کے انسداد کی فکر ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ان کے ہاتھ مین قانون کی طاقت تو تھی نہین اس لیے انھون نے قرآن و حدیث اور صحابہ کے عمل کی روشنی مین ایسے اصول مرتب کئے جس سے اس فتنہ کا انسداد ہو سکے۔ چنانچہ انہی اصولون کے تحت بڑے بڑے راوی حدیث کی مرویات جانچی و پرکھی جانے لگین۔ جس نے بھی قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا لفظ زبان سے نکالا اس کی روایت کی صحت حتیٰ کہ اس کے ذاتی حالات تک کی تفتیش شروع ہو جاتی تھی جب تک اس کے ضبط، احتیاط، قوت حافظہ اور اس کی اخلاقی حالت کے متعلق پورا اطمینان نہین ہو جاتا تھا۔ ائمۂ حدیث نہ تو اس کی روایت ہی قبول کرتے تھے اور نہ اس کو قابل اعتماد اور ثقہ سمجھتے تھے۔ اس وقت اصول حدیث کا فن ہمارے سامنے مدون اور مرتب طور پر موجود ہے، ابتداً اس کی یہ شکل نہین تھی بلکہ ہر امام اور محدث نے اپنے علم و بصیرت کے مطابق کچھ اصول بنا لئے تھے جنھیں بعد مین مرتب و مدون کر دیا گیا۔ عبداللہ بن مبارک بھی ان بزرگون مین تھے جنھون نے حدیث کی روایت کے کچھ اصول مرتب کر لئے تھے، ان کے چند اصول درج ذیل ہیں۔

(۱) حدیث کے صحیح اور قابل حجت ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے تمام رواۃ ثقہ اور فقیہ ہون۔ فقیہ کے یہ معنی ہین کہ وہ الفاظ کی تاثیر، زبان کے قواعد و محاورات اور مطالب کے طرز ادا سے بخوبی واقف ہون۔ وہ احادیث جن کے رواۃ ثقہ ہون مگر فقیہ نہ ہون قابل حجت تو ہین لیکن قسم اول کی حدیثون سے کم رتبہ ہیں۔

(۲) قرب اسناد (یعنی راوی کا کم نہ ہونا) حدیث کی صحت وجودت کی دلیل نہین ہے، رواۃ کی تعداد خواہ کسی قدر ہو مگر یہ ضروری ہے کہ ان مین ہر ایک راوی ثقہ اور معتبر ہو۔

(۳) حدیث کے لائق احتجاج ہونے کے لیے یہ بات بھی ضروری ہے کہ راوی نے خود اس کو سنا ہو اور روایت کرتے وقت تک اس نے اس کو اچھی طرح محفوظ رکھا ہو۔

(۴) روایت بالمعنی کے قائل تھے۔ انما المیت یعذب ببکاء الحی[1] کو حدیث بالمعنی تسلیم کرتے تھے،

(۵) اصول درایت کو تسلیم کرتے تھے۔ لیکن بالعموم نہین بلکہ خاص حالتون مین۔

(۶) تدلیس یعنی راوی کا اپنے شیخ کا صراحۃً ذکر نہ کرنے کے سخت مخالف تھے۔

فقہ | فقہ کی مشق ومہارت انھون نے امام ابوحنیفہ کی خدمت مین بہم پہنچائی تھی، اس لئے انہین قدرے تفقہ بھی تھا۔ امام مالک ان کو خراسان کا فقیہ کہتے تھے، اسی طرح بعض دوسرے علماء بھی ان کے تفقہ کے معترف ہیں۔ مگر یہ مسلم ہے کہ حدیث مین ان کا جو مرتبہ تھا۔ تفقہ واجتہاد میں ان کو وہ درجہ حاصل نہین تھا۔ جو امام صاحب کے دوسرے تلامذہ کو حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شہرت فقیہ کی حیثیت سے کم اور محدث کی حیثیت سے زیادہ ہے۔ یحیی بن آدم جو ان کے معاصر اور خاص شاگرد ہیں فرماتے ہیں کہ۔

کنت اذا طلبت الدقیق من | جب بھی مین نے ان سے دقیق مسائل دریافت

---

[1] یعنی میت پر اس کے خاندان والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے۔ اس روایت کو حضرت عائشہؓ لفظاً و معنیً کسی طرح بھی تسلیم ہی نہین کرتی تھیں۔ ان کا استدلال قرآن کی اس آیت سے تھا۔ ولا تزر وازرۃ وزر اخری۔ وہ فرماتی تھیں کہ اس مین راویون سے غلطی ہو گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کچھ لوگ میت پر رو رہے تھے، آنحضرت صلعم نے دیکھا تو فرمایا کہ میت پر عذاب ہو رہا ہے۔ اور یہ رو رہے ہیں۔ رونا عذاب کا سبب نہین تھا مگر راویون نے اسے سبب قرار دے دیا۔

المسائل فلہ اجلد ۲ عمل ۲ کیے تو اس کا جواب ان سے نہیں

الیست منہ[1] پایا جس سے میں بہت مایوس ہوا۔

دوسرے علوم: عبداللہ بن مبارک حدیث وفقہ کے ساتھ تفسیر، سیرت، نحو و بلاغت، ادب و لغت، شعروشاعری غرض ان تمام اصنافِ علم سے واقف تھے جن کی ضرورت علوم دینیہ میں ہوتی ہے ایک بار ان کے تلامذہ مثلاً فضیل بن عیاض، مخلد بن حسین وغیرہ جمع ہوئے اور آپس میں طے کیا کہ او عبداللہ ابن مبارک کی علمی وعملی لیاقتوں اور صلاحیتوں کو شمار کریں۔ پھر ان سے ہر ایک نے ان کی کچھ نہ کچھ خصوصیات کا ذکر کیا پھر سب نے متفقہ طور پر ان کے بارے میں کہا کہ

جمع العلم والفقہ والادب والنحو واللغۃ والشعر والعربیۃ والفصاحۃ۔[2]

وہ علم وفقہ، ادب ونحو، لغت وشاعری عربی ادب اور فصاحت کے جامع تھے۔

اس وقت شعروشاعری عام طور پر سرتا سر رندی وہوسناکی کا مظہر بن گئی تھی۔ شعراء یا تو داد وتحسین حاصل کرنے کے لئے غزل کہتے تھے یا مادی فائدے سمیٹنے کے لیے امراء وسلاطین کی مدح سرائی وقصیدہ گوئی کرتے تھے، مگر اس کے باوجود کچھ لوگ ایسے موجود تھے جو اخلاقی شاعری کے دیدبان تھے۔

عبداللہ بن مبارک بھی شعروشاعری کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے اور کبھی کبھی کچھ کہہ بھی لیا کرتے تھے ان کے جو اشعار خطیب بغدادی اور کردری وغیرہ نے نقل کئے ہیں وہ اخلاقی تعلیمات سے پر ہیں۔

---

[1] مناقب کردری جلد ۲ صفحہ ۳۰۱، وتذکرہ الحفاظ جلد اصفحہ ۲۵۱ یحیی بن آدم نے اپنی کتاب الخراج میں تقریباً ۶۰ روایتیں ابن مبارک سے کی ہیں اس لئے اس سلسلہ میں ان کا بیان قابل قدر ہے۔ [2] تہذیب الاسماء۔

چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

اذا رافقت فی الاسفار قوماً — فکن لھم کذی الرحیم الشفیق

جب تم کسی کے رفیق سفر ہو تو — اس کے ساتھ اس طرح پیش آؤ جیسے اپنے بھائی بند کے ساتھ پیش آتے ہو

متی تاخذ تعنفھم تولوا — وتبقی فی الزمان بلا صدیق

اگر تم اپنے لحاظ کے ساتھ سخت رویہ رکھوگے تو — تو اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمھارا کوئی دوست نہیں رہ جائے گا

قد یفتح المرء حانوتاً لمتجره — وقد فتحت لک الحانوت بالدین

لوگ اسباب تجارت کیلئے دوکان کھولتے ہیں — اور تو نے دین فروشی کی دکان کھول رکھی ہے

بین الاساطین حانوت بلا غلق — تبایع اموال المساکین

یہ دوکان (مسجد کے) کھمبوں کے درمیان ہے جس میں تالا لگانے کی ضرورت نہیں، جس کے ذریعہ غربا کی دولت سمیٹی جارہی ہے

صیّرت دینک شاھیناً تصید بہ — ولیس یفلح اصحاب الشواھین

تم نے شکار کرنے کیلئے دین کو شاہین بنا رکھا ہے — مگر یاد رکھو کہ ایسے شاہیں باز فلاح نہیں پاسکتے

ان اشعار میں ان دنیادار اور علما و اور فقہاء کی زندگی کی تصویر کھینچی گئی ہے جنہوں نے مسند درس کو دولت و وجاہت کے حصول کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔

عبادت و تقویٰ اور عادات و اخلاق عبد اللہ بن مبارک عبادت و ریاضت، زہد و تقویٰ اور اپنے عادات و اخلاق میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے نمونہ تھے صحابہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ

فی اللیل رھبان وفی النھار فرسان — رات میں راہبوں کی طرح عبادت کرتے تھے، اور دن میں شہسوار بنکر میدان کارزار میں نظر آتے تھے

ابن مبارک اس خصوصیت کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ اسی بنا پر سفیان بن عیینہ فرماتے تھے کہ

نظرت فی امر الصحابۃ فما رأیت — میں نے صحابہ کے حالات پر غور کیا تو صحبت

لهم فضلا علی ابن المبارک — بنوتؐ کے علاوہ اور کسی چیز میں ابن مبارک

الا لصحبتهم النبی صلی اللہ علیہ وسلم — کو ان سے کم تر نہیں پایا۔

ظاہر ہے کہ صحبت نبوی صحابہؓ کا اتنا بڑا فضل ہے کہ اس میں نہ تو ان کا کوئی شریک و سہیم ہوا اور نہ اس میں کوئی ان کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتا ہے، مگر اپنے اخلاق و کردار کے لحاظ سے امت میں ان کے بعد بہت سے ایسے افراد پیدا ہوتے رہے ہیں جو ان کی صحیح تصویر تھے، انہی میں ابن مبارک بھی تھے ہم مختلف عنوانوں کے تحت مختصر طور سے ان کی زندگی کے ان اخلاقی اوصاف کی یہاں وضاحت کرتے ہیں۔

عبادت و تقوی — عبادت اور تقوی میں ضرب المثل تھے، ابونعیم نے حلیۃ الاولیا میں اور امام شعرانی نے طبقات الکبریٰ میں ان کا شمار زہاد و تبع تابعین میں کیا ہے، سفیان ثوری جن کی جلالت پر ایک زمانہ متفق ہے وہ فرماتے تھے کہ میں نے کوشش کی کہ عبداللہ بن مبارک جیسی محتاط زندگی گزاروں تو میں چند دن بھی نہ گذار پایا[1]، تمام اہل تذکرہ فرماتے ہیں کہ وہ زہد و ورع، عبادت اور قیام لیل میں آپ اپنی مثال تھے، اسمٰعیل بن عیاش فرماتے ہیں کہ کوئی نیک خصلت ایسی نہیں ہے جو ان میں موجود نہ رہی ہو[2]۔

احساس ذمہ داری — ایک بار شام میں کسی شخص سے قلم مستعار لیا، اتفاق سے قلم اس شخص کو واپس کرنا بھول گئے، جب مرو پہنچے تو قلم پر نظر پڑی، مرو سے شام پھر واپس گئے اور قلم صاحب قلم کو واپس کیا[3]۔

تنہا یہ واقعہ ان کی اخلاقی زندگی کا بہترین مظہر ہے اور دنیا کی اخلاقی تاریخ کا غیر معمولی واقعہ ہے۔ مرو شام سے سیکڑوں میل دور ہے، اور پھر یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب رسل و رسائل کے ذرائع صرف گھوڑے اونٹ اور خچر ہوتے تھے۔

خشیت الٰہی — اس زہد و ورع کے ساتھ آخرت کی بازپرس سے ہر وقت لرزاں رہتے تھے، انھوں نے

---

[1] صفوۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۱۱۱ [2] تہذیب ج ۵ ص ۳۸۵ [3] ایضاً [4] کردری ج ۲ ص ۱۷۹

زہد و ورع پر ایک کتاب لکھی تھی۔ جب اس کو طلبہ کے سامنے پڑھتے تھے تو ان پر اس قدر رقت طاری ہو جاتی تھی کہ بول نہیں سکتے تھے۔

قاسم بن محمد فرماتے ہیں کہ میں عبداللہ بن مبارک کے ساتھ اکثر سفر میں رہتا تھا۔ میرے دل میں خیال ہوا کہ آخر کس بنا پر ان کو اتنا فضل و شرف اور قبول عام حاصل ہے۔ جس طرح وہ نماز پڑھتے ہیں ہم بھی نماز پڑھتے ہیں۔ جتنے روزے وہ رکھتے ہیں، ہم بھی ان سے کم روزہ نہیں رکھتے، وہ حج کرتے ہیں ہم بھی حج کرتے۔ وہ جہاد میں شرکت کرتے ہیں اس شرف میں ہم بھی ان سے پیچھے نہیں ہیں، کہتے ہیں کہ ایک بار ہم لوگ شام جا رہے تھے۔ راستہ میں رات کو کہیں ٹھہرے، سب لوگ رات کا کھانا کھا رہے تھے کہ یک بیک چراغ گل ہو گیا۔ ایک آدمی چراغ جلانے کے لئے اٹھا، چراغ جلا کر وہ واپس ہوا تو ہم نے دیکھا کہ عبداللہ بن مبارک کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہے۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اسی (خشیت الہٰی کی) وجہ سے ان کو یہ فضل و شرف حاصل ہے، پھر فرماتے ہیں غالباً چراغ گل ہونے پر اندھیرا ہو گیا، اور اس سے یکگونہ ہم لوگوں پر جو گھبراہٹ طاری ہوئی اس چیز نے ان کو قبر و قیامت کی یاد دلادی اور ان پر رقت کی یہ کیفیت طاری ہو گئی۔[۱]

امام احمد ابن حنبل فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو رفعت دی تھی وہ ان کی اس باطنی کیفیت کی بنا پر تھی جو ان کے لیے مخصوص تھی۔[۲]

اخلاق و عادات ان کا یہ زہد و اتقاء صرف عبادات ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ ان کے اخلاق و کردار اور ان کے معاملات میں بھی اس کا پورا اثر نمایاں تھا۔

مہمان نوازی مہمان نوازی اسلامی زندگی کی ایک امتیازی خصوصیت ہے، اس میں وہ معروف تھے۔ ان کا دستر خوان ان کے احباب، اعزہ، پڑوسی اور اجنبی سب کے لیے کھلا رہتا تھا، خوان یغما

---

[۱] صفوۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۱۲۱۔ [۲] ایضاً

وہ کبھی بغیر مہمان کے کھانا نہین کھاتے تھے، اس بارے مین کسی نے ان سے پوچھا تو فرمایا کہ مہمان کے ساتھ جو کھانا کھایا جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا حساب نہیں لیتا، سال کے بیشتر حصہ مین وہ روزہ رکھتے تھے جن دن وہ روزہ سے ہوتے اس دن دوسرون کو عمدہ عمدہ کھانا پکوا کر کھلاتے، ابواسحاق کا بیان ہے کہ کسی سفر جہاد یا حج میں جا رہے تھے۔ تو ان کے ساتھ دو اونٹنیوں پر بھنی ہوئی مرغیاں لدی ہوئی تھیں۔ یہ سب سامان ان مسافرون کا تھا جو ان کے ہمسفر تھے[1]۔

ادب اور حسن معاشرت ادب اور حسن معاشرت کا نمونہ تھے۔ فرماتے تھے کہ ادب و حسن معاشرت دین کا دو حصہ ہے، حدیث کی مجلس مین ان کا یہ ادب دیکھنے کے قابل ہوتا تھا، یون تو عام مجلسون مین بھی وہ خلاف اسلام کوئی فعل نہین دیکھ سکتے تھے۔ ایک بار مجلس مین کسی شخص کو چھینک آئی۔ اس نے الحمد للہ نہین کہا۔ آپ کچھ دیر منتظر رہے پھر اس سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ بھائی! جب چھینک آئے تو کیا کہنا چاہیے، اس نے کہا کہ الحمد للہ۔ آپ نے جواب مین یَرْحَمُكَ اللّٰه کہا، اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اس شخص کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور دوسرون کو اتباعِ سنت کی ترغیب ہو۔

ذریعۂ معاش اسلاف مین بیشمار ایسے لوگ گزرے ہیں۔ جن کا ذریعۂ معاش صنعت و حرفت یا تجارت تھا۔ جب تک اسلامی زندگی کے نمایان آثار باقی تھے اس وقت تک اس چیز کو کم درجہ یا معیوب نہین سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ امت کے بلند تر افراد حرفہ و پیشہ ہی اختیار کرنا پسند کرتے تھے، عبداللہ بن مبارک نے بھی تجارت کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا تھا، ان کا تجارتی کاروبار بہت وسیع تھا۔ تجارت کی وسعت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک لاکھ درہم سالانہ صرف فقراء پر خرچ کرتے تھے عموماً وہ خراسان سے سامانِ تجارت حجاز لاتے اور وہیں فروخت کرتے تھے[2]۔

تجارت کا مقصد مگر یہ تجارت محض حصولِ زر یا دنیا طلبی کے لیے نہین تھی، بلکہ اس کا مقصد ہی تھا

---

[1] طبقات شعرانی۔ [2] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۱۶۰۔

جو اسلام نے مقرر کیا ہے فضیل بن عیاض نے ایک روز ان سے کہا کہ آپ ہم لوگوں کو تو زہد وقناعت اور دنیا سے بے رغبتی کی ترغیب دیتے ہیں اور خود قیمتی قیمتی سامانوں کی تجارت کرتے اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ

اے فضیل یہ تجارت اس لئے کرتا ہوں کہ اس سے اپنی ذات کو مصائب سے اپنی عزت کو ذلت سے بچا سکوں اور خدا کی اطاعت میں اس سے مدد لوں اور اللہ تعالیٰ نے جو مالی حقوق میرے ذمہ ڈالے ہیں، ان کی طرف میں سبقت کروں اور انھیں بخوبی پورا کر دوں[1]،

ایک بار فضیل بن عیاض سے فرمایا[2]

لولا انت واصحابک ما اتجرت — اگر تم اور تمھارے ساتھی نہ ہوتے تو میں تجارت نہ کرتا،

یعنی میں تمھیں لوگوں کے لیے یہ پریشانی اٹھاتا ہوں۔

ایسے علما، اور طلبا، کی ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر امداد کرتے تھے، جو دینی علوم کے حصول یا درس وتدریس میں لگے ہوتے، مگر معاشی حیثیت سے پریشان ہوتے ان لوگوں کی مدد کو سب کاموں پر مقدم رکھتے تھے، چنانچہ اس کے لئے وہ ہزاروں روپیے اپنے شہر سے باہر بھیجتے تھے، بعض لوگوں نے ان سے شکایت کی کہ آپ اپنا مال اپنے شہر میں اس فراوانی کے ساتھ نہیں خرچ کرتے جس فراوانی کے ساتھ باہر بھیجتے ہیں، جواب میں فرمایا۔

میں ان لوگوں پر مال خرچ کرتا ہوں جن کے علم، فضل اور صداقت و دیانت سے بخوبی واقف ہوں، وہ علم دین کی طلب و اشاعت میں لگے ہوئے ہیں مگر ان کی ذاتی اور دخانگی) ضرورتیں بھی ہیں، اگر یہ لوگ ان کے پورا کرنے میں لگ جائیں تو علم ضائع ہو جائیگا اور اگر ہم ان کی مدد کرتے ہیں تو ان کے ذریعہ علم (دین کی) اشاعت ہوتی رہے گی، اور منصب نبوت کے اختتام کے بعد علم دین کی اشاعت سے بڑھکر دوسرا کوئی کام نہیں ہے[3]

[1] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۱۶۰ [2] تہذیب ج ۵ ص ۳۸۶ [3] تاریخ بغداد ج ۱ ص ۱۶۰

عام فیاضی | ان کی سخاوت و فیاضی صرف اہل علم ہی تک محدود نہین تھی، بلکہ اس سے ہر خاص و عام فائدہ اٹھاتا تھا، چند واقعے ملاحظہ ہون۔

ایک شخص سات سو درہم کا مقروض تھا، کچھ لوگون نے ابن مبارک سے کہا کہ آپ اس کا قرض ادا کردین، انھون نے منشی کو لکھا کہ فلان شخص کو سات ہزار درہم دیدئے جائیں، یہ تحریر لیکر مقروض ان کے منشی کے پاس پہنچا، اس نے خط پڑھکر حامل رقعہ سے پوچھا کہ تم کو کتنی رقم چاہیئے، اس نے کہا کہ مین سات سو کا مقروض ہون اور اسی رقم کے لئے لوگون نے ابن مبارک سے میری سفارش کی ہے، منشی کو خیال ہوا کہ ابن مبارک سے سبقت قلم ہوگئی ہے اور وہ سات سو کے بجائے سات ہزار لکھ گئے ہین، منشی نے حامل رقعہ سے کہا کہ خط مین کچھ غلطی معلوم ہوتی ہے، تم بیٹھو مین ابن مبارک سے دوبارہ دریافت کرکے تم کو رقم دیتا ہون، اس نے ابن مبارک کو لکھا کہ خط لانے والا تو صرف سات سو درہم کا طالب ہے اور آپنے سات ہزار دینے کی ہدایت کی ہے، سبقت قلم تو نہین ہوگئی ہے؟ انھون نے جواب مین لکھا کہ جس وقت تم کو یہ خط ملے اسی وقت اس شخص کو تم چودہ ہزار درہم دے دو، منشی نے ازراہ ہمدردی ان کو دوبارہ لکھا کہ اگر اسی طرح آپ اپنی دولت لٹاتے رہے تو جلد ہی سارا سرمایہ ختم ہوجائے گا، منشی کی یہ ہمدردی اور خیر خواہی ان کو ناپسند ہوئی اور انھون نے ذرا سخت لہجہ مین لکھا کہ اگر تم میرے ماتحت اور مامور ہو تو مین جو حکم دیتا ہون اس پر عمل کرو اور اگر تم مجھے اپنا مامور و محکوم سمجھتے ہو تو پھر تم آکر میری جگہ پر بیٹھو تا کہ اس کے بعد جو تم حکم دوگے مین اس پر عمل کرون گا، میرے سامنے مادی دولت و ثروت سے زیادہ قیمتی سرمایہ آخرت کا ثواب اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد گرامی ہے جس مین آپنے فرمایا ہے کہ جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کو اچانک اور غیر متوقع طور پر خوش کردے گا اللہ تعالیٰ اسے بخش دے گا، اس نے مجھ سے سات سو درہم کا مطالبہ کیا تھا مین نے سوچا کہ اس کو سات ہزار

ملیں گے تو یہ غیر متوقع رقم پاکر وہ بہت زیادہ خوش ہوگا، اور فرمان نبوی کے مطابق میں ثواب کا مستحق ہوں گا، دوبارہ رقعہ میں ۴ہزار انھوں نے اسلیے کرایا کہ غالباً لینے والے کو ۳ہزار کا علم ہوچکا تھا اسلیے اب یہی رقم اوسکے لیے غیر متوقع ہوسکتی تھی[۱]

محمد بن عیسی کا بیان ہے کہ ابن مبارک طرطوس (شام) اکثر آیا کرتے تھے، راستہ میں رقہ پڑتا تھا، یہاں وہ جس سرائے میں قیام کرتے تھے، اس میں ایک نوجوان بھی رہا کرتا تھا جب تک انکا قیام رہتا یہ نوجوان ان سے سماع حدیث کرتا اور ان کی خدمت میں لگا رہتا تھا، ایک بار یہ پہنچے تو اس کو نہیں پایا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ قرض کے سلسلہ میں قید کردیا گیا ہے، انھوں نے قرض کی مقدار اور صاحب قرض کے بارے میں معلوم کیا تو پتہ چلا کہ فلاں شخص کا وہ دس ہزار کا مقروض تھا اس نے دعوی کیا تھا اور عدم ادائیگی کی صورت میں وہ قید کردیا گیا، عبداللہ بن مبارک نے قرض خواہ کو تنہائی میں بلایا اور اس سے کہا کہ بھائی تم اپنے قرض کی رقم مجھ سے لے لو اور اس نوجوان کو رہا کرادو یہ کہکر اس سے یہ قسم بھی لی کہ وہ اس کا تذکرہ کسی سے نہ کرے گا، اس نے اسے منظور کرلیا ادھر آپ نے اس کی رہائی کا انتظام کیا اور اسی رات رخت سفر باندھکر وہاں سے روانہ ہوگئے، نوجوان رہا ہوکر سرائے میں پہنچا تو اس کو آپ کی آمد و رفت کی اطلاع ملی، اس کو ملاقات نہ ہونے کا اتنا رنج ہوا کہ اسی وقت طرطوس کی طرف روانہ ہوگیا، کئی منزل کے بعد آپ سے ملاقات ہوئی تو آپنے اس کا حال دریافت کیا۔ اس نے اپنے قید ہونے اور رہا ہونے کا ذکر کیا۔ آپنے پوچھا رہائی کیسے ہوئی، بولا کہ کوئی اللہ کا بندہ سرائے میں آکر ٹھہرا تھا، اسی نے اپنی طرف سے قرض ادا کرکے مجھے رہا کرادیا، مگر میں اسے جانتا نہیں فرمایا کہ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس مصیبت سے تمھیں نجات ملی، محمد بن عیسی کا بیان ہے کہ ان کی وفات کے بعد قرض خواہ نے اس واقعہ کو لوگوں سے بیان کیا[۲]

ان کی زندگی کا ایک خاص معمول زیارت حرمین بھی تھا۔ قریب قریب ہر سال اس سعادت کو

---

[۱] صفوۃ الصفوہ ج ۴ ص ۱۱۸ - [۲] ایضاً ص ۱۱۷

حاصل کرنے کی کوشش کرتے سفرِ حج کے موقع پر ان کا معمول تھا کہ سفر سے پہلے اپنے تمام رفقائے سفر سے کہتے کہ اپنی اپنی رقم سب لوگ میرے حوالہ کر دیں جب وہ لوگ حوالہ کر دیتے تو ہر ایک کی رقم کو الگ الگ ایک ایک تھیلی میں ہر ایک کا نام لکھ کر صندوق میں بند کر دیتے اور پورے سفر میں جو کچھ خرچ کرنا ہوتا وہ اپنی جیب سے کرتے، ان کو اچھے سے اچھا کھانا کھلاتے، ان کی دوسری ضروریات پوری کرتے۔ جب فریضۂ حج ادا کر کے مدینہ منورہ پہنچتے تو رفقا سے کہتے کہ اپنے اہل وعیال کے لئے جو چیزیں پسند ہوں خرید لیں، سفرِ حج ختم کر کے جب گھر واپس آتے تو تمام رفقائے سفر کی دعوت کرتے پھر وہ صندوق کھولتے جس میں لوگوں کی رقمیں رکھی ہوتی تھیں اور جس تھیلی پر جس کا نام ہوتا اس کے حوالہ کر دیتے، راوی کا بیان ہے کہ زندگی بھر ان کا یہی معمول رہا۔[1]

ان کے سوانحِ حیات اس طرح کے واقعات سے پر ہیں، یہ چند واقعات اس لئے نقل کیے گئے ہیں کہ اندازہ ہو سکے کہ ان کی تجارت اور حصولِ دولت کا مقصد اور مصرف کیا تھا۔

اس علم وفضل، زہد وتقویٰ اور فیاضی اور سیر چشمی کے باوجود طبیعت میں تواضع وخاکساری اس قدر تھی کہ وہ اپنی رفتار وگفتار، نشست وبرخاست کسی چیز سے اپنی اس امتیازی حیثیت کو ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے، مرو میں ان کے پاس اچھا خاصا کشادہ مکان تھا۔ جہاں ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا، آپ کو یہ عقیدت مندی ناپسند تھی اس لیے وہاں سے کوفہ چلے آئے اور ایک نہایت ہی تنگ وتاریک مکان میں قیام پذیر ہوئے، لوگوں نے دریافت کیا کہ اتنا وسیع مکان چھوڑ کر اس تنگ وتاریک مکان میں رہتے ہوئے، وحشت نہیں ہوتی؟ فرمایا کہ جس بات کو تم پسند کرتے ہو یعنی عقیدت مندوں کا ہجوم وہ مجھے ناپسند ہے، اسی لئے تو میں مرو سے بھاگ نکلا، اور یہاں تم گمنام زندگی کو ناپسند کرتے ہو حالانکہ مجھے یہی پسند ہے۔[2]

---

[1] صفوۃ الصفوہ ج ۴ ص ۱۱۰ [2] ایضاً ص ۱۰۹

ایک بار کسی سبیل پر[1] پانی پینے کے لیے گئے، اس کے قریب پہنچے تو ایک ہجوم سے ان کو ایسا دھکا . . . لگا کہ وہ پانی پینے کی جگہ سے دور جا پڑے جب وہاں سے نکلے تو حسن سے جو ان کے ساتھ تھے فرمایا کہ

ما العیش الا هکذا یعنی لم نعرف | زندگی اسی طرح گذارنی چاہیے کہ نہ
ولم نوقر[2] | ہم کو لوگ پہچانیں اور نہ ہماری توقیر کریں،

شوق جہاد اوپر سفیان ثوری کا یہ قول گذر چکا ہے کہ ابن مبارک اپنی پوری زندگی مین صحابہ کے نمونہ تھے، صحابۂ کرام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان کی زندگی کا کوئی لمحہ دعوت و تبلیغ اور اقامت دین کی جد وجہد اور اصلاح حال اور جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری سے خالی نہین ہوتا تھا، کسی وقت وہ اپنے داخلی دشمن کو مغلوب کرنے کے لیے جہاد بالنفس مین مشغول رہتے تھے اور کبھی خارجی دشمن کو زیر کرنے کے لیے سینہ سپر رہتے تھے، ان کی یہ خصوصیت ضرب المثل بن گئی ہے۔

فی اللیل رھبان وفی النھار فرسان | رات میں وہ یکسو ہوکر عبادت مین لگے رہتے ہین اور دن کو میدان مین شہ سوار نظر آتے ہین

عبد اللہ بن مبارک اس خصوصیت مین صحابۂ کرام کا نقش ثانی تھے، ایک وقت مین وہ مجلس درس مین رونق افروز ہوتے تو دوسرے وقت مین وہ ارشاد و اصلاح کی مسند پر متمکن نظر آتے اور تیسرے وقت ایک سپاہی کی طرح میدان جہاد مین سرگردان دکھائی دیتے انھون نے سال کو تین حصوں مین تقسیم کر دیا تھا۔ ایک حصہ مین تجارت کرتے، دوسرے حصہ مین درس و تدریس کا کام انجام دیتے اور تیسرے حصہ مین جہاد اور سفر حج مین مشغول رہتے تھے۔

ان کے درس و تدریس اور سفر حج کے واقعات کا ذکر اوپر آچکا ہے، شرکت جہاد کے دو ایک

---

[1] اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت عام جگہون پر پانی پینے اور پلانے کا انتظام ہوتا تھا، [2] صفوۃ الصفوہ ج ۴ ص ۱۱۰

واقعے نقل کئے جاتے ہیں۔

اس زمانہ میں رومیوں اور مسلمانوں میں برابر آویزش رہتی تھی، کبھی رومی اسلامی سرحدوں پر حملہ کرتے اور کبھی مسلمان پیش قدمی کرتے، ایک بار مسلمانوں نے پیش قدمی کی عبداللہ بن مبارک بھی جہاد میں رضاکارانہ شریک ہوئے[1]، رومی فوج سے ایک سپاہی نکلا اور اس نے دعوتِ مبارزت دی، سلیمان مروزی کا بیان ہے کہ اسلامی فوج سے بھی ایک شخص اس کے مقابلہ کے لیے نکلا اور پہلے ہی وار میں اسکا کام تمام کر دیا، پھر دوسرا شخص سامنے آیا اس کا حشر بھی وہی ہوا، لگاتار اسی طرح یکے بعد دیگرے کئی آدمی مقابلہ میں آئے اور اس مجاہد نے ان سب کو ڈھیر کر دیا، لوگوں نے یہ بہادری دیکھکر مجاہد کو گھیر لیا، اس نے اپنا چہرہ لپیٹ رکھا تھا، جب لوگوں نے چہرے سے کپڑا ہٹایا تو دیکھا یہ بہادر مجاہد عبداللہ بن مبارک ہیں۔

اہل تذکرہ لکھتے ہیں کہ مصیصہ، طرطوس وغیرہ مقامات میں یہ رومیوں کی سرحد سے قریب پڑتے تھے اس لیے بغرض جہاد ان جگہوں پر وہ اکثر جاتے رہتے تھے۔

ایک بار کسی مجوسی سے برسرپیکار تھے کہ اسی اثنا میں مجوسی کی عبادت کا وقت آگیا، اس نے اس سے مہلت چاہی، جب وہ سورج کے سامنے سربسجود ہوا تو انھوں نے ارادہ کیا کہ اس کا کام تمام کر دیں۔ مگر یہ آیت

اوفوا بالعهد ان العهد كان مسؤلا — عہد کی بازپرس ہوگی،

سامنے آئی تو رک گئے، جب وہ عبادت سے فارغ ہوا اور اس کو اس بات کا علم ہوا تو وہ یہ کہتا ہوا حلقہ بگوش اسلام ہو گیا کہ۔

---

[1] اس وقت تک کرایہ کے سپاہی ہی میدان میں نہیں بھیجے جاتے تھے، بلکہ ہر مسلمان شرکت جہاد کو اپنے لیے سب سے بڑی خوش قسمتی اور سب سے افضل عبادت سمجھتا تھا۔ صفوۃ الصفوۃ

نعم الرب ربٌ یعاتب لیه فی عدوٌ — بہترین رب وہ رب ہے جو اپنے دوستوں پر دشمن کے معاملہ میں عتاب کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ دوسرے دینی فرائض کے ساتھ انھوں نے فریضۂ جہاد کو بھی اپنے اوپر لازم کر لیا تھا۔

امراء اور سلاطین سے گریز | امراء و سلاطین سے ملنا پسند نہین کرتے تھے، ہارون رشید نے کئی بار ملاقات کی خواہش ظاہر کی مگر یہ گریز کرتے رہے۔ ابراہیم موصلی جن کا تعلق دربار شاہی سے بھی تھا، وہ ابن مبارک سے غایت درجہ محبت کرتے تھے۔ ان کی روایت ہے کہ ہارون نے متعدد بار ابن مبارک سے ملنے کی خواہش ظاہر کی مگر مین کسی طرح ٹال دیتا تھا۔ اس لیے کہ مین جانتا تھا کہ ابن مبارک کے سامنے دین و شریعت کے خلاف کوئی بات ہو گی تو وہ ہارون کو سختی سے روکین گے بلکہ تنبیہ کرین گے، اور یہ بات ہارون جیسے خود پسند خلیفہ کی ناگواری کا سبب بنے گی اور پھر نہ جانے اس کا کیا نتیجہ ہو۔ یہی نہین کہ وہ خود دربار سے گریز کرتے تھے، بلکہ اپنے تمام احباب و اقربا کو بھی اس سے روکتے تھے۔

ابن علیہ اس وقت کے ممتاز محدث اور امام تھے وہ عبداللہ بن مبارک کے خاص احباب مین تھے، تجارت مین بھی وہ ان کے شریک تھے۔ اٹھنا بیٹھنا بھی ساتھ تھا۔ مگر انھون نے بعض امرا کی مجالس مین جانا شروع کر دیا تھا[1]، عبداللہ بن مبارک کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انھون نے ناراضگی کا اظہار کیا اور ایک روز مجلس مین آئے تو ان سے مخاطب نہین ہوئے، ابن عُلَیہ بیحد پریشان ہوئے، مجلس مین تو کچھ نہ کہہ سکے گھر پہنچے تو بڑے اضطراب کی حالت مین ابن مبارک کو یہ خط لکھا۔

اے میرے سردار مدتوں سے مین آپ کے احسانات مین ڈوبا ہوا ہون، قسم ہے خدا کی ان احسانات کو مین اپنے اور اپنے متعلقین کے حق مین برکت شمار کرتا تھا۔ آپ نے مجھکو نہ جانے کیون اپنے

---

[1] بعض روایتون مین ہے کہ صدقات کی وصولی کے انچارج بنا دیئے گئے تھے۔

جدا کر دیا، اور مجھ کو میرے ہمنشینون مین کم رتبہ بنا دیا۔ مین آپ کے دولت کدہ پر حاضر ہوا لیکن آپ نے میری طرف توجہ تک نہ کی، اسی عدم توجہی سے مجھے آپ کی ناراضگی کا علم ہوا اور مجھے اب تک نہین معلوم ہو سکا کہ میری کون سی غلطی آپ کے غضب و غصہ کا سبب بنی ہے۔

اے میرے محترم، میری آنکھوں کے نور! میرے استاذ! خدا کی قسم آپ نے کیون نہین بتلایا کہ وہ کیا خطا ہوئی جس کی بنا پر مین آپ کی ان تمام نوازشون اور کرم فرمائیون سے جو میری غایت تمنا تھین محروم ہو گیا۔

عبد اللہ بن مبارک نے یہ پُر اثر خط پڑھا مگر ان پر اس کا کوئی اثر نہین ہوا۔ یہ چند اور اشعار جواباً ان کے پاس لکھکر بھیج دیئے۔

یا جاعل العلم لہ بازیاً	یصطاد اموال المساکین
اے علم کو ایک ایسا باز بنانے والے	جو غریبون کا مال سمیٹ کر کھا جاتا ہے۔
احتلت للدنیا ولذاتھا	بحیلۃ تذھب بالدین
تم نے دنیا اور اس کی لذتون کے لئے	ایسی تدبیر کی ہے جو دین کو مٹا کر رکھدیگی
فصرت مجنونا بھا بعد ما	کنت دواءً للمجانین
تم خود مجنون ہو گئے	جب کہ تم مجنونون کا علاج تھے
این روایاتک فی سردھا	عن ابن عون وابن سیرین
وہ تمام روایتین آپ کی کیا ہوئیں	جو ابن عون اور ابن سیرین سے آپ بیان کرتے تھے
این روایاتک فی القول فی	لزوم ابواب السلاطین
وہ روایتیں کہاں گئیں جن مین	سلاطین سے ربط ضبط رکھنے کی وعید آئی ہے
ان قلت اکرھت فماذا لذا	زل حمار العلم فی الطین

اگر تم کہو کہ میں اس پر مجبور کیا گیا تو ایسا کیوں ہوا ہاں چارپایہ پر دکتا ہو چند کہ اسیطرح ذلت ہوتی ہے

ابن علیہ کے پاس قاصد یہ اشعار لیکر پہنچا اور انھوں نے پڑھا تو ان پر رقت طاری ہو گئی اور اسی وقت اپنے عہدہ سے استعفا لکھکر بھیج دیا[1]

مرجع خلائق | انہی محاسن اور اوصاف کی بنا پر وہ مرجع خلائق بن گئے تھے، اگرچہ وہ اپنے فضل و کمال کو بہت کم ظاہر ہونے دیتے تھے مگر پھر بھی جس مقام پر پہنچ جاتے تھے، لوگ جوق درجوق ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے، ان کو جو قبول عام حاصل تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجیے۔

ایک بار ابن مبارک رقہ آئے[2] اس کا علم ہوا تو استقبال کے لیے پورا شہر ٹوٹ پڑا ہارون رشید کی ایک لونڈی محل سے یہ تماشا دیکھ رہی تھی، اس نے لوگوں سے دریافت کیا یہ کیا ماجرا ہے، لوگوں نے اسے بتایا کہ خراسان کے ایک عالم ابن مبارک یہاں آئے ہیں، انہی کے استقبال کیلیے یہ مجمع امڈ آیا ہے، اس نے بیساختہ کہا کہ

ھو الملك لا ملك ھارون	حقیقت میں خلیفۂ وقت یہ ہیں ہارون نہیں، اس لئے کہ اس کے گرد کوئی مجمع بغیر پولیس،
الذی لا یجتمع الناس علیہ	
الا بشرط و اعوان[3]	فوج اور اعوان و انصار اکٹھا نہیں ہوتا۔

سفیان ثوری ان کو مشرق و مغرب کا عالم کہا کرتے تھے[4]

زرین اقوال | تذکروں میں عبد اللہ بن مبارک کے سیکڑوں قیمتی اقوال ملتے ہیں جن میں سے چند یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

معرفت الٰہی | ایک بار فرمایا کہ اہل دنیا دنیا کی سب سے مرغوب اور لذیذ چیز سے لطف اندوز

---

[1] صفوۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۱۱۶۔ [2] خلفائے عباسیہ عموماً رقہ میں گرمی گذارتے تھے یہ مقام نہایت ہی سرسبز اور شاداب ہے [3] کردری ص ۳۰، [4] ایضاً

ہوئے بغیر بیان سے رخصت ہو جاتے ہیں، لوگوں نے پوچھا کہ سب سے لذیذ چیز کیا ہے، فرمایا معرفت الٰہی،

ورع و تقوی | فرمایا کہ اگر آدمی سو باتوں میں تقوی اور خوف خدا اختیار کرتا ہے اور ایک بات میں نہیں تو وہ متقی نہیں ہے، فرمایا کہ اگر کوئی شخص سو چیزوں میں پرہیزگاری اختیار کرتا ہے اور ایک چیز میں اسے ترک کر دیتا ہے تو اس کو متورع یعنی پرہیزگار نہیں کہا جا سکتا۔

مشتبہ مال | فرمایا کہ میں ایک مشتبہ[1] درہم کو استعمال نہ کرنے کو سو درہم صدقہ کرنے کے مقابلہ میں زیادہ پسند کرتا ہوں۔

اللہ کے لیے محبت | فرمایا میں کسی چیز کے تلاش کرنے میں تھکا نہیں بجز ایسے دوست کی تلاش میں جو صرف اللہ کے لیے محبت کرتا ہو۔

شہرت | فرمایا کہ گم نامی کو پسند کرو اور شہرت سے دور رہو مگر یہ ظاہر نہ کرو کہ تم گم نامی کو پسند کرتے ہو اس لئے کہ اس سے بھی نفس میں بلندی اور غرور پیدا ہوگا۔

تہذیب | زندگی کے ہر معاملہ میں ادب و تہذیب دین کا دو حصہ ہے،

شاہ اور عوام | کسی نے پوچھا کہ بازاری لوگ کون ہیں، بولے خزیمہ اور اس کے ساتھی، پھر پوچھا کہ سب سے گرے ہوئے کون لوگ ہیں، بولے جو قرض پر زندگی بسر کرتے ہیں اور ہاتھ پیر نہیں ہلاتے۔

جہل | فرمایا جس میں جہالت و جاہلیت کی ایک عادت بھی موجود ہوگی اس کو جاہل کہا جائے گا، کیا سنا نہیں کہ حضرت نوح ؑ نے جب یہ کہا کہ اے اللہ میرے لڑکے کو اس طوفان سے بچا لے اس لیے کہ وہ میرے اہل میں ہے اور تو نے میرے اہل و عیال کو بچانے کا وعدہ فرمایا ہے تو خدا تعالیٰ نے

---

[1] مال و دولت کی تین صورتیں ہوتی ہیں، ایک حلال، دوسرے حرام اور تیسرے جس کا حلال یا حرام ہونا مشتبہ ہو، آن حضرت صلعم نے فرمایا ہے، کہ آدمی جب مشتبہات کے قریب جائے گا تو پھر حرام کھائے گا اس لیے مشتبہ سے بچنا چاہیے یہ اسی ارشاد نبوی کی تفسیر ہے [2] صفوۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۱۰ - ۱۴۱

جواب دیا کہ میں نصیحت کرتا ہوں کہ تو جاہلوں میں نہ ہو، تیرا لڑکا جب ایمان کی دولت سے محروم ہو گیا تو پھر اہل میں کہاں رہا، صاحب زہد و تقوی آدمی دنیا میں بھی ایک بادشاہ وقت سے زیادہ معزز ہوتا ہے، کیونکہ بادشاہ اگر اپنے گرد لوگوں کو جمع کرنا چاہے تو اسے جبر و کراہ کرنا پڑتا ہے بخلاف خدا رسیدہ آدمی کے کہ وہ لوگوں سے بھاگتا ہے مگر لوگ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔

علم اور علما | وہ شخص عالم نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس کے دل میں خوف خدا اور دنیا سے بے رغبتی نہ ہو۔

تواضع | ایک شخص نے پوچھا کہ تواضع کیا ہے آپ نے فرمایا کہ اغنیا کے مقابلہ میں خود دار رہنا، فرمایا کہ شریف وہ ہے جسے اطاعت الٰہی کی توفیق ہوئی، اور رذیل وہ ہے جس نے بے مقصد زندگی گذار دی، ایک شخص نے حسن خلق کی تعریف پوچھی تو فرمایا کہ ترک الغضب غصہ نہ کرنا۔

محاسن و مساوی، | فرمایا کہ کسی آدمی کے محاسن اور معائب کا اندازہ اس کی کمیت سے کرنا چاہیئے، یعنی اگر کسی کے اندر محاسن زیادہ ہیں تو اس کے معائب کو سامنے نہ لانا چاہیے اور اگر کسی میں معائب زیادہ ہیں تو محاسن کا کوئی شمار نہیں۔

حسن نیت | فرمایا کہ بہت سے چھوٹے اعمال ہیں جو حسن نیت کی وجہ سے بڑے ہو جاتے ہیں اور بہت سے بڑے اعمال ہیں جو سوء نیت کی وجہ سے چھوٹے ہو جاتے ہیں علم کے لیے سب سے پہلے نیت و ارادہ پھر فہم، پھر عمل پھر حفظ اور اس کے بعد اس کی اشاعت و ترویج کی ضرورت ہے۔

امت کے طبقے | ایک روز مسیب بن واضح سے ابن مبارک نے پوچھا کہ تم کو معلوم ہے کہ عام بگاڑ اور فساد کیسے پیدا ہوتا ہے، مسیب نے کہا کہ مجھے علم نہیں، فرمایا کہ خواص کے بگاڑ سے عام بگاڑ پیدا ہوتا ہے، پھر فرمایا کہ امت محمدیہ کے پانچ طبقے ہیں جب ان میں فساد اور خرابی پیدا ہو جاتی ہے تو سارا ماحول بگڑ جاتا ہے (۱) علما یہ انبیا کے وارث ہیں مگر جب یہ دنیا کی حرص و طمع میں پڑ جائیں،

لے وہ غلام جس نے کچھ رقم دیکر اپنے کو آزاد کرا لینے کا معاہدہ کر لیا ہو۔

توپھر کس کو اپنا معتمد بنایا جائے (۲) تجار یہ اللہ کے امین ہیں جب یہ خیانت پر اتر آئیں توپھر کس کو امین سمجھا جائے (۳) مجاہدین، یہ اللہ کے مہمان ہیں جب یہ مال غنیمت کی چوری شروع کردیں تو پھر دشمن پر فتح کس کے ذریعہ حاصل کیجائے (۴) زہاد یہ زمین کے اصل بادشاہ ہیں جب یہ لوگ برے ہوجائیں توپھر کس کی پیروی کیجائے (۵) حکام یہ مخلوق کے نگران ہیں جب یہ گلہ بان ہی بھیڑیا صفت ہوجائے تو گلہ کو کس کے ذریعہ بچایا جائے۔

غروراور خودپسندی ابو وہب مروزی نے غرور کی تعریف پوچھی تو فرمایا کہ لوگوں کو حقیر سمجھنا اور عیب نکالنا غرور ہے، پھر عجب یعنی خودپسندی کی تعریف پوچھی تو بولے کہ آدمی یہ سمجھے کہ جو اس کے پاس ہے وہ دوسرے کے پاس نہین ہے۔

حقیقی جہاد ایک شخص نے جہاد اور اسکی تیاری کے بارے مین سوال کیا تو فرمایا کا اپنے نفس کو حق پر جمائے رکھنا یہان تک کہ وہ خود اس پر جم جائے سب سے بڑا جہاد ہے، یہ اس حدیث کا بالکل ترجمہ ہے جس مین کہا گیا ہے کہ

المجاھد من جاھد نفسہ[۱] مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے لڑے۔

تصنیف حضرت عبداللہ بن مبارک کی زندگی مین مجاہدانہ رنگ غالب تھا اس لئے وہ علم وفن اور تدوین وتالیف کی طرف کوئی خاص توجہ نہین کر سکے پھر بھی انھون نے جو کچھ تحریری یادگارین چھوڑی ہین وہ ان کے علم وفضل پر شاہد ہیں، امام ذہبی نے اس سلسلہ مین ان کی صرف ایک کتاب کتاب الذہب کا تذکرہ کیا ہے اور پھر لکھا ہے۔

صاحب التصانیف النافعۃ[۲] بہت سی مفید کتابون کے مصنف ہیں

تذکرون میں کتاب الذہب کے علاوہ ان کی کسی تصنیف کا ذکر نہیں ہے۔ مگر ابن ندیم نے

---

[۱] کردری ج ۲ ص ۱۷۶۔ [۲] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۰۔

متعدد کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔

(۱) کتاب السنن (۲) کتاب التفسیر (۳) کتاب التاریخ (۴) کتاب الزہد (۵) کتاب البر والصلۃ[1]

وفات ان کی وفات جس طرح ہوئی اس میں ہر مومن کے لیے سامان بصیرت ہے ان کی زندگی زہد و اتقا کا مرقع تھی مگر ان کی سب سے نمایاں خصوصیت جہاد فی سبیل اللہ تھی، اللہ تعالیٰ کی شان دیکھئے کہ انکی وفات بھی اسی مبارک سفر میں ہوئی۔

شام کے علاقہ میں جہاد کے لیے گئے ہوئے تھے کہ اثنائے سفر میں طبیعت خراب ہوئی، ستو پینے کی خواہش کی، ایک شخص نے ستو پیش کیا مگر یہ شخص ہارون کا درباری تھا اس لیے اس کا ستو پینے سے انکار کر دیا۔ وفات سے کچھ دیر پہلے آواز پھنس گئی، اس گلو بندی کی وجہ سے ان کو گمان ہوا کہ زبان سے کلمہ شہادت نکلنا نہ رہ جائے اس لئے انھوں نے اپنے ایک شاگرد حسن بن ربیع سے کہا کہ دیکھو جب میری زبان سے کلمۂ شہادت نکلے تو تم اتنی بلند آواز سے دہرانا کہ میں سن لوں جب تم ایسا کروگے تو یہ کلمہ خود بخود میری زبان پر جاری ہو جائے گا، چنانچہ اسی حالت میں وہ اپنے خالق سے جا ملے،

سنہ عمر اور مقام وفات یہ حادثہ عظمی ۱۸۱ھ میں مقام ہیت[2] میں پیش آیا وفات کے وقت عمر ۶۳ سال تھی۔

مقبولیت وفات گو وطن سے سیکڑوں میل دور ہوئی تھی، مگر عام مقبولیت کا حال یہ تھا کہ جب لوگوں کو وفات کی اطلاع ملی تو جنازہ پر اس قدر اژدحام ہوا کہ ہیت کے حاکم کو اس واقعہ کی اطلاع دار الخلافہ بغداد بھیجنی پڑی، زندگی میں وہ ہارون سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے مگر جب اس کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو اس نے اپنے وزیر فضل سے کہا کہ آج لوگوں کو عام اجازت دے دو کہ ابن

---

[1] ابن ندیم صفحہ ۳۱۹ [2] یہ مقام گو حدود کوفہ ہی میں داخل تھا مگر صحرائے شام میں واقع ہے اس وقت اس کی حیثیت ایک قصبہ کی تھی۔

تعزیت لوگ ہمارے پاس آکر کریں (مقصد یہ تھا کہ ان کی وفات پوری مملکت اسلامی کے لیے ایک حادثہ ہے، اور میں اس وقت اس کا ذمہ دار ہوں تو ان کی تعزیت کا میں بھی حقدار ہوں) مگر فضل نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی تو ہارون نے ان کے کچھ اشعار پڑھے اور اس حادثہ کی اہمیت بتلائی۔

راوی کا بیان ہے کہ ان کی وفات کے بعد مجھے اس آیت کا مفہوم واضح ہوا

ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات	جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیا ان
سیجعل لھم الرحمن ودا	کی محبت اللہ تعالے لوگوں
	کے دلوں میں پیدا کردے گا۔

امام شعبہ

امام شعبہ کا شمار تبع تابعین میں ہوتا ہے، مگر وہ اپنے علم و فضل، دیانت و تقویٰ اور بعض دوسری خصوصیات کی وجہ سے تابعین کے زمرہ میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں۔ انھوں نے دو صحابی حضرت انس بن مالکؓ اور عمرو بن سلمہ کو دیکھا تھا۔ اگر ان کے تابعی ہونے کے لئے کوئی دوسری وجہ نہ بھی ہوتی تو تنہا رویت صحابہ کا فضل ہی ان کی تابعیت کے لیے کافی تھا، مگر ارباب تذکرہ ان کا ذکر تبع تابعین کے ساتھ کرتے ہیں۔ غالباً ان کے نزدیک صرف رویت صحابہ تابعیت کے لیے کافی نہیں، اس لئے ان کو اس فہرست میں لے لیا گیا ہے،

نام ونسب اور ولادت | شعبہ نام اور ابو بسطام کنیت، والد کا نام حجاج تھا، ان کے والد قصبہ واسط کے قریب ایک دیہات تہیان کے رہنے والے تھے، ۸۳ھ میں یہیں ان کی ولادت ہوئی۔[1]

تعلیم وتربیت | ان کی ولادت تو ایک گاؤں میں ہوئی مگر ان کے والد غالباً ترک سکونت کرکے شہر واسط چلے آئے۔ واسط کوفہ و بصرہ کے درمیان ایک مرکزی مقام ہے جہاں علم و ادب کا کافی چرچا تھا، امام شعبہ کا نشو ونما یہیں کے علم پرور ماحول میں ہوا۔ ان کی علمی زندگی شعر وادب سے شروع ہوئی مگر بہت زیادہ دن نہیں گزرنے پائے تھے کہ وہ علم حدیث کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور اس میں وہ کمال حاصل کیا کہ امام المحدثین بن گئے۔ خود انھوں نے یہ واقعہ اپنی زبان سے بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں زیادہ

---

[1] عام تذکرہ نگار ان کی جائے پیدائش واسط کو بتاتے ہیں مگر سمعانی نے لکھا ہے کہ واسط نہیں بلکہ اس کے ایک قریہ میں ان کی ولادت ہوئی۔

تو مشہور شاعر طرماح کے پاس رہتا تھا اور اس سے شعر و شاعری کے بارے میں سوال کرتا رہتا تھا مگر ایک دن کوفہ کے مشہور محدث حکم بن عتیبہ[۵] کی مجلس درس سے گزرا تو وہ محدثانہ انداز سے ارشادات رسول کی روایت کر رہے تھے۔ حدیث نبوی کی آواز جب میرے کانوں میں پہونچی تو وہ دل تک اتر گئی۔ میں نے اسی وقت دل میں طے کر لیا کہ شعر و شاعری جس کی طلب اب تک میں نے کی ہے اس کے مقابلہ میں حدیث نبوی کی طلب بدرجہا بہتر ہے، چنانچہ اس دن سے میں علم حدیث کے حصول میں لگ گیا۔ افسوس کے ساتھ فرماتے تھے کہ میں اگر شعر و ادب میں نہ لگ گیا ہوتا تو امام شعبی سے حدیث میں استفادہ کیا ہوتا۔[سے]

شیوخ حدیث | امام شعبہ نے اس وقت کے تمام ممتاز محدثین سے سماع حدیث کیا تھا، عام ارباب تذکرہ لکھتے ہیں کہ ان کے شیوخ حدیث میں تقریباً چار سو تابعین شامل ہیں۔ حافظ ابن حجر نے ان کے شیوخ کی جو فہرست دی ہے اس میں تین سو سے اوپر نام ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ کوفہ کے تین سو شیوخ حدیث سے روایت کی ہے۔

یہ شیوخ کسی ایک دو مقام پر نہیں بلکہ ممالک اسلامیہ کے لاکھوں مربع میل علاقہ میں پھیلے ہوئے تھے۔ پھر راستہ کی دشواری اور اس زمانہ کے محدود حمل و نقل کے ذرائع پر غور کیجیے، گدھے اونٹ یا کسی خوش قسمت کو گھوڑے میسر ہو جاتے تھے، ان کے ذریعہ یہ لاکھوں میل کا فاصلہ طے کرنا کتنا دشوار کام تھا، پھر ایسا بھی ہوتا تھا کہ بسا اوقات ایک ایک حدیث کے لیے ہزاروں میل کا سفر طے کرنا پڑتا تھا۔ اور پھر امام شعبہ کے والد کا انتقال بچپن ہی میں ہو چکا تھا۔ انھوں نے انتہائی عسرت کی حالت میں تعلیم حاصل کی۔ خود فرماتے تھے کہ عسرت کی وجہ سے میں نے ... . سات دینار میں اپنی والدہ کا طشت

---

[۵] امام شعبہ اور اعمش دونوں حکم بن عتیبہ کے شاگرد ہیں۔ مگر احمد بن حنبل کہا کرتے تھے کہ شعبہ حکم کے احادیث کے سب سے بڑے محافظ ہیں، اگر وہ نہ ہوتے تو حکم کی مرویات ضائع ہو جاتیں۔ تہذیب [سے] تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۵۰ [سے] تاریخ بغداد اور انھوں نے حدیث کی طرف توجہ کی تو امام شعبی وفات پا چکے تھے، جس کا ان کو افسوس تھا۔

فروخت کر ڈالا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کو یہ تمام سفر پیدل ہی طے کرنے پڑے ہوں گے (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۷۱)

قوت حافظہ | خدائے تعالیٰ نے قوت حافظہ بھی غیر معمولی دیا تھا۔ وہ حدیث نبوی بہت کم لکھتے تھے مگر لمبی لمبی حدیثیں نوک زبان رہتی تھیں، ایک بار علی بن المدینی نے یحییٰ بن قطان سے پوچھا کہ سفیان ثوری اور امام شعبہ میں کون لمبی لمبی حدیثوں کو زیادہ اچھی طرح یاد رکھتا تھا؟ بولے شعبہ اس میں بہت آگے تھے[1]

. . . .

غیر معمولی قوت حافظہ اور اس کد و کاوش کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی حدیث نبوی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ان کے سینے میں محفوظ ہو گیا۔ اور اب وہ خود مرجع خلائق بن گئے، اسلامی مملکت کے گوشہ گوشہ سے حدیث نبوی کے پروانے آکر اس شمع علم کے گرد جمع ہونے لگے۔

بصرہ میں قیام اور حلقۂ درس | تحصیل علم کے بعد انھوں نے واسط کے بجائے بصرہ میں جو اس وقت علم و فن کا گہوارہ تھا۔ قیام کیا اور وہیں اپنا حلقۂ درس قائم کیا۔ بصرہ کی سرزمین ان کو ایسی پسند آئی کہ ساری عمر وہیں ختم کر دی، خلیفہ مہدی نے ان کو بصرہ میں کچھ زمین بھی عطا کر دی تھی مگر انھوں نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی[2]

تلامذہ | اس سرچشمۂ علم سے جن تشنگان علم نے فائدہ اٹھایا ان کی صحیح تعداد تو نہیں بتائی جا سکتی، حافظ ابن حجر نے ان کے ۴۴ ممتاز تلامذہ کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح دوسرے اہل تذکرہ نے بھی کچھ نام گنائے ہیں۔ امام نووی چند ائمہ کے نام لکھنے کے بعد فرماتے ہیں۔

وخلائق لا یحصون من کبار الائمۃ[3] — ان کے ممتاز تلامذہ کا بھی شمار نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] تاریخ البغداد ج ۹ ص ۲۶۴۔ [2] تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۵۵۔
[3] تہذیب الاسماء ص ۴۴۵

چند ائمہ کے نام یہ ہیں،

سفیان ثوری۔ سفیان بن عینیہ۔ عبدالرحمن بن مہدی۔ وکیع بن جراح۔ ایوب سختیانی۔ اعمش، محمد بن اسحاق۔ ابوداؤد۔ عبداللہ بن مبارک۔ اسمٰعیل بن علیہ وغیرہ۔

علم وفضل اوپر ذکر آچکا ہے کہ ان کی تعلیم شعر وادب سے شروع ہوئی تھی، اور مشہور شاعر طرماح کے شاگرد تھے۔ خود اصمعی ان کے ادبی ذوق کا معترف تھا۔ اس کے بعد دینی علوم کی طرف توجہ کی تو اس میں بھی انھوں نے ممتاز حیثیت حاصل کی بخصوصیت سے حدیث مین ان کی امامت اور جلالت تو ضرب المثل بن گئی ہے۔ حدیث کی کوئی قابل ذکر کتاب ایسی نہین ہے جس مین ان کی مرویات کثرت سے موجود نہ ہون۔ امام بخاری فرماتے تھے کہ علی بن المدینی کے واسطہ سے ان کی دو ہزار حدیثین ہم تک پہونچی ہیں۔ ابوداؤد کہتے تھے کہ میں نے ان سے سات ہزار حدیثین سنی ہیں جن میں سے ایک ہزار حدیثون پر مین نے ان سے ردوقدح کیا اور ایک ہزار حدیثون کے دلائل براہین سے خود انھون نے مجھے واقف کیا[1]۔

علماء کا اعتراف اس وقت کے تمام علما ومحدثین کو ان کے علم وفضل کا اعتراف تھا۔ امام احمد بن حنبل فرماتے تھے کہ علم حدیث مین امام شعبہ اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم تھے۔ امام شافعی فرماتے تھے کہ اگر امام شعبہ نہ ہوتے تو عراق مین علم حدیث اتنا زیادہ معروف نہ ہوتا۔ سفیان ثوری فرماتے تھے کہ شعبہ امیر المومنین فی الحدیث' امام احمد بن حنبل فرمایا کرتے تھے کہ حدیث کی بصیرت حفظ واتقان اور رجال کی تنقید مین وہ تنہا ایک امت کے برابر تھے۔ مشہور محدث حماد بن زید فرماتے تھے کہ اگر کسی حدیث کی روایت مین امام شعبہ میری موافقت کرتے ہیں تو مین کسی کی پرواہ نہین کرتا، انہی حماد کا بیان ہے کہ ایوب سختیانی نے ایک دن کہا کہ جلد ہی واسطہ سے ایک شخص حدیث کا ماہر آنے والا ہے۔ اس سے حدیثیں سیکھو' ان کا اشارہ امام شعبہ کی طرف تھا' ابو الولید نے یحیی بن

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج اص ۱۷۰، ۱۵۳ ایضاً،

سعید سے پوچھا کہ امام شعبہ سے زیادہ اچھا حدیث کا کوئی عالم آپ نے دیکھا ہے یا نہیں۔ فرمایا نہیں، پوچھا آپ ان کی صحبت میں کتنے دن رہے۔ بولے بیس برس[1]۔

امام نووی نے لکھا ہے کہ ان کی امامت و جلالت پر سب کا اتفاق ہے، حاکم نے لکھا ہے کہ یہ معرفت حدیث میں امام الائمہ تھے۔ امام ذہبی اور حافظ ابن حجر وغیرہ نے بھی قریب قریب یہی الفاظ لکھے ہیں۔

روایت حدیث میں احتیاط اس علم و فضل کے باوجود حدیث کی روایت میں بڑی احتیاط کرتے تھے، جب تک وہ کسی حدیث کو کئی کئی بار سن نہ لیتے تھے، اس کی روایت نہیں کرتے تھے، بسا اوقات ایک ایک حدیث کا سماع وہ بیس بیس مرتبہ کرتے تھے، حماد بن زید کہتے تھے کہ کسی حدیث میں اگر شعبہ میرے موافق ہوں تو میں کسی دوسرے کی پرواہ نہیں کرتا۔ اس لئے کہ وہ کسی حدیث کو سننے کے بعد فوراً مطمئن نہیں ہوتے تھے، سفیان ثوری کا قول ہے کہ میں نے حدیث نبوی کی روایت میں شعبہ سے زیادہ کسی کو محتاط نہیں پایا[2]۔ ان کو صحیح حدیث میں بھی شک ہو جاتا تھا۔ تو ترک کر دیتے تھے، خود فرماتے تھے کہ میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں یہ مجھے پسند ہے مگر یہ پسند نہیں کر سکتا کہ میں نے کسی حدیث کو سنا نہ ہو اور یہ کہوں کہ سمعت میں نے سنا ہے۔

اس زمانہ میں حدیث میں بعض لوگ تدلیس کرتے تھے۔ تدلیس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی راوی کسی شیخ سے اپنے اس شیخ کا نام نہ لے جس سے اس نے روایت سنی ہے۔ بلکہ اوپر کے راوی کا نام لے۔ یہ ایک طرح کی غلط بیانی ہے، اس لیے ائمہ نے اس کو بہت ناپسند کیا ہے، عبدالحق محدث دہلوی نے مشکوٰۃ کے مقدمہ میں لکھا ہے۔

بالغ شعبة فی ذمہ   امام شعبہ تدلیس کی بہت زیادہ مذمت کرتے تھے۔

---

[1] تاریخ بغداد [2] ایضاً [3] ایضاً [4] تہذیب التہذیب۔

خود اپنے بارے میں فرماتے تھے کہ میں یہ پسند کروں گا کہ میں آسمان سے گر پڑوں اور میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں مگر یہ بات پسند نہیں کر سکتا کہ میں کسی حدیث کی روایت میں تدلیس کروں۔

وہ روایت حدیث میں خود ہی احتیاط نہیں کرتے تھے، بلکہ دوسروں کو بھی اس سے باز رکھنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ جب کسی نااہل آدمی کو حدیث کی روایت کرتے سنتے تھے تو اس کے پاس جاتے اور اس سے کہتے کہ تم حدیث نبوی کی تحدیث چھوڑ دو ورنہ میں بادشاہ کے پاس تمھاری شکایت لے جاؤں گا۔

تنقید رجال کی ابتدا اس وقت حدیث کی روایت میں جو بے اعتدالیاں شروع ہو گئی تھیں اور حدیث کا مبارک علم جس طرح آہستہ آہستہ نااہل لوگوں کے ہاتھوں میں جا رہا تھا۔ اگر بروقت اس کی روک تھام نہ کی جاتی تو امت میں ایک نئے فتنے کا آغاز ہو جاتا۔ خدا جزائے خیر دے امام شعبہ کو کہ وہ ہر وقت اس فتنے کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ انھوں نے رواۃ حدیث پر کلام کیا، ان کے صفات بتائے۔ ان کے لیے کچھ اصول مقرر کیے۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے اعتدالیاں کم ہونے لگیں اور ہر کس و ناکس کو روایت حدیث کی جرأت نہیں ہوتی تھی، امام شعبہ نے جس کام کی ابتدا کی تھی گو اس کی تکمیل دوسرے ائمہ یعنی امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین وغیرہ نے کی مگر بہرحال[1] تقدم کا شرف امام شعبہ کو حاصل ہے۔ امام نووی نے صالح بن محمد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

اول من تکلم فی الرجال شعبۃ ثم تبعہ یحیی القطان ثم	راویوں پر سب سے پہلے تنقید امام شعبہ نے شروع کی پھر امام یحییٰ القطان نے ان کے

---

[1] اب یہ ایک مستقل فن اسماء الرجال کے نام سے بن گیا ہے۔ جس میں رواۃ حدیث کی سیرت و کردار پر پوری بحث ہوتی ہے۔

احمد بن حنبل و یحییٰ بن معین[۱] | بعد امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے

حافظ ابن حجر نے بھی اپنی کتاب تہذیب میں ابو بکر ابن منجویہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

وھو اول من فتش با لعراق عن امر المحدثین وجانب الضعفاء والمتروکین (جلد ۴ ص ۳۴۵) | عراق میں سب سے پہلے امام شعبہ نے عام محدثین اور ضعیف اور متروک راویوں کے بارے میں چھان بین شروع کی۔

تنقید رجال کے بارے میں امام شعبہ کی حیثیت اتنی مسلّم ہو چکی تھی کہ جن راویوں سے وہ روایت نہیں کرتے تھے، دوسرے محدثین بھی ان کی روایت سے گریز کرتے تھے۔ ممتاز محدث ابن عون سے کسی نے پوچھا کہ آپ فلاں آدمی سے روایت نہیں کرتے آخر اس کا سبب کیا ہے؟ بولے شعبہ اس سے روایت نہیں کرتے تھے[۲]۔

حدیث میں ان کی امامت وجلالت مسلّم تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ انسان تھے، اس لئے ان سے بھی روایت حدیث میں بعض لغزشیں ہوئی ہیں، جن کی طرف بعد کے علماء نے توجہ دلائی ہے۔

عجلی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث میں ثقہ اور قابلِ اعتماد ہیں مگر اسماء رجال میں ان سے کبھی کبھی غلطی ہو جاتی تھی۔ دار قطنی نے لکھا ہے کہ متن حدیث کے یاد کرنے میں اتنا زیادہ مشغول رہتے تھے کہ ان کی توجہ رواۃ کی طرف نہیں ہونے پاتی تھی۔ اس وجہ سے رجال کے ناموں میں کبھی کبھی غلطی ہو جاتی تھی، مگر ان کی اس غلطی کا اثر روایت کی صحت اور عدم صحت پر نہیں پڑتا تھا، بلکہ صرف اتنا ہوتا تھا کہ روایت کرتے وقت کبھی کسی راوی کا نام بھول گئے یا اس کا نام غلط لے لیا کرتے تھے، چنانچہ سفیان ثوری سے کسی نے ان کے بارے میں پوچھا تو فرمایا کہ امام شعبہ

---

[۱] تہذیب الاسماء [۲] تہذیب التہذیب۔

اسماء الرجال میں غلطی کرتے ہیں مگر ان کی غلطی

لا یضرہ و یعاب علیہ ایسی نہیں ہے جس سے ان کی عظمت پر حرف آتا ہو یا ان کی وجہ سے ان کو مطعون ہونے دیا جائے

زہد و تقویٰ اور سیرت و کردار — امام شعبہ اس علم و فضل کے ساتھ اپنے سیرت و کردار اور زہد و تقویٰ میں بھی ممتاز تھے۔

نماز نہایت ہی حضور قلب اور خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھتے تھے۔ رکوع و سجدہ میں اتنی تاخیر کرتے تھے کہ دیکھنے والوں کو شبہہ ہوتا کہ وہ بھول گئے۔ ابو قطن کا بیان ہے کہ شعبہ جب رکوع یا سجدہ کرتے تھے تو مجھے گمان ہوتا تھا کہ شاید یہ بھول گئے ہیں اس لئے اتنی تاخیر ہو رہی ہے۔[1]

نماز میں انھیں اس قدر لطف آتا تھا کہ جب بھی ان کو فرصت ملتی تو وہ نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔ روزہ سے بھی ان کو خاص شغف تھا، سال کے اکثر ایام میں وہ روزے سے ہوتے تھے کثرت صوم و عبادت کی وجہ سے نہایت ہی کمزور اور نحیف ہو گئے تھے۔ اور چہرہ کا رنگ سیاہ ہو گیا تھا مگر صوم و صلوٰۃ کی یہ کثرت حقوق عباد کی ادائگی یا خدمت خلق میں سد راہ نہیں بنتی تھی بلکہ وہ حقوق اللہ کے ساتھ حقوق عباد کی بھی پوری نگہداشت کرتے تھے غریبوں اور مسکینوں کے تو وہ ملجا و ماویٰ تھے۔ خود ان کی مالی حالت کچھ اچھی نہیں تھی۔ مگر جب بھی ان کے ہاتھ میں کوئی رقم آ جاتی تو وہ فوراً فقرا و مساکین میں تقسیم کر دیتے تھے، ایک بار خلیفہ مہدی نے تین ہزار درہم ان کے پاس بھجوائے۔ انھوں نے پوری رقم اہل حاجت میں تقسیم کرا دی۔ کسی مسکین کو دیکھ لیتے تو ان کا دل بھر آتا تھا، اور ان کے پاس جو کچھ ہوتا تھا، دے ڈالتے تھے۔

نضر بن شمیل بیان کرتے ہیں کہ میں نے ان سے زیادہ غریبوں پر رحم کرنے والا آدمی نہیں دیکھا

---

[1] تذکرۃ الحفاظ،

ان کی یہ کیفیت تھی کہ جب کوئی غریب آدمی ان کے پاس سے گزرتا تھا تو جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو جاتا تھا، اس کی طرف نظر ترحم سے دیکھتے رہتے تھے۔[۱]

ایک بار وہ گدھے پر سوار ہو کر کہیں جا رہے تھے، راستے میں مشہور محدث سلیمان بن مغیرہؒ ملے، انھوں نے اپنے فقر و فاقہ کی شکایت کی۔ امام شعبہ نے کہا کہ واللہ میرے پاس اس گدھے کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ یہ کہکر وہ نیچے اتر گئے اور گدھا سلیمان کے حوالہ کر دیا۔ ایک بار کسی پڑوسی نے ان سے کچھ مانگا، ان کے پاس کچھ موجود نہیں تھا۔ فرمایا ایسے وقت میں تم نے مجھ سے سوال کیا کہ کچھ موجود نہیں ہے۔ اچھا یہ سواری کا گدھا لے لو، اس نے گدھا لینے سے انکار کیا۔ آپ نے پھر اصرار کیا تو اس نے لے لیا، وہ گدھے کو لے کر کچھ آگے گیا تھا کہ ان کے بعض احباب نے دیکھا اور پہچانا کہ یہ تو امام کی سواری کا گدھا ہے۔ وہ چونکہ ان کی طبیعت سے واقف تھے، اس لیے صورت حال سمجھ گئے، انھوں نے سائل سے پانچ درہم میں گدھے کو خرید لیا اور پھر اس کو لاکر امام شعبہ کو ہدیہ کر دیا۔ امام شعبہ اس وصف میں بالکل انصارؓ کے نمونہ تھے، قرآن نے جن کے بارے میں کہا ہے،

ویؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ۔	انصار کا حال یہ ہے کہ وہ خود تنگی میں ہوتے ہوئے بھی ایثار سے کام لیتے ہیں۔

اس صفت میں وہ اس قدر معروف و مشہور تھے کہ ان کو لوگ ابو الفقراء و ام المساکین کے ماں باپ کہنے لگے تھے۔ اپنے تلامذہ سے کہا کرتے تھے کہ اگر (میرے درس میں) مساکین نہ ہوتے تو تم لوگوں کے لیے یہ مجلس نہ برپا کرتا۔[۲] مقصد یہ ہے کہ غریبوں کے پاس وہ اسباب و ذرائع نہیں ہیں جن کی

---

[۱] تاریخ بغداد۔ تذکرۃ الحفاظ۔ [۲] یہ تمام واقعات تاریخ بغداد سے لیے گئے ہیں لہ سلیمان ابن مغیرہ ان کے استاد ہیں، ان کو امام شعبہ سید اہل البصرہ کہا کرتے تھے [۳] یہ تمام واقعات تاریخ بغداد سے لیے گئے ہیں۔

مدد سے وہ وطن سے باہر جا کر تحصیل علم کر سکیں۔ اس لیے میں درس دیتا ہوں کہ ان کی علمی تشنگی یہیں رفع ہو جائے
اور ان کو باہر نہ جانے کا کوئی غم نہ ہو۔

سادگی | امام شعبہ کی مالی حالت اچھی نہیں تھی مگر ان کے دو بھائی بشار اور حماد جو صرافہ کا کام کرتے تھے بہت مالدار تھے۔ یہ دونوں بھائی امام شعبہ کو بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے، ان کی اور ان کے اہل وعیال کی کفالت بھی انہی کے ذمہ تھی پھر خلفاء کے یہاں بھی ان کی قدر و منزلت تھی۔ اگر وہ چاہتے تو ان دونوں ذرائع سے کام لے کر بڑی آرام و سکون کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ مگر انھوں نے ہمیشہ نہایت ہی سادگی بلکہ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی۔ اپنی ضرورت سے زیادہ انھوں نے نہ تو اپنے بھائیوں سے لینا پسند کیا اور نہ اس کے لیے کبھی دربار خلافت کا رخ کیا، اور اگر کبھی ضرورت سے زیادہ کوئی رقم ہدیۃً وتحفۃً آ گئی تو فوراً اسے اہل حاجت میں تقسیم کر ڈالا۔

امام شعبہ کا لباس عموماً کرتا پاجامہ اور ایک چادر پر مشتمل ہوتا تھا۔ وہ بھی نہایت ہی کم قیمت۔ ان کے ایک شاگرد سلیمان کا بیان ہے کہ ان کا پورا لباس دس درہم (دو روپیہ) سے بھی کم قیمت کا ہوتا تھا۔ ایک بار وہ سوار ہو کر کہیں جا رہے تھے، احباب نے ان کی سواری اور لباس کی قیمت کا اندازہ لگانا شروع کیا تو ان کا تخمینہ ۱۸ درہم چار پانچ روپیے سے زیادہ نہیں ہوا۔ ان کی سادگی اور کسر نفسی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ وفات کے بعد جب گھر کا سامان جمع کیا گیا تو پورا اثاثہ ایک گدھا، اس کی زین اور لگام، بدن کا کپڑا موزہ اور ایک جوڑا جوتا تھا جس کی مجموعی قیمت ۱۶ درہم تھی، خود فرمایا کرتے تھے کہ اگر میرے گھر میں آٹا اور پانی پینے کا برتن موجود رہے تو مجھے اور کسی چیز کے نہ ہونے کا کوئی غم نہیں ہے[۵]۔

خود ہی سادہ زندگی بسر نہیں کرتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی اس پر آمادہ کرتے تھے۔ ابو نوح

---

[۵] تاریخ بغداد

بیان کرتے ہیں کہ ایک بار انھوں نے مجھے قیمتی کپڑا پہنے ہوے دیکھا تو پوچھا کہ کتنے میں تیار ہوا ہے؟ میں نے کہا آٹھ درہم میں، بولے بندۂ خدا! اللہ سے ڈرتے نہیں، آٹھ درہم کا صرف کرتا پہنتے ہو۔ کیا حرج تھا اگر چار درہم کا کرتا بنواتے اور چار درہم کسی مستحق کو دے دیتے۔[1]

خوفِ آخرت | آخرت کا خوف ہر وقت دامنگیر رہتا تھا۔ حدیث کی روایت میں وہ جس قدر احتیاط کرتے تھے اس کا ذکر اوپر آچکا ہے، مگر اس احتیاط کے باوجود آخرت کی باز پرس سے ہر وقت خائف رہتے تھے کہ کوئی غلطی ہو گئی ہو تو قیامت کے دن خدا کے حضور شرمندہ ہونا پڑے۔ فرماتے تھے کہ مجھے دوزخ میں لیجانے والی چیزوں میں سب سے زیادہ خوف حدیث نبوی سے رہتا ہے۔ فرماتے تھے کہ کاش میں ایک معمولی فرد ہوتا اور مجھے حدیث کی معرفت نہ حاصل ہوتی۔ بسا اوقات جب ان کے سامنے کوئی حدیث بیان کی جاتی تو وہ چیخ اٹھتے تھے۔ ان کا یہ خوف اور ڈر ان ذمہ داریون کے احساس کی وجہ سے تھا جو حدیث کے راوی کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتی تھیں ایک ذمہ داری روایت کی تھی، دوسرے اس کے عمل و اتباع کی، ظاہر ہے کہ ایسی بہت سی احادیث خود انھوں نے روایت کی ہونگی جن میں ان دونون ذمہ داریوں کی طرف حضور انور نے توجہ دلائی ہوگی تو ان کا یہ خوف لازمی تھا اگر کسی کو خوف نہ ہو تو تعجب ہے۔

انہی اوصاف و کمالات اور اخلاقی خوبیون کی بنا پر یحیی بن معین جو خود علم و تقوی میں اپنی نظیر تھے امام شعبہ کو امام المتقین کہتے تھے۔ یحیی بن معین کے متعدد شاگردوں کا بیان ہے کہ ہم نے یحیی بن معین کی زبان سے سنا ہے کہ

شعبہ امام المتقین

شعبہ متقیون کے امام ہیں۔

دربارِ خلافت سے تعلق | اموی اور عباسی دور کے متعدد خلفا کا زمانہ پایا، مگر اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے کبھی ان کے پاس نہیں گئے، خصوصیت سے مہدی ان کا بہت قدردان تھا، اوپر ذکر آچکا ہے

---

[1] صفوۃ الصفوۃ

کہ ایک بار اس نے ان کو کچھ زمین دی اور تیس ہزار درہم نقد تحفۃً دیئے مگر انھون نے نہ تو زمین سے فائدہ اٹھایا اور نہ اس رقم کو اپنے مصرف مین لائے۔ بلکہ یہ پوری رقم فقراء مین تقسیم کردی۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ امام شعبہ کے دو بھائی بڑے مالدار تھے، ایک بار انھون نے خلیفہ مہدی سے کئی ہزار دینار کا غلہ خریدا، اتفاق سے اس مین ان کو گھاٹا ہوا، اور وہ غلہ کی رقم حسب وعدہ مہدی کو ادا نہ کرسکے۔ عدم ادائیگی کے جرم مین ایک بھائی کو سزا ہوگئی۔ امام شعبہ کو جب اطلاع ہوئی تو ان کو بہت رنج ہوا۔ اور انکی زندگی مین یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اپنے بھائی کی رہائی کے لیے دربار خلافت مین گئے۔ وہ اس کے پاس پہونچے اور کچھ ایسے اشعار پڑھے جن مین اپنے مدعا کی طرف اشارہ تھا۔ مہدی سمجھ گیا۔ اور بولا کہ ابو بسطام اس بارے مین کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہین ہے، آپ جس مقصد کے لیے تشریف لائے ہیں اسے ابھی پورا کئے دیتا ہون، یہ کہکر اس نے فوراً حکم دیا کہ امام شعبہ کے بھائی کو ان کے ساتھ کردو۔ اور ان سے کوئی مطالبہ نہ کیا جائے۔

امام شعبہ دربار خلافت مین دنیاطلبی یا کسی وجاہت کے حصول کے لیے نہین گئے تھے، مگر پھر بھی یہ واقعہ بالکل انوکھا تھا۔ اس لئے اس پر چہ میگوئیان شروع ہوگئین، خاص طور سے اہل عزیمت علماء جو دربار سے کسی طرح کے تعلق کو پسند نہین کرتے تھے، ان کیلئے یہ خبر بڑی افسوس ناک تھی، چنانچہ امام سفیان ثوری کو جب اطلاع ملی تو انھون نے کہا کہ لیجئے یہ امام شعبہ بھی خلفاء کے پاس پہونچنے لگے، جب امام شعبہ کو اس بات کی اطلاع ہوئی بولے کہ ہان سفیان کو کبھی بھائی کی گرفتاری کا صدمہ نہین پیش آیا ہے، مقصد یہ تھا کہ انتہائی مجبوری کی بناپر مین دربار خلافت مین گیا اگر ویسی مجبوری ان کو بھی پیش آجاتی تو وہ بھی جانے پر مجبور ہوتے۔

وفات | ۱۶۰ھ مین ۷۷ برس کی عمر مین بصرہ مین وفات پائی۔ ان کی وفات کی خبر سفیان ثوری کو پہونچی تو بولے کہ مات الحدیث حدیث کا علم آج ختم ہوگیا۔

خاندان | خطیب بغدادی نے ان کے ایک لڑکے سعد اور دو بھائی حماد و شاد کا ذکر کیا ہے، ان کے خاندان مین علم و فضل کا چرچا انہی کی ذات سے شروع ہوا اور غالباً انہی پر ختم بھی ہو گیا،

زرین اقوال | ان کے دو چار زرین اقوال جو تذکرون مین ملتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس طرح کے نہ جانے کتنے ایسے مقولے ان کی زبان سے نکلے ہوں گے۔ فرماتے تھے کہ عقل کے اعتبار سے لوگ تین طرح کے ہوتے ہیں، کچھ لوگ ہوتے ہیں جن کی عقل ان کے ساتھ رہتی ہے، اور کچھ لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان کی عقل ہمیشہ ان سے دور رہتی ہے، اور بعض لوگ عقل سے بالکل کورے ہوتے ہیں، جن مین پہلے گروہ کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ بات کرنے ہی سے پہلے سوچ لیتے ہیں کہ ان کو کیا کہنا ہے[1]

انکے عہد مین حدیث کا چرچا اتنا زیادہ ہو گیا تھا کہ لوگون کی توجہ قرآن کی طرف سے قدرے کم ہو گئی تھی، انکو جب اسکا احساس ہوا تو وہ لوگوں سے برابر کہا کرتے تھے کہ اگر تم حدیث سے بہت زیادہ شغف رکھو گے تو پھر قرآن کے علم مین پیچھے رہ جاؤ گے۔ مقصد یہ ہے کہ دونون دین کے سرچشمے ہیں۔ اس لئے ان دونون سے برابر فائدہ اٹھانا چاہئے۔

امام شعبہ کے اس جملہ سے دینی تاریخ کے ایک بہت بڑے حادثہ کا پتہ چلتا ہے۔ وہ یہ کہ دوسری صدی مین جتنا عام چرچا اور شغف حدیث سے رہا ہے قرآن سے اس کا دسوان حصہ بھی نہین تھا، خالص حدیث کی تحدیث و روایت کے لیے ایک دو نہین بلکہ سینکڑون مجلسین برپا تھین۔ لیکن خاص طور سے قرآن کی تعلیم و تفسیر کے لیے مشکل سے دو چار مجالسِ درس قائم تھین۔

تصنیف | یہی وجہ ہے کہ انھون نے علمِ قرآن کی ترویج کیلئے خود ایک تفسیر لکھی، صاحب کشف الظنون نے تفسیر شعبہ کے نام سے اس کتاب کا ذکر کیا ہے، صاحب مفتاح السعادہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے، اسوقت اسکے موجود ہونے کا کوئی علم نہین ہے مگر اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسری صدی کے ابتدائی زمانہ ہی سے علم تفسیر کی بھی تدوین شروع ہو گئی تھی اور غالباً علم تفسیر پر پہلی کتاب تھی۔

---

[1] یہ مقولہ پورا تذکرون مین منقول نہین ہے۔

مسعر بن کدام

نام و نسب | مسعر نام، ابوسلمہ کنیت، نسب نامہ یہ ہے، مسعر بن کدام بن ظہیر بن عبید اللہ بن حارث ابن عبید اللہ بن عمرو بن عبد مناف بن ہلال بن عامر بن صعصعہ قرشی عامری۔

فضل و کمال | مسعر علمی اور مذہبی دونوں کمالات کے اعتبار سے ممتاز ترین تبع تابعین میں تھے، یعلی بن مرہ کا بیان ہے کہ مسعر کی ذات علم اور ورع دونوں کی جامع تھی[1]۔ عراق میں ان کے پایہ کے علماء کم تھے، ہشام بن عروہ کا بیان ہے کہ عراقیوں میں مسعر اور ایوب سے افضل ہمارے یہاں کوئی نہیں آیا[2]۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ ان کی جلالت پر سب کا اتفاق ہے[3]۔

حدیث | حدیث کے وہ اکابر حفاظ میں سے تھے۔ امام ذہبی انھیں حافظ اور علمائے اعلام میں لکھتے ہیں[4]، ان کے حافظہ میں ایک ہزار حدیثیں محفوظ تھیں[5]۔

حدیث میں انھوں نے عمرو بن سعید نخعی، ابواسحٰق سبیعی، عطاء، معن، سعید بن ابراہیم، ثابت بن عبد اللہ انصاری، عبد الملک بن عمیر، بلال بن جناب، حبیب بن ابی ثابت، علقمہ بن مرثد، قتادہ، معن ابن عبد الرحمٰن، مقدام بن شریح اور اعمش وغیرہ ایک کثیر جماعت سے استفادہ کیا تھا[6]،

ان کی مرویات کا پایہ | ان کی روایات کی صحت کے لیے یہ کافی ہے کہ شعبہ جیسے محدث انھیں مصحف کہتے تھے[7]

۸۹

۱؎ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۷۰ ۲؎ تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۱۱۴ ۳؎ تہذیب الاسماء ج اول ق اول ص

۴؎ تذکرۃ الحفاظ ج اول ص ۱۶۹ ۵؎ ایضاً ۶؎ تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۱۱۳ و تہذیب الاسماء

۷؎ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۹،

ان کی ذات احادیث کی جانچ کے لیے معیار تھی۔ میزان ان کا لقب ہوگیا تھا[1]۔

کم ایسے محدثین نکلیں گے جن کی مرویات پر کسی نہ کسی حیثیت سے تنقید کی گئی ہو۔ لیکن مسعر کی ذات اس سے مستثنیٰ تھی[2]۔

ائمہ حدیث شک اور اختلاف کے موقع پر ان کی طرف رجوع کرتے تھے، سفیان ثوری کا بیان ہے کہ جب ہم لوگوں میں (حدیث کی) کسی چیز کے بارہ میں اختلاف ہوتا تھا، تو مسعر سے پوچھتے تھے[3]۔ ابراہیم بن سعد کہتے تھے کہ جب سفیان او شعبہ میں کسی حدیث کے بارہ میں اختلاف ہوتا تھا تو میزان یعنی مسعر کے پاس جاتے تھے[4]۔

احتیاط | اس محدثانہ کمال کے باوجود وہ روایت حدیث میں بڑے محتاط تھے، اس ذمہ داری سے وہ اس قدر گھبراتے تھے کہ فرماتے تھے کہ کاش حدیثیں میرے سر پر شیشوں کا بار ہوتیں کہ گر کر چور چور ہو جاتیں[5]، ان کی احتیاط شک کے درجہ تک پہنچ گئی تھی، ابونعیم کا بیان ہے کہ مسعر اپنی احادیث میں بڑے شکی تھے لیکن وہ کوئی غلطی نہ کرتے تھے۔ اعمش کہا کرتے تھے کہ مسعر کا شیطان انکو کمزور کر کے شک دلاتا رہتا ہے[6]۔

ان کے اس شک نے ان کی احادیث کا درجہ اتنا بلند کر دیا تھا کہ محدثین ان کے شک کو یقین کا درجہ دیتے تھے، اعمش سے بعض لوگوں نے کہا کہ مسعر اپنی حدیثوں میں شک کرتے تھے، انھوں نے کہا ان کا شک اوروں کے یقین کے برابر ہے[7]۔

فقہ | فقہ میں کوئی قابل ذکر شخصیت نہ تھی۔ تاہم کوفہ کے صاحب افتا جماعت میں تھے[8]۔

امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب سے تعلق خاطر | یہ امام ابو حنیفہ کے حلقۂ تلامذہ میں تو نہ تھے، مگر ان کی ذات

---

[1] تہذیب ج ۱۰ ص ۱۱۴ [2] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۱۱۴ [3] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۸۹ [4] تذکرۃ الحفاظ ج اول ص ۱۷۰ [5] تذکرۃ الحفاظ ج اول ص ۱۷۱ [6] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۱۱۴ [7] تذکرۃ الحفاظ ج اول ص ۱۶۹ [8] اعلام الموقعین ص ۲۸

اور ان کے اصحاب سے ان کو بڑا تعلق خاطر تھا، اور ان کے علم وفضل کے مداح تھے۔ کوفہ میں امام ابو حنیفہ کے حلقۂ درس کے قریب ہی ان کا حلقۂ درس بھی تھا، بسا اوقات درس سے فارغ ہو کر استفادہ کی غرض سے امام اور ان کے اصحاب کی مجلسِ درس میں شریک ہو جایا کرتے تھے۔ ان کے بعض تلامذہ کو یہ چیز ناگوار ہوئی اور انھوں نے ان سے کہا کہ ہم تو آپ سے احادیث رسول کے سماع کے لئے آتے ہیں اور آپ اہل بدعت (یعنی امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب) سے سماع کرتے ہیں۔ یہ سن کر انکو غصہ آگیا فرمایا کہ درس سے اٹھ جاؤ اگر ان میں کا کوئی معمولی آدمی بھی زمانۂ حج کے پورے مجمع میں پہنچ جائے تو ان کے دامن کو علم سے بھر دے[1]۔

حلقۂ درس | مسجد میں حلقۂ درس تھا، عبادت کے معمولات کے بعد روزانہ مسجد میں بیٹھ جاتے تھے اور شائقین علم حدیث اگرد حلقہ باندھ کر استفادہ کرتے تھے[2]۔

زہد وعبادت | ان کی ماں بڑی عابدہ خاتون تھیں۔ ان کے فیض تربیت کا مسعر پر بڑا گہرا اثر پڑا تھا ان کی ماں بھی مسجد میں نماز پڑھتی تھیں۔ اکثر دونوں ماں بیٹے ایک ساتھ مسجد جاتے، مسعر نمدہ لئے ہوتے تھے، مسجد پہنچکر ماں کے لیے نمدہ بچھا دیتے۔ جس پر کھڑی ہو کر وہ نماز پڑھتیں، مسعر مسجد کے دوسرے حصہ میں نماز میں مشغول ہو جاتے۔ نماز تمام کرنے کے بعد ایک مقام پر بیٹھ جاتے اور شائقین حدیث آکر جمع ہو جاتے، مسعر انھیں حدیثیں سناتے، اس درمیان میں ان کی ماں عبادت سے فارغ ہو جاتیں، مسعر درس ختم کرنے کے بعد ماں کا نمدہ اٹھاتے اور ان کے ساتھ گھر واپس آتے[3]، ان کے صرف دو ٹھکانے تھے، گھر یا مسجد[4] کثرتِ عبادت سے پیشانی پر اونٹ کے گھٹے کی طرح نمایاں موٹا گھٹا پڑ گیا تھا[5]۔

---

[1] مناقب مکی جلد ۲ صفحہ ۱۶۶ [2] ابن سعد جلد ۶ صفحہ ۲۵۳، ۱۰۵، [3] ابن سعد جلد ۶ صفحہ ۲۵۳، [4] ایضاً ص ۲۵۴ [5] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۱۷۰

روزانہ شب کو نصف قرآن تمام کرڈالتے تھے۔ ان کے صاحبزادے محمد کا بیان ہے کہ والد آدھا قرآن ختم کئے بغیر نہ سوتے تھے[1] تلاوت قرآن ختم کرنے کے بعد چادر لپیٹ کر سو جاتے، ایک ہلکی سی جھپکی لینے کے بعد پھر اس طرح چونک پڑتے جیسے کسی کی کوئی چیز کھو گئی ہو اور وہ پریشان ہو کر اس کی تلاش کر رہا ہو، اٹھکر وضو اور مسواک کرتے پھر نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے یہاں تک کہ نماز فجر کا وقت ہو جاتا تھا مگر اس زہد و عبادت کو انتہائی مخفی رکھتے تھے۔ ان کے صاحبزادے کا بیان ہے کہ

وکان یجتہد علی اخفاء ذالک جدًا — وہ اس زہد و عبادت کو انتہائی مخفی رکھتے تھے۔

(صفوۃ الصفوۃ ج ۳ ص ۷۲)

آخرت کا خوف اور رقت قلب آخرت کی باز پرس سے ہر وقت ترسان اور لرزاں رہتے تھے۔ ان کے ایک بڑے کا بیان ہے کہ ایک دن یکایک مسعر پر گریہ طاری ہو گیا۔ ان کی یہ کیفیت دیکھ کر ان کی والدہ بھی رونے لگیں۔ مسعر نے پوچھا اماں جان! آپ کیوں رو رہی ہیں۔ بولیں بیٹا! میں نے تم کو روتے دیکھا اس لئے میں بھی رو پڑی۔ بیٹے نے کہا اماں! کل جو کچھ پیش آنے والا ہے اس کے تصور سے میں اس قدر روتا ہوں۔ پوچھا وہ کیا۔ اس پر مسعر پھر پھوٹ پڑے اور روتے ہوئے جواب دیا کہ اماں! قیامت اور اس کی ہولناکی۔ یہ کہہ کر ماں کے پاس سے اٹھے اور چلے گئے تاکہ ان کی اس کیفیت سے ان کو مزید رنج نہ پہونچے۔

ابن جوزی نے لکھا ہے کہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اور نماز پڑھتے ہر وقت ان پر رقت طاری رہتی تھی۔ (صفوۃ الصفوۃ ص ۷۳)

وہ اس درجہ پر پہونچنے کے بعد بھی رکے نہیں بلکہ ان کے روحانی مدارج ہمیشہ ترقی پذیر رہے، ابن عیینہ کا بیان ہے کہ میں نے مسعر کو خیر میں ہر روز ترقی کرتے دیکھا۔[2] معن کا بیان ہے کہ ہم نے ان کا ہر دن

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج اول ص ۱۷۰، [2] ایضاً ص ۱۷۱۔

پہلے دن سے افضل پایا، وہ عبادت وریاضت اور فضائلِ اخلاق کے اس درجہ پر پہنچ گئے تھے کہ لوگ ان کے جنتی ہونے میں کوئی شک نہ کرتے تھے، حسن بن عمارہ کہا کرتے تھے کہ اگر مسعر جیسے آدمی بھی جنت میں داخل نہ ہوں گے تب تو جنتیوں کی تعداد بہت ہی کم ہوگی[1]

ابن مبارک یا اسی درجہ کے کسی اور بزرگ نے ان کے فضائل سے متاثر ہوکر ان کی شان میں یہ اشعار کہے تھے[2]

من کان ملتمساً جلیساً صالحاً	فلیأت حلقة مسعر بن کدام
جس شخص کو اچھے جلیس کی تلاش ہو۔	اس کو مسعر بن کدام کے حلقہ میں آجانا چاہئے
فیہا السکینة والوقار واہلہا	اہل العفاف وعلیة الاقوام
اس میں سکینہ ہوا اور وقار ہے اور اس کے ارکان	پاکباز اور اونچے درجے کے ہیں۔

دولتِ دنیا سے بے نیازی اس زندگی کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ وہ دنیا اور اس کے شان وشکوہ سے بالکل بے نیاز تھے، چنانچہ حکومت کے عہدوں کو وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے، ابوجعفر عباسی آپ کا عزیز تھا، اس نے ان کو کسی مقام کا والی بنانا چاہا، انھوں نے کہا کہ میرے گھر والے تو مجھے دو درہم کا سودا لانے کے لائق بھی نہیں سمجھتے، اور کہتے ہیں ہم تمھارا دو درہم کا سودا کرنا بھی نہیں پسند کرتے۔ اور تم مجھے والی بنانا چاہتے ہو، خدا تم کو صلاحیت دے، ہماری قرابت داری ہے اس لئے ہمارا حق ہے (کہ ہم بھی کچھ کہہ سکیں) ان کے اس عذر پر ابوجعفر نے ان کو اس خدمت سے معاف کردیا[3]

وفات باختلافِ روایت ۱۵۲ھ یا ۱۵۵ھ میں کوفہ میں وفات پائی[4]۔ مرض الموت میں حضرت سفیان ثوری جو خود صاحب زہد واتقا تھے، ملنے گئے۔ تو دیکھا کہ مسعر پر گھبراہٹ اور رقت طاری ہے، بولے! آپ کے اوپر موت کی گھبراہٹ طاری ہے، حالانکہ میں تو ہر وقت موت کے لیے تیار رہتا ہوں

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج اول ص ۱۶۹ [2] ایضاً ص ۱۷۱ [3] ایضاً ص ۱۷۰ [4] ایضاً۔

اور اس وقت بھی تیار ہوں۔ مسعر نے حاضرین سے کہا کہ انکو بٹھاؤ حضرت سفیان بیٹھ گئے۔ اور پھر وہی بات دہرائی، مسعر بولے کہ آپ کو اپنے اعمال پر اعتماد ہے اس لئے آپ مطمئن ہیں۔ مگر میری کیفیت تو یہ ہے کہ میں اپنے کو ایک پہاڑ کی چوٹی پر سمجھتا ہوں اور نہیں جانتا کہ یہاں سے کس طرح اور کہاں گرایا جاؤں گا۔ یہ پر درد الفاظ سن کر حضرت سفیان کی آنکھیں بھی نم ہوگئیں۔ اور فرمایا کہ آپ مجھ سے بھی زیادہ خدا سے ڈرنے والے ہیں[1]

عادات و اخلاق نہایت خوش اخلاق تھے۔ دوسروں کے جذبات کا بڑا لحاظ رکھتے تھے جب کبھی کوئی انھیں ایسی حدیث سناتا جس سے وہ خود اس شخص سے زیادہ واقف ہوتے تو وہ محض اس کی دلشکنی اور احترام حدیث کے خیال سے انجان بن کر نہایت خاموشی سے سنتے تھے[2]۔ زیادہ بولنا پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ عادت عنفوان شباب ہی سے پیدا ہوگئی تھی۔ ماں کی خدمت اور ان کا حد درجہ احترام کرتے تھے۔

ایک بار ماں نے عشا بعد پانی مانگا وہ پانی لے کر آئے تو وہ سو چکی تھیں۔ انھوں نے جگانا مناسب نہ سمجھا اور پوری رات کھڑے رہ گئے کہ نہ جانے کس وقت ماں کی نیند ٹوٹ جائے۔ (طبقات شعرانی)

حکیمانہ اقوال فرماتے تھے کہ میں پسند کرتا ہوں کہ محزون و غمگین آواز سنوں اس لئے کہ اس سے موت اور آخرت کا تصور سامنے آتا ہے (بخلاف قہقہے اور چہچہے کے سننے سے آدمی کے اندر خدا سے غفلت پیدا ہوتی ہے۔)

فرماتے تھے کہ آدمی کے نفس کا جو تقاضا بھی ہوتا ہے اس کے اوپر وہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہ گویا ترجمہ ہے۔ اس حدیث کا

الاثم ما حاک فی نفسک   گناہ وہ ہے جو آدمی کے دل میں کھٹکے۔

---

[1] صفوۃ الصفوہ ج ۳ ص ۳، [2] ابن سعد ج ۶ ص ۲۵۳۔

کسی نے ان سے کہا کہ آپ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ کوئی آپکے عیوب آپکے سامنے بیان کرے، فرمایا ہاں اگر وہ خیر خواہی کی بنا، پر بیان کرتا ہے تو میں اس کو پسند کروں گا۔ اور اگر مقصد محض شماتت ہے تو پھر نہیں پسند کروں گا۔

اکثر حزنیہ اور آخرت کا تصور دلانے والے اشعار ان کی زبان پر ہوتے تھے۔ مثلاً۔

الا قد فسد الدھر — فاضحی حلوہ مرّا

زمانہ اس قدر بگڑ گیا ہے کہ — اس کی شیرینی بھی تلخ ہو گئی ہے

فالزم نفسک الیاس — من الناس تعش حرّا

لوگوں سے کوئی امید نہ رکھو — تو زندگی آزادی سے گذرے گی

تفنی اللذاذۃ ممن نال صفوتھا — من الحرام و یبقی الاثم والعار

وہ لذتیں اور آسائشیں جو حرام ذرائع سے کسی کو حاصل ہوں اور جس کے پیچھے گناہ اور ذلت بھی ہو

تبقی عواقب سوء من مغبتھا — لاخیر فی لذۃ من بعدھا النار

ان کے نتائج انجام کار برے ہی ہوتے ہیں اور اس لذت و آسائش میں کوئی خوبی اور بھلائی نہیں جس کا نتیجہ دوزخ کی آگ ہو۔

عبداللہ بن وہب

امام مالک کے جو تلامذہ ان کے علم و فضل کے وارث ہوئے اور جن کے ذریعہ مشرق و مغرب میں انکے فقہی مسلک کی ترویج ہوئی اُن میں سب سے زیادہ ممتاز اسد بن فرات، ابنِ قاسم، اشہب عبداللہ بن عبدالحکم، یحییٰ بن یحییٰ، اور عبداللہ بن وہب تھے۔

ان میں سے ہر ایک کی کچھ امتیازی خصوصیتیں اور خدمات ہیں۔ عبداللہ بن وہب چند باتوں میں ممتاز تھے، ان میں حفظ حدیث، وسعت علم، اور کثرت تصانیف خاص طور سے قابل ذکر ہیں، دیگر تصانیف کے علاوہ اُن کو موطا امام مالک کی تدوین کی سعادت بھی حاصل ہے۔ گو شہرت انکے مرتب کردہ نسخہ کے بجائے یحییٰ کے نسخہ کو ہوئی، مگر خود یحییٰ نے امام مالک کی وفات کے بعد ان کے تلامذہ میں سب سے پہلے ابن وہب ہی سے سماع موطا کیا تھا۔ اس طرح ابن یحییٰ کی تدوین میں بھی بواسطہ ان کا ہاتھ تھا۔

نام و نسب | عبداللہ نام، ابو محمد کنیت تھی، قریش کے ایک خاندان بنو فہر کے غلام تھے۔ آبائی وطن مصر تھا، اور یہیں یہ ۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے۔[1]

تعلیم | ایک مدت تک انکو حصولِ علم کا موقع نہ مل سکا یا طبیعت کا میلان نہیں ہوا۔ مگر جب ان کی عمر ۱۷ سال کی ہوئی تو حصولِ علم کا شوق ہوا، مصر میں اس وقت لیث بن سعد کے درس فقہ و حدیث کی ہر طرف شہرت تھی، ابن وہب نے بھی ان سے کسب فیض کیا، مصر میں اس وقت فقہ

---

[1] ابن خلکان ج ۱ ص ۴۴۵۔

وحدیث کی متعدد ممتاز مجلسیں موجود تھیں۔ مگر اسکے باوجود ابن وہب کے ذوقِ طلب کو تسکین نہیں ہوئی۔ اور انھون نے مکہ، مدینہ بغداد وغیرہ کا سفر کیا اور وہان کے ائمۂ علم وفضل سے استفادہ کیا۔ بغداد کے زمانۂ قیام یعنی ۱۴۶ھ مین یہ ممتاز تابعی ہشام بن عروہ کی خدمت مین حاضر ہوئے مگر ان سے کسب فیض کا موقع نہ مل سکا۔ اور اسی سال ان کا انتقال ہوگیا۔ اربابِ تذکرہ لکھتے ہیں کہ انھون نے تقریباً چارسو اربابِ فضل وکمال سے اکتساب علم کیا تھا۔[1]

ان کے طلب علم کا سب سے طویل زمانہ امام مالک کی خدمت مین گذرا تقریب بیس سال تک وہ امام کی خدمت مین رہے۔ اُن کی ذہانت وذکاوت اور غیر معمولی قوتِ حافظہ کی بنا پر امام مالک ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ایک بار کسی نے امام مالک سے تخلیلِ اصابع (انگلیون مین خلال) کے بارے مین اسوۂ نبویؐ دریافت کیا۔ انھون نے اس کا کوئی جواب نہین دیا۔ ابن وہب مجلس مین موجود تھے۔ بولے کہ ہاں ہمارے پاس ایک ارشادِ نبوی موجود ہے اور پھر لیث بن سعد کے واسطہ سے یہ روایت سنادی کہ "جب وضو کرو تو پیر کی انگلیون کا خلال کرلیا کرو"

اس کے بعد امام مالک سے جب کوئی شخص یہ مسئلہ پوچھتا تو اس کو انگلیوں کے خلال کا حکم دیتے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہدیتے کہ مین نے ابتک یہ روایت نہین سنی تھی یعنی اس کا علم مجھے ابن وہب کے ذریعہ ہوا ہے۔ ابن وہب جب مصر چلے جاتے اور امام مالک انکو خط لکھتے تو خط کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی،

عبد اللہ ابن وھب الی فقیہ مصر الی مفتی مصر	عبداللہ بن وہب کی طرف جو مصر کے فقیہ ومفتی ہین۔

یہ جملے نقل کرنے کے بعد اربابِ تذکرہ لکھتے ہیں۔ کہ اتنی قدر افزائی امام مالک نے کسی کی

---

[1] الانتقاء ص ۴۸ بستان المحدثین ص ۲۰ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۷۹۔

نہین کی۔[1] حالانکہ مصر مین اس وقت لیث بن سعد، ابن لہیعہ جیسے ائمۂ روزگار کے علاوہ خود امام مالک کے بیشمار صاحب علم وفضل تلامذہ موجود تھے۔

مدینہ منورہ جہاں امام مالک کا چشمۂ علم تقریباً نصف صدی جاری رہا ان کی وفات کے بعد وہاں کے ارباب علم مین جب کسی مسئلہ یا حدیث نبوی کے بارے مین اختلاف ہوتا تھا، تو وہ لوگ ابن وہب کی رائے کے منتظر رہتے تھے کہ اس کا آخری فیصلہ وہی کرین گے جب وہ حج کو تشریف لاتے تو یہ لوگ ان کی رائے دریافت کرتے اور اسی پر فیصلہ ہو جاتا تھا۔

ابن وہب نے جن ممتاز شیوخ سے استفادہ کیا تھا ان کی فہرست بہت لمبی ہے چند مشاہیر کے نام یہ ہیں۔

عمرو بن حارث، قاضی حیاۃ بن شریح ابن لہیعہ، یونس بن یزید، معاویہ بن صالح سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ وغیرہ۔

علم وفضل | ان اساتذہ کی صحبت اور اپنی فطری صلاحیت کی بنا پر زمرۂ تبع تابعین مین ممتاز حیثیت کے مالک ہو گئے جس کا اعتراف تمام معاصرین نے کیا ہے۔

امام احمد فرماتے تھے کہ ابن وہب کو قدرت نے عقل، دین اور اصلاح سب کچھ دیا تھا، وہ حدیث کی صحت کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ کسی نے کہا مگر حدیث کے اخذ کرنے مین غلطی کرتے ہیں فرمایا کہ ہان یہ بات ضرور ہے۔ مگر مین نے ان کی روایتون کے کل ذخیرہ کو جو انھون نے اپنے اساتذہ سے روایت کیا ہے پرکھا مجھے سب صحیح نظر آیا۔[3]

ابن معین فرماتے تھے کہ یہ ثقہ ہیں۔ ابو حاتم کا قول ہے کہ یہ صادق اور ان کی مرویات عمدہ ہیں،

---

[1] تذکرۃ الحفاظ و تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۷۴۔ [2] تہذیب ج ۶ ص ۷۲۔

[3] تہذیب ج ۶ ص ۷۲۔

میں ان کو ولید بن مسلم سے زیادہ پسند کرتا ہوں۔ امام وقت ابن عیینہ جب انکا ذکر کرتے تو شیخ اہل مصر کہتے،
ابوزرعہ رازی کا بیان ہے کہ میں نے ابن وہب کی تیس ہزار حدیثوں کو بنظرِ غائر دیکھا مگر مجھے اس میں ایک
حدیث بھی ایسی نہیں ملی جس کی کوئی بنیاد نہ ہو، یہ واقعی ثقہ تھے، ابن حبان کہتے ہیں کہ حجاز اور مصر کے اہل
علم میں احادیثِ نبوی کا جو ذخیرہ پھیلا ہوا تھا۔ اس کو انھوں نے یاد کیا پھر اس کو جمع کر کے مدون و
مرتب کیا، حتی کہ ان کے مسانید و مقاطیع[1] سب کو جمع کر ڈالا۔ میں نے ان کے ذخیرۂ روایات میں
کوئی منکر روایت نہیں دیکھی۔[2]

حارث بن مسکین ان کو "دیوان العلم" ذخیرۂ علم کہا کرتے تھے۔ امام مالک کے مشہور شاگرد
ابن قاسم کہتے تھے کہ اگر ابن عیینہ کا انتقال ہو گیا تو اہلِ علم کی سواریاں مکہ کے بجائے مصر ابن وہب
کے پاس جایا کریں گی، حدیث کی جمع و تدوین کا جو کام ابن وہب نے کیا کسی نے نہیں کیا، انکے
سامنے بڑے بڑے اربابِ علم کی گردنیں جھک جاتی تھیں۔ ابن سعد نے ان کو کثیر العلم اور ثقہ
لکھا ہے، محمد بن عبد اللہ کہتے تھے کہ ابن وہب ابن قاسم سے زیادہ فقیہ تھے مگر غایت احتیاط سے
فتوے نہیں دیتے تھے۔[3] ابن قاسم سے ان کو افقہ قرار دینا بڑی اہمیت رکھتا ہے ابن قاسم کا تفقہ
ضرب المثل ہے، اسی طرح کی رائے یحییٰ بن بکیر نے بھی دی ہے (ذہبی)

ان کو کثرت سے احادیثِ نبوی یاد تھیں۔ امام ذہبی نے لکھا ہے کہ ایک لاکھ روایتیں انکے
نوک زبان تھیں۔ ان کی تصانیف کے ذریعہ تقریباً سوا لاکھ روایتیں مدون ہو گئیں۔[4]

جامعیت | یہ محض راوی حدیث ہی نہیں تھے، بلکہ حدیث نبوی کے مسائل کے اجتہاد اور استنباط کی
صلاحیت بھی انہیں موجود تھی، امام ذہبی نے انکو حافظ حدیث کے ساتھ مجتہد بھی لکھا ہے، حدیث کے

---

[1] مقطوع جس کی سند تابعی پر ختم ہو [2] یہ تمام اقوال تہذیب ج ۶ ص ۷۲ سے لئے گئے ہیں۔ [3] ایضاً
[4] تذکرہ ج ۱ ص ۲۷۸۔

علاوہ اُن کو حدیث اور مغازی مین بھی درک تھا۔ کسی نے امام مالک سے ابن قاسم اور ابن وہب کے علم وفضل کے بارے مین پوچھا تو فرمایا ابن قاسم فقیہ اور یہ عالم ہین۔ مقصد یہ تھا کہ ابن قاسم کو علوم دینیہ کے ایک شعبہ فقہ مین درک ہے اور ابن وہب کے علم مین وسعت و ہمہ گیری تھی۔[1]

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے بستان المحدثین مین ابن وہب کا تذکرہ تدوین موطا کے سلسلہ مین کیا ہے، اس مین وہ لکھتے ہین:۔

> عبداللہ ابن وہب اپنے زمانے مین حجت تھے، تمام لوگ ان کی مرویات پر کمال وثوق اور اعتماد رکھتے تھے، وہ کسی کی تقلید نہین کرتے تھے بلکہ خود مجتہد تھے، البتہ طریقۂ اجتہاد وتفقہ مین وہ امام مالک اور لیث بن سعد کا اتباع کرتے تھے (ص ۱۷)

جرح وتنقید اس فضل وکمال کے باوجود بعض اہلِ علم اُن کی مرویات اور طریقۂ اخذ روایت پر تنقید کرتے ہین۔ اوپر امام احمد کا ارشاد گزر چکا ہے کہ وہ اخذ روایت مین غلطی کرتے تھے، نسائی کہتے تھے کہ وہ قبول روایت مین کچھ تساہل ضرور برتتے تھے، مگر ان کی مرویات کو قبول کرنے میں کوئی حرج نہین ہے، ساجی کا بیان ہے کہ یہ سماعی حدیثون کے بارے مین کچھ متساہل واقع تھے اور یہ تساہل اس وجہ سے تھا کہ اہلِ مصر اجازتِ حدیث کو تحدیث کے لیے کافی سمجھتے تھے، (چنانچہ ان روایتون کو جو اجازۃً ان کو پہونچی ہیں) انکو حدثنی فلان وغیرہ الفاظ سے بیان کرتے تھے (حالانکہ یہ الفاظ سماع کے لیے مخصوص ہین) اس سے معلوم ہوا کہ اخذ روایت مین انپر جو تساہل کا الزام لگایا گیا ہے اس کا مدار اہل مصر اور اہل حجاز کے طریقۂ اخذ روایت کے اختلاف پر ہے

---

[1] بستان المحدثین ذکر ابن وہب، [2] محدثین کی اصطلاح مین ان روایتون جن کو شیخ سے سنا نہ ہو بلکہ شیخ کی اجازت سے روایت کر رہا ہو، اس کو حدثنا یا حدثنی کے لفظ سے روایت نہ کرنا چاہئے۔ [3] تہذیب ج ۶ ص ۷۴۔

دُنہ وہ تحدیثِ روایت مین حد درجہ محتاط تھے۔ ایک بار کسی نے ان سے کہا کہ فلان شخص آپ کے واسطہ سے یہ روایت کرتا ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فتنون کو برا نہ سمجھو اس سے منافقین کی جڑ کٹ جاتی ہے" یہ سنکر انکو غصہ آگیا اور فرمایا کہ اے اللہ اگر یہ جھوٹا ہے تو اس کو اندھا کردے چنانچہ ان کی دعا مقبول ہوگئی اور وہ اندھا ہوگیا[1]۔

حلقۂ درس امام مالک کی وفات کے بعد موطا کی سماع کے لئے سب سے پہلے تشنگانِ علم نبوی انہی کی طرف متوجہ ہوئے، خود یحیٰی نے جو موطا کے متداول نسخہ کے مرتب ہیں، اس کا ایک حصہ جو امام مالک سے وہ سماع نہین کر سکے تھے ان سے پورا کیا[2]۔

امام مالک کے مشہور شاگرد سحنون کا بیان ہے کہ ابن وہب نے پورے سال کو تین کامون کے لئے تقسیم کر دیا تھا جس مین چار ماہ درس و تدریس کے لیے مخصوص[3] تھے، ان کو یہ فخر بھی حاصل تھا کہ خود ان کے اساتذہ مین لیث اور امام مالک نے ان سے روایتین کی ہین۔ مثلاً انگلیوں کے خلال کے سلسلہ مین امام مالک کی ایک روایت کا ذکر اوپر آچکا ہے، تذکرون مین ہے کہ امام مالک نے ایک دوسری حدیث بھی ان سے روایت کی ہو وہ ہے بیع عربان کے سلسلہ مین یعنی آپ نے بیع عربان سے منع کیا ہے[4]۔

ایک دن آپ درس دے رہے تھے کہ ایک سائل آیا اور اس نے کہا کہ اے ابو محمد (آپ کی کنیت ہے) کل آپ نے جو درہم مجھکو عطا کئے تھے وہ سب کے سب کھوٹے تھے، ابن وہب نے کہا کہ بھائی ہمارے پاس عموماً ہدیے اور عاریت کی رقمین آتی ہیں، جیسی رقمین آتی ہیں ویسی ہی ہم تمکو دیدیتے

---

[1] تہذیب جلد ۶ ص ۷۴، [2] انتقاء ذکر یحیٰی ص ۵۹۔ [3] تذکرۃ الحفاظ ص ۲۷۹۔ [4] بیع عربان اسی خرید و فروخت کو کہتے ہیں جس میں خریدار کچھ رقم پیشگی بائع کو اسلئے دیتا ہے کہ اگر خرید و فروخت ہوگی تو وہ رقم محسوب ہو جائے گی جسے ایڈوانس اور بیعانہ کہتے ہیں۔

ہین۔ سائل کو اس جواب سے تسکین نہیں ہوئی وہ غصہ مین آکر برا بھلا کہنے لگا۔ یہان تک کہہ ڈالا کہ خدا کی رحمت ہو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جنہون نے یہ فرمایا کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب صدقات و خیرات کے ذرائع امت کے منافقون کے ہاتھ مین چلے جائین گے ابن وہب تو اس تلخ کلامی پر خاموش رہے مگر ایک نوجوان عراقی شاگرد کو بہت برا معلوم ہوا اور اس نے درس سے اٹھ کر اس فقیر کو ایسا طمانچہ رسید کیا کہ وہ زمین پر گر گیا۔ اس نے شور مچانا شروع کیا اور پھر آپ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ اے ابو محمد آپ کی مجلس مین لوگ ایسی حرکتین کرتے ہیں ابن وہب کو بھی یہ حرکت بری معلوم ہوئی وہ مجلس سے اٹھکر واقعہ کی تفتیش کرنے لگے۔ معلوم ہوا یہ حرکت فلان عراقی نوجوان نے کی ہے۔ آپ نے اس سے باز پرس کی وہ نوجوان بولا استاذ محترم مین نے آپ ہی کی زبان سے یہ ارشاد نبوی سنا ہے کہ

من حمی لحم مومنٍ من منافقٍ	جو شخص کسی مومن کی عزت کی حفاظت
بعث اللہ الیہ ملکاً یحمی لحمہ من النار	اس منافق سے کرے جو اس کی برائی کر رہا ہے
	تو اللہ تعالیٰ دوزخ سو اسکی حفاظت کرے گا

جب خدا نے عام مسلمانون کی حمایت مین اتنے ثواب و اجر کا وعدہ کیا ہے تو آپ تو امام و پیشوا ہیں آپ کی حمایت سے تو نہ جانے کتنا ثواب دربار الٰہی سے ملے گا۔ ابن وہب نے فرمایا کہ اگر تمھاری یہ نیت تھی تو خدا تعالیٰ تمکو اس کا بدلہ دے گا پھر فرمایا اچھا اس سلسلہ کی دوسری حدیث بھی سن لو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ کچھ ایسے مساکین ہونگے جو مالدار ہونگے جو نہ نماز کے لیے وضو کرتے ہونگے اور نہ ناپاکی دور کرنے کے لیے غسل جو مسجدون اور عیدگاہون مین جا کر اپنا فضل اور اپنی بزرگی جتا کر لوگون سے سوال کرین گے اور یہ خیال بھی ان کو ہو گا کہ یہ تو ہمارا حق ہے جو ہم لوگوں سے وصول کرتے ہیں اور اپنے اوپر خدا کا کوئی حق

نہ سمجھتے ہوں گے۔[1]

تلامذہ | جن لوگوں نے ان کے درس سے فائدہ اٹھایا ان میں چند مشاہیر کے نام یہ ہیں۔ عبد الرحمٰن ابن مہدی۔ یحییٰ بن یحییٰ، عبد اللہ بن یوسف، علی بن المدینی، یحییٰ بن بکیر، احمد بن صالح، اصبغ بن الفرج، یہ ابن وہب کے سب سے معتمد اور کثیر الروایت شاگرد ہیں، سحنون، احمد بن سعید الدارمی وغیرہ،

عہدۂ قضا سے انکار | حکومت کی عام بے راہ روی اور اس کی غیر اسلامی روش کی بنا پر عام ائمہ، تبع تابعین نے فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی مگر اس سے کسی طرح کا تعلق رکھنا پسند نہیں کیا۔ اس لیے جو ارباب فضل و کمال اس سے تعلق رکھتے تھے وہ عوام و خواص میں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے تھے، ابن وہب بھی انہی بزرگوں میں تھے جو دربار خلافت سے اپنا دامن بچائے رہے۔ اگر اس سلسلہ میں انکو کچھ مصائب بھی برداشت کرنے پڑے۔ امام ذہبی نے لکھا ہے کہ عباد بن محمد والی مصر نے ان کو بلایا۔ اور ان کے سامنے عہدۂ قضا پیش کیا۔ انھوں نے اس سے کسی طرح پیچھا چھڑایا، اور چھپ گئے عباد کو ان کے غائب ہو جانے کی اطلاع ملی۔ تو اس نے غصہ میں انکا گھر گروا دیا مگر اس کے باوجود انھوں نے اس عہدے کو قبول کرنا پسند نہیں کیا۔[2]

اس سلسلہ میں دوسری روایت ابن خلکان نے یونس بن عبد الاعلیٰ سے نقل کی ہے، وہ یہ ہے کہ خلیفۂ وقت نے خود انکو لکھا کہ آپ مصر میں عہدۂ قضا قبول کرلیں مگر آپ نے اسے پسند نہیں کیا اور روپوش ہو کر خانہ نشین ہو گئے، ایک دن وہ گھر کے صحن میں وضو کر رہے تھے کہ اسد بن سعد آ گئے انھوں نے کہا کہ کیا یہ بہتر بات نہیں تھی کہ آپ گھر سے باہر نکل کر کتاب و سنت کے مطابق لوگوں کے فیصلے کرتے (یہ اشارہ تھا عہدۂ قضا کے قبول کر لینے کی طرف) یہ سنکر ابن وہب نے سر اٹھایا اور بولے

---

[1] بستان المحدثین ذکر ابن وہب [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۷۹۔

بس تمھاری عقل اسی قدر ہے۔ کیا تمھین معلوم نہین کہ علما کا حشر انبیا کے ساتھ ہوگا۔ اور قضاۃ کا سلاطین کے ساتھ۔[1] انھون نے اس جملے مین اسوقت کے سلاطین کی غیر اسلامی روش اور اس کے انجام کی طرف کیسو بلیغ انداز مین اشارہ کیا ہے۔ پہلی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عباد والی مصر نے ان کو عہدۂ قضا پیش کیا اور دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ خود خلیفہ نے براہ راست ان کو لکھا۔ مگر ان دونون مین تضاد نہین ہے بلکہ واقعہ یہ ہوگا کہ خلیفہ نے والی مصر عباد کو لکھا ہوگا اور اُس نے ابن وہب کو بلا کر یہ حکم سنایا ہوگا۔ اور عدم تعمیل مین اس نے یہ روش اختیار کی ہوگی جیسا کہ عموماً نیچے کے افسران کرتے رہتے ہیں مگر یہ توجیہ اس وقت صحیح ہو سکتی ہے جب یہ واقعہ ۱۶۴ھ کے بعد کا مانا جائے۔ اس لئے کہ قضاۃ کا تقرر ۱۶۴ھ سے پہلے صوبون کے والیوں کے ہاتھ مین تھا۔ ۱۶۴ھ سے خود خلفا نے اپنے ہاتھ مین اسے لے لیا تھا۔[2]

زہد و عبادت

زہد و عبادت مین ممتاز تھے، خاص طور سے زیارتِ حرمین کا جذبہ اُن مین عشق کی حد تک پہونچا ہوا تھا۔ سال کے چار مہینے وہ دیارِ حبیب کی آمد و رفت مین گزار دیتے تھے، انھون نے قریب ۳۶ حج کئے تھے۔[3] دوسری عبادات کا حال بھی یہی تھا، ساجی کا قول ہے کہ

وکان من العباد

یہ عبادت گزارون مین تھے۔[4]

خوفِ خدا اور قیامت کی بازپرس کا خیال

خدا کا خوف اور قیامت کی بازپرس کا خیال ایک مومن کی نمایان صفت ہونی چاہئے، یہ چیز اس کی زندگی مین جتنی شدت کے ساتھ موجود ہوگی، اس کی زندگی اتنی ہی پاکیزہ اور صالح ہوگی، ابن وہب پر خوفِ خدا کی کیفیت ہمہ وقت طاری رہتی تھی، ذرا قیامت کی ہولناکی کا ذکر آیا اور ان کی آنکھین بہ پڑین بسا اوقات بیہوش ہو جاتے تھے، ایک بار کسی نے ان کے سامنے یہ آیت تلاوت کی۔

---

[1] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۴۹ [2] الیضاً ص ۲۴۹ [3] تذکرہ ج ۱ ص ۲۶۹ [4] تہذیب ج ۶ ص ۷۴۔

واذ یتحاجون فی النار فیقول	یاد کرو جب دوزخی (اہل کفر) ایک دوسرے
الضعفاء للذین استکبروا انا کنا	سے حجت کرین گے ایک گروہ کہے گا کہ ہم
لکم تبعاً فھل انتم مغنون عنا	نے تمھاری بات مانی تھی ذرا کچھ عذاب کو
نصیباً من النار قال الذین استکبروا	ہلکا کرو تو وہ کہین گے ہم تو خود ہی اس
انا کل فیھا۔	مین مبتلا ہین۔

آپ نے سنا تو غشی کی کیفیت طاری ہو گئی اور بہت دیر تک یہ حالت رہی، خوف خدا کی یہی شدت ان کے موت کا سبب بن گئی، انھون نے ایک کتاب اہوالِ قیامت (قیامت کی ہولناکیان) کے نام سے مرتب کی تھی، ایک دن کسی نے ان کے سامنے یہ کتاب پڑھنی شروع کی، ان پر اس دن، ۔۔۔

وفات اتنا اثر ہوا کہ وہ بیہوش ہو کر گر پڑے، اٹھا کر گھر لائے گئے اور اسی حالت مین جان بحق ہو گئے، یہ حادثہ شعبان ۱۹۷ھ مین پیش آیا سفیان بن عیینہ کو جب اس حادثہ کی اطلاع ملی تو انا للہ پڑھا اور بڑے درد و رنج مین ڈوبے ہوئے لہجہ مین فرمایا یہ عامۃ المسلمین اور خواص اہل علم دونون کا حادثہ ہے[1]۔

سیرت و کردار ان کی سیرت و کردار کے واقعات تذکرون مین بہت کم ملتے ہین مگر ایک ہی واقعہ سے ان کی سیرت کے خط و خال دیکھے جا سکتے ہین، ان کا دستور تھا کہ جب وہ کسی کی غیبت کرتے تو اس کی پاداش مین ایک روزہ رکھتے تھے، ایک دن لوگون سے کہا کہ مجھے روزہ رکھتے رکھتے ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ اب نفس کے اوپر روزون کا رکھنا شاق نہین گزرتا۔ اس لئے اب مین نے یہ طے کیا ہے کہ اب اگر کسی کی غیبت کرون گا تو ایک درہم خیرات کرون گا، چنانچہ ایک درہم کا صدقہ کرنا مجھ پر (تنگی کی وجہ سے) اتنا شاق گذرا کہ غیبت کرنے کی عادت ہی چھوٹ گئی[2]۔

شوق جہاد میدانِ جہاد کی پرشور زندگی، علم و فن کی پرسکون زندگی کے ساتھ بہت کم جمع ہوتی ہے،

---

[1] تہذیب ج ۶ ص ۴۰۸۔ [2] بستان المحدثین۔

مگر تبع تابعین مین عبداللہ بن مبارک اور ابن وہب ان دونون اوصاف کے جامع تھے، ابن وہب نے پورے سال کو تین کامون کے لیے تقسیم کر دیا تھا، چار ماہ درس وتدریس کے لیے، چار ماہ سفر حج کے لیے، چار ماہ باطل کو سرنگون اور حق کو غالب کرنے کی جد وجہد کے لیے۔[۱]

تصنیف | ابن قاسم ان کے بارے مین کہتے تھے۔ ان کے جیسا تدوین وتالیف کا کام کسی نے نہین کیا[۲] ابن خلکان نے لکھا ہے کہ

ولہ مصنفات فی الفقہ معروفۃ — علم فقہ مین ان کی تصانیف معروف ومشہور ہین

ان بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ انھون نے اپنی کافی تحریری یادگارین چھوڑی تھین مگر ارباب تذکرہ صرف ان کی دو تین کتابون کا تذکرہ کرتے ہین۔

موطا | اس مین انھون نے ان مرویات کو جمع کیا تھا جو انھون نے امام مالک سے سنی تھین۔ موطا کے جامعین ہزارون ہین مگر ان مین محض پندرہ سولہ نسخے موجود ہین۔ ان مین سب سے زیادہ اہمیت تین موطاؤن کو ہے۔ موطا امام محمد۔ موطا یحییٰ بن یحییٰ (آج کل یہی متداول ہے) اور موطا ابن وہب، غالباً انھون نے اس کا اختصار بھی کیا تھا جس کا نام موطا صغیر رکھا تھا۔ ان کی تیسری کتاب احوال قیامت ہے، اس مین انھون نے قیامت کی بازپرس اور دوزخ کی ہولناکی کا ذکر کیا ہے۔[۳]

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۷۵ [۲] ایضاً ۲۷۸ [۳] عام تذکرے اور ابن خلکان ج ۱ ص ۲۴۶ ج ۱ ص ۲۴۴۔

یحییٰ بن معین

فن حدیث کا ایک اہم شعبہ "اسماء الرجال" ہے۔ اس میں حدیث کے رواۃ پر اس حیثیت سے بحث ہوتی ہے کہ کون راوی قابلِ اعتماد ہے، اور کون ناقابلِ اعتماد۔ راوی کی اخلاقی زندگی کیسی ہے؟ اسین عقل وفہم کا ملکہ کس قدر ہے؟ اس کے علم اور قوتِ حافظہ کا کیا حال ہے؟ چونکہ ان ہی بحثوں پر حدیث کی صحت وعدم صحت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس فن مین کلام کرنے کے لیے غیر معمولی علم وفضل اور عقل وبصیرت کے ساتھ ساتھ خدا ترسی اور احساسِ ذمہ داری کی بھی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اگر کسی راوی کی جرح مین افراط کی گئی اور اس کی روایت ترک کردی گئی تو حدیثِ نبوی کی تکذیب ہوتی ہے۔ اور اگر تعدیل مین تفریط کی گئی تو اقوالِ رسول مین غلط باتون کے داخل ہوجانے کا خطرہ ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حدیثِ نبویؐ کی تحدیث وروایت کرنے والون کی تعداد تو آپ کو بیشمار ملے گی، مگر فنِ رجال کے جاننے والون کی تعداد بہت کم ملے گی۔ یحییٰ بن معین اس فن کے امام ہی نہین بلکہ امام الائمہ سمجھے جاتے ہین۔ ان کے عہد مین اس فن کے متعدد ائمہ تھے مثلاً احمد بن حنبل، ابن مدینی، سعید القطان، ابن مہدی وغیرہ۔ مگر ابن معین کو ان سب بزرگون مین ایک خاص امتیاز حاصل تھا۔

یحییٰ بن معین کے حالاتِ زندگی ان کے علم وفضل کے علاوہ اس حیثیت سے بھی قابلِ ذکر ہین کہ ان کی زندگی اسلامی معاشرہ کی مساوات اور رفعت کا صحیح مرقع ہے۔

غلام خاندان سے تھے اسلامی معاشرہ مین خواہ وہ غلام ہو یا آزاد ہر شخص کو مساوی طور پر پروان چڑھنے اور ترقی کرنے کا موقع حاصل ہوتا ہے، اس لیے یحییٰ بن معین اگرچہ ایک غلام خاندان کے فرزند تھے،

مگر اسلامی معاشرہ کی مساوات پسندی نے ان کی فطری صلاحیتوں کو پورے طور پر ابھرنے کا موقع دیا یہان تک کہ وہ بڑے بڑے آزاد علمی خانوادون کے ارباب فضل و کمال سے بھی سبقت لیگئے، اونکی غلامی ان کے اعزاز کی کسی راہ مین بھی مانع نہین ہوئی۔ ایک بار کسی نے ان سے پوچھا کہ آپ عرب خاندان سے ہین؟ بڑی بے نیازی سے فرمایا کہ

"مین عرب نہین ہون بلکہ عربون کا غلام ہون"[۵]

نام ونسب سنہ ۱۵۱ھ مین ولادت ہوئی یحییٰ نام اور ابوزکریا کنیت تھی، ان کے والد کا نام معین تھا، ان کا وطن بغداد کے مضافات مین موضع نقیا مین تھا۔ یہ عباسی حکمران منصور کے عہد حکومت مین لے کے عامل تھے۔ دنیاوی اعزاز کے ساتھ انھون نے دولت بھی کافی کمائی جو انکی وفات کے بعد یحییٰ بن معین کو ترکہ مین ملی،

تحصیل علم ابتدائی تعلیم کے بعد انھون نے اپنی ساری توجہ علم حدیث کی تحصیل کی طرف مرکوز رکھی، اور اس کے لئے اپنی جان ومال کا پورا سرمایہ لگادیا۔

خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ اپنے والد کی تمام متروکہ رقم جس کی تعداد ڈیڑھ لاکھ درہم تھی، انھون نے علم حدیث پر صرف کرڈالی۔ یہان تک کہ وہ اس قدر مفلس ہوگئے کہ پہننے کے لئے جوتے نہین رہ گئے۔

شیوخ حدیث کسی علم کے حاصل کرنے مین اس علم کے اساتذہ اور ماہرین کی صحبت اور ان سے اکتساب فیض کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے یحییٰ بن معین کے شیوخ حدیث پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت کے تمام ائمۂ علم وفن سے مستفید ہوئے تھے۔ چند مشاہیر کے نام یہان درج کئے جاتے ہین:۔

عبد السلام بن حرب، عبد اللہ بن مبارک، یحییٰ بن سعید القطان، وکیع بن جراح
عبد الرحمن بن مہدی، حفص بن غیاث، سفیان بن عیینہ، عبد الرزاق، ہشام بن یوسف وغیرہ

۵۔ تاریخ بغداد ص ۸۰، ج ۱۴۔

کتابت حدیث | وہ صرف حدیث کے سماع پر اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ سنی ہوئی حدیثوں کو لکھ لیا کرتے تھے، علی بن المدینی ذکر کرتے ہیں کہ حدیث کی جتنی کتابت یحییٰ بن معین نے کی کسی دوسرے محدث نے نہیں کی۔ خود ابن معین فرماتے تھے کہ میں نے اپنے ہاتھ سے لاکھوں حدیثیں لکھی ہیں۔[۵] پھر یہی نہیں کہ سرسری طور پر جس حدیث کو سن لیتے لکھ لیتے بلکہ اسپر کافی غور و خوض کرتے۔ اس غور و خوض میں بعض وقت ایک ایک روایت کو پچاس پچاس مرتبہ لکھتے تھے۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے کہ اگر ہم کسی روایت کو بار بار لکھتے اور کاٹتے نہیں تو اس کے مغز سخن کو نہیں سمجھ پاتے،[۶]

ابن سعد کا بیان ہے کہ یحییٰ بن معین کتابت حدیث میں معروف تھے،

تلامذہ | تحصیل علم کے بعد وہ اپنا بیشتر وقت رواۃ حدیث کی جرح و تعدیل اور متنِ حدیث کی صحت و عدم صحت پر غور کرنے میں صرف کرتے تھے۔ اس لیے خود ان کو تحدیثِ روایت کا موقع بہت کم ملتا تھا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ وہ قریب قریب حدیث کی روایت نہیں کرتے تھے۔[۳] تاہم ان سے اہل علم کی ایک کثیر تعداد مستفید ہوئی۔ جن میں بڑے بڑے ائمہ شامل ہیں مثلاً امام احمد بن حنبل، ابوزرعہ رازی۔ ابویعلی الموصلی، امام بخاری، امام مسلم، اور امام ابوداؤد وغیرہ،

یحییٰ بن معین کا اصلی کارنامہ | حدیث نبوی کی تحدیث و روایت بڑی ذمہ داری کا کام تھا۔ اس لئے عہد صحابہ تک اس پر قانونی اور اخلاقی دونوں طرح کی پابندی عائد تھی۔ اس لئے ہر شخص اس کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

حضرت عمرؓ کے سامنے جب کوئی نئی حدیث بیان کی جاتی تو وہ اکابر صحابہ تک سے شہادت طلب کرتے تھے۔ اس قانونی پابندی کے ساتھ عہد صحابہ تک روایتِ حدیث کی اہمیت اور اس کی

---

[۱] بعض روایتوں میں چھ لاکھ بعض روایتوں میں بارہ لاکھ اور بعض میں ایک لاکھ کی تعیین کی گئی ہے، مگر اسطرح کی تعیین عموماً بالکل صحیح نہیں ہوتی۔ اس لئے ہم نے مجملاً لکھا ہے [۲] تذکرۃ الحفاظ، تہذیب ج ۱۱ ص ۲۸۲ [۳] ایضاً

ذمہ داری کا احساس بھی عام تھا۔ بعض جلیل القدر صحابہ تک اس احساس ذمہ داری کی بنا پر تحدیث روایت سے گریز کرتے تھے کہ مبادا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی غلط بات نہ منسوب ہو جائے[1]

ان ہی خلاقی اور قانونی بندشوں کا اثر یہ تھا کہ بہت کم لوگ روایت حدیث کی جرات کرتے تھے مگر بعد میں نہ تو قانونی گرفت باقی رہی اور نہ وہ پہلا سا اخلاقی اثر ہی رہا پھر رواۃ حدیث کو معاشرہ میں ایک عزو شرف کی نگاہ سے بھی دیکھا جاتا تھا۔ اس لئے اہل اور صاحب کمال لوگوں کے ساتھ بہت سے نا اہل بھی اس مجد و شرف میں سہیم و شریک بننے کے لئے اس منصب پر متمکن ہو گئے۔ اور انھوں نے نہایت ہی غیر ذمہ دارانہ طور پر حدیث نبوی کی روایت شروع کر دی، خصوصیت سے پیشہ ور واعظوں اور قصہ گویوں نے گرمیٔ مجلس کی خاطر نہ جانے کتنی بے سروپا روایتیں بیان کرنی شروع کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیشمار غلط باتیں یا صحیح باتیں غلط طریقہ پر رواج پا کر زبان زد خاص و عام ہو گئیں یہ ایسا فتنہ تھا کہ اگر اس کے سد باب کی فوری طور پر فکر نہ کی جاتی تو نہ جانے اس کے نتائج کتنے برے نمودار ہوتے، حکومت وقت اس فتنہ کو بڑی آسانی سے دبا سکتی تھی، مگر اس کو اس کی بہت زیادہ فکر نہیں تھی، امت احمدیہ ان محدثین اور علماء کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی جنھوں نے اپنی خداداد فہم و بصیرت سے اس فتنہ کی اہمیت کو بروقت سمجھ لیا اور ہمت و جراءت کر کے اس کے مقابلہ کے لئے میدان میں آ گئے،

یہ کام پہلی صدی کے آخر ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ مگر دوسری صدی میں محدثین نے جس کے سرخیل ابن معین تھے باقاعدہ ایک نئے فن کی بنیاد ڈال کر اس فتنہ کا بڑی حد تک سد باب کر دیا۔ اسی فن کو فن اسماء الرجال کہتے ہیں۔ اس میں انھوں نے سند حدیث کے کچھ اصول و قوانین مرتب کئے۔ رواۃ کے لئے سیرت و کردار کا ایک معیار مقرر کیا۔ اب جو لوگ اس پر پورے اترتے تھے انکی روایتیں قبول کی جاتی تھیں، اور

---

[1] یہ احساس ذمہ داری اس ارشاد نبوی کی بناء پر تھا کہ جو شخص میری طرف کوئی غلط بات منسوب کرے گا اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔

جو لوگ اس میزان پر پورے نہیں اترتے تھے ان کی روایتیں رد کردی جاتی تھیں. لیکن صرف اصول وقوانین مرتب کردینے سے بھی اس فتنہ کا پورے طور پر سدباب نہیں ہوسکتا تھا. ضرورت تھی کہ ان غلط روایتوں کو جو عوام میں رواج پا چکی تھیں. ان میں سے ایک ایک روایت نیز اس کے راوی کو پرکھ کر دیکھا جائے کہ روایت کا کتنا حصہ صحیح اور کتنا غلط ہے. وہ راوی ذمہ دار ہے یا غیر ذمہ دار ظاہر بات ہے کہ یہ کام آسان نہ تھا. اس کے لئے غیر معمولی فہم وبصیرت اور قوت حافظہ کے علاوہ کتاب وسنت سے غیر معمولی ذوق وشغف کی بھی ضرورت تھی. چنانچہ خدا نے جب جن بزرگوں سے یہ کام لیا ان کو فہم بصیرت کے ساتھ ایسا غیر معمولی حافظہ بھی بخشا تھا کہ ان کے حفظ کے واقعات سن کر حیرت ہوتی ہے. ان ہی لوگوں میں ایک اہم شخصیت حضرت یحییٰ بن معین کی بھی تھی. انھوں نے اس سلسلہ میں جو غیر معمولی محنت ومشقت کی ہے اس کی تفصیل یہ ہے:-

انھوں نے صحیح اور عدم صحیح روایتوں کی تمیز اور رواۃ حدیث کے سیرت وکردار کے معلوم کرنے میں اپنی پوری ذہنی وعملی قوت صرف کردی تھی. وہ ایک حدیث کو پچاس پچاس بار اس لیے لکھتے تھے[1] اس کے عیوب ونقائص معلوم ہوجائیں.

وہ واعظوں، کاذب راویوں کی روایتوں کو بھی اس لئے لکھ لیا کرتے تھے کہ ان کی پھیلائی ہوئی غلط روایتوں کے انبار سے صحیح باتیں اخذ کرلی جائیں، خود فرماتے ہیں کہ،

میں کاذبین کی روایتوں کو لکھ لیتا ہوں. اور ان کو تنور میں ڈال کر ان سے پکی پکائی روٹیاں نکال لیتا ہوں.[2]

---

[1] ایک ہی بات کو جب متعدد آدمی بیان کرتے ہیں تو اس میں کچھ نہ کچھ اختلاف تو ضرور ہوجاتا ہے جو لوگ جتنے ذمہ دار ہوتے ہیں. وہ اتنی ہی ذمہ داری سے روایت کرتے ہیں، اس لئے ہر شخص کا بیان جب سامنے آجاتا ہے تو صحیح بات معلوم کرنے میں آسانی ہوتی ہے، اسی لئے یحییٰ بن معین یہ کرتے تھے تمام راویوں کے سلسلوں کو لکھ لیتے تھے پھر کتاب وسنت کی روشنی میں اپنی بصیرت سے صحیح وغلط ہونے کا فیصلہ کر جاتے تھے، ٦ ٣/٥٩

[2] تاریخ بغداد وتہذیب،

مقصد یہ ہے کہ روایت و درایت کے معیار پر ان روایتوں کو پرکھتا ہوں، ان میں جو صحیح ہیں، انھیں لے لیتا ہوں۔ اور جو غلط ہیں ان کی غلطی کو واضح کر کے ان کی حدیثِ نبوی ہونے کی حیثیت کو ختم کر دیتا ہوں۔ عجلی جو خود اس فن کے امام ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ ابن معین کے سامنے بہت سی ملتبس اور مختلط احادیث لائی جاتیں، تو سب کی حیثیت کو واضح کر دیتے تھے۔[1]

جن روایتوں کی غلطی پر بڑے بڑے ائمۂ حدیث کی نظر نہیں جاتی تھی۔ یحییٰ بن معین بیک نظر ان کو پا لیتے تھے۔ ابو سعید حداد کا بیان ہے کہ ہم لوگ جب کسی محدث کی خدمت میں جاتے تو ان کی کتابوں میں جو احادیث درج ہوتیں، ان کو صحیح سمجھ کر قبول کر لیتے۔ مگر جب وہی روایتیں ابن معین کے سامنے پیش کی جاتیں تو ان کی نظر فوراً غلطیوں پر پڑ جاتی اور وہ غلطی اتنی باریک ہوتی تھی کہ وہ اگر توجہ نہ دلاتے تو ہم کو اس کا احساس بھی نہ ہوتا۔

احساسِ ذمہ داری | ائمۂ رجال کا کام بڑا اہم، نازک اور بڑی ذمہ داری کا ہے۔ اگر وہ کہیں نقد و جرح میں افراط سے کام لیتے تو ایک طرف راوی پر ناحق کذب بیانی اور افترا پردازی کا الزام عائد ہو جاتا، اور دوسری طرف بہت سی احادیث نبوی کی تکذیب یا کم از کم ان کی صحت میں تشکیک پیدا ہو جاتی، اور یہ دونوں باتیں دینی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں تھیں۔ اسی طرح اگر انھوں نے تعدیل و توثیق میں نرمی اور تفریط سے کام لیا ہوتا تو ایک طرف بہت سے نا اہلوں کو تحدیثِ روایت کے منصب پر متمکن ہونے کا موقع مل جاتا تو دوسری طرف ارشاداتِ نبوی میں بیشمار غلط باتوں کے شامل ہو جانے کا خطرہ تھا، اور یہ دونوں باتیں دین کے حق میں مضر ثابت ہوتیں۔

پھر جرح و تعدیل کی زد میں بسا اوقات وہ علما و مشائخ تک آجاتے ہیں جن کی شہرت اور ثقاہت پر ایک زمانہ کو اعتماد ہوتا ہے، اس لئے اس منصب کے لیے جہاں غیر معمولی علم و فضل، فہم و بصیرت

---

[1] تہذیب ج ۱۱ ص ۲۸۸۔

اور ہمت و جرات کی ضرورت تھی وہیں تقویٰ، خشیت الٰہی، احساس ذمہ داری اور بے نفسی کی بھی بہت زیادہ ضرورت تھی ورنہ پھر اس نازک ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا بہت ہی مشکل تھا۔

امام یحییٰ بن معین میں دونوں طرح کے اوصاف بدرجۂ اتم موجود تھے، بڑے بڑے ائمہ سے بھی اگر بیان و روایت میں غلطی ہو جاتی تھی تو وہ ان کی غلطی واضح کئے بغیر نہیں رہتے تھے، ابن الرومی کا بیان ہے کہ

شیوخ حدیث کے بارے میں میں نے یحییٰ بن معین سے زیادہ حق بات کہنے والا نہیں دیکھا[1]

مگر اس اظہار حق میں ذب عن حدیث الرسول کے علاوہ کوئی دوسرا نفسانی جذبہ نہیں ہوتا تھا اس لیے وہ دعا فرماتے تھے کہ

بار الٰہا اگر میں نے کسی شخص کے اوپر تنقید و جرح کرکے اس کی کذب بیانی واضح کی ہو مگر اس میں وہ بات نہ ہو تو میری مغفرت نہ کرنا[2]۔

ظاہر ہے کہ اگر وہ جرح و تعدیل میں احساسِ ذمہ داری کو . . . . . پورے طور پر ملحوظ نہ رکھتے تو آخرت میں فلاح و مغفرت سے محروم ہو جانے کی دعا بھی نہ کرتے کیونکہ ایک مومن کا سب سے قیمتی سرمایہ یہی ہے۔ جس طرح دوسروں کی روایت قبول کرنے میں محتاط تھے، اسی طرح خود بھی روایت کرنے میں حد درجہ محتاط تھے، خود فرماتے ہیں کہ

میں ایک بر روایت بیان کر دیتا ہوں مگر پھر اس خوف سے رات کی نیند حرام ہو جاتی ہے کہ شاید روایت میں غلطی نہ ہو گئی ہو[3]

فرماتے تھے کہ حدیث کے معاملہ میں آدمی کو "سمح" یعنی فیاض اور سیر چشم نہیں ہو گا تو کذب بیانی کرنے لگا، لوگوں نے پوچھا کہ حدیث میں آدمی کیسے سمح ہو؟ فرمایا کہ

اذا شککت فی الحدیث ترکتہ[4] — جب کسی حدیث میں شک ہو تو اسے چھوڑ دے،

---

[1] تہذیب ج ۱۱ ص ۲۸۲ [2] ایضاً [3] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۱۸۲ [4] تہذیب ج ۱۱ ص ۲۸۷۔

مقصد یہ ہے کہ حدیث کے قبول کرنے میں اگر وہ بہت زیادہ محتاط نہیں رہے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نادانستہ طور پر وہ بہت ہی غلط روایتون کو صحیح سمجھ کر ان کی تحدیث کرے گا اور اس طرح سے کذب بیانی کا مرتکب ہو جائے گا۔

قبول روایت مین جد درجہ محتاط ہونے کے باوجود کسی راوی کی کوئی غلطی دیکھتے تھے تو اسے حتی الامکان چھپاتے تھے کہ وہ خود اس کو مان لے، اگر وہ نہیں مانتا تھا تو پھر اسکی غلطی کو برملا بیان کرتے تھے۔ اور پھر اس کی دوسری روایت قبول نہین کرتے تھے۔ خود فرماتے ہیں کہ

مین جب کسی شخص کی کوئی غلطی دیکھتا ہون تو اس کو پوشیدہ رکھتا ہون اور چاہتا ہون کہ حسن وخوبی سے اس کی غلطی اس پر واضح ہو جائے اور کبھی مین ایسے راوی سے ملتا ہون جس کے چہرے سے مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی بات یعنی کوئی غلطی ایسی ہے جس کے اظہار کو وہ پسند نہیں کرتا تو مین اس کی غلطی اس پر واضح کرتا ہون۔ اگر وہ اپنی غلطی تسلیم کر لیتا ہے تو اس کو اپنے تک محدود رکھتا ہون ورنہ پھر اسکو متروک قرار دیتا ہون۔

ائمہ حدیث کی رائے ان کے ان ہی اوصاف وکمالات اور علم وفضل کی بنا پر تمام معاصر ائمہ حدیث ان کی جلالت شان، کے قائل تھے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جو روایت یحیی بن معین کو نہ معلوم ہو اس کی صحت مشکوک ہے[۱]۔

ایک شخص نے احمد بن حنبل کے سامنے کچھ احادیث بیان کیں اور ان سے پوچھا کہ ان میں کوئی غلطی ہو تو بتا دیجئے۔ فرمایا کہ

علیک بابی زکریا فانہ یعرف الخطاء[۲]	ان احادیث کو یحیی بن معین کے سامنے پیش کرو، روایات کی غلطیوں کو وہ خوب پہچانتے ہیں

---

[۱] تہذیب ج ۱۱ ص ۲۸۶ [۲] ایضاً ص ۲۸۳۔

امام احمد بن حنبل فرماتے تھے کہ یحییٰ بن معین کے ساتھ سماع حدیث کرنے میں یہ فائدہ ہوتا تھا کہ قلب میں جو خلش ہوتی تھی نکل جاتی تھی۔

فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا شخص پیدا کر دیا ہے جو کاذبون کی کذب بیانی ظاہر کر دیتا ہے۔

احمد بن حنبل غایت احترام مین اپنی مجلس مین انکے نام کے بجائے ان کی کنیت ابو زکریا سے ان کا ذکر کرتے تھے۔

ابو سعید حداد کہتے تھے کہ اگر یحییٰ بن معین نہ ہوتے تو مین حدیث نہ لکھتا، مقصد یہ تھا کہ حدیث کی صحت اس زمانے مین اس قدر مشتبہ ہو گئی تھی کہ صحیح اور غلط مین کوئی تمیز باقی نہین رہ گئی تھی مگر یحییٰ بن معین نے اس مین حد فاصل قائم کر دی ہے۔ اس لیے اب لکھنے مین کوئی حرج نہین۔ علی بن المدینی جو خود امام جرح وتعدیل تھے فرماتے ہیں مین بغداد مین چالیس سال تک مقیم تھا۔ اس مدت مین امام احمد سے مجھ سے برابر حدیث کا مذاکرہ ہوتا تھا جب کسی حدیث کے بارے مین ہم دونون مین اختلاف ہوتا تھا تو اسے یحییٰ بن معین کے سامنے پیش کرتے تھے، وہ فوراً حدیث کے مالہ وما علیہ کو بتا دیتے تھے۔[1]

ان ہی کا قول ہے کہ یحییٰ بن آدم کے بعد علم کے مرکز یحییٰ بن معین ہیں۔

ابو عبید فرماتے تھے کہ امام احمد بن حنبل، علی بن المدینی، اور ابوبکر بن شیبہ اور یحییٰ بن معین پر علم ختم ہو گیا مگر ان چارون مین یحییٰ بن معین حدیث کی صحت وسقم کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔[2]

صالح بن محمد کا قول ہے کہ یحییٰ بن معین معاصر ائمۂ حدیث مین سب سے زیادہ رجال سے واقف ہیں۔ یحییٰ بن معین نے بعض بڑے بڑے ائمہ پر بھی جرح کر دی ہے مگر اس کے معنی یہ نہین ہین کہ ان کی جرح سے وہ ائمہ مجروح یا متروک قرار دے دیے جائیں گے بلکہ اصل بات یہ ہے، اس زمانہ مین بعض ایسی احادیث رواج پا گئی تھین کہ جو تھین تو واقعی ضعیف مگر وہ چونکہ مشہور ومعروف ہو گئی تھین اور شرعی احکام کے خلاف بھی نہین تھین، اس لیے ان روایتون مین بعض ائمہ نے زیادہ احتیاط نہین کی یا انھون

[1] تہذیب [2] تہذیب ج ۱۱ ص ۲۸۳۔

ان کے قبول مین تسہیل سے کام لیا مگر چونکہ دوسرے ائمہ کے نزدیک ان روایتون کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح نہین تھی۔ اس لیے انھون نے جرح وتنقید کر کے ان کی حیثیت کو واضح کیا اور بہرحال ائمہ بھی انسان ہی تھے معصوم نہ تھے۔ اس لئے ان کی اس غلطی پر جن لوگون نے ٹوکا انھون نے بہت ہی اہم کام انجام دیا۔ اس لئے کہ ان ائمہ پر جرح کرنا اس سے بہت کم درجہ کی بات تھی کہ آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی غلط بات منسوب ہوجائے۔

غرض یہ کہ ان پر جو جرح وتنقید کیگئی وہ اپنی جگہ صحیح تھی۔ مگر اس کی وجہ سے ان کی امامت وجلالت پر کوئی حرف نہین آتا اور نہ اس سے ان کی کوئی تنقیص ہوتی ہے اور نہ وہ متروک قرار پاتے ہیں،

علامہ ابن عبدالبر اور علامہ سبکی نے اس پر بڑی لمبی گفتگو کی ہے یہاں ہم اس کا کچھ خلاصہ درج کرتے ہین

"جرح وتعدیل کے بارے مین صحیح بات یہ ہے کہ جن لوگون کی امامت اور عدالت عام ہو چکی ہو اور ان کے مادحین کی تعداد زیادہ اور جرح وقدح کرنے والون کی تعداد بہت کم ہو تو ایسے اشخاص پر جو جرح کی جائے گی وہ قابل التفات نہیں ہے۔ ورنہ اگر یہ راستہ کھول دیا جائے تو پھر ائمہ مین سے کوئی شخص بھی محفوظ نہین رہ سکتا۔

محدثین کا یہ اصول کہ جرح تعدیل پر مقدم ہے علی الاطلاق صحیح نہین ہے خصوصیت سے ان لوگون کے بارے مین جن کی امامت اور جلالت علم پر ایک دنیا کا اتفاق ہو۔

مثلاً ابن ابی ذیب نے امام مالک پر اور ابن معین نے امام شافعی پر اور امام نسائی نے احمد بن صالح وغیرہ پر جو جرح کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان ائمہ کے بارے مین یہ اصول کہ جرح تعدیل پر مقدم ہے بالکل ہی غلط ہے ان کی طرف توجہ نہین کی جاسکتی۔"[1]

وفات | وفات ایسی پائی کہ خدا ہر مسلمان کو نصیب کرے، امام نے متعدد حج کیے تھے، حج سے فارغ ہو کر

[1] طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۱۶۸۔

مدینۃ النبی کا قیام بھی ان کا معمول تھا۔ ۳۳۲ھ میں آخری بار یہ موقع نصیب ہو تو حسب معمول حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ کا رخ کیا۔ وہ یا حبیب کی زیارت کے بعد واپس ہونا چاہتے تھے، مگر جوار نبی کا شرف ہمیشہ کے لیے ان کی قسمت میں مقدر تھا۔ اس لئے پھر رک گئے، ابھی چند ہی دن گذرے تھے کہ پیغام اجل آپہنچا، مدینہ میں جب آپ کی وفات کی خبر عام ہوئی تو جنازہ میں شرکت کے لیے ایک مخلوق ٹوٹ پڑی، سب سے بڑی سعادت یہ نصیب ہوئی کہ آپ کا جنازہ اسی تابوت میں اٹھایا گیا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جسد مبارک اٹھایا گیا تھا۔ جس وقت آپ کا جنازہ اٹھایا گیا تو لوگوں کی زبان پر عام طور پر یہ جملہ تھا کہ

"یہ اس شخص کا جنازہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو کذب بیانی سے بچاتا تھا"[1]

جنۃ البقیع جہاں ہزاروں گنج ہائے گراں مایہ مدفون تھے۔ اسی میں آپ بھی سپرد خاک کئے گئے۔ رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ

بہت سے لوگوں نے آپ کا مرثیہ کہا،

---

[1] سنہ وفات میں تو تمام اہل تذکرہ متفق ہیں مگر عمر میں کچھ اختلاف ہے

یحییٰ بن سعید القطان

حضرت یحییٰ بن سعید بھی غلام خاندان سے تھے۔ مگر علم وفضل کے لحاظ سے ان کا شمار ممتاز تبع تابعین میں ہوتا ہے۔ بصرہ آبائی وطن تھا، اور وہیں ۱۲۰ھ میں ان کی ولادت ہوئی[1]۔

تعلیم و تربیت | شیخ ابن سعید نے جس زمانہ میں آنکھ کھولی۔ اس وقت مملکت اسلام کا ہر قصبہ اور ہر قریہ قال اللہ وقال الرسول کی آواز سے گونج رہا تھا، خدا کو ان سے حدیث نبوی کی تدوین کا کام لینا تھا۔ اس لیے اس نے ان بزرگوں کی خدمت میں جانے کی توفیق عطا کی جو اس فن کے امام تھے، ان کے شیوخ کے ناموں پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے کے تمام ممتاز محدثین سے خواہ وہ کسی خطہ کے ہوں انھوں نے استفادہ کیا تھا خصوصیت سے امام شعبہ جو اس وقت مرجع خلائق تھے۔ ان کی خدمت میں یہ بیس برس متواتر سماع حدیث کرتے رہے۔ جن محدثین سے انھوں نے استفادہ کیا تھا ان کی فہرست کافی طویل ہے۔ چند مشاہیر کے نام یہ ہے۔

امام مالک، امام اوزاعی، امام شعبہ سفیان ثوری، ابن ابی عروبہ، یحییٰ بن سعید الانصاری تابعی، ہشام بن عروہ، امام اعمش، مسعر بن کدام سفیان بن عیینہ، اور سلیمان اعمش وغیرہ۔ امام نووی نے لکھا ہے کہ یحییٰ بن سعید نے پچاس ایسے شیوخ حدیث سے سماع کیا تھا جو سفیان ثوری جیسے محدث روزگار کے اساتذہ میں تھے[2]۔

وہ اپنی غیر معمولی ذہانت اور قوت حافظہ میں زمانہ طالب علمی سے ممتاز تھے، امام شعبہ اور سفیان

---

[1] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۵۴

ثوری جو خود ان اوصاف میں فائق تھے۔ وہ ان کی ذہانت اور قوت حافظہ پر حیرت کرتے تھے۔ ان کے ان اوصاف کی شہرت ہوئی تو حدیث نبوی کے پیاسے ہر طرف سے ان کے گرد جمع ہونے لگے۔ تذکروں میں ان کے حلقۂ درس کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں مگر بعض ممتاز ائمہ کا برسوں ان کی خدمت میں رہ کر کسب فیض کرنا اس بات کی علامت ہے کہ ان کا باقاعدہ حلقۂ درس تھا۔ ان سے استفادہ کرنے والوں کے چند نام یہ ہیں،

امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، اسحاق بن راہویہ، عبد الرحمٰن بن مہدی، سفیان بن عیینہ، ابوبکر بن شیبہ، علی بن المدینی، ان میں سے ہر ایک کا شمار کبار تبع تابعین میں ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بے شمار افراد نے ان سے استفادہ کیا تھا۔ جن میں ان کے لڑکے محمد اور ان کے پوتے احمد بھی ہیں[1] انکی جلالت علم کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ امام احمد، ابن معین اور ابن المدینی جیسے ائمۂ روزگار ان کے سامنے بیٹھنے کی ہمت نہیں کرتے تھے اور ان سے جو کچھ پوچھنا ہوتا تھا کھڑے کھڑے پوچھ لیتے تھے،

علم و فضل اپنے فضل و کمال اور زہد و اتقا کے لحاظ سے زمرۂ تبع تابعین کے گوہر شب چراغ تھے، تمام ائمۂ حدیث و فقہ نے ان کے فضل و کمال کا اعتراف کیا ہے، امام احمد بن حنبل فرماتے تھے کہ میری آنکھوں نے یحییٰ جیسا عالم نہیں دیکھا۔ ایک بار کسی نے ان سے پوچھا کہ وکیع بن جراح اور یحییٰ بن سعید میں کون زیادہ صاحب علم ہے۔ فرمایا کہ میں نے یحییٰ جیسا صاحب علم .... نہیں دیکھا[2] امام احمد بن حنبل سے اسی طرح کے اور بھی بیشمار جملے منقول ہیں۔ ان کا یہ اعتراف بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ وہ امام شافعی، امام محمد جیسے ائمۂ فقہ و حدیث سے استفادہ کر چکے تھے۔

عبد الرحمٰن بن مہدی جن کی جلالت علم ہر کہ و مہ کو مسلم تھی انھوں نے بھی یحییٰ بن معین سے کہا کہ تمھاری آنکھیں ان کے جیسا صاحب فضل و کمال نہ دیکھیں گی۔ شیخ بندار جو ان کی خدمت میں بیس

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۱۶ [2] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۱۳۹۔

برس رہے تھے۔ وہ انھیں امام زمانہ کہتے تھے۔ امام نووی نے لکھا ہے کہ ان کے علم و فضل امامت و جلالت اور صلاح و تقویٰ پر سب کا اتفاق ہے۔ ان کے علم و فضل کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جب کسی مسئلہ میں ائمۂ حدیث کے درمیان اختلاف ہوتا تھا تو یہ حکم مقرر ہوتے تھے۔ ایک بار امام شعبہ کے سامنے کسی مسئلہ میں اختلاف ہوا، اختلاف کرنے والوں نے ان سے کہا کہ آپ کسی کو حکم بنا دیجئے۔ امام شعبہ کی نظر انتخاب حضرت یحییٰ بن سعید پر پڑی۔ چنانچہ ان کے سامنے وہ مسئلہ رکھا گیا انھوں نے امام شعبہ جیسے امام وقت اور استاد کے خلاف فیصلہ دیا مگر استاد کی حق پرستی بھی دیکھئے کہ شاگرد کے فیصلہ کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "اے یحییٰ تمھاری غیر موجودگی کیسے برداشت کی جائے گی؟"[1]

حدیث | علم حدیث ان کا خاص فن تھا۔ اور اس میں ان کا مرتبہ امام کا تھا۔ ارباب تذکرہ لکھتے ہیں کہ عراق میں علم حدیث کا عام رواج ان ہی کی ذات سے ہوا[2]۔ ائمۂ حدیث کے یہاں ان کی مرویات کا جو مرتبہ تھا۔ اس کا صحیح اندازہ ان راویوں سے ہو سکتا ہے جو ان کے بارے میں انھوں نے ظاہر کی ہیں۔

مشہور محدث علی بن المدینی کہتے تھے کہ ہمارے معاصرین میں تین آدمی ایسے تھے جنھوں نے بد شعور سے علم حدیث کی طرف توجہ کی اور اس سے زندگی بھر لپٹے رہے۔ یہاں تک کہ وہ خود مسند تحدیث پر فائز ہو گئے۔ ان تین آدمیوں میں سب سے پہلا نام انھوں نے یحییٰ بن سعید کا لیا[3]۔ عبدالرحمٰن بن مہدی جو ان کے معاصر اور علم و فضل میں ان سے کم تر نہ تھے! انھوں نے اپنے مجموعۂ حدیث میں دو ہزار حدیثیں یحییٰ بن سعید کی سند سے داخل کر لی تھیں جنھیں وہ ان کی زندگی ہی میں روایت کرتے تھے[4]۔ ابن مہدی جیسے یگانۂ روزگار کا ان کی زندگی ہی میں ان سے روایت کرنا بڑی اہمیت رکھتا ہے امام نووی نے لکھا ہے کہ ابن مہدی نے ان کے واسطہ سے تیس ہزار روایتیں لکھیں یعنی لکھی تو انھوں نے تیس ہزار تھیں، مگر روایت صرف دو ہزار کی کرتے تھے۔

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۲۰ [2] تہذیب ج ۱۱ ص ۲۲۰ [3] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۱۳۷ [4] ایضاً

اگر کسی حدیث کے تذکرہ مین یہ ذکر ملے کہ ان کو کئی لاکھ حدیثین یاد تھین اسکا مطلب یہ نہین ہوتا کہ اتنے ارشادات نبوی یاد تھے، بلکہ اسکا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اتنی روایتین یا سلسلۂ بیان یاد تھا، ائمہ ان تمام سلسلۂ سند کو اس لئے یاد کرتے تھے کہ سب کو سامنے رکھکر کسی حدیث کے بارے مین صحیح فیصلہ کیا جا سکے. مثلاً ایک ہی حدیث کے متعدد راوی ہوتے ہیں۔ ان مین ایک ناقص روایت کرتا ہے دوسرا کامل، ایک مفصل روایت کرتا ہے اور دوسرا مجمل، اب دونون کو سامنے رکھنے کے بعد فیصلہ آسان ہوتا ہے کہ کون سی روایت زیادہ صحیح اور قابل قبول ہے۔

روایتون کی کثرت تعداد دیکھکر بعض بدسوادون کو احادیث نبوی کے موجودہ ذخیرہ کے بارے مین شبہہ ہونے لگتا ہے کہ آخر کار اتنا بڑا ذخیرۂ حدیث کہان سے آگیا۔ مگر یہ ان کی کم علمی ہے کہ وہ روایت اور حدیث مین فرق نہیں کرتے۔ روایت اس سلسلۂ بیان کو کہتے ہیں جو راوی حدیث کی سند کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچانے کیلیے بیان کرتا ہے اس لئے بسا اوقات ایک ہی حدیث کے لیے متعدد سلسلۂ بیان ہوتے ہیں۔ اس لیے روایات کی کثرت کو حدیث کی کثرت پر قیاس کرنا غلطی ہے

یحییٰ بن سعید کو یہ شرف و اعزاز کچھ تو ان کی فطری ذہانت و استعداد کی وجہ سے ملا تھا لیکن اس کا بڑا سبب خود ان کی ذاتی جد و جہد ہے۔ حدیث نبوی سے ان کو عشق تھا۔ اس کے حصول کیلیے انھون نے جو محنت اور کوشش کی اس کی مثال کم ملے گی۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ وہ صرف امام شعبہ کی خدمت مین بیس برس تک حدیث کا سماع کرتے رہے۔ وہ کس اہتمام کے ساتھ خود ان کی زبانی اس کی تفصیل سنیے فرماتے ہیں:

کامل بیس برس تک مین امام شعبہ کی خدمت مین حاضر رہا اور روزانہ زیادہ سے زیادہ تیرہ حدیثین ان سے سماع کر کے لوٹتا تھا۔ غور کیجیے کہ ابن سعید جیسے ذہین و ذکی آدمی کا روزانہ صرف تیرہ حدیثون کا سماع کرنا بلاوجہ نہین تھا۔ اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہو سکتی تھی کہ وہ جو کچھ پڑھتے تھے

اس پر پورے طور پر غور و خوض کرتے اور اس سے معانی کا استنباط کرتے تھے محض حصول تبرک کے لیے وہ حدیثیں نہیں سنتے تھے۔ اسی بنا پر حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ تمام ائمۂ حدیث روایت حدیث میں ان کو حجت سمجھتے تھے، ائمۂ حدیث کا یہ مقولہ ضرب المثل ہے کہ جو شخص یحییٰ بن سعید کی روایات کو چھوڑ دے گا ہم اس کو چھوڑ دیں گے [1]۔

تنقید رواۃ و روایت | یحییٰ بن سعید صرف حافظ حدیث ہی نہیں تھے، بلکہ ان کا شمار ائمۂ جرح و تعدیل میں بھی ہوتا ہے۔ حدیث کی روایت میں سلسلۂ سند کا بڑا اہتمام ہوتا ہے یعنی اس بات کا بڑا لحاظ کیا جاتا ہے کہ حدیث نبوی کی روایت جو لوگ کر رہے ہیں، ان کی یادداشت کیسی ہے؟ ان کے شیوخ کون ہیں؟ ان کے اخلاق و عادات کا کیا حال ہے؟ غرض یہ کہ ایک روایت کے جتنے راوی ہوتے ہیں، ان کے بارے میں جب تک یہ باتیں نہ معلوم ہوں اس وقت تک کوئی روایت قابل اعتبار نہیں سمجھی جا سکتی۔ تبع تابعین کے زمانہ میں روایت و تحدیث کرنے والے بے شمار اہل علم تھے، مگر جو لوگ روایت و رواۃ کے بارے میں پوری تنقید و تفتیش کرتے تھے، ان کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ یحییٰ بن سعید بھی ان ہی میں تھے۔ ابن منجویہ کا بیان ہے کہ

ھو الذی مھد لاھل العراق	اہل عراق کے لیے حدیث کی بساط انہی
رسم الحدیث و معن فی البحث	نے بچھائی اور ثقہ راویوں کے قبول کرنے
عن الثقات و ترک الضعفاء [2]	اور ضعیف راویوں کے ترک کر دینے میں
	میں انھوں نے کافی غور و خوض اور تلاش [؟]

علی بن المدینی کا جو خود جرح و تعدیل کے اساطین میں ہیں۔ قول ہے کہ میں نے یحییٰ بن سعید سے زیادہ علم رجال کا اور عبد الرحمٰن بن مہدی سے زیادہ حدیث کی خطا و صواب کا جاننے والا

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۲۰۔ [2] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۵۵

کسی کو نہیں پایا چنانچہ یہ دونوں جس راوی کو ضعیف قرار دیتے ہیں، اس کو ترک کر دیتا ہون اور جن رواۃ کی یہ روایتیں قبول کر لیتے ہیں، مین بھی قبول کر لیتا ہون[1] خود عبد الرحمٰن بن مہدی بھی ان کے اس وصف کے ثناخوان تھے، ابراہیم بن محمد تیمی کا بیان ہے کہ

ما رایت اعلم بالرجال من یحییٰ

مین نے یحییٰ سے زیادہ رواۃ حدیث کا جاننے والا نہین دیکھا[2]۔

قوت حافظہ علم حدیث مین درک پیدا کرنے کے لئے ہزارون حدیثوں کے الفاظ اور سینکڑون راویون کے حالات پر نظر رکھنی پڑتی ہے، اس لئے جب تک کوئی شخص غیر معمولی قوت حافظہ کا مالک نہ ہو، فنِ حدیث مین غیر معمولی حیثیت حاصل نہین کر سکتا یون تو عام ائمۂ حدیث کو خدا نے اس نعمت سے نوازا تھا مگر بعض ائمہ اس اعتبار سے ضرب المثل تھے۔ ان ہی مین یحییٰ بن سعید بھی ہیں۔

عموماً محدثین کا دستور تھا کہ جن احادیث کو درس مین طلبہ کے سامنے بیان کرنا ہوتا تھا وہ پہلے سے لکھ لیا کرتے تھے تاکہ غلطی نہ ہو مگر یحییٰ بن سعید کو اپنے حافظہ پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ بڑی سے بڑی حدیث زبانی سنا دیا کرتے تھے۔ ایک بار سلیمان بن اشعث نے امام احمد سے پوچھا کہ کیا یحییٰ آپ کو زبانی روائتین سناتے تھے۔ فرمایا کہ ہاں! ہم نے ان کے پاس کبھی کتاب نہین دیکھی۔ عام طور پر وہ اپنے حافظے سے روایت کرتے تھے۔ یہان تک کہ وہ طویل طویل روائتین جو ہم کتابون مین لکھ لیا کرتے وہ ان کو بے تکلف سنا دیا کرتے تھے[3]۔

ایک بار ان کے استاذ امام ثوری نے غالباً امتحان کی غرض سے ایک روایت کا سلسلۂ سند قصداً ذرا مجمل بیان کیا۔ یحییٰ نے سنا تو فوراً بولے۔ اس روایت مین یہ اجمال ہے۔ امام ثوری یہ سن کر حیران رہ گئے اور کہا کہ مین نے تمھارے جیسا فن رجال کا جاننے والا نہین دیکھا۔ تم سے کوئی

---

[1] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۵۵ [2] ایضاً [3] ایضاً

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ ایک راوی محمد بن سالم جو اپنے نام سے معروف تھے۔ ان کی کنیت ابوسہل اہل علم میں زیادہ معروف نہیں تھی، امام ثوری نے روایت کرتے وقت نام کے بجائے ان کی کنیت کا ذکر کیا۔ خیال یہ تھا کہ یحییٰ کو راوی کی کنیت کا علم نہ ہوگا اور وہ اسے کوئی نئی روایت سمجھیں گے لیکن امام ثوری کی یہ توقع صحیح ثابت نہیں ہوئی۔ یحییٰ نے سنتے ہی فرمایا کہ ابوسہل تو محمد بن سالم ہیں،

اس سلسلہ میں امام احمد بن حنبل کے متعدد اقوال تذکروں میں ملتے ہیں۔ ایک بار انھوں نے فرمایا کہ یحییٰ بن سعید حد درجہ قوی الحافظ اور واقعی محدث تھے۔ ان کا ایک قول ہے کہ میں نے یحییٰ بن سعید جیسا آدمی نہیں دیکھا، ان پر تثبت فی الحدیث ختم ہے۔[۱]

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ائمۂ حدیث نے حدیث نبویؐ کی تدوین میں جتنی دیدہ ریزی و محنت کی ہے اور راویوں کی تنقید و توثیق میں جس قدر تلاش اور تفحص سے کام لیا ہے، اس کی نظیر دنیا کی مذہبی تاریخ میں ناپید ہے، انھوں نے اپنے راہنما ہی کے اقوال و افعال کو مدون نہیں کیا بلکہ جن لوگوں نے اس کے کسی قول کو بیان کیا ہے ان کی زندگی کے احوال و کوائف بھی لکھ لیے تاکہ غلطی کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

جرح و تعدیل ائمۂ حدیث نے تدوین حدیث میں رواۃ کی جرح و تعدیل میں جس حزم و احتیاط سے کام لیا ہے، اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی مگر پھر بھی وہ انسان تھے اس لیے ان سے بھی بعض تسامحات ہوئے ہیں۔ اور ان پر ان کے دوسرے ہم عصر یا بعد کے محدثین نے گرفت کی ہے، چنانچہ بڑے بڑے ائمہ کے تذکرہ میں جہاں ان کے محاسن و اوصاف کا تذکرہ ملے گا وہیں ان پر جرح و تنقید بھی ملے گی۔ یعنی اس بات کی تفصیل ملے گی کہ ان سے روایتِ حدیث میں کیا کیا غلطیاں ہوئی

---

[۱] یہ اقوال تہذیب التہذیب میں ملیں گے [۲] تہذیب ص۲۰۰

ہیں۔ اسی جرح وتنقید ہی کا یہ فیض ہے کہ سنتِ نبوی کا چشمۂ صافی گدلا نہیں ہونے پایا، ورنہ دوسرے مذاہب کے پیشواؤں کی طرح حضورؐ کی سیرت بھی افسانوں میں گم ہوجاتی۔ اتنی احتیاط اور دیدہ ریزی کے بعد بھی اہل بدعت نے بہت سے افسانے گھڑ کر عوام میں پھیلا ہی دئے۔

یحییٰ بن سعید کے تذکرہ میں ان کے محدثانہ محاسن کی تفصیل تو بہت ملتی ہے، مگر ان کی کسی مخصوص غلطی کا ذکر نہیں ملتا، صرف امام احمد بن حنبل کا ایک قول ملتا ہے۔

امام احمد نے فرمایا کہ انھوں نے متعدد احادیث کے بیان کرنے میں غلطی کی ہے۔ مگر غلطی سے کون بچا ہے۔[1] اسکے ساتھ یہ فرمایا کہ غلطی سے کون بچا ہے اس بات کی اہمیت نہ تھی معتقد تھا کہ بڑے بڑے ائمہ سے بھی روایت حدیث میں غلطی ہوتی ہے، اسلئے ان سے غلطیاں ہوئی ہیں مگر امام احمد نے غلطیوں کی نشاندہی نہیں کی ہے۔

عبادت اور اخلاق و کردار یحییٰ بن سعید اپنے اخلاق و کردار اور اتقاء و پرہیزگاری میں اسلام کی زندہ تصویر تھے۔ ان کی ہر ادا سے خدا کی اطاعت و فرمان برداری کا اظہار ہوتا تھا، ان کی زندگی میں خدا کی نافرمانی کی کوئی مثال ڈھونڈھے سے نہیں ملتی۔ ان کے ایک شاگرد بندار جو ان کی خدمت میں بیس سال مسلسل رہے تھے، فرماتے ہیں۔

اختلفت الی یحییٰ بن سعید عشرین سنۃً فما ظن انہ عصی اللہ	میں نے بیس برس تک ابن سعید کی خدمت میں آمد و رفت رکھی، میرا گمان ہے کہ اس مدت میں کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا جسے خدا کی نافرمانی کہا جا سکے۔

امام احمد فرماتے ہیں کہ وہ کسی حالت اور کسی کام میں ہوں میں نے ان کے جیسا آدمی نہیں دیکھا۔ ابن معین کا بیان ہے کہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ ان کی جماعت ترک ہوئی ہو۔ نماز باجماعت کے

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۱۱۰ [2] تہذیب ج ۱۱ ص ۲۱۹

حد درجہ پابند ہونے کے ساتھ نوافل کا بھی پورا اہتمام کرتے تھے جتنی نفل نمازیں شروع کر دیتے تھے۔ ان پر مداومت کی کوشش کرتے[1]۔ کلام الٰہی کی تلاوت سے خاص شغف تھا۔ ان کے صاحبزادے کا بیان ہے کہ عموماً دن رات میں ایک بار قرآن ختم کر لیتے تھے[2]۔

قرآن کا اثر اور خوف آخرت

لیکن وہ محض قرآن خواں نہیں تھے۔ بلکہ ان پر قرآن کا وہی اثر ہوتا تھا، جو قلب مومن پر ہونا چاہیے۔ بلکہ بسا اوقات قرآن کی زبان سے آخرت کا تذکرہ سنکر وہ بے خود ہو جاتے تھے۔ ممتاز محدث علی بن المدینی کا بیان ہے کہ ایک بار ہم لوگ ان کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حاضرین میں سے کسی سے فرمایا کہ قرآن پاک کا کوئی حصہ سناؤ اس نے سورۂ دخان کی تلاوت شروع کی۔ جوں جوں وہ پڑھتا جاتا تھا ان پر رقت طاری ہوتی جا رہی تھی جب وہ اس آیت

ان یوم الفصل میقاتھم اجمعین — فیصلہ کے دن سب لوگ حاضر ہوں گے،

پر پہنچا تو ان پر لرزہ طاری ہو گیا اور وہ بیہوش ہو گئے۔ ان کی یہ کیفیت دیکھکر سارا خاندان گھر کے بچے اور عورتیں رو پڑیں کچھ دیر کے بعد جب ان کی یہ کیفیت دور ہوئی تو ان کی زبان پر یہی آیت تھی ان یوم الفصل میقاتھم اجمعین[3]۔ تسلیم و رضا ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی۔ رنج ہو یا مصیبت کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے تھے۔ مرض الموت میں کسی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو شفا عطا فرمائے عفاک اللہ! بڑے پرسکون انداز میں فرمایا۔

اُحبہ الی ما احبہ الی اللہ عزو جل — میں اپنے لیے وہی پسند کرتا ہوں جو اللہ عزوجل میرے لیے پسند کرتا ہے۔

مقصد یہ تھا کہ مصیبت و بیماری میں گھبراہٹ اور پریشانی مومن کی شان نہیں ہے کیونکہ بیماری و مصیبت مرد مومن کے لیے کفارہ سیئات ہوتی ہیں اس لئے ان کو خدا کی رحمت سمجھنا چاہیے۔

---

[1] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۴ [2] تاریخ بغداد [3] صفوۃ الصفوۃ ج ۳ ص ۲۷۰۔

متانت وسنجیدگی اور سادگی وقناعت پسندی

متانت وسنجیدگی اور سادگی وقناعت پسندی کے وہ پیکر تھے۔ ان کے پوتے کا بیان ہے کہ میرے دادا نہ کبھی مذاق وہنسی کرتے تھے اور نہ قہقہہ لگا کر ہنستے تھے، وہ کبھی حمام میں غسل کے لئے نہیں گئے اور نہ زیبائش وآرائش کے لئے تیل وسرمہ لگانے کے عادی تھے[1]، ان کی اس سنجیدگی سے لوگ ناجائز فائدہ بھی اٹھاتے تھے، ایک بار کسی پڑوسی سے کچھ بات چیت ہو گئی، پڑوسی نے ان کو برا بھلا کہنا شروع کیا، یحییٰ بن سعید اس بدزبانی کا جواب دے نہیں سکتے تھے اس لئے رونے لگے اور فرمایا کہ

اس نے سچ کہا کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔ غالباً اس نے ان کے غلام ہونے پر کچھ تعریض کی ہوگی اس وقت کے علماء اپنے لباس اور وضع وقطع میں عام لوگوں سے کچھ امتیاز برتتے تھے، مگر یحییٰ بن سعید اپنے غیر معمولی فضل وکمال کے باوجود صحابۂ کرام کی طرح نہایت سادہ وضع میں رہتے تھے۔ سادگی کی وجہ سے عام آدمیوں کو ان کے فضل وکمال کا علم بھی نہیں ہو پاتا تھا۔ ابن عماد کا بیان ہے کہ یحییٰ بن سعید بالکل معمولی آدمی معلوم ہوتے تھے۔ مگر جب حدیث نبوی کا درس دینے لگتے تھے تو بڑے بڑے فقہا کو زبان کھولنے کی جراءت نہیں ہوتی تھی[2]۔

سادگی لباس ہی تک محدود نہیں تھی بلکہ کھانے پینے میں بھی طبیعت نہایت سادہ وقناعت پسند واقع ہوئی تھی۔ جو کچھ مل جاتا صبر وشکر کے ساتھ خود کھاتے اور بال بچوں کو کھلاتے۔ ابن ابی صفوان کا بیان ہے کہ ان کا ذوقِ حیات صرف غلہ تھا، کبھی جو آگیا تو جو کھا لیا، گیہوں آگیا تو شکر بھیجکر اس کو کھا لیا۔ کھجوریں آگئیں تو اس سے سد رمق کر لیا[3]۔ غرض کھانے پینے اور لباس میں نہ تو عیش وتنعم سے کام لیتے تھے، اور نہ اس کیلئے بہت زیادہ جد وجہد اور پریشانی کو پسند کرتے تھے۔

ان کے نام کا ایک جزء قطان ہے، اس کے بارے میں سمعانی نے لکھا ہے کہ یہ قطن

---

[1] تاریخ بغداد [2] ایضاً ج ۱۱ ص ۱۷۰ [3] ایضاً ج ۱۴ ص ۱۴۱۔

(روہوئی) کی طرف نسبت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں روئی کا کاروبار ہوتا تھا،

وفات | اٹھتر برس کی عمر میں ۱۹۸ھ میں وفات پائی،

اولاد | ان کی نرینہ اولاد میں محمد بن یحییٰ کا نام تذکروں میں ملتا ہے۔ یہ بھی صاحب علم و فضل تھے، محمد کے ایک صاحبزادے احمد کا تذکرہ بھی رواۃ حدیث کے سلسلہ میں ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے دادا سے بھی استفادہ کیا تھا۔

عبدالرحمٰن بن مہدی

حضرت عبدالرحمٰن بن مہدی بھی غلامانِ اسلام میں تھے۔ مگر زمرۂ تبع تابعین میں ان کا شمار ان ممتاز محدثین میں ہوتا ہے جن کے ذریعہ حدیثِ نبویؐ کی تدوین و حفاظت ہوئی، حدیث و رجال میں ان کی رائے حضرت یحییٰ بن معین اور ابنِ قطان وغیرہ کے ہم پلہ سمجھی جاتی ہے۔

نام و نسب | عبدالرحمٰن نام، ابوسعید کنیت تھی۔ والد کا نام مہدی تھا۔ یہ قبیلۂ ازد بصری کے غلام تھے، اس لئے ان کو بھی اہلِ تذکرہ بصری لکھتے ہیں[1]۔ ان کی ایک اور نسبت لولوی بھی ہے۔ اس نسبت کے بارے میں سمعانی نے لکھا ہے کہ ان کے یہاں موتیوں (لولو) کی تجارت ہوتی تھی۔ اس پیشہ کی نسبت سے ان کو لولوی بھی کہا جاتا ہے[2]۔

ولادت، ماحول اور تعلیم و تربیت | خلافت عباسیہ کے آغاز ۱۳۵ھ میں یہ بصرہ میں پیدا ہوئے۔ عراق میں اس وقت دو مقام کوفہ و بصرہ خاص طور سے گہوارۂ علم و فضل بنے ہوئے تھے، بصرہ میں جہاں دینی علوم کے متعدد چشمے ابل رہے تھے، وہیں دوسری قوموں کے اختلاط سے غیر دینی رجحانات اور غلط افکار بھی دین کے چشمۂ صافی میں مختلط ہو رہے تھے۔ اس اختلاط سے جہاں بہت سے برے نتائج پیدا ہوئے ان میں ایک مذہبی قصہ گوئی بھی ہے، اس قصہ گوئی کو رواج دینے میں عام مجالس پند و نصائح کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ اس وقت بصرہ میں امام حسن بصری کی مجالس پند و نصائح کا بڑا چرچا تھا۔ مگر وہ اس بارے میں انتہائی محتاط تھے، ان کے بعد یہ احتیاط باقی نہیں

---

[1] تاریخ بغداد اور تہذیب وغیرہ [2] کتاب الانساب۔

رہی، اور اہل لوگوں کے ساتھ بہت سے نا اہل بھی اس بزم کے مسند نشیں بن گئے۔ چونکہ یہی دور دینی علوم اور خاص طور پر حدیث کی تدوین و ترتیب کا بھی تھا اس لئے بڑی آسانی سے یہ روایتیں ذخیرۂ تفسیر و حدیث میں داخل ہوگئیں۔

ابن مہدی نے آنکھ کھولی تو بصرہ میں قصہ گوئی کا عام رواج ہو چکا تھا۔ چنانچہ ان کے علمی نشو و نما کا آغاز قصہ گویوں کی صحبت ہی سے ہوا۔ ابو عامر عقدی کہتے ہیں کہ وہ قصّاص کے پاس جایا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے ان سے کہا کہ ان قصہ گویوں کی صحبت سے تمھارے ہاتھ کچھ نہ آئے گا، چنانچہ میری یہی نصیحت ان کو علم حدیث کی طرف مائل کرنے کا سبب بن گئی۔ پھر یہ طلب اتنی بڑھی کہ بصرہ سے سینکڑوں میل دور دیار نبی یعنی مدینہ منورہ پہنچے اور امام مالکؒ کے حلقۂ درس میں شریک ہو کر طلب علم کی پیاس بجھائی[1]۔

شیوخ انھوں نے کبار تابعین کا زمانہ تو نہیں پایا تھا مگر پھر بھی ان کے زمانہ میں تابعین کی ایک معتد بہ تعداد موجود تھی، انھوں نے ان سے اور ممتاز اتباع تابعین سے استفادہ کیا تھا۔ ان کے اساتذہ کے چند نام یہ ہیں۔

ایمن بن نابل، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، امام مالک، امام شعبہ، مالک بن مغول، خالد بن دینار، مہدی بن میمون وغیرہ۔

درس و تدریس ذہانت و ذکاوت اور قوتِ حافظہ میں ابتدا ہی سے ممتاز تھے، چنانچہ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ زمانۂ طالب علمی ہی سے استاذ بن گئے تھے۔ خود ان کا بیان ہے کہ جس زمانے میں میں امام مالک کے حلقۂ درس میں داخل ہو کر استفادہ کر رہا تھا، اس زمانے میں بہت سے طالبانِ حدیث مجھ سے نقل روایت کرتے تھے[2]۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۴۰ [2] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۸۰۔

امام مالک کی مجلس درس کے بارے مین یہ مشہور ہے کہ وہ نہایت باوقار اور سنجیدہ ہوتی تھی جب تک درس کا سلسلہ جاری ہوتا تھا کوئی شخص اپنی جگہ سے ہل نہین سکتا تھا۔ اور نہ خود امام پہلو بدلتے تھے۔ یہی حال ابن مہدی کی مجلسِ درس کا بھی تھا۔ احمد بن سنان اس کا نقشہ ان الفاظ مین کھینچتے ہیں۔

جب تک درس ہوتا رہتا تھا کوئی مجلس مین بات چیت نہین کر سکتا تھا۔ نہ کوئی قلم بناتا تھا اور نہ مجلس سے اُٹھ کر جا سکتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ حاضرین نماز مین شریک ہین یا انکے سرون پر پرندے بیٹھے ہین۔[1]

بہت سے ممتاز ائمہ نے ان سے استفادہ کیا تھا چند استفادہ کرنے والون کے نام یہ ہین
عبداللہ بن مبارک۔ اسحاق بن راہویہ، امام احمد بن حنبل۔ یحیی بن معین۔ علی بن المدینی۔ امام ذہلی استاذ امام بخاری وغیرہ۔

ان کے فضل وکمال کے بارے مین معاصرین کی رائے

علی بن المدینی کہتے ہیں کہ میں اگر کعبہ میں کھڑے ہو کر قسم کھاؤن کہ مین نے ان کے جیسا عالم نہین دیکھا تو مین اپنی قسم میں سچا ہوں گا۔[2] امام احمد فرماتے ہیں کہ سنہ ۱۸۰ھ مین ابن مہدی بغداد آئے ان کو مین برابر دیکھا کرتا تھا، مگر ان سے کبھی استفادہ نہین کیا، اس کے بعد یہ پھر دوبارہ بغداد آئے تو ہم لوگ ان کی خدمت مین حاضر ہوئے اور پھر جم کر ان سے استفادہ کیا، تنہا مین نے ان کے سماع سے تقریباً چھ سات سو روایتین نقل کین۔[3] یحیی بن سعید سے کسی نے ایک حدیث کے بارے مین سوال کیا، بولے کہ ابن مہدی کے پاس جاؤ اور خود ان کی چند مرویات میرے سامنے بیان کین۔[4] ابن سعید کہتے تھے کہ مین نے براہ راست جو حدیثیں اعمش سے سماع کی ہین وہ روایتیں جب ابن مہدی اعمش سے بواسطہ سفیان بیان کرتے ہیں تو مجھے ان کا بالواسطہ سماع اپنے براہ راست سماع سے زیادہ پسندیدہ معلوم ہوتا ہے۔[5] امام ذہبی ان کو الحافظ الکبیر اور العالم الشہیر لکھتے ہیں،

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۰۳ [2] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۴۵ [3] ایضاً ص ۲۴۲ [4] ایضاً [5] ایضاً ص ۲۴۴

ابن حجر نے انھیں حافظ اور امام علم لکھا ہے۔ امام نووی نے لکھا ہے کہ ان کے اوپر علوم حدیث میں اعتماد کیا جاتا ہے۔ اور اس علم کے معارف کا ان کے اوپر دار و مدار ہے۔

قوت حافظہ قوت حافظہ بھی غیر معمولی پایا تھا۔ تمام ائمۂ حدیث نوادن کی قوت حافظہ کا اعتراف کیا ہے، اس کا اندازہ عبد اللہ کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک بار ابن مہدی نے بیس ہزار حدیثیں مجھے اپنے حافظہ سے املا کرائی تھیں[1]۔

علم حدیث میں ان کا مرتبہ علم حدیث میں ان کا شمار ان اساطین امت میں ہوتا ہے جن کے ذریعہ یہ فن اہل ہوس کی دست برد سے محفوظ و مامون رہا۔ تمام ائمۂ حدیث نے ان کی خدمت حدیث اور اس میں ان کی امامت و جلالت کا اعتراف کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل فرماتے تھے کہ یہ خدیث نبوی کی خدمت ہی کے لیے پیدا کیے گئے تھے[2]۔ ابن مہدی جس شخص کی روایت قبول کر لیں، سمجھو کہ وہ حجت ہے[3]۔ ابن مدینی جو خود فن رجال کے امام ہیں کہتے تھے کہ ابن مہدی اور ابن قطان جس راوی سے روایت کرنا چھوڑ دیتے ہیں، میں بھی اسے ترک کر دیتا ہوں اور جب کسی راوی کی روایت قبول کرنے میں یہ دونوں امام مختلف الرائے ہو جاتے ہیں تو میں ابن مہدی کی رائے کو ترجیح دیتا ہوں، اس لئے کہ یہ رائے دینے میں زیادہ معتدل اور محتاط ہیں، اور ابن قطان میں تشدد زیادہ ہے[4]۔ ابن معین فرماتے تھے، میں نے فن حدیث میں ابن مہدی سے زیادہ پختہ کار نہیں دیکھا[5]۔ ابو حاتم کا قول ہے کہ وہ ثقہ تھے، فکر و نظر کی پختگی میں ان کا درجہ وکیع سے بھی بڑھا ہوا تھا[6]۔ ابو ربیع زہرانی بیان کرتے تھے کہ ان کی خصوصیت بصیرت فی الحدیث تھی، ابن عمار کہتے تھے کہ وکیع اور ابن مہدی دونوں قابل وثوق ہیں مگر ابن مہدی کی بصیرت فی الحدیث بڑھی ہوئی تھی۔ انہی کا قول ہے کہ حدیث کے الفاظ کے اختلاف سے خوب واقف تھے، امام احمد فرماتے تھے کہ ابن مہدی وکیع بن جراح سے اس لئے زیادہ

۱؎ صفوۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۲ ۲؎ تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۳۰۵ ۳؎ تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۴۴ ۴؎ ایضاً ۵؎ تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۳۰۵
۶؎ تاریخ بغداد ص ۲۴۲۔

قابلِ وثوق ہیں کہ یہ عہدِ تدوین وتحریر سے زیادہ قریب تھے[1] یعنی ان کے زمانہ مین حدیث کی تدوین و ترتیب کا کام عام طور پر شروع ہوگیا تھا، اور وکیع بن جراح کے زمانہ مین ائمہ زیادہ تر زبانی ہی روایت کرتے تھے۔

حدیث کی صحت کا معیار درایت بھی ہے

حدیث کی صحت اور عدم صحت کا فیصلہ دو چیزون پر ہے، ایک روایت یعنی سلسلۂ سند اور دوسرے درایت، یعنی کسی حدیث کے صحیح ہونے کے لیے صرف اتنی بات کافی نہین ہے کہ وہ ثقہ اور قابلِ وثوق لوگون کے ذریعہ بیان ہوئی ہے بلکہ اس مین یہ بھی غور کرنا چاہیئے کہ یہ روایت اسلامی تعلیم کی کسی روح کے خلاف تو نہیں ہے۔ وہ کسی حدیث صحیح سے متصادم تو نہین ہوتی ہے۔ اس میں مقامِ نبوت سے گری ہوئی کوئی بات تو بیان نہین ہوئی ہے۔ وہ قرآن کے کسی بیان سے ٹکراتی تو نہین ہے، درایت کا استعمال عہدِ نبوی ہی سے شروع ہوگیا تھا۔ عہد صحابہ مین بھی ہمیشہ یہ اصول برتا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ خصوصیت سے اس مین سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ تابعین اور اتباع تابعین کے زمانہ مین بھی حدیث کے رد وقبول مین صرف روایت کا نہین بلکہ درایت کا بھی لحاظ کیا جاتا تھا۔ مگر درایت کے مقابلہ مین روایتِ حدیث کا کام آسان ہو اس لئے حاملین روایت کی تعداد تو کثرت سے نظر آتی ہے، اسکے مقابلہ مین صاحبِ درایت خال خال نظر آتے ہیں، اس کی وجہ ظاہر ہے۔ روایت حدیث کا دار و مدار زیادہ تر قوتِ حافظہ پر ہے، جو شخص اس نعمت سے بہرہ ور ہے وہ تھوڑی سی ذہانت وذکاوت کے ساتھ اس فرض کو انجام دے سکتا ہے۔ مگر صاحبِ درایت کے لیے محض قوتِ حافظہ ہی کی نہین بلکہ غیر معمولی ذہانت وذکاوت کے ساتھ وسعت نظر اور دقت فکر کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے اس کے حاملین کی تعداد تو کم ہونی ہی چاہیئے۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۷۳۔

اتباع تابعین میں جن بزرگوں کو یہ خصوصیت حاصل تھی ان میں ابن مہدی بھی تھے۔ اوپر جو اقوال نقل ہوئے ہیں، ان سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ علم حدیث میں ان کی بصیرت اور دقیقہ سنجی کے تمام اکابر معترف ہیں، خود فرماتے تھے کہ کسی شخص کا امام (جس کا اتباع کیا جائے) بننا اس وقت تک صحیح نہیں ہے جب تک اس کو روایت کی صحت اور غلطی کا علم نہ ہو جائے تاکہ وہ ہر روایت سے استدلال نہ کرنے لگے، اس کے ساتھ اس کو علم کے اصل ماخذ و منبع کا بھی علم ہونا چاہیے یعنی کتاب و سنت کی روح سے پورے طور پر واقف ہونا چاہیے۔ درایت کے پورے مفہوم کو اردو میں کسی ایک لفظ سے ظاہر نہیں کیا جا سکتا، البتہ اس کے مفہوم کو ذہن سے قریب تر کرنے کے لیے مہارت فن اور ذوق علم کے الفاظ استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ یعنی کسی علم کی ممارست اور انہماک سے جو ایک ذوق حاصل ہو جاتا ہے اور اس ذوق سلیم کی روشنی میں اس فن کے بارے میں جو فیصلہ کیا جاتا ہے، اس کو درایت کہتے ہیں۔ خود ابن مہدی نے درایت کے مفہوم کو ایک بڑی عمدہ مثال کے ذریعہ واضح کیا ہے، ابن مہدی بیان کرتے ہیں کہ ان کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے پوچھا کہ اے ابوسعید! آپ کسی روایت کو ضعیف اور کسی کو قوی قرار دیتے ہیں۔ کسی کے بارے میں کہہ دیتے ہیں کہ یہ صحیح ہے اور کسی کے غلط ہونے کا حکم لگا دیتے ہیں، تو یہ رائے اتنی جلد آپ کس طرح قائم کرتے ہیں (یعنی وہ کون سا معیار ہے جس پر جانچ کر آپ صحیح و غیر صحیح ہونے کا حکم لگاتے ہیں) فرمایا کہ تم کسی صراف یا روپیے کے پارکھ کے پاس روپیے دینار لے جاتے تو وہ فوراً دیکھتے ہی کہتا ہے کہ یہ سکہ کھرا ہے اور یہ کھوٹا، یہ اچھا ہے اور یہ ردی تو کیا تم اس سے پوچھتے ہو کہ یہ حکم تم نے کیوں اور کیسے لگایا؟ یا اس کی بات تسلیم کر لیتے ہو۔ اس نے کہا کہ ہاں اس بارے میں تو اس کی رائے بے چون و چرا تسلیم ہی کر لینی پڑتی ہے۔ فرمایا کہ روایات کا حال بھی بالکل ایسا ہی ہے۔ مگر یہ منصب ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے بڑی ممارست، اہل علم کی صحبت تبادلہ خیال اور دقت نظر کی ضرورت ہوتی ہے[1]۔ معرفت حدیث کے بارے میں ان کا قول تھا کہ حدیث کی

---

[1] تہذیب الاسماء ص ۳۰۵۔

معرفت ایک طرح کا الہام ہے۔[1] ان کا یہ جملہ درایت حدیث کی بہترین تفسیر ہے۔

روایت باللفظ | حدیث نبوی کا جو ذخیرہ ہمارے پاس روایات کے ذریعہ پہنچا ہے اس مین کچھ قولی ہیں اور کچھ فعلی۔ فعلی حدیثون کو تمام صحابہ نے اپنے الفاظ مین بیان کیا ہے۔ مثلاً آپ نے وضو فرمایا تو وضو کی پوری حالت کو مختلف صحابہ نے اپنے اپنے الفاظ مین بیان کیا ہے مگر احادیث کا وہ حصہ جو آپ کے ارشادات پر مشتمل ہے اس مین کچھ حصہ تو صحابہ نے اپنے الفاظ مین بیان کیا ہے یعنی روایت بالمعنی کی ہے، اور کچھ حصہ ایسا ہے جس مین ارشاد نبوی کو لفظ بلفظ بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ صحابۂ کرام کے عہد سے عہد اتباع تابعین تک بیشمار ایسے اکابر گذرے ہیں جو غایت احتیاط مین ارشاد نبوی کی معناً روایت کرنے کے بجائے لفظاً روایت کرنے کو پسند کرتے تھے۔ ان ہی بزرگوں مین عبدالرحمن بن مہدی بھی تھے۔ امام احمد بن حنبل سے کسی نے پوچھا کہ ابن مہدی حافظ حدیث تھے؟ فرمایا کہ حافظ حدیث ہی نہین تھے۔ انتہائی محتاط محدث تھے۔ اور ان کی ایک خاص خصوصیت یہ تھی کہ

وکان یحب ان یحدث باللفظ[2] — کلام نبوی کی لفظ بلفظ روایت کرنا پسند کرتے تھے

حدیث میں ان کی ایک اور خصوصیت کا ذکر خطیب بغدادی نے کیا ہے، وہ یہ ہے کہ

برع فی معرفۃ الاثر وطرق الروایات واحوال الشیوخ — آثار نبوی ... روایات کے مختلف سلسلۂ سند اور شیوخ حدیث کے احوال سے واقفیت مین ان کو پوری مہارت حاصل تھی۔

تفقہ | جس شخص مین روایت و درایت حدیث کے تمام اوصاف موجود ہون، جو دین کی روح اور اس کے ماخذ و منبع سے پوری واقفیت رکھتا ہو، اس کے تفقہ فی الدین مین کیا شبہہ ہو سکتا ہے، امام احمد فرماتے ہیں کہ بصرہ مین دو غیر معمولی عالم پیدا ہوئے، ایک یحییٰ بن سعید دوسرے عبدالرحمن بن مہدی

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۰۳۔ [2] تہذیب ج ۶ ص ۲۸۰۔

مگر تفقہ میں ابن مہدی کا پلہ بھاری تھا، کمال تفقہ ہی کے بناء پر معاذ بن معاذ کہتے تھے کہ بصرہ میں عہدۂ قضا کا اگر کوئی اہل ہے تو صرف ابن مہدی ہیں مگر انہیں کمی یہ ہے کہ ان کا خاندان یہاں نہیں ہے، اگر وہ کسی بڑے آدمی کے خلاف کوئی فیصلہ کر دیں تو پھر وہ بڑے ان کو اس فیصلہ سے روکنے کی کوشش کریں گے، (اور ان کا کوئی ہمنوا نہ ہوگا) [1] اس واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عجمی اثرات کی وجہ سے اسلامی معاشرہ میں دوبارہ خاندانی عصبیت کس طرح گھس آئی تھی کہ اس وقت کا قاضی اگر اپنی پشت پر اپنے ہمنواؤں کی ایک جماعت نہیں رکھتا تھا تو اس کے اپنے فیصلے بھی بے اثر ہو سکتے تھے، اور حکومت اس میں کچھ نہ کر پاتی تھی،

سیرت و اخلاق۔ اپنی سیرت و اخلاق کے اعتبار سے بھی وہ ممتاز تھے۔ ابن جوزی نے ان کو صاحب زہد و تقویٰ اتباع تابعین میں شمار کیا ہے، ایوب بن متوکل کا بیان ہے کہ جب ہم کو کسی ایسے شخص سے ملنے کی خواہش ہوتی جو دین و دنیا کا جامع ہو تو ابن مہدی کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تھے، حسان ازرق کہتے ہیں کہ ان کے دیکھنے سے آنکھیں ٹھنڈی ہو جاتی تھیں [2]

ان کے ورع و تقویٰ کا حال یہ تھا کہ اگر ان کو کسی چیز میں حرام ہونے کا شبہہ بھی ہو جاتا تھا تو اس کو اپنے استعمال میں نہیں لاتے تھے، وہ کہا کرتے تھے کہ جو چیز تم خدا کی رضا اور خوشنودی کے لیے چھوڑ دو گے خدا تعالیٰ اس کو تمہارے پاس ضرور واپس کر دے گا۔ یہ کہنے کے بعد انھوں نے اپنا ایک واقعہ بیان کیا کہ میں نے اور میرے بھائی نے مشترکہ تجارت کی جس میں کافی نفع ہوا مگر جب نفع تقسیم ہونے لگا تو اس مال میں کچھ شبہہ ہوا، میں اپنے حصہ سے دستبردار ہو گیا۔ مگر خدا کی قدرت دیکھئے کہ میری زندگی میں وہ تمام دولت پھر میرے اور میرے لڑکوں کے پاس آگئی، وہ اس طرح کہ میرے بھائی نے اپنی تین لڑکیوں کی شادی میرے تین لڑکوں سے کر دی تھی اور میں نے اپنی لڑکی کی شادی انکے

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۴۲۔

لڑکے سے کردی۔ اتفاق سے کچھ دن بعد بھائی کا انتقال ہوگیا۔ اور ان کے سارے مال کے وارث میرے والد اور مرحوم بھائی کی لڑکیاں جو میرے لڑکوں سے منسوب تھیں ہوئیں۔ اس کے بعد والد کا بھی انتقال ہوگیا، اور وہ کل دولت میرے گھر میں آگئی[1]

ایک بار کسی زمین کے بیچنے کا ارادہ کیا۔ ڈھائی سو دینار فی جریب پر معاملہ طے ہوگیا، دلال جسکے ذریعہ غالباً یہ معاملہ طے ہوا تھا، اس نے آپ سے کہا کہ خریدار نے اس زمین کو ویران اور غیر آباد سمجھ کر اتنی قیمت لگائی ہے اگر میں اور آپ کا غلام دونوں مل کر اس زمین میں کھاد وغیرہ ڈال کر اس کو آباد کر دیں تو اس زمین کی قیمت فی جریب پچاس دینار (پانچ چھ سو روپیہ) سے زیادہ ہو جائیگی، اس طرح پوری زمین میں آپ کو چار ہزار دینار مزید مل جائیں گے، گو ایسا کرنا غلط نہیں تھا، اس لئے کہ اس نے ابھی قیمت نہیں ادا کی تھی، مگر پھر بھی انھوں نے محض تھوڑے سے فائدے کے لئے وعدہ کرنے کے بعد اس کو مایوس کرنا ایک طرح کی بدمعاملگی اور بداخلاقی سمجھی، اس لئے دلال کی گفتگو سے بہت ناراض ہوئے اور بولے کہ تم چار ہزار دینار کا لالچ دیتے ہو، میں اس چار ہزار سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں، پھر اس کے بعد یہ آیت تلاوت کی

لایستوی الخبیث والطیب	حرام اور حلال مال برابر نہیں ہو سکتے،
ولو اعجبک کثرۃ الخبیث	اگرچہ حرام مال کی کثرت تمہارے لئے کتنی ہی پسندیدہ کیوں نہ ہو۔

پھر کہا کہ میں ہرگز اس معاملہ سے باز نہیں رہ سکتا۔ خواہ چار ہزار کے بجائے ایک لاکھ دینار کا فائدہ کیوں نہ ہو[1] حصول ثواب کا انہیں عشق تھا۔ فرماتے تھے کہ اگر مجھے اس بات کا خوف نہ ہوتا کہ خدا کی نافرمانی ہوگی تو میں یہ تمنا کرتا کہ اس شہر کا ہر ہر شخص میری غیبت کرے۔ بھلا اس نیکی سے عمدہ

---

[1] صفوۃ الصفوہ ج ۴ ص ۳

کون سی نیکی ہو سکتی ہے جس کو اس نے نہ تو کیا ہو اور نہ اسے اس کا علم ہوگا۔ قیامت کے دن محاسبہ ہو تو اس کے صحیفۂ اعمال مین وہ نیکی موجود ہو[1]۔ یہ اشارہ اس حدیثِ نبوی کی طرف ہے جس مین یہ کہا گیا ہے کہ جب کسی بندہ کی ناحق برائی کی جاتی ہے، تو ہر برائی کے بدلہ اس کے نامۂ اعمال مین ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے۔

نصیحت | اہلِ علم کو وہ نصیحت کیا کرتے تھے کہ جب آدمی اپنے سے زیادہ صاحب فضل وکمال سے ملے تو اس کی صحبت کو غنیمت سمجھے، اگر اپنے برابر سے ملے تو اس سے استفادہ اور مذاکرہ کی کوشش کرے، اور اگر اپنے سے کم تر آدمی سے ملے تو اس کے ساتھ تواضع سے پیش آئے اور اس کو اپنے علم وفضل سے فائدہ پہنچائے۔

جو شخص ہر سنی سنائی روایت کو نقل کر دیتا ہو اور جو ہر کہ ومہ کی روایت قبول کر لیتا ہو وہ علم حدیث کا امام بننے کے لائق نہین ہے[2]۔

علم وفضل اور اخلاق وسیرت کے ساتھ عبادت وریاضت مین بھی وہ ممتاز تھے۔ ان کے صاحبزادے کا بیان ہے کہ وہ اکثر اوقات پوری رات نفل نماز تلاوت قرآن مین گزار دیتے تھے۔ ان کا عام معمول یہ تھا کہ ہر روز نصف قرآن تلاوت کر ڈالتے تھے، یہ ایک بار پوری رات جاگتے رہے مگر عین صبح کے وقت آنکھ لگ گئی اور نماز فجر قضا ہو گئی۔ ان کو اس کا اتنا رنج ہوا کہ اس کی تلافی کے لئے بہت دنون تک زمین پر پیٹھ نہین لگائی[3]۔

خلق قرآن کے مسئلہ مین ان کی رائے | یونانی فلسفہ اور دوسری قومون کے اختلاط سے اس زمانہ مین بہت سے ایسے مسائل پیدا ہو گئے تھے، جن کا وجود عہد نبوی اور عہد صحابہ مین نہین ملتا، ابتدائً علماء محدثین ان مسائل کے جواب سے گریز کرتے تھے، مگر جب یہ مسائل

---

[1] صفوۃ الصفوۃ ج ۴ ص [2] ایضاً [3] تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۳۰۳۔

بہت زیادہ عام ہوئے تو ان کو ان کے بارے مین اپنی رائے دینی ہی پڑی، انہی مسائل مین ایک مسئلہ قرآن کے مخلوق ہونے کا بھی تھا، اس بارے مین قریب قریب اس عہد کے بیشتر علماء و محدثین سے سوال کیا گیا تھا اُن سے پوچھا گیا تو فرمایا کہ اگر مجھے اقتدار حاصل ہوتا تو قرآن کو مخلوق کہنے والے کی میں گردن اڑا دیتا اور پھر اس کی لاش دجلہ میں پھنکوا دیتا[1]

فرماتے تھے، فرقہ جہمیہ چاہتا ہے کہ خدا کے لیے نہ تو صفت کلام ثابت ہو سکے اور نہ قرآن اس کا کلام ثابت ہو سکے، حالانکہ یہ ثابت ہے کہ خدا نے حضرت موسیٰؑ سے کلام کیا اور پھر بتاکید کہا کہ

وکلم اللہ موسیٰ تکلیماً — اللہ نے حضرت موسیٰؑ سے کلام کیا[2]

وفات | اس پیکر فضل و کمال نے ترسٹھ سال کی عمر مین ۱۹۸ھ میں بصرہ مین وفات پائی، رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً :-

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۰۳ [2] ایضاً -

علی بن مدینی

اتباع تابعین کے زمرہ میں جن محدثین کو جرح و تعدیل کا امام سمجھا جاتا ہے، ان میں ایک علی بن المدینی بھی ہیں۔ گو یہ عمر میں چھوٹے تھے۔ مگر علم و فضل کی وجہ سے ان کا شمار اکابر محدثین میں ہوتا تھا۔

نام و نسب | ابو الحسن کنیت اور علی نام تھا۔ ان کا خانوادہ قبیلہ بنو سعد کے ایک شخص عطیۃ السعدی کا غلام تھا۔ آبائی وطن مدینہ تھا۔ اس نسبت سے مدینی مشہور ہیں، بعد میں یہ خاندان بصرہ میں آباد ہو گیا تھا یہیں سنہ ۱۶۱ھ میں ان کی ولادت ہوئی۔ اور وہیں ان کی نشو و نما اور ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا، ان کے دادا اور والد دونوں صاحب علم و فضل تھے۔ ان کے والد کے بارے میں تو خطیب نے لکھا ہے کہ یہ مشہور محدث تھے، انکی ابتدائی تعلیم انہی کی آغوشِ تربیت میں ہوئی۔ بعض واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اختتام تعلیم سے پہلے ہی ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ چنانچہ جب انھوں نے سماع حدیث کے لیے یمن کا سفر کیا تو اس وقت ان کے اخراجات کی ساری ذمہ داری ان کی والدہ کے سر تھی۔

طلب علم کا شوق | ان کے شیوخ کی فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے طلب علم کے شوق میں دور دور کی خاک چھانی تھی، مکہ، مدینہ، بغداد، کوفہ۔ غرض ممالک اسلامیہ کے ہر مشہور مقام تک طلب علم کے لیے گئے خصوصیت سے یمن میں وہ تین سال تک مقیم رہے۔ علم حدیث سے ان کو فطری لگاؤ بھی تھا، اور وراثۃً بھی یہ علم ان کے حصہ میں آیا تھا۔ اس لیے ان کے علم کا سارا جوہر اس فن میں کھلا، سماع حدیث کے لیے جس وقت انھوں نے یمن کا سفر کیا تھا۔ اس وقت یہ مبتدی نہیں تھے بلکہ اپنے حفظ و سماع سے حدیث کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ اپنے پاس جمع کر چکے تھے۔ خود بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے سلسلۂ سفر

اعتبار سے ایک سند جمع کی تھی۔ میں جب یمن جانے لگا تو اس کو بحفاظت ایک بکس میں بند کرتا گیا لیکن تین برس کے بعد واپس ہوا تو یہ سارا ذخیرہ مٹی کا ڈھیر ہو چکا تھا۔ مجھ پر اس کا ایسا اثر ہوا کہ پھر دوبارہ اس کے جمع کرنے کی ہمت نہ کر سکا[1]۔

والدہ کی طرف سے طلب علم کی ہمت افزائی

والد کے انتقال کے بعد گھر کا کوئی نگران نہیں تھا۔ صرف ان کی والدہ تنہا تھیں ان کے قیام یمن کے زمانہ میں ان کو نہ جانے کتنی کلفتوں کا سامنا کرنا پڑا ہو گا مگر انھوں نے یہ پسند نہیں کیا کہ ان تکالیف کی اطلاع دے کر اپنے نور چشم کے سمند شوق کی راہ میں کوئی روڑہ ڈالیں بلکہ جن لوگوں نے اس کا مشورہ دیا ان کو انھوں نے اپنے لڑکے کا دشمن سمجھا، چنانچہ جس وقت علی بن المدینی یمن سے واپس آئے تو انھوں نے بیان کیا کہ بیٹا میں نے تمھارے دوستوں اور دشمنوں کو اچھی طرح پہچان لیا۔ بیٹے نے پوچھا! اماں جان! یہ کیسے؟ بولیں جب تم یمن میں تھے تو فلاں فلاں آدمی میرے پاس آتے اور ادب سے سلام کرتے اور مجھ کو تسلی دیتے اور کہتے کہ آپ ان کی مفارقت سے گھبرائیں نہیں جس وقت علی واپس آئیں گے تو ان کو دیکھ کر آپ کی آنکھیں ٹھنڈی اور دل باغ باغ ہو جائیگا میں نے اس سے سمجھ لیا کہ یہ لوگ تمھارے مخلص اور بہی خواہ ہیں۔ ان کے برخلاف فلاں فلاں اشخاص آئے اور کہنے لگے کہ آپ ان کو خط لکھئے کہ وہ جلد واپس آجائیں اگر نہ آئیں تو پھر پریشان کن خط لکھیے۔ ان باتوں سے میں سمجھی کہ یہ لوگ تمھارے دشمن ہیں دوست نہیں[2]۔

علمی شغف

ان کے علمی شغف کا حال یہ تھا کہ رات کو سوتے سوتے کوئی حدیث یاد آگئی یا کوئی شبہہ ہوا فوراً لونڈی سے کہتے کہ چراغ جلا۔ چراغ جل جاتا اور وہ جب اپنی تسکین کر لیتے تب جاکے پھر انکو نیند آتی تھی[3]۔

اساتذہ

جن اساتذہ سے انھوں نے کسب فیض کیا تھا۔ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے، چند مشاہیر کے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۷۔ [2] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۴۶۳ [3] ایضاً ص ۴۶۲

نام یہ ہیں۔ ان کے والد عبداللہ بن جعفر، حماد بن زید، سفیان بن عیینہ، یحیٰی بن سعید القطان، عبدالرحمٰن بن مہدی،

ابوداؤد طیالسی، ابن علیہ، سعید بن عامر وغیرہ،

اعتراف فضل | ان کے علم وفضل کا ہر گروہ کو اعتراف تھا۔ یحیٰی بن سعید القطان ان کے اساتذہ میں تھے، مگر وہ کہا کرتے تھے کہ علی بن المدینی نے جتنا مجھ سے استفادہ کیا ہے اس سے کہیں زیادہ میں نے ان سے استفادہ کیا ہے[1]۔ اسی طرح مشہور محدث اور ان کے شیخ ابن مہدی کہا کرتے تھے کہ میں نے احادیث نبوی کا اتنا بڑا جاننے والا نہیں دیکھا[2]۔ سفیان بن عیینہ کے یہ خاص اور محبوب تلامذہ میں تھے۔ بعض لوگوں کو ابن المدینی کے ساتھ ان کی منسبت ومحبت ناگوار گزرتی تھی۔ ایک دن انھوں نے فرمایا کہ مجھے لوگ علی کی محبت پر ملامت کرتے ہیں۔ خدا کی قسم انھوں نے مجھ سے جتنا کسب فیض کیا ہے، اس سے کچھ زیادہ میں نے ان سے استفادہ کیا ہے[3]۔ سفیان ان کو حدیث کا مرجع دماغی کہتے تھے۔ کہتے تھے کہ اگر ابن المدینی نہ ہوتے تو میں درس دینا بند کر دیتا۔ امام احمد بن حنبل ان کا اتنا احترام کرتے تھے کہ ادب سے ان کا نام نہیں لیتے تھے۔ بلکہ ہمیشہ ان کی کنیت ابوالحسن ہی سے ان کو مخاطب کرتے تھے[4]۔ امام بخاری ان کے تلامذہ میں ہیں، انکا قول ہے کہ میں نے علی بن المدینی کے علاوہ کسی کے سامنے اپنے کو حقیر نہیں سمجھا[5]۔ ان کے انتقال کے بعد ایک بار کسی نے امام بخاری سے پوچھا کہ آپ کے دل میں کوئی خواہش باقی ہے؟ بولے ہاں! ایک خواہش ہے۔ وہ یہ ہے کہ ابن مدینی زندہ ہوتے تو میں عراق جاکر ان کی صحبت میں بیٹھتا[6]۔ ابن ماجہ اور نسائی نے ان سے بالواسطہ روایتیں کی ہیں۔ امام نسائی کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو علم حدیث ہی کے لیے پیدا کیا ہے[7]۔

خصوصیت | ان کے اساتذہ اور دوسرے ائمہ نے ان کے بارے میں جو رائیں دی ہیں۔ ان میں

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۳۵۱ [2] ایضاً۔ [3] تہذیب التہذیب جلد ۷، صفحہ ۳۵۹ - [4] ایضاً
[5] ایضاً ص ۳۵۲ [6] ایضاً ص ۳۵۱ - [7] ایضاً،

کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ واقعہ ہے کہ ابن مدینی کو جو خصوصیت حاصل تھی اس مین ان کے اساتذہ اور معاصر ائمہ مین بہت کم لوگ ان کے سہیم و شریک تھے۔

ابن مدینی حدیث کے حافظ اور محض راوی نہین تھے، بلکہ حدیث نبوی کے عارف و ماہر تھے، سند و متن رواۃ و روایت ہر چیز پر نظر تھی، خامیون اور نقائص کا پورا علم رکھتے تھے۔ ابو حاتم کا قول ہے کہ علی معرفت حدیث و علل مین ایک علامت و نشان تھے۔[1]

محدث فرہیانی سے کسی نے امام احمد، یحییٰ بن معین اور ابن مدینی کے بارے مین سوال کیا تو انھون نے کہا کہ یحییٰ کو رجال مین درک تھا، اور امام احمد مین تفقہ زیادہ تھا اور ابن مدینی کے بارے مین کہا کہ

فاعلمهم بالحدیث والعلل — حدیث اور اس کی سندون اور علتون سے خوب واقف تھے۔[2]

محمد بن یحییٰ کا بیان ہے کہ مین نے ان کے پاس ایک کتاب دیکھی جس کی پشت پر لکھا تھا کہ ابن مدینی کہا کرتے تھے کہ مجھے ایک حدیث کی علت سے واقفیت ہو جائے تو یہ مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ بے جانے بوجھے مین بیسیوں حدیثیں یاد کر لوں۔

اسی خصوصیت کی بنا پر روایت کی صحت و عدم صحت پر جب بحث و مباحثہ ہوتا تو اپنے معاصرین میں یہی حکم بنائے جاتے، اور انہی کی رائے پر بحث کا خاتمہ ہوتا تھا۔ بغداد اس وقت علم و فن کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ مگر وہان جب ابن المدینی پہنچ جاتے تو ایک نیا حلقہ درس قائم ہو جاتا۔ اور تمام ائمہ پروانون کے گرد جمع ہو جاتے، اور جب ان کے درمیان کوئی مختلف فیہ مسئلہ آجاتا اور فیصلہ نہ ہو پاتا تو پھر اس مین ابن مدینی اپنی رائے دیتے تھے۔[3]

روایت حدیث مین شدت احتیاط — اس زمانہ مین روایت حدیث عام طور پر ایک علم و فضل کی چیز بن گئی تھی

---

[1] تہذیب التہذیب [2] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۳۵۲ [3] ایضاً۔

اس لیے بعض نااہلوں نے بھی روایت حدیث کی مسند سنبھالی تھی اور ان کی وجہ سے بیشمار قصے اور افسانے احادیث نبوی کے نام سے عوام میں مشہور ہو گئے تھے، ائمۂ حدیث کا یہ غیر معمولی کارنامہ ہے کہ انھوں نے ایسے افسانوں اور قصوں کو ذخیرۂ حدیث سے چھانٹ کر الگ کر دیا خود ابن مدینی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی ایک لاکھ مرویات جن میں تیس ہزار ایک راوی عباد بن صہیب سے مروی تھیں ترک کر دیں اس لیے کہ یہ قابلِ اعتبار نہیں تھیں[1]

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ائمۂ حدیث اور خاص طور سے ابن مدینی نے صحیح حدیث کی تفتیش و تنقید میں کتنی جانکاہی کی تھی۔

عادات و اخلاق | اپنے اخلاق و عادات میں اسلاف کا نمونہ تھے عباس عنبری کہتے ہیں کہ اگر ان کی عمر نے کچھ اور زیادہ وفا کی ہوتی تو اپنے اخلاق و عادات میں وہ حسن بصری سے بڑھ جاتے۔ ان کی زندگی کا ہر گوشہ اتنا پاکیزہ اور پرکشش تھا کہ

کان الناس یکتبون قیامه وقعوده	ان کی چال ڈھال، نشست و برخاست، انکے
ولباسه وکل شیء یقول ویفعل[2]	لباس کی کیفیت غرض ان کے ہر قول و عمل
	کو لوگ اسوہ سمجھ کر لکھ لیا کرتے تھے۔

ان ہی اوصاف کا کرشمہ تھا کہ جبتک یہ بغداد میں رہتے، سنت کا چرچا بڑھ جاتا اور شیعیت کا زور گھٹ جاتا اور جب کچھ دنوں کے لیے یہ بصرہ چلے جاتے تو یہ فتنہ پھر زور پکڑ لیتا، یحییٰ بن معین فرماتے ہیں۔

وکان علی بن المدینی اذا قدم علینا	علی بن المدینی جب بغداد آجاتے تو سنت
اظهر السنة واذا ذهب الی	کا چرچا ہو جاتا تھا اور جب وہ بصرہ چلے جاتے
البصرة اظهر التشیع (تہذیب ج ۷ ص ۳۵۵)	جاتے تو شیعیت زور پکڑ جاتی،

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۳۵۵ [2] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۴۶۴

تصنیف | یہ ان ائمہ تبع تابعین مین ہیں، جنھون نے اپنی تحریری یادگارین بھی چھوڑی ہیں۔ امام نووی نے لکھا ہے کہ انھون نے حدیث میں دو سو ایسی تصنیفیں چھوڑی ہیں جس کی مثال ان سے پہلے نہین ملتی۔ مگر ان میں بیشتر ضائع ہوگئیں، حافظ ابن حجر نے صرف اتنا لکھا ہے کہ وہ صاحب تصانیف تھے۔ ابن ندیم نے ان کی چند تصانیف کے نام بھی گنائے ہیں۔

کتاب المسند بعلله، کتاب المدلسین، کتاب الضعفاء، کتاب العلل، کتاب الاسماء والکنی، کتاب الاشربہ، کتاب التنزیل (ص ۳۲۲)

فتنۂ خلق قرآن اور ابن مدینی کی آزمائش | متعدد ائمہ کے حالات مین مسئلہ خلق قرآن کا ذکر آچکا ہے۔ اس فتنہ کی شدت اور ہمہ گیری کا اندازہ اس وقت نہین لگایا جا سکتا مگر دوسری صدی کے آخر اور تیسری صدی کے شروع کے حالات و واقعات کو اگر سامنے رکھا جائے تو اس کی اہمیت اور شدت کا کچھ اندازہ ہو جائے گا۔ اس مسئلہ نے سب سے زیادہ اہمیت خلیفہ معتصم کے زمانہ مین اس وقت اختیار کر لی تھی، جب اس نے پوری مملکت مین یہ اعلان کرادیا تھا۔ اور اپنے گورنرون کے ذریعہ یہ گشتی کرادی تھی کہ جو شخص خلق قرآن کا قائل نہین ہے۔ اس کو حبس و ضرب ہی نہین بلکہ دار و رسن کی سزا بھی دی جا سکتی ہے، اس اعلان کے بعد بڑے بڑے ائمہ اور محدثین کے پیرون مین لغزش آگئی اور انھون نے اس کا اقرار کر لیا، کتنے روپوش ہوگئے مگر کچھ مردان خدا ایسے بھی تھے، جو نہ روپوش ہوئے اور نہ ان کے پیرون مین لغزش آئی بلکہ آخر وقت تک اس بات کا اظہار کرتے رہے کہ یہ عقیدہ سراسر اسلام و ایمان کے خلاف ہے۔ اس کے نتیجہ مین ان کو وہ سب کچھ بھگتنا پڑا جس کا اس سے پہلے اعلان ہو چکا تھا، ان ظاہرین علی الحق کے سرخیل امام احمد بن حنبل تھے۔

اس مسئلہ مین جن بزرگون نے کمزوری دکھائی، یا یون کہئے کہ عزیمت کے بجائے رخصت اختیار کی، ان مین علی بن المدینی بھی تھے، اوپر ذکر آچکا ہے کہ امام احمد بن حنبل ان کا انتہائی احترام کرتے تھے،

مگر اس مسئلہ مین جب سے ان سے لغزش ہوئی تو انھون نے اپنا رویہ بدل لیا۔ اس واقعہ کی تفصیل خطیب بغدادی نے یہ بیان کی ہے۔

معتصم باللہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ امام احمد بن حنبل اور بعض دوسرے ائمہ اس مسئلہ مین اس کی رائے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ تو اس نے ان کو دربار مین طلب کیا اور برسر دربار شاہانہ انداز مین ان سے مخاطب ہو کر کہا کہ "مین نے سنا ہے کہ آپ اس بات کے قائل ہیں کہ قیامت مین خدا کا دیدار ہوگا۔ حالانکہ یہ ممکن نہین ہے، اس لئے کہ خدائے تعالیٰ کی ذات لامحدود ہے، اور ہماری آنکھون کی بصارت محدود تو محدود چیز لامحدود کو کیسے دیکھ سکتی ہے۔ آپ کے پاس اس کی کیا دلیل ہے کہ قیامت مین رویت باری ہوگی۔ آپ نے نہایت ہی صفائی اور جرات سے فرمایا "میرے پاس جو دلیل ہے وہ محض ظنی و قیاسی نہین بلکہ نقل و روایت پر مبنی ہے۔" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ "تم قیامت میں خدائے تعالیٰ کو اسی طرح دیکھو گے جس طرح چودھوین کے چاند کو دیکھتے ہو"، معتصم یہ دلیل سنکر کچھ گھبرا سا گیا اور اس نے قاضی احمد بن داؤد سے مخاطب ہو کر پوچھا تمھارے پاس اس حدیث نبوی کا کوئی جواب ہے، یہ بیچارہ کیا جواب دیتا۔ بولا! کہ مین اس حدیث کی سند پر غور کر لون تو جواب دون۔ علی بن المدینی سے غالباً اس کے تعلقات پہلے سے تھے۔ دربار سے نکل کر سیدھے ان کے پاس پہنچا، اور ان کے سامنے کچھ نذر پیش کی۔ اور کوئی گفتگو کیے بغیر چلا گیا۔ پھر دوبارہ دس ہزار درہم ان کی خدمت میں یہ کہلا کر بھیجا کہ یہ امیر المومنین نے آپ کو ہدیۃً بھیجے ہیں، اور انھون نے یہ حکم دیا ہے کہ آپ کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ فراہم کر دی جائے۔ یہ دام زرین بچھانے کے بعد پھر ابن مدینی کی خدمت مین حاضر ہوا، اور اس نے پوچھا کہ رویت باری کے سلسلہ میں حضرت جریر بن عبداللہ رضی سے جو روایت مروی ہے کیا وہ صحیح ہے، آپ کے نزدیک اس مین کوئی سقم تو نہیں ہے؟ ابن مدینی

۱ے یہ فرما کر امام نے اس کی عقل پرستی پر ایک ضرب لگائی تھی۔ ۲ے اسی شخص کی بدنفسی اور جاہ پسندی کی وجہ سے اس مسئلہ نے اتنا زور پکڑا تھا۔

فرمایا کہ مجھے اس بارے میں معاف ہی رکھئے۔ (مقصد یہ تھا کہ یہ حدیث صحیح ہے، مگر چونکہ یہ فتنہ کا سبب بنی ہوئی ہے، اس لئے میں اس بارے میں کوئی رائے دینا نہیں چاہتا) ابن ابی داؤد نے دیکھا کہ اس کا وار خالی جانا چاہتا ہے تو اس نے ابن مدینی سے کہا کہ یہ موجودہ زمانہ وحالات کی ضرورت ہے جس کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے، اس کے بعد پھر ان کی خدمت مین کچھ تحائف پیش کئے۔ اور اس حدیث کے بارے مین ان کی رائے دریافت کی۔ اب ابن مدینی کے پائے ثبات مین لغزش آگئی، اور انھون نے وہی جواب دے دیا جو ابن ابی داؤد کا منشا تھا۔ انھون نے کہا کہ اس حدیث کے سلسلۂ سند مین ایک سقم ہے، وہ یہ کہ اس کا ایک راوی قیس بن حازم قابلِ ترک ہے، ابن ابی داؤد یہ سن کر خوشی سے اچھل پڑا اور ابن مدینی کو گلے سے لگالیا، اور وہان سے دربار خلافت کا رخ کیا۔ وہان پہنچ کر اس نے معتصم کے سامنے روایت کے اس ضعف کو ظاہر کیا، معتصم کو جب یہ بہانہ ہاتھ آگیا تو امام احمد کو اس نے سزا دینے کا حکم دیا۔

خطیب نے اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد خود ہی اسے ناقابلِ اعتبا ٹھہرایا ہے۔ اس سلسلہ مین انھون نے کئی باتین لکھی ہیں، ایک یہ کہ جن لوگون نے امام احمد کی آزمایش کا ذکر کیا ہے، ان مین کسی نے بھی یہ نہین لکھا ہے کہ رؤیت باری کے بارے مین امام احمد سے سوال و جواب ہوا۔ دوسرے قیس بن حازم کو ناقابلِ اعتبار کہنا صحیح نہیں ہے۔ ان کا شمار ممتاز تابعین مین ہوتا ہے، تمام ائمہ حدیث انکی وثاقت پر متفق ہیں۔ اور ان سے روایت کرتے ہیں، خود ابن مدینی نے بھی ان سے متعدد روایتین کی ہیں، ظاہر ہے کہ ابن مدینی جس راوی سے خود روایت کرتے ہون اس کو وہ ناقابلِ اعتبار ٹھہرائیں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟

پھر انھون نے لکھا ہے کہ اگر بفرض محال یہ بات صحیح ہو کہ اس موضوع پر معتصم کے سامنے مناظرہ ہوا تو بھی یہ بات تو قطعی غلط ہے کہ ابن مدینی نے مذکورہ روایت کے راوی قیس بن حازم کو قابل ترک قرار دیا ہو۔ یہ بھی ابن ابی داؤد کی چال تھی کہ اس نے خود اپنی طبیعت سے ایک اعتراض پیدا کیا اور اس کو ابن مدینی کی طرف منسوب کر دیا۔[1]

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۲۶۔

ممکن ہو کہ یہ واقعہ اس صورت میں صحیح نہ ہو مگر اتنی بات یقینی ہے کہ ابن مدینی سے مسئلہ خلقِ قرآن کے بارے مین لغزش ہوئی اور انھون نے امام احمد کی رائے کے خلاف رائے دی، جس کی وجہ سے معتصم کی پوزیشن مضبوط ہو گئی۔ اور اس میں وہ تنہا نہیں تھے بلکہ بہت سے اور بھی علما و شریک تھے، یہ اور بات ہے کہ یہ لغزش ان سے حبس و ضرب اور دار و رسن کے خوف سے ہوئی۔ خود ابن مدینی کو اس غلطی کا زندگی بھر افسوس رہا، کسی نے ان سے کہا کہ احمد کے مقابلہ مین اب آپ کی روایات کو اہل علم وقعت نہین دیتے، تو نہایت ہی شرمساری کے ساتھ بولے کہ ہان! ایسا تو ہونا ہی چاہئے۔ امام احمد تو کوڑون کی شدید مار سہار لے گئے۔ مین تو ایک کوڑا بھی نہین برداشت کرسکتا تھا۔[1]

محمد بن عبداللہ موصلی کا بیان ہے کہ علی بن مدینی جہمیت کے عقائد کی ہمیشہ تردید کیا کرتے تھے، مگر جب انھون نے ابتلاء کے زمانے مین اپنی پہلی رائے کے خلاف رائے دی تو مین نے ان کو ایک خط لکھا اس مین مین نے ان کو خدا کا واسطہ دے کر لکھا کہ آپ نے اس سے پہلے جن خیالات کی تردید کی تھی آج ان ہی کی تائید کر رہے ہیں، جب خط ان کو ملا تو رو پڑے اور بڑے افسوس کے لہجہ مین کہا کہ مین نے جو کچھ لکھا ہے محض قتل کے خوف سے لکھا ہے ورنہ میرا قلب اس رائے سے بالکل ابا کرتا ہے، تم جانتے ہو کہ مین کمزور آدمی ہون، اگر مجھ کو ایک کوڑا بھی لگتا تو مین جانبر نہین ہوسکتا تھا۔[2]

جس وقت یہ ابتلاے عام پیش آیا اس وقت ظاہری طور پر امام احمد کا ساتھ آخر وقت تک کسی نے نہین دیا، مگر چونکہ رائے یہی صحیح تھی، اس لئے ہر خاص و عام کے دل مین ان ہی کی رائے کی وقعت تھی، اور جن لوگون نے ان کے خلاف رائے دی وہ ان کی نگاہون سے گر گئے تھے۔

حدیث کے بارے مین ابن مدینی کی شخصیت کے مسلّم ہونے مین کیا شبہہ ہے مگر مسئلہ خلق قرآن مین امام احمد کی رائے سے اختلاف کی بناء پر عام ائمہ حدیث کی نظرون مین وہ اتنا گر گئے کہ ان کی روایت

۱؎ تہذیب التہذیب ج، ص ۳۵۰، ۲؎ ایضاً ص ۳۵۵۔

کے قبول کرنے مین لوگ پس وپیش کرنے لگے تھے حتیٰ کہ بعض نے تو ان کے بارے مین بہت سخت الفاظ استعمال کئے ہیں۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ لوگون نے ان کی تصانیف کی طرف کوئی اعتنا نہین کیا اور کثیر التصانیف ہونے کے باوجود ان کی کوئی تحریری یادگار موجود نہین رہی۔ مگر بہر حال یہ بات صحیح نہین ہے کہ ان کی ایک لغزش کی وجہ سے جس پر ان کو ندامت اور شرمندگی بھی تھی، یہ رائے قائم کی جائے کہ ان کی تمام روایتین ضعیف تھین۔

ابوجعفر عقیلی کہتے ہیں کہ ان کا رجحان اگرچہ ابن ابی داؤد اور جہمیت کی طرف ہوگیا تھا، مگر انکی مرویات نہایت ہی درست ہیں۔[1] امام ذہبی لکھتے ہیں کہ ابن مدینی کے مناقب وفضائل بہت زیادہ ہیں، کاش وہ اس فتنہ مین مبتلا نہ ہوئے ہوتے اگرچہ اس کی کوئی اہمیت باقی نہین رہ گئی، اس لئے کہ انھون نے بعد مین اس پر اپنی ندامت کا اظہار کیا اور جن خیالات کا پہلے اظہار کر چکے تھے اون سے رجوع بھی کر لیا تھا یہانتک کہ خلق قرآن کے قائلین کی تکفیر کرنے لگے تھے۔[2] وہ برسر منبر کہتے تھے کہ کلام اللہ مخلوق نہین ہے عمرو بن علی ان پر بہت سخت تنقید کرتے تھے، یحییٰ بن معین کو معلوم ہوا تو وہ اس پر بہت خفا ہوئے اور فرمایا کہ ان کو مرتد یا فاسق بنانا انتہائی غلط بات ہے، محض جان کے خوف کی وجہ سے مسئلہ خلق قرآن مین ان سے چوک ہوگئی۔

ابن اخزم اپنی مجلس مین ایک دن ابن مدینی کی تعریف کی۔ اسی پر کسی نے کہا کہ عمرو بن علی تو ان پر جرح کرتے ہیں۔ ابن اخزم نے عمرو کو بہت سخت سست کہا۔[3]

ان کے علاوہ امام بخاری۔ ابن حبان اور دوسرے تمام ائمہ حدیث نے ان کی توثیق کی ہے، ظاہر ہے کہ ان ہی ائمہ پر جرح وتعدیل کا دارومدار ہے۔ انھون نے جب ان کی توثیق کردی تو ان کی روایات کے بارے مین ضعف کا شبہہ کرنا صحیح نہین ہے۔

---

[1] تہذیب ج ۷، ص ۳۵۶ [2] ایضاً۔ [3] ایضا ص ۳۵۷ [4] ایضاً۔

وفات | ان کے سنہ وفات اور مقام وفات دونوں میں اختلاف ہے، سنہ وفات کسی نے ۲۳۲ھ کسی نے ۲۳۵ھ اور کسی نے ۲۳۹ھ لکھا ہے۔ مگر خطیب بغدادی نے ۲۳۴ھ کو صحیح قرار دیا ہے۔ بعض اہل تذکرہ نے لکھا ہے کہ ان کا انتقال بصرہ میں ہی ہوا مگر خطیب بغدادی اور ابن ندیم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا انتقال سامرا میں ہوا اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے [۱]۔

---

[۱] خطیب بغدادی جلد ۱۱ صفحہ ۲۷۲ - ۲۷۳ -

امام لیث بن سعد

امام لیث بن سعد ان ممتاز تبع تابعین میں ہیں جن کی مجلس درس میں بڑے بڑے ائمہ نے زانوے تلمذ تہ کیا تھا۔ امام شافعی نے ان کا زمانہ پایا تھا مگر کسی وجہ سے اکتساب فیض نہ کر سکے، جس کا ان کو زندگی بھر افسوس رہا، ان کے مجتہدات اور مسائل فقہ مدون کیے گیے ہوتے تو ان کا شمار ائمۂ مجتہدین مین ہوتا، اسی بنا پر امام شافعی فرماتے تھے کہ ان کے تلامذہ نے ان کو ضائع کر دیا یعنی ان کے افادات کو انھون نے مدون نہین کیا کہ ان کی امامت و جلالت کا صحیح اندازہ بعد کے لوگون کو ہو سکے۔

علم و فضل، تفقہ فی الدین، فیاضی و سیر چشمی اور تواضع و مدارات ان کے سوانح حیات کی جلی سرخیان ہین۔

خاندان آبائی وطن اصفہان تھا۔ مگر ان کا خانوادہ کسی جنگ مین قبیلہ قیس کی ایک شاخ فہم کا غلام ہو گیا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے آبائی وطن چھوڑ کر انکو مصر مین متوطن ہونا پڑا، ان کے خاندان کے بزرگون نے ان کی پیدایش سے پہلے اصفہان کو چھوڑ دیا تھا مگر لیث بن سعد کے دل مین اصفہان کی محبت ہمیشہ باقی رہی، لوگون سے کہا کرتے تھے کہ اصفہان کے رہنے والون کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرو۔[1]

نام و نسب لیث نام، ابو الحرث کنیت تھی، والد کا نام سعد اور دادا کا نام عبد الرحمٰن تھا، ان کے والد اور دادا کے نام سے پتہ چلتا ہے کہ یہ غلام خاندان قدیم الاسلام تھا، مصر کے قریب ایک بستی قرقشندہ مین ان کا خانوادہ اوس وقت آباد تھا۔ اور یہین ان کی ولادت ہوئی یہ بستی مصر کے اس سرسبز و شاداب مقام

---

[1] بعض تذکرون مین ان کو کنانہ کا غلام لکھا ہے۔ مگر ان دونون باتون مین کوئی تضاد نہین ہے، بنو کنانہ کا تعلق بھی بنو قیس ہی سے تھا۔ الرحمۃ الغیثیہ ص ۳ [2] ایضاً

واقع تھی، جس کو ریف[1] مصر کہا جاتا ہے۔ یاقوت نے لکھا ہے کہ اس بستی میں حضرت لیث کا ایک مکان تھا، جس کو ان کے چچازاد بھائی ابن رفاعہ نے دشمنی کی وجہ سے دوبار گرادیا تھا۔ مگر امام نے تیسری بار پھر اسے تعمیر کرایا۔ یہ ابن رفاعہ اس وقت مصر کا امیر تھا، ابن رفاعہ کو امام سے کیوں اس قدر عناد تھا کہ اس نے آپ کا مکان تک گرادیا اس کی کوئی وجہ ارباب تذکرہ نہیں لکھتے۔ مگر قرائن سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے بعض سوانح نگار لکھتے ہیں کہ غلہ کی پیداوار سے لیث بن سعد کو ۲۵ ہزار سے ۵۰۰۴۰ ہزار درہم سالانہ تک آمدنی ہو جایا کرتی تھی اگرچہ اسکی تصریح نہیں ملتی کہ یہ جائداد جس سے اتنی کثیر آمدنی ہوتی تھی۔ کہاں پر تھی مگر غالب گمان یہ ہے کہ یہ قرقشندہ ہی میں ہوگی، اس لئے کہ مصر کی بہترین اور کثیر پیداوار یہیں ہوتی تھی، اس لئے ممکن ہے کہ اس لالچ کی وجہ سے ابن رفاعہ نے یہ کوشش کی ہو کہ اگر ان کی بودوباش یہاں نہ رہے گی تو اس جائداد پر اس کو تصرف کا حق مل جائے گا۔

دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ منصور نے لیث بن سعد کے سامنے مصر کی امارت (گورنری) پیش کی تھی۔ مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ ممکن ہے۔ ابن رفاعہ نے اسی وجہ سے ان کو پریشان کیا ہو کہ منصور کی ناراضگی کا اثر اس کے اقتدار پر نہ پڑے، اس آبائی مکان اور جائداد کے علاوہ بھی لیث بن سعد نے ایک مکان اور مسجد مصر میں تعمیر کرائی تھی، یہ مکان و مسجد جس جگہ پر واقع تھے، اس کو "زقاق لیث" (کوچۂ لیث) کے نام سے یاد کیا جاتا تھا[2]

سنہ ولادت لیث بن سعد کے سنہ ولادت میں تھوڑا سا اختلاف ہے، مگر صحیح یہ ہے کہ ان کی ولادت ۹۴ھ[3] میں ہوئی۔ خود فرماتے تھے کہ میرے خاندان کے بعض لوگوں کا بیان ہے کہ میں ۹۳ھ میں پیدا ہوا لیکن صحیح یہ ہے کہ میری ولادت ۹۴ھ میں ہوئی اس لئے کہ جس وقت عمر بن عبدالعزیزؓ کا انتقال ہوا میں ۷ برس کا تھا، اور یہ معلوم ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؓ کا انتقال ۱۰۱ھ میں ہوا[4]۔

---

[1] ریف عربی میں سرسبز و شاداب مقام کو کہتے ہیں، اس مقام کو ریف مصر اس وجہ سے کہتے تھے کہ یہ اپنی سرسبزی و شادابی میں پورے ملک میں ممتاز تھا [2] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳، الصفوۃ الصفوہ ج ۴ ص ۲۸۵ [3] معجم البلدان ج ۷ ص ۵۰ [4] الرحمۃ الغیثیہ ص ۳

تعلیم و تربیت ان کی ابتدائی تعلیم اور تربیت کے بارے مین کچھ زیادہ تفصیلات نہین ملتین مگر انکو نحو و ادب اور شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت کے عام دستور کے مطابق ان کی ابتدائی تعلیم ان ہی علوم سے شروع ہوئی، مگر بعد مین ان پر فقہ و حدیث کا اتنا غلبہ ہوا کہ ان کے صحیفۂ زندگی کے اصل عنوان یہی علوم بن گئے اور دوسرے علوم ان مین گم ہو گئے۔

سن شعور کو پہنچتے ہی انھون نے حدیث و فقہ کی طرف توجہ کی، سب سے پہلے اپنے وطن مصر کے مشائخ فقہ و حدیث سے استفادہ کیا، پھر اسلامی ممالک کے دوسرے مقامات کا سفر کر کے تمام معروف و مشہور اساتذہ سے مستفیض ہوئے۔ ان کے اساتذہ مین پچاس سے زیادہ کبار تابعین ہیں۔

نافع کی خدمت مین مشہور تابعی نافع جو حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے خاص تربیت یافتہ تھے، لیث بن سعد کے زمانہ مین مرجع خلائق تھے، یہ ان کی خدمت مین بھی پہنچے، حضرت نافع نے ان کا نام و نسب اور وطن پوچھا جب یہ بتا چکے تو عمر دریافت کی کہا بیس برس فرمایا، مگر داڑھی سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمھاری عمر چالیس سال سے کم نہ ہوگی[1] حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ مینے لیث بن سعد کا ایک مرتب کردہ حدیث کا ایک مجموعہ دیکھا تھا جس مین انھون نے سو کے قریب حدیثین صرف نافع کی روایت سے جمع کی تھین، نافع مولی ابن عمر کے علاوہ ان کے چند تابعی شیوخ کے نام یہ ہین۔

امام زہری، سعید المقبری، عبد اللہ بن ابی ملیکہ، یحیی الانصاری وغیرہ ان کے علاوہ بیشمار اتباع تابعین سے بھی انھون نے فیض حاصل کیا۔ امام نووی ان کے چند ممتاز شیوخ کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہین۔

وخلائق لا یحصون من الائمة[2] ان کے علاوہ اتنے ائمہ سے انھون نے استفادہ کیا ہے کہ انکا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔

---

[1] الرحمۃ الغیثیہ ص ۳ [2] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۷۴

امام زہری سے سماع | بعض تذکرہ نگارون نے لکھا ہے کہ ان کو امام زہری سے بھی سماع حدیث حاصل ہوا[1] مگر یہ صحیح نہین ہے، امام زہری کے علم وفضل سے انھون نے فائدہ ضرور حاصل کیا تھا۔ لیکن یہ استفادہ بالواسطہ تھا۔ بالمشافہ نہین تھا۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ لیث امام زہری کی روایتین کبھی ایک کبھی دو، اور تین اور اس سے زائد واسطون سے روایت کرتے ہیں، خود لیث کا یہ قول متعدد تذکرون مین منقول ہے۔

کتبت من علم الزہری کثیرًا	مین نے زہری کی روایتون کی ایک کثیر
(یعنی عن غیرہ) فاردت ان	مقدار لکھ لی تھی، (یعنی غیرون کے واسطے
ارکب البرید الیہ الی الرصافۃ	سے) پھر مین نے ارادہ کیا کہ رصافہ جاکر ان سے
فخفت ان لایکون ذالک للّٰہ	بالمشافہ روایت کرون مگر اس خوف سے
فترکت ذالک (یعنی فصار	باز آیا کہ ممکن ہے کہ میرا یہ عمل اللہ کی رضا کی
یروی عنہ بالواسطۃ)	لئے نہ ہو۔ (مقصد یہ ہے کہ پھر وہ بالواسطہ
(الرحمۃ الغیثیۃ ص ۴)	ہی روایت کرتے رہے)

فضل وکمال | لیث بن سعد اپنی فطری صلاحیت اور غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے آغاز شباب مین تابعین اور تبع تابعین دونون کے علوم کے جامع بن گئے اور ہر طرف ان کے علم وفضل کا چرچا شروع ہو گیا، خود ان کے شیوخ تک ان کے فضل وکمال کا اعتراف کرتے تھے، شرجیل بن یزید کا بیان ہے کہ مین نے مصر کے ائمہ حدیث کو دیکھا ہے کہ وہ لیث کے علم وفضل کا اعتراف کرتے تھے، اور انکو آگے بڑھاتے تھے،

---

[1] بغدادی نے لکھا ہے کہ یہ ۱۱۳ھ مین حج کے لیے گئے تھے اسی سال مکہ مین امام زہری سے انھون نے سماع کیا تھا۔ حافظ ابن حجر نے بھی تہذیب میں یہی لکھا ہے مگر الرحمۃ الغیثیہ مین اس کے خلاف ایک روایت نقل کی ہے، ابن خلکان نے ان سے استفادہ کا تو ذکر کیا ہے، مگر سماع کا نہین۔ [2] ابن خلکان نے اردت کے بجائے طلبت کا لفظ لکھا ہے جس کا مفہوم بھی یہی ہے۔

حالانکہ ابھی بالکل نوجوان تھے۔ یحییٰ بن سعید ان کے شیوخ میں ہیں، انھوں نے کسی بات ان کو ٹوکا اور پھر فرمایا
کہ تم امام وقت ہو جس کی طرف نظریں اٹھتی ہیں۔[۵] امام شافعی نے ان کا زمانہ پایا تھا، مگر ان سے استفادہ نہ کر سکے
تھے، جس کا ان کو زندگی بھر افسوس رہا، فرماتے تھے مجھے لیث بن سعد اور ابن ابی ذئب کے علاوہ کسی سے
نہ ملنے کا افسوس نہیں ہے[۶]، مشہور محدث عبداللہ بن وہب فرماتے تھے کہ اگر لیث اور امام مالک نہ ہوتے
تو میں گمراہ ہو جاتا۔ ابو اسحاق شیرازی نے لکھا ہے کہ مصر میں تابعین کا علم لیث پر ختم ہو گیا، امام ابن حبان
کا قول ہے کہ علم و فضل، تفقہ، قوت حافظہ میں اپنے زمانہ کے ممتاز لوگوں میں تھے۔[۷] امام نووی نے لکھا ہے کہ
ان کی امامت و جلالت شان اور حدیث و فقہ میں ان کی بلندی مرتبت پر سب کا اتفاق ہے۔ وہ اپنے زمانے
میں مصر کے امام تھے۔[۸] یعقوب بن داؤد مہدی کا وزیر تھا اس کا بیان ہے کہ جب لیث بن سعد عراق آئے
تو مہدی نے کہا کہ اس شیخ وقت کی صحبت اختیار کرو، اس وقت ان سے بڑا کوئی عالم نہیں ہے،
حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ میں نے اختلافات ائمہ پر نظر ڈالی تو بجز ایک مسئلہ کے لیث بن سعد کو کسی دوسرے
مسئلہ میں صحابہ و تابعین سے الگ نہیں پایا وہ مسئلہ جس میں وہ منفرد تھے، وہ یہ ہے کہ وہ مری ہوئی ٹڈی
کھانا حلال نہیں سمجھتے حالانکہ اس کی تحریم کا کوئی قائل نہیں ہے (ص ۹ الرحمۃ)

حدیث | علم حدیث میں ان کی حیثیت مسلم ہے، حدیث کی کوئی متداول کتاب نہیں ملے گی جس میں
لیث بن سعد کی مرویات نہ موجود ہوں، ان سے سماع حدیث کو بڑے بڑے ائمہ اپنے لیے باعث
فخر سمجھتے تھے، مگر اس کے باوجود وہ روایت حدیث میں حد درجہ محتاط تھے ابو الزبیر ان کے مشائخ
حدیث میں تھے، مگر وہ جن روایتوں میں تدلیس[۱] کرتے تھے، ان روایتوں کی تحدیث کو لیث ترک کر دیتے تھے
اس وجہ سے محدثین نے لکھا ہے کہ ابو الزبیر کی وہ مرویات جو لیث سے مروی ہیں بہت زیادہ قابل اعتماد
ہیں، غیر معمولی ذہانت اور قوت حافظہ کے باوجود وہ تحدیث روایت میں کسی پر اعتماد نہیں کرتے تھے

الرحمۃ الغیثیہ ۵ ؎۶ الرحمۃ ۶ ؎۷ ایضاً تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۷۴ ؎۱ تدلیس فن حدیث کی

حتی کہ جو روایتیں ان کے یہاں لکھی ہوتی نہیں انھیں بھی خود اپنی زبان سے روایت کرتے تھے[1]، بہت سے محدثین کا یہ طریقہ تھا کہ وہ اپنی مرویات کی دوسرون کے ذریعہ تحدیث کراتے تھے، ان کے صاحبزادے شعیب کا بیان ہے کہ ایک بار تلامذہ نے ان سے پوچھا کہ آپ بسا اوقات ایسی روایتیں بھی کر دیتے ہیں جو آپ کے مرتب کردہ مجموعون مین نہیں ہیں، فرمایا کہ جو کچھ میرے سینے مین محفوظ ہے وہ سب اگر سفینون مین منتقل کر دیا جاتا تو یک سواری کا بوجھ ہو جاتا[2] حدیث کی روایت اور اس کی حفاظت میں جو درک ان کو حاصل تھا، اس کا اعتراف تمام ممتاز اہل علم اور ائمۂ جرح و تعدیل نے کیا ہے، امام احمد ابن حنبل فرماتے تھے کہ لیث کثیر العلم اور صحیح الحدیث تھے، ابو داؤد کا بیان ہے کہ مین نے امام احمد سے سنا ہے، وہ فرماتے تھے کہ مصر میں صحیح احادیث کی روایت اور ان کے حفظ و اتقان مین ان کا کوئی ہمسر نہین تھا، اس مرتبہ مین عمرو بن حارث ان سے کچھ قریب تھے، کسی نے ان سے کہا کہ فلان نے ان کی تضعیف کی ہے، فرمایا کہ مین نہین جانتا۔ جرح و تعدیل کے امام یحیٰ بن معین ان کو ثقہ کہتے تھے، کسی نے ان سے پوچھا کہ آپ لیث اور ابن ابی ذیب مین کس کو زیادہ حدیث کا محافظ پاتے ہیں، فرمایا دونون کو، پھر کہا کہ یزید بن حبیب کی مرویات مین ان کا درجہ محمد بن اسحاق سے بلند ہے، ایک شخص نے ابن معین سے پوچھا کہ حضرت نافع سے جو احادیث انھون نے روایت کی ہیں ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ فرمایا نہایت ہی صالح اور قابل وثوق ہیں۔ ابن المدینی کا قول ہے کہ لیث ثقہ اور قابل اعتماد تھے، اسی طرح عجلی، نسائی، ابو زرعہ یعقوب بن ابی شیبہ جیسے ائمہ حدیث نے

بقیہ حاشیہ ص ۳۷۷) ایک اصلاح ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ راوی بیچ کے آدمی کا تذکرہ چھوڑ دے اور اوپر کے راوی کا نام لے اس سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ اوس نے اوپر کے راوی سے براہ راست روایت کی ہے۔

[1] الرحمۃ ص ۷

[2] تہذیب ج ۸ ص ۴۶۴،

انکی توثیق کی ہے ائمہ جرح و تعدیل جب کسی محدث یا امام کی توثیق یا تجریح کرتے ہیں تو اس وقت عموماً انکے پیش نظر نہ انکی امامت و جلالت ہوتی ہے اور نہ کوئی اور جذبہ بلکہ انکے سامنے روایت و درایت کے وہ اصول ہوتے ہیں جن کو انھوں نے کتاب و سنت سے اخذ کرکے تحدیث و روایت کی اساس قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات بڑے بڑے ائمہ کی مرویات پر ان کو جرح کرنا اور ان کو رد کر دینا پڑتا ہے، اور بہت سے کم درجہ محدث کی روایتوں کو قبول کر لینا اور ان کی توثیق کرنی پڑتی ہے، اس لیے علم حدیث میں کسی امام و محدث کے درجہ کی تعیین کرنے میں ان کے اقوال و آراء سے بڑی مدد ملتی ہے۔ اور ان کی روشنی میں انکے علم و فضل کے خط و خال بھی بخوبی نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے جن ائمہ نے حدیث کی تدوین و ترتیب اور اس کی حفاظت میں حصہ لیا ہے ان کے سوانح حیات میں ائمہ جرح و تعدیل کے اقوال کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اسی ضرورت کے پیش نظر یہ نقل کئے گئے ہیں۔

فقہ علم فقہ اب ایک مخصوص فن بن گیا ہے، مگر دوسری صدی کے نصف تک یہ کوئی مرتب و مدون فن نہیں تھا۔ اور نہ تو مختلف حلقے اور مدارس فقہ قائم ہوئے تھے، بلکہ جن ارباب علم میں ملکۂ اجتہاد تھا وہ ضرورت کے مطابق کتاب و سنت سے اجتہاد کرتے تھے، قریب قریب ہر اسلامی ملک میں دو چار ایسے ائمہ مجتہدین موجود تھے، جو حالات و ضرورت کے مطابق پیش آمدہ مسائل کا جواب دیا کرتے تھے، جس شخص کو جس امام پر اعتماد تھا وہ ان کے مجتہدات پر عمل کرتا تھا، لیث ابن سعد کے زمانہ میں ایک طرف عراق اور شام میں امام اوزاعی اور امام ابو حنیفہ کے مجتہدات کا چرچا تھا تو دوسری طرف حجاز میں امام مالک کے تفقہ و اجتہاد کا غلغلہ تھا، ابھی مصر کی سرزمین میں کوئی ممتاز مجتہد نہیں پیدا ہوا تھا لیث بن سعد کے وجود سے یہ کمی پوری ہو گئی، ان میں پورا ملکۂ اجتہاد موجود تھا، اور انھوں نے نہ جانے کتنے مسائل قرآن و سنت سے مستنبط بھی کئے، مگر افسوس ہے کہ دوسرے ائمہ کی طرح ان کے استنباطات اور مجتہدات مدون و مرتب نہیں ہو سکے جس کی وجہ سے نہ تو ان کو شہرت ہی ہو سکی اور

نہ ان کے فقہ و اجتہاد کا عام چرچا ہی ہو سکا تفقہ و اجتہاد میں ان کا جو مرتبہ تھا۔ اس کا اندازہ ائمہ محدثین و مجتہدین کے اقوال سے بخوبی ہو سکتا ہے، امام شافعی فرمایا کرتے تھے کہ لیث بن سعد امام مالک سے زیادہ آثار و احادیث کے لئے (تفقہ کے اعتبار سے) نافع تھے ان ہی کا قول ہے کہ

اللیث افقہ من مالک الا ان — لیث امام مالک سے زیادہ فقیہ تھے لیکن ان کے تلامذہ

اصحابہ ضیعوہ — نے ان کو ضائع کر دیا،

اس جملہ کی تشریح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔

یعنی لم یدونوا فقہہ کما دونوا فقہ — جس طرح امام مالک کی فقہ کی تدوین ہوگئی اسطرح

مالک[1] — لیث کے شاگردوں نے ان کی فقہ کی نہیں کی

یحیی بن بکیر کہا کرتے تھے کہ لیث، امام مالک سے افقہ تھے، (مگر شہرت و عظمت) ان کے حصہ میں آئی، مشہور محدث ابن وہب کا بیان ہے کہ لیث کے مستنبط مسائل ان کی مجلس میں پیش کئے گئے تو ایک دن ایک مسئلہ پر حاضرین نے بڑی تحسین کی اور کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لیث امام مالک سے سنکر جواب دے دیتے ہیں، اس پر ابن وہب بولے یہ نہ کہو کہ بلکہ یہ کہو کہ امام مالک لیث سے سنکر جواب دے دیتے ہیں، میں بخدا کہتا ہوں کہ میں نے لیث سے زیادہ فقیہ نہیں دیکھا،

یہ ابن وہب امام مالک کے خاص تلامذہ میں ہیں، اس لئے ان کا بیان بڑی اہمیت رکھتا ہے

اسی تفقہ و اجتہاد کی وجہ سے منصور خلیفۂ عباسی ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ مصر میں قضاۃ کا تقرر بغیر ان کی مرضی کے نہیں ہوتا تھا منصور نے یہ بھی خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ مصر کی امارت قبول کر لیں مگر انھوں نے اس سے انکار کیا، بعض تذکروں میں ہے کہ یہ مصر کے قاضی بنا دئے گئے تھے، مگر بعض قرائن کی بنا پر یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا آئندہ، ایک مسجد سے نکلے تو یحیی بن ایوب ادھر سے گذر رہے تھے کمال تفقہ کے باوجود جب انکو کوئی مسئلہ نہیں معلوم ہوتا تھا تو دوسرے اہل علم سے دریافت کرنے میں تکلف محسوس نہیں کرتے تھے ایک بار

---

[1] الرحمۃ الغیثیہ ص ۹

ان کو رد کا اور کسی مسئلہ کے بارے میں ان سے دریافت کیا وہ جواب دیکر واپس چلے گئے، گھر پہنچکر انھون نے اس احسان کا بدلہ یہ چکایا کہ ایک ہزار دینار ان کو ہدیۃً بھیج دئے (الرحمۃ الغیثیہ ص ۵)

دوسرے علوم | حدیث وفقہ کے علاوہ دوسرے علوم مین بھی انھین دستگاہ تھی یحیی بن بکیر کا قول ہے کہ مین نے لیث سے زیادہ جامع آدمی نہین دیکھا وہ مجسم فقیہ تھے، ان کی زبان خالص عربی تھی قرآن نہایت اچھا پڑھتے تھے، نحو مین بھی درک تھا۔ اور اشعار عرب اور حدیث کے حافظ تھے، بات چیت بھی بہت عمدہ کرتے تھے یہی قول امام نووی نے امام احمد بن حنبل کی طرف بھی منسوب کیا ہے،[1] ان کی یہ جامعیت صرف علم و فن ہی تک محدود نہین تھی، بلکہ دوسرے اوصاف کے بھی وہ جامع تھے۔

روزمرہ کے عام معمولات | ان کی اسی جامعیت کی وجہ سے ہر طبقہ اور ہر زمرہ کے لوگ ان کی خدمت مین آتے اور اپنی ضرورت پوری کرتے تھے، حکومت کے ذمہ دار اور اہل علم سے لیکر عوام تک اس مین شامل تھے، روزانہ ان کی چار مجلسین ہوتی تھین، ایک مجلس حکومت وارکانِ حکومت کی ضروریات کے لیے مخصوص ہوتی تھی، دوسری مجلس مین وہ تشنگان حدیث نبوی کی پیاس بجھاتے تھے، اور تیسری مجلس ان لوگون کے لئے ہوتی تھی جو فقہ و مسائل فقہ دریافت کرنے آتے تھے، اور چوتھی مجلس عام لوگون کے لیے مخصوص ہوتی تھی، ان مجلسون میں ان کا سلوک نہایت ہی فیاضانہ ہوتا تھا، نہ تو وہ افادہ و تعلیم مین کسی کی دل شکنی کرتے تھے، اور نہ اہل حاجت کی حاجت روائی میں دلگیر ہوتے تھے، بلکہ راوی کا بیان ہے کہ

لا یسئلہ احد فیردہ صغرت حاجۃ او کبرت[2] — یہ نہین ہوسکتا تھا کہ کوئی شخص سوال کرے اور وہ اسے رد کر دین خواہ اس کی ضرورت چھوٹی ہو یا بڑی۔

تلامذہ | اوپر ذکر آچکا ہے کہ وہ عنفوان شباب ہی مین اہل علم کی توجہ کا مرکز بن گئے تھے، اس وقت سے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۴۔ [2] الرحمۃ ص ۹۔

بلکہ وفات تک وہ مصر ہی میں رہے، پوری عمر میں مشکل سے دو تین بار وہ مصر سے باہر گئے تھے، اس پوری مدت میں جو کم از کم ۵۰۔۶۰ برس ہوتی ہے وہ اپنے اوقات کا نصف حصہ تعلیم و افادہ، تحدیث روایت اور تفریع مسائل میں صرف کرتے رہے ظاہر ہے کہ اتنی لمبی مدت میں ان سے ہزاروں آدمیوں نے اکتساب فیض کیا ہوگا۔ ان تمام مستفیدین اور تلامذہ کا استقصا تو ناممکن ہے چند ممتاز فیض یافتگان کے نام یہاں درج کئے جاتے ہیں،

شعیب[1]، محمد بن عجلان، ہشام بن سعد (یہ دونوں بزرگ ان کے شیوخ میں تھے) ابن لہیعہ، ہشیم بن بشیر، قیس بن الربیع، عبداللہ بن مبارک، عبداللہ بن وہب، ابوالولید بن مسلم، ابوسلمۃ الخزاعی، عبداللہ ابن الحکم، سعید بن سلیمان، آدم بن ایاس، عبداللہ بن یزید المقری، عمرو بن خالد، عیسیٰ بن حماد وغیرہ۔

حافظ ابن حجر نے تقریباً ۵۰ ثقہ تلامذہ کا تذکرہ کیا ہے مگر طوالت کے خیال سے ان کا نام یہاں درج نہیں کیا گیا ہے۔

سیرت وکردار ان کے صحیفۂ زندگی کا یہ باب نہایت ہی روشن ہے وہ اپنے اخلاق و اوصاف اور سیرت و کردار میں اسلامی زندگی کا نمونہ تھے، ابن مریم فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے زیادہ جامع اوصاف آدمی نہیں دیکھا، ہر وہ عادت و خوبی جس سے خدا کا قرب حاصل ہو سکتا ہو وہ ان میں موجود تھی[2]، ابن وہب کا بیان ہے کہ جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے ان سب کو وہ اپنی زندگی میں برتتے تھے (بغدادی ج ۱۳ ص ۰)

ایک بار مصر کا ایک قافلہ امام مالک کی خدمت میں گیا۔ انھوں نے ملنے میں کچھ تاخیر کی، یہ لوگ آپس میں چہ می گوئیاں کرنے لگے کسی نے کہا کہ یہ اخلاق میں ہمارے امام کی طرح نہیں ہیں، امام مالک نے یہ بات سنی تو ان کو فوراً اندر بلالیا، اور پوچھا تمہارے امام کون ہیں، لوگوں نے کہا کہ لیث بن سعد، فرمایا مجھے ان کے

---

[1] تہذیب یہ ان کے صاحبزادے تھے۔

[2] الرحمۃ الغیثیہ ص ۷

ساتھ تشبیہ نہ دو پھر ان کے کچھ اخلاقی اوصاف بیان کئے۔[1]

ایک بار بعض تاجروں نے ان سے کچھ پھل خریدے، خریداری کے بعد ان کو پھل گران محسوس ہوئے اس لیے آپ سے پھل واپس کر لینے کی خواہش کی، آپ نے پھل واپس کر لیے، جب معاملہ ختم ہو گیا تو روپے کی تھیلی مانگی اور اس میں سے پچاس دینار نکالکر تاجروں کو ہدیۃً دیدیے۔ ان کے صاحبزادے بھی اس موقع پر موجود تھے، ان کو یہ برا معلوم ہوا۔ اور انھوں نے حضرت لیث سے اس کا اظہار بھی کیا، مگر آپ نے فرمایا کہ خدا تمھیں معاف کرے، یہ پھل انھوں نے فائدے ہی کی امید اور غرض سے تو خریدا تھا، مگر جب ان کو فائدہ محسوس نہیں ہوا تو انھوں نے واپس کر دیا، اور واپس کرنے کے بعد ان کے فائدے کی امید بھی ختم ہو گئی تو میں نے یہ مناسب سمجھا کہ ان کی اس امید و توقع کا کچھ تو بدلہ دے دوں،[2]

سخاوت | سخاوت و فیاضی گویا ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، وہ اپنی دولت مستحقین پر بے دریغ صرف کرتے تھے، لوگوں کو پیسہ جمع کرنے میں لطف آتا ہے اور ان کو اس کے خرچ کرنے میں لذت محسوس ہوتی تھی، ابن جوزی کا بیان ہے کہ صرف غلہ سے ان کو ۵۰ ہزار دینار سالانہ کی آمدنی ہوتی تھی، اس کے علاوہ تجارت کا روبار بھی تھا۔ ان کے تمام سوانح نگار لکھتے ہیں۔ ان کی سالانہ آمدنی ۷۰-۸۰ ہزار دینار تھی مگر اس پوری آمدنی پر کبھی زکاۃ دینے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ یہ پوری آمدنی فقرا و مساکین اور مستحق اہل علم پر خرچ ہو جاتی تھی۔ خود فرماتے تھے کہ میں جب سے بالغ ہوا ہوں مجھ پر ایک درہم بھی زکاۃ واجب نہیں ہوئی۔[3] کسی سال آمدنی کم ہوتی تھی تو قرض کی نوبت آجاتی تھی۔

جب تک زندہ رہے سو دینار سالانہ مستقل طور سے امام مالک کے پاس بھیجتے تھے، ایک بار امام مالک نے انھیں لکھا کہ مجھ پر کچھ قرض ہو گیا ہے فوراً پانچ سو دینار ان کے یہاں بھجوا دیے ایک بار امام مالک نے ان سے تھوڑی سی عُصفُر (زرد رنگ کی گھاس) لڑکوں کے کپڑے رنگنے کے لیے مانگی

---

[1] صفوۃ الصفوہ ج ۴ ص ۲۰۸ [2] ایضاً۔ [3] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۰ وصفوۃ الصفوہ والرحمۃ الغیثیہ وغیرہ

(غالباً یہ مصر کی خاص پیداوار تھی) انھون نے اتنی مقدار مین بھیجی کہ امام مالک کا بیان ہے کہ ہم نے اپنے گھر کے بچون کے کپڑے رنگے پڑوسیون نے استعمال کیا پھر بھی اتنی بچ گئی کہ ایک ہزار دینار مین اسے فروخت کیا۔[1]

امام لیث بن سعد ۱۱۳ھ مین حج کو گئے تھے، حج سے فارغ ہوکر زیارت نبوی کی غرض سے مدینہ منورہ تشریف لے گئے وہان پہونچے تو امام مالک نے عمدہ کھجورون کا ایک طشت ان کے پاس ہدیۃً بھیجا انھون نے اس طشت مین ایک ہزار دینار رکھکر واپس کیا۔[2]

ابن لہیعہ مشہور محدث ہین۔ اتفاقاً ان کے گھر مین آگ لگ گئی اور سارا اثاثہ جل گیا۔ حضرت لیث بن سعد کو اطلاع ہوئی تو ایک ہزار دینار (بطور اعانت) ان کے پاس بھیج دیئے،

بسا اوقات وہ اپنی اس داد و دہش کو اپنے لڑکون سے بھی پوشیدہ رکھتے تھے، تاکہ پانے والے کو یہ ذلیل نہ سمجھین۔ ایک بار منصور بن عمار کو انھون نے ایک رقم دی اور کہا کہ دیکھو میرے لڑکے کو نہ معلوم ہو ورنہ تم اس کی نگاہ مین حقیر ہوجاؤ گے جب ان کے صاحبزادے شعیب کو معلوم ہوا تو اس کی تلافی مین انھون نے بھی اپنے والد کی رقم سے ایک دینار کم رقم منصور کو دی اور کہا کہ مین نے ایک دینار کم اس لئے کردیا ہے کہ عطیہ مین والد کے برابر نہ ہوسکون۔[3] اسار بن موسیٰ کا بیان ہے کہ جب عراق مین عباسیون نے بنو امیہ کو قتل کرنا شروع کیا تو مین بھاگ کر مصر چلا گیا، مصر مین بڑی بے سروسامانی اور پریشانی کی حالت مین پہونچا تھا، اتفاق سے اسی حالت مین لیث بن سعد کی مجلس درس مین گیا جب مجلس برخاست ہوگئی، تو ان کا خادم میرے پاس آیا اور کہا کہ مین جب تک واپس نہ آجاؤن یہین ٹھہرے۔ تھوڑی دیر بعد وہ آیا اور اس نے مجھے سو دینار کی ایک تھیلی دی اور کہا کہ امام نے فرمایا ہے کہ اس سے اپنا سامان درست کرلیجئے، اسار کا بیان ہے کہ اس وقت میری کمر مین ایک ہزار دینار بندھے ہوئے تھے، مین نے اس کو نکالا اور خادم

---

[1] الرحمۃ الغیثیہ ص ۵ خطیب نے اس واقعہ کے بیان مین بہت زیادہ مبالغہ سے کام لیا ہے [2] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۷۷ [3] صفوۃ الصفوہ ج ۴ ص ۲۸۴،

سے کہا کہ مین شیخ سے ملنا چاہتا ہون تم جا کر اجازت لاؤ، چنانچہ میں ان کے پاس گیا، اپنا نام و نسب بتایا پھر اس رقم کو واپس کرنا چاہا، انھون نے کہا کہ یہ ہدیہ ہے صدقہ نہین ہے اس لئے قبول کرنے مین تامل نہ ہونا چاہئے مگر مین نے معذرت کی اور کہا کہ جس چیز سے مین مستغنی ہون نفس کو اس کا عادی بنانا نہین چاہتا، شیخ نے فرمایا کہ اچھا اگر تم لینا پسند نہین کرتے تو مستحق اصحاب حدیث میں یہ رقم تقسیم کر دینا، اسد کہتے ہیں مین نے مجبور ہو کر یہی کیا۔[1]

ایک عورت ایک پیالہ لیکر آئی اور اس نے کہا کہ میرا شوہر بیمار ہے[2] معلوم ہوا ہے کہ آپ کے یہان شہد ہے، اس پیالہ بھر شہد دے دیجئے، فرمایا وکیل[3] کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ وہ تمھین ایک مطر شہد دے دے عورت جب وکیل کے پاس پہنچی تو وکیل امام کے پاس آیا اور غالباً شہد کی اتنی بڑی مقدار دینے پر کچھ کہا سنا مگر آپ نے فرمایا کہ جاؤ اس کو دے دو اس نے اپنے ظرف کے بقدر مانگا تھا، ہم اسکو اپنے ظرف کے بقدر دیتے ہیں۔ ایک مطر کا ایک سو بیس رطل ہوتا ہے[4]۔

مہمان نوازی | سخاوت و فیاضی کا ایک مظہر مہمان نوازی بھی ہے بخل کے ساتھ یہ صفت شاذ و نادر ہی جمع ہوتی ہے، لیث بن سعد جس درجہ کے فیاض تھے اسی درجہ کے مہمان نواز بھی تھے، عبد اللہ ابن صالح ان کے خاص شاگرد اور کاتب تھے، ان کا بیان ہے کہ مین تقریباً بیس برس ان کی خدمت مین رہا مگر کبھی ان کو تنہا کھانا کھاتے ہوئے نہین دیکھا، ابو حاتم کا بیان ہے کہ لیث کے پاس جب کوئی مہمان باہر سے آجاتا تھا تو وہ جب تک رہتا تھا، اس کو وہ اپنے اہل و عیال کی طرح اپنی کفالت میں لے لیتے تھے، جب وہ جانا چاہتا تھا، پورا زاد سفر دیکر رخصت کرتے تھے[5] یہ مہمان نوازی صرف حضر ہی تک محدود نہین تھی، بلکہ سفر مین بھی مہمانون کا ہجوم ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ ان کے شاگرد قتیبۃ بن سعید

---

[1] الرحمۃ الغیثیہ ص۵ [2] بعض تذکرون میں لڑکے کا ذکر ہے، اور بعض تذکرون مین مطلق یہ واقعہ مذکور ہے
[3] ناظم امور خانہ داری یا پرائیویٹ سکریٹری کو وکیل کہتے تھے [4] الرحمۃ ص۵ [5] ایضاً۔

بیان کرتے ہیں کہ ایک بار امام لیث بن سعد کے ساتھ اسکندریہ سے سفر کرنیکا اتفاق ہوا تو اس سفر مین تین کشتیان تھیں، ایک کشتی میں کھانیکا سامان تھا۔ دوسری مین اہل وعیال اور تیسری کشتی مہمانون کے لئے مخصوص تھی

اشہب کا بیان ہے کہ لیث بن سعد کبھی کسی سائل کو واپس نہین کرتے تھے، اور ان کے یہان ایک لنگر خانہ جاری رہتا تھا، عموماً جاڑون مین ان کے یہان ہریسہ شہد وگائے کے گوشت کے ساتھ مہمانون کو ملتا تھا، اور گرمی مین اخروٹ کا ستو شکر کے ساتھ، ان کا معمول تھا کہ ہر نماز کے بعد مساکین پر کچھ رقم صدقہ ضرور کرتے تھے[1]

ذاتی زندگی نہایت سادہ تھی مگر یہ ساری فیاضی اور سیر چشمی دوسروں کے لئے تھی، ان کی ذاتی زندگی نہایت سادہ تھی، محمد بن معاویہ کا بیان ہے کہ ایک بار اپنے گدھے پر سوار ہو کر جا رہے تھے تو مین نے انکی سواری اور سامان وغیرہ کا اندازہ کیا تو سب کی قیمت ۱۸-۲۰ درہم سے زیادہ نہ تھی۔ یعنی زیادہ سے زیادہ چار روپئے

ایوان حکومت سے بے نیازی خلافت راشدہ کے بعد اموی حکومت جب ملوکیت کا شکار ہوئی، اور حق وناحق کا فیصلہ ایک شخص کی رائے کے تحت ہونے لگا اس وقت سے ممتاز صحابہ اور محتاط تابعین نے حکومت سے تعلق رکھنا پسند نہین کیا۔ تبع تابعین کے زمانہ مین گو یہ احتیاط کم ہوگئی تھی مگر پھر بھی ممتاز اور خدا ترس تبع تابعین کی اکثریت نے حکومت کے ساتھ تعاون وتعلق مین صحابہ وتابعین ہی کی روش اختیار کی، لیث بن سعد کا رویہ اس بارے مین ذرا معتدل تھا۔ انھون نے نہ تو اتنا تعلق پیدا کیا کہ وہ درباری عالم ہو کر رہ گئے، اور نہ اتنے بے تعلق رہے کہ اس شجر ممنوعہ کے قریب جانا بھی پسند نہ کرتے، انھون نے نہ تو حکومت کی کوئی ذمہ داری قبول کی اور نہ اس کے سامنے اپنی کوئی غرض لے گئے کہ اظہار حق

---

[1] یہ گیہون کو کوٹ کر اس میں گوشت کی آمیزش کر کے بناتے تھے۔ [2] المرحمۃ صفحہ ۶۔ [3] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۲۰۵۔

میں یہ مانع ہو مگر اسی کے ساتھ وہ خلفاء امراء سے ملتے، اور ان کی بہت سی ملکی و انتظامی مشکلات میں ان کا ہاتھ بھی بٹاتے رہے۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ ان کی ایک مجلس خاص طور سے ارکان حکومت کی حاجت روائی کے لئے ہوتی تھی۔

ان کی اسی اعتدال پسندی کی وجہ سے عوام اور حکومت دونوں پر ان کا اثر تھا ان کے حکم پر مصر کے امراء و قضاۃ کا عزل و نصب ہوتا تھا، ایک بار قاضی اسمٰعیل بن الیسع نے ایک مسئلہ مین ایسا فتویٰ دے دیا جسے اہل مصر پسند نہین کرتے تھے، ان کے خلاف ایک ہنگامہ ہوگیا جب امام لیث کو اطلاع ہوئی تو وہ ان کے پاس گئے اور کہا کہ آپ نے یہ فتویٰ کیسے دے دیا، جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا عمل اس کے خلاف موجود ہے، غالباً قاضی صاحب نے رجوع نہین کیا اس لئے انھون نے ان کے معزول کرنے کے لیے لکھا[1] چنانچہ ان کے معزول کئے جانیکا شاہی فرمان آگیا چونکہ اس معزولی میں قاضی اسمٰعیل کی ہر طرح کی بدنامی تھی۔ اس لیے خط مین خاص طور سے یہ بات امام نے لکھ دی تھی کہ ہم کو نہ تو ان کی دیانت داری میں کوئی شبہہ ہے۔ اور نہ انھون نے درہم و دینار میں کوئی خیانت کی ہے، مگر ان سے شکایت یہ ہے کہ انھون نے ایک سنت جاریہ کے خلاف فتویٰ دیا۔ اور فیصلہ کیا ہے[2]

کندی نے کتاب القضاۃ میں انکے معزول کئے جانے کی ایک وجہ اور بھی لکھی ہے، ممکن ہے کہ دونون وجہین جمع ہو گئی ہوں، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ مصر کے امراء ان کے مشورہ کے بغیر کوئی فیصلہ نہین کرپاتے تھے۔ الرحمۃ ص ،)

خلیفہ منصور نے ان سے خواہش کی تھی کہ وہ پورے ملک مین اس کی نیابت قبول کرلیں، بعض

---

[1] یہ بات بھی یہان قابل ذکر ہے کہ پہلے مصر مین قضاہ کا تقرر مصر کے امرا کے ہاتھ میں تھا۔ مگر بعد مین یعنی ۱۵۵ھ سے براہ راست خلفائے عباسیہ ان کا تقرر کرتے تھے، اسمٰعیل دوسرے قاضی تھے، جن کو مہدی نے خود مقرر کیا تھا، کندی نے کتاب القضاۃ مین اس کی تفصیل دی ہے [2] الرحمۃ الغیثیہ ص ۸ ۔

روایتون مین ہے کہ پورے ملک کی نیابت نہیں بلکہ مصر کی امارت پیش کی تھی، مگر انھون نے انکار کیا، اس نے پھر اصرار کیا تو اپنی کمزوری کا اظہار کیا، اس پر منصور نے بڑے زوردار الفاظ بلکہ شاہانہ انداز مین کہا کہ میری موجودگی میں آپ کو کسی کمزوری کا احساس نہ کرنا چاہیئے۔ مگر اس شدید اصرار کے باوجود وہ اپنے فیصلہ پر جمے رہے، اور یہ ذمہ داری قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

اگر پہلا بیان صحیح ہے[1]، تو منصور ان کے سامنے پوری مملکت اسلام کی وزیر اعظمی پیش کر رہا تھا اور اگر دوسرا بیان صحیح ہے تو اسلامی سلطنت کے سب سے بڑے اور مالدار صوبہ کی گورنری پیش کیجا رہی تھی، مگر انھون نے اس سے گریز کیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ گو اس وقت سارا نظام اسلامی ہی تھا، مگر اقتدار اعلیٰ جمہوری نہین، شخصی تھا، اس لیے حکومت میں منسلک ہونے کے بعد کسی معاملہ مین اظہار حق کی گنجایش نہین تھی، یہی وجہ تھی کہ محتاط بزرگون نے دربار سے بالکل بے تعلقی رکھی، یا کم از کم اس کی کسی ذمہ داری کے قبول کرنے سے گریز کیا اور جن بزرگون قبول کیا وہ بڑی آزمایش مین رہے، اس آزمایش مین پڑنے کے بعد دو چار ہی بزرگ ایسے تھے جو اپنی حق گوئی اور جرات سے سلامت بچ گئے، ورنہ زیادہ تر لوگون کا دامن اس آزمائش میں داغدار ہو کر رہا،

کیا عہدۂ قضا قبول کر لیا تھا

ابن خلکان اور صاحب شذرات الذہب نے لکھا ہے کہ انھون نے عہدۂ قضا قبول کر لیا تھا۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے، اس کی متعدد وجہین ہیں، ایک یہ کہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ انھون نے امارت کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کیا، ظاہر ہے کہ جب انھون نے امارت کی ذمہ داری تک قبول نہیں کی، تو پھر اس سے کم درجہ کا عہدہ یعنی عہدہ قضا قبول کرنے کے کیا معنی، دوسرے یہ کہ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے کہ جب ان کے حکم سے مصر کے امرا، اور قضاۃ کا عزل و نصب تک ہوتا تھا، تو پھر ان کو اس عہدہ کے قبول کرنے کی کیا ضرورت تھی جو خود ان کے اثر و اختیار کے تحت ہو،

---

[1] یہ بیان حافظ ابن حجر اور امام ذہبی کا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ کندی نے مصر کے ولاۃ و قضاۃ کی مکمل تاریخ لکھ دی ہے، جو ہر کتب خانہ میں مل سکتی ہے، اس میں ولاۃ یا قضاۃ کی جو فہرست دی ہے اس میں کہیں لیث بن سعد کا نام نہیں ملتا، بخلاف اس کے کتاب میں ایسے واقعات ملتے ہیں، جن سے اس کی تردید ہوتی ہے۔

مگر اس بے تعلقی کے باوجود وہ دربار میں جاتے، اور موقع آجاتا تو خلفاء کو نصیحت و موعظت بھی کرتے، ایک بار ہارون رشید سے ملنے گیے۔ اس نے ان سے پوچھا کہ مصر کی خوش حالی اور فارغ البالی کا دار مدار کس چیز پر ہے، نہایت صفائی سے فرمایا کہ

اجراء النیل وصلاح امیرہا	نیل کے جاری رہنے اور مصر کے امیر کے صلاح و تقویٰ پر،

پھر فرمایا کہ نیل کے منبع کی طرف سے گندگی آتی ہے، جس کی وجہ سے پوری نہر پٹ جاتی ہے، اس کی صفائی کی ضرورت ہے، یہ باتیں سننے کے بعد ہارون نے کہا کہ آپ نے بہت صحیح فرمایا[1]۔

اس زمانہ میں خلفاء و امراء کی مدح سرائی اور قصیدہ خوانی کا عام رواج تھا، بسا اوقات یہ بدعت مسجدوں تک میں کیجاتی تھی، ایک بار معروف شاعر عمار بن منصور مصر آیا، اور اس نے مسجد میں خلیفہ وقت کی مدح میں ایک قصیدہ پڑھا، ابھی اس نے اپنا قصیدہ ختم ہی کیا تھا کہ دو آدمی اس کے پاس آئے، اور کہا کہ تم کو امام لیث ابن سعد بلا رہے ہیں، جب یہ ان کے پاس آیا تو آپ نے اس سے کہا کہ تم مسجد میں کیا پڑھ رہے تھے، قصیدہ دہرایا، سننے کے بعد ان پر افسوس اور رقت کی کیفیت طاری ہوئی، کچھ دیر کے بعد جب یہ کیفیت دور ہوئی تو نام پوچھا، پھر اس کو روپیے کی ایک تھیلی دی، اور اس سے کہا کہ اپنے کلام کو سلاطین کے دربار سے بچائے رکھو اور (سلاطین ہی پر کیا ہے) کسی مخلوق کی مدح نہ کرو، بس خدا کی حمد و ثنا تمھارے لیے کافی ہے۔ انشاء اللہ میں ہر سال تم کو اتنی ہی رقم بھیجتا رہوں گا[2]۔ غالباً اس کے بعد سے اس نے کسی کی مدح نہیں کی

---

[1] الرحمۃ [2] ایضاً ص ،

اور امام کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوگیا۔

اہل مصر کو حضرت عثمانؓ کی تنقیص سے روکا | حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جہاں اور بہت سے فتنے پیدا ہوئے، وہاں ایک فتنہ بزرگوں پر طعن و تشنیع اور سب و شتم کا بھی تھا۔ جو لوگ حضرت عثمانؓ کے حامی تھے، وہ حضرت علیؓ کی تنقیص کرنا ضروری سمجھتے تھے، اور جو لوگ حضرت علیؓ کے مددگار تھے، وہ حضرت عثمانؓ پر چھینٹے ڈالنا اپنا فرض سمجھتے تھے، مصر کے باشندے عام طور پر حضرت علیؓ کے حمایتی تھے، اس لیے وہ حضرت عثمانؓ کی مذمت و تنقیص کیا کرتے تھے، مصر میں جب امام لیث بن سعد کا اثر و رسوخ بڑھا تو انھوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی، اور حضرت عثمانؓ کے فضائل عام طور پر بیان کرنے شروع کر دیئے، یہاں تک کہ تنقیص عثمان کی بدعت سیئہ مصر سے ختم ہو گئی۔[1]

وفات | اس مجسمۂ حسن و خوبی اور مجموعۂ فضل و کمال نے نصف شعبان بروز جمعہ ۱۷۵ھ کو وفات پائی اور جمعہ کی نماز کے بعد مصر کے ممتاز قبرستان قرافۂ صغریٰ میں جس میں نہ جانے کتنے گنجہائے گراں مایہ مدفون تھے، سپرد خاک کیے گئے، موسیٰ بن عیسیٰ ہاشمی نے نماز جنازہ پڑھائی، جنازہ میں بے شمار مجمع تھا، مگر پورا مجمع اس طرح پیکر غم بنا ہوا تھا کہ گویا یہ ہر شخص کے گھر کی میت ہے، خالد بن عبد السلام صدفی کا بیان ہے کہ میں اپنے والد عبد السلام کے ساتھ جنازہ میں شریک تھا، میں نے ایسا عظیم الشان جنازہ نہیں دیکھا، پورا مجمع پیکر غم بنا ہوا تھا، ہر ایک دوسرے سے اظہار تعزیت کر دیا تھا، غم کا یہ عالم دیکھکر میں نے اپنے والد سے کہا کہ مجمع کا ہر شخص ایسا غم زدہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ جنازہ اسی کے گھر کا ہے، والد نے کہا کہ بیٹا یہ ایسے جامع فضل و کمال عالم تھے، کہ شاید تمھاری آنکھیں پھر ایسا عالم نہ دیکھیں۔[2]

اولاد | ان کے دو صاحبزادوں کے نام تذکروں میں ملتے ہیں، ایک شعیب، دوسرے حرث،

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ، [2] الرحمۃ الغیثیہ ص ۹۔

آپ کی کنیت ابو الحرث ان ہی صاحبزادہ کے نام پر تھی، ان صاحبزادگان کے حالات تذکروں مین نہیں ملتے مگر جستہ جستہ جو واقعات ملتے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ صاحب علم تھے شعیب کے صاحب علم ہونے کا پتہ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام لیث بن سعد انہی کی اقتدا مین نماز پڑھا کرتے تھے[1]۔

تصانیف، افسوس ہے کہ ان کی مرویات اور ان کے فتاوے و مجتہدات باقاعدہ مدون نہیں کئے گئے ورنہ ان کے علم وفضل کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ ہمارے سامنے موجود ہوتا، اب بھی اگر احادیث وفقہ کی کتابوں سے ان کی مرویات اور ان کے اقوال وفتاوے کو الگ کر لیا جائے تو حدیث وفقہ کا ایک اچھا خاصہ گلدستہ اس سے تیار کیا جاسکتا ہے، مگر اب اس طرح کام کون کرے اور اگر کر بھی لیا جائے تو اس کی قدر کون کرے تذکروں میں انکی جن تحریری یادگاروں کا ذکر ملتا ہے وہ یہ ہیں۔

امام ذہبی نے لکھا ہے کہ یہ کثیر التصانیف تھے[2] لیکن انھوں نے ان کی کسی تصنیف کا ذکر نہیں کیا کیا ہے، اور یہ عموماً تصانیف کا تذکرہ کم کرتے بھی ہیں۔

حافظ ابن حجر نے تہذیب میں تو ان کی کسی تصنیف کا ذکر نہیں کیا ہے، مگر الرحمۃ الغیثیہ مین لکھا ہے کہ مین نے ان کی مرویات کا وہ مجموعہ دیکھا ہے جو حضرت نافع کے واسطہ سے مروی ہیں، انھوں نے اس کتاب مین لیث بن سعد کی روایت کردہ چالیس ایسی احادیث بھی نقل کی ہیں، جو ان تک صرف آٹھ واسطوں سے پہنچی ہیں، ایسی روایات جو کم سے کم راویوں کے ذریعہ مروی ہوں ان کو محدثین کی اصطلاح ہیں عوالی حدیث کہا جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھوین صدی تک ان کی مرویات کے بعض مجموعے متداول تھے، کسی شاگرد نے ان سے پوچھا کہ آپ بسا اوقات ایسی روائتین کرتے ہیں جو آپ کی کتابوں مین نہین ملتیں، بولے۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱، [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۷

أوكلها في صدري في كتبي[1] کیا جو کچھ سینہ میں تھا سب مجبراً تمام کتابوں میں آگیا؟

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود لیث بن سعد نے اپنی مرویات اور ممکن ہے کہ بعض فتاوے وغیرہ بھی مرتب کر لئے تھے، جو ان کے تلامذہ کی عام توجہی کی وجہ سے ضائع ہو گئے۔ جیسا کہ امام شافعی نے فرمایا ہے۔ ضیعہ اصحابہ ان کے تلامذہ نے ان کو (یعنی ان کے علم و فضل کو) ضائع کر دیا۔

ابن ندیم نے ان کی دو کتابوں کا خاص طور سے ذکر کیا ہے، ایک کتاب التاریخ، دوسری کتاب مسائل فی الفقہ (ص ۲۸۱)

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۸ صفحہ ۴۶۴۔

حضرت فضیل بن عیاض

تبع تابعین میں جن بزرگوں کا زہد و اتقا ضرب المثل تھا۔ ان میں فضیل بن عیاض بھی تھے، علم و فضل کے لحاظ سے بھی معاصرین میں بہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، مگر دلوں میں ان کی فضیلت اور عظمت و جلالت ان کے زہد و اتقا ہی کی وجہ سے تھی، ان کی زندگی توبہ و انابت الی اللہ کی صحیح تصویر تھی۔

خاندان ان کا خاندان صوبہ خراسان کی ایک بستی طالقان کا رہنے والا تھا جو بعد میں فندین میں آباد ہو گیا تھا۔ اس فندین کے قریب ایک بستی ابیورد تھی، وہیں ان کی ولادت ہوئی۔[1]

ابتدائی حالات فضیل گو ایک آزاد مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے مگر ان کو سازگار ماحول نہیں ملا، جس کی وجہ سے ان کی عادتیں بگڑ گئیں، اور کچھ دنوں میں وہ ایک مشہور ڈاکو کی حیثیت سے مشہور ہو گئے ان کی ڈاکہ زنی کا اتنا چرچا تھا کہ خراسان کے آس پاس سے قافلے گذرتے ہوئے ڈرتے تھے۔

توبہ ان کی زندگی کے یہی لیل و نہار تھے، کہ یکا یک فضل ایزدی نے ان کا دامن پکڑا، اور ان کو توبہ کی توفیق نصیب ہوئی، ان کے توبہ کی داستان میں کتنوں کے لئے سامان بصیرت ہے انکو کسی لڑکی سے عشق ہو گیا تھا، مگر خواہش نفس کی تکمیل کی کوئی سبیل پیدا نہیں ہو رہی تھی، ایک دن موقع پا کر اس کے گھر کی دیوار پھاند کر، اندر داخل ہونا چاہتے تھے کہ کسی خدا کے بندے نے یہ آیت تلاوت کی۔

الم یان للذین آمنوا ان تخشع	کیا ابھی اہل ایمان کے لئے وقت نہیں آیا ہے
قلوبھم لذکر اللہ	کہ ان کے دل اللہ کی یاد کیلئے جھک جائیں

---

[1] ابن خلکان ج ۲ ص ۱۵۱۔

کلام الٰہی کی یہ دل گداز آواز ان کے کانون مین پہنچی، اور کانون کے ذریعہ دل مین اتر گئی، ایمان کی دبی ہوئی چنگاریان بھڑک اٹھین، بے اختیار بول اٹھے، یارب آن، اے پروردگار وہ وقت آگیا، کہ مین بحر معاصی سے نکل کر تیرے دامن رحمت مین پناہ لون۔ وہان سے وہ اسی وقت واپس ہوئے، رات کا وقت تھا، اس لیے ایک خرابہ مین ٹھہر گئے، پاس ہی کوئی قافلہ پڑاو ڈالے پڑا تھا، اہل قافلہ آپس مین مشورہ کر رہے تھے، کہ کب رخت سفر باندھا جائے بعضون کا خیال تھا، کہ اسی وقت چل دینا چاہئے۔ مگر اہل تجربہ نے رائے دی، کہ صبح سے پہلے سفر کرنا خطرے سے خالی نہین ہے، اسی راستہ پر فضیل قافلون پر ڈاکے ڈالتا ہے، فضیل کا بیان ہے، کہ مین نے دل مین سوچا کہ مین رات بھر معاصی مین غرق رہتا ہون اور بندگان خدا مجھ سے ڈرتے ہیں، حالانکہ خدا نے ان کے درمیان مجھے اس لیے نہین بھیجا ہے، پھر صدق دل سے توبہ کی اور یہ دعا کی،

اللھم انی تبت الیک وجعلت	اے پروردگار مین تیری طرف پلٹتا ہون
توبتی مجاورۃ البیت الحرام[1]	اور اس توبہ کے بعد اپنی زندگی کو تیرے گھر
	کی خدمت کے لیے مخصوص کرتا ہون۔

اس توبۂ نصوح کے بعد ان کو علم دین کی تحصیل کا شوق دامن گیر ہوا، اور اسی شوق میں وہ ترک وطن کرکے کوفہ آئے، یہان امام اعمش، شیخ منصور اور بعض دوسرے ائمۂ حدیث سے اکتساب فیض کیا، پھر حسب وعدہ جوار حرم کو اپنا مسکن بنایا، اور پھر اسی کے سایہ مین پوری زندگی بسر کر دی،[2]

علمی مقام | پچھلی زندگی کا ان پر کچھ ایسا ردعمل ہوا تھا کہ وہ گوشہ گیر ہوکر یک گونہ دنیا سے بے تعلق ہو گئے تھے، عام طور پر محدثین ایسے زاہدوں اور گوشہ گیرون کو کوئی علمی مقام نہین دیتے تھے، اور نہ انکی روایتون کو قبول کرتے تھے، مگر فضیل بن عیاض کی ذات اس سے مستثنیٰ تھی، ان کی روایتون کو عام

---

[1] تہذیب ج ۸ ص ۲۹۵ [2] ابن خلکان ج ۲ ص ۱۵۸۔

محدثین نے قبول کیا ہے، اور خود بھی ان سے روایت کی ہے، اس کی وجہ یہ تھی کہ فضیل بن عیاض کی زہد پسندی نے انھیں حصول علم دین سے بے نیاز نہیں کر دیا تھا، توبہ کے بعد گو ان کی عمر کافی ہو چکی تھی لیکن وہ اس کے باوجود کوفہ پہنچے، اور وہاں ممتاز شیوخ حدیث وفقہ سے استفادہ کیا[1]

ان کے ممتاز شیوخ فقہ وحدیث یہ ہیں، امام اعمش، سلیمان التیمی، منصور بن معتمر، حمید الطویل، یحیٰی بن سعید الانصاری، محمد بن اسحاق، جعفر بن محمد الصادق، اسماعیل بن خالد، سفیان ثوری وغیرہ[2]، فقہ میں خاص طور پر انھوں نے فقہ کے سب سے ممتاز ائمہ امام ابو حنیفہ، اور محمد بن ابی لیلی سے استفادہ کیا تھا[3]

زہد واتقا میں ان سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد کا حصر تو نا ممکن ہے۔ مگر جن لوگوں نے زہد واتقاء کے ساتھ ان سے علمی استفادہ کیا تھا، ان کی تعداد بھی کم نہیں ہے، سفیان ثوری گو ان کے شیوخ میں ہیں، مگر خود انھوں نے بھی ان سے روایت کی ہے، اسی طرح سفیان بن عیینہ، ابن مبارک اور امام شافعی ان کے تلامذہ میں ہیں، ان کے علاوہ یحیی بن سعید القطان، ابن مہدی، عبد الرزاق حمیدی، ابن وہب، اصمعی، یحیٰی بن یحیی التیمی وغیرہ نے، ان سے استفادہ کیا تھا۔

روایت حدیث میں احتیاط تمام محدثین نے ان کے علم وفضل کا اعتراف کیا ہے، ان کی روایتیں قبول کی ہیں، لیکن اس کے باوجود تحدیث روایت سے حتی الامکان گریز کرتے تھے، امام نووی نے لکھا ہے وہ حدیث نبوی سے سخت خائف رہتے تھے، اور اس کی روایت ان پر بہت گران گذرتی تھی[4]، خاص طور پر کسی غیر محدث سے حدیث کی روایت کو تو پسند ہی نہیں کرتے تھے، ایک بار کسی نے ان سے کہا کہ آپ جعفر بن یحیی سے روایت نہیں کرتے، فوراً بولے کہ میں حدیث نبوی کو اس سے بلند سمجھتا ہوں

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۹۸ و تہذیب الاسماء لنووی ج ۲ ص ۵۱ [2] البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۹۸ و تہذیب الاسماء نووی ج ۲ ص ۵۱ اور تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۲۹۴ [3] الجواہر المضیہ ج ۱ ص ۴۰۹ [4] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۵۱

کہ اس کی روایت ابن یحییٰ سے کیجائے، فرماتے تھے کہ اگر کوئی مجھ سے درہم و دینار مانگ لے تو یہ میرے لیے آسان ہے، مگر مجھ سے تحدیث کی فرمائش نہ کرے[1]۔

محدثین کا اعتراف ان کے علم و فضل کی زیادہ تفصیل تذکروں میں نہیں ملتی، ابن جوزی نے ان کے حالات میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے، اگر وہ ملجاتی تو البتہ ان کے بارے میں کافی معلومات ملتیں۔ لیکن ممتاز ائمہ حدیث و فقہ نے ان کے بارے میں جو رائے دی ہے، اس سے کسی حد تک ان کے علم و فضل کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

سفیان بن عیینہ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے[3]، قاضی شریک نے ان کو حجت کہا ہے، ابن ناصر الدین نے امام الحرم شیخ الاسلام قدوۃ الاعلام وغیرہ کے الفاظ سے انکا تذکرہ کیا ہے[4]، دار قطنی اور نسائی نے ثقہ اور ابو حاتم نے صدوق کہا ہے۔ ابن سعد نے ان کو ثقہ، فاضل، متقی اور کثیر الحدیث بتایا ہے، امام نووی نے لکھا ہے کہ ان کی توثیق پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے، وہ صحیح الحدیث اور صدوق اللسان تھے، ان کی روایتیں صحیح اور سچی ہوتی تھیں[5]، ان کے علم و فضل کی توثیق کے لیے یہ بات کافی ہے کہ ان سے سفیان ثوری، یحییٰ بن سعید القطان، امام بخاری، امام مسلم جیسے ائمہ حدیث نے روایت کی ہے، بعض محدثین ان کی روایت کے قبول کرنے میں کچھ تامل بھی کرتے تھے، مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔

زہد و اتقاء ان کے صحیفۂ زندگی کا سب سے تابناک باب یہی ہے، ابن مبارک جن کا زہد و اتقا خود ضرب المثل تھا، وہ فرماتے ہیں کہ فضیل اس زمانہ کے سب سے متقی آدمی تھے، دوسری روایت ہے کہ وہ فرماتے تھے، کہ میرے نزدیک زمین پر اس وقت ان سے زیادہ افضل آدمی کوئی دوسرا نہیں ہے[6]،

---

[1] تہذیب الاسماء جلد ۲ صفحہ ۵۱ [2] الجواہر المضیئہ جلد ۱ صفحہ ۴۰۹ [3] تہذیب ج ۸ ص ۲۹۵ [4] شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۱۶ [5] تہذیب التہذیب اور تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۵۲ [6] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۲۹۵۔

خلیفۂ وقت ہارون رشید کہا کرتا تھا کہ علماء میں امام مالک سے زیادہ بارعب اور فضیل بن عیاض سے زیادہ متقی آدمی میں نے نہیں دیکھا، ہارون نے جو کچھ کہا تھا، وہ سنی سنائی بات نہیں تھی، بلکہ خود اس کا ذاتی تجربہ تھا۔

فضل بن ربیع کا بیان ہے کہ امیر المومنین ہارون رشید حج کے لیے نکلے تو وہ مجھ سے بھی ملنے آئے، میں نے سنا کہ امیر المومنین آئے ہیں، تو تیزی ہی سے ان کے پاس آیا، اور عرض کیا آپ مجھ کو طلب کر لیتے ہیں خود حاضر ہو جاتا، انھوں نے کہا کہ میرے دل میں کچھ خلش ہے، کسی ایسے آدمی کے پاس لے چلو جس سے میں اپنی تسکین حاصل کر سکوں، فضل نے کہا یہاں سفیان بن عیینہ موجود ہیں، آپ میرے ساتھ ان کے پاس چلیے، چنانچہ ہم لوگ ان کے دروازہ پر پہنچے، دروازہ کھٹکھٹایا، انھوں نے اندر سے پوچھا کون؟ میں نے کہا کہ امیر المومنین آپ سے ملنے آئے ہیں، یہ سن کر وہ تیزی سے آئے، اور بولے امیر المومنین! آپ نے بلا لیا ہوتا میں خود حاضر ہو جاتا۔ ہارون نے کہا کہ اچھا جس کام کے لیے ہم آئے ہیں، وہ شروع کیجیے، ہارون نے ان سے کچھ دیر بات چیت کی، پھر پوچھا کہ آپ پر کسی کا قرض تو نہیں ہے، ابن عیینہ نے اثبات میں جواب دیا، ہارون اس کی ادائگی کا حکم دے کر ان سے رخصت ہوا، جب باہر آیا تو اس نے فضل سے کہا کہ تمھارے دوست سے مجھے تسکین نہیں ہوئی، کسی دوسرے صاحب علم کے پاس لے چلو، فضل، عبد الرزاق بن ہمام کی خدمت میں لے گیا، وہاں بھی ہارون کو تسکین نہیں ہوئی، پھر یہ قافلہ فضیل بن عیاض کے پاس پہنچا، ابن عیاض اس وقت نماز میں تھے، اور ایک ہی آیت کو بار بار دہرا رہے تھے، غالباً جب وہ فارغ ہو گئے تو ان لوگوں نے دستک دی، انھوں نے اندر سے پوچھا کون؟ فضل نے کہا امیر المومنین آپ سے ملنے آئے ہیں، اسکے جواب میں انھوں نے بڑی بے نیازی سے فرمایا مجھ سے امیر المومنین کو ملنے کی کیا ضرورت ہے، فضل نے کہا کہ کیا آپ پر اطاعت ضروری نہیں ہے، اس کے بعد ابن عیاض کوٹھے سے نیچے اتر

اور دروازہ کھولا، ہم لوگ ان کے پاس بیٹھ گئے، انھوں نے چراغ گل کر دیا، اور خود ایک گوشہ مین بیٹھ گئے، اتفاق سے اندھیرے مین ہارون کا ہاتھ فضیل کے بدن پر پڑ گیا، فضیل نے کہا کہ کتنا نرم ہاتھ ہے، کاش کل یہ عذاب دوزخ سے بچ جائے، ہارون نے اس کے بعد کچھ ہدایتین کرنے کی فرمائش کی، ابن عیاض نے بڑے پر اثر انداز میں فرمایا کہ عمر بن عبدالعزیز رضہ خلیفہ منتخب ہوئے تو انھوں نے سالم بن عبداللہ، محمد بن کعب القرظی، اور رجاء بن حیوٰۃ کو بلایا۔ اور پر درد لہجہ میں فرمایا کہ میں اس آزمائش میں ڈال دیا گیا ہون، آپ لوگ مجھے اس سلسلہ مین مشورہ دیجیے، تو انھون نے خلافت کی ذمہ داری کو بلا د آزمائش، قرار دیا، اور آپ اور آپکے اصحاب نے اس کو محض نعمت قرار دیا ہے، سالم بن عبداللہ نے عمر بن عبدالعزیز رضہ سے فرمایا کہ اس دنیا مین ایک روزہ دار کی طرح رہنا چاہیے، ابن کعب نے کہا کہ جو مسلمان آپ سے بڑے ہیں، انھیں آپ اپنے والد کی طرح سمجھیں، اور جو متوسط عمر کے ہیں، انھیں بھائی سمجھین، اور جو چھوٹے ہیں، انھین اپنا لڑکا سمجھین، تو باپ کی توقیر کیجیے بھائی کا اکرام و اعزاز کیجیے اور لڑکے سے پوری شفقت و محبت سے پیش آئیے، رجاء بن حیوٰۃ بولے، اگر آپ کل قیامت کے دن عذاب الٰہی سے نجات چاہتے ہیں، تو مسلمانون کے لیے وہی پسند کیجیے، جو اپنے لیے پسند کرتے ہیں، اور ان کے لیے وہ نہ پسند کیجیے، جو آپ اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں، ابن عیاض نے ہارون کو مخاطب کرتے ہوے فرمایا کہ اس دن جس دن لوگون کے پیر اپنی جگہ سے ڈگ رہے ہون گے، آپکے لیے، مین بہت خائف ہون، آپ پر خدا رحم کرے، کہ آپ کے قریب ایسے لوگ نہین ہیں جو آپ کو اس طرح کا مشورہ دےسکین، یہ سن کر ہارون پھوٹ پڑا اور اس پر غشی کی کیفیت طاری ہو گئی، پھر جب یہ کیفیت دور ہوئی، تو ہارون نے کہا کہ آپ پر خدا رحم کرے، کچھ اور ارشاد ہو، ابن عیاض نے پھر اسی انداز مین فرمایا کہ امیر المومنین مجھے یہ بات معتبر طریقہ سے معلوم ہوئی ہے کہ عمر بن عبدالعزیز رضہ کے ایک عامل نے ان کو خط کے ذریعہ اپنی کسی تکلیف کا اظہار کیا، جواب مین انھون نے لکھا کہ میرے

بھائی مین تم کو اہل دوزخ کے دوزخ میں ابدالاباد تک جاگتے رہنے کی یاد دلاتا ہون، اور ڈرو کہ کہین تم خدا کے پاس اس حالت مین واپس ہو کہ تم کو بخشش کی کوئی امید نہ رہ جائے، جب یہ خط اس عامل نے پڑھا تو سارے کام چھوڑ کر عمر بن عبدالعزیزؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، انھون نے وجہ دریافت کی تو بولا کہ آپ کا خط پڑھ کر مین نے تہیہ کر لیا ہے، کہ اب موت تک کسی ذمہ داری کو قبول نہ کرون گا۔ یہ سن کر ہارون پر ایک بار پھر رقت طاری ہو گئی، تھوڑی دیر بعد پھر اس نے مزید ہدایت کی خواہش ظاہر کی، ابن عیاضؒ نے فرمایا کہ اے امیرالمومنین! نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ ایک بار خدمت نبوی مین آئے اور خواہش ظاہر کی کہ مجھے کسی جگہ کا امیر بنا دیجئے، تو آپ نے فرمایا کہ امارت کی ذمہ داری قیامت کے دن سراسر حسرت و ندامت ہو گی، تو اس کی خواہش نہ کیجئے، اس پر ہارون ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا اور مزید کچھ کہنے کی خواہش کی، آپ نے فرمایا کہ اے خوبرو چہرے والے قیامت کے دن اپنی خلق کے بارے مین خدا تعالیٰ پوچھ گچھ کرے گا اگر آپ یہ خوبصورت چہرہ آگ سے بچانا چاہتے ہیں تو اس طرح بچایئے کہ کبھی کسی رعیت کی طرف اپنے دل مین کوئی کھوٹ کینہ نہ رکھیے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، کہ جو شخص لوگون کی طرف سے کینہ اور کھوٹ رکھتا ہے، اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے، یہ سن کر ہارون پھر رو پڑا، جب سکون ہوا، تو اس نے پوچھا کہ آپ پر کسی کا قرض تو نہین ہے، ابن عیاضؒ نے فرمایا کہ ہان میرے رب کا قرض میرے اوپر ہے جسکا وہ محاسبہ کرے گا، میری تو ہلاکت ہی ہے، اگر اس نے مجھ سے سوال کیا میری بربادی ہی ہے اگر اس نے پوچھ گچھ کی اور اس کا جواب اس نے کافی نہین سمجھا، ہارون بولا مین بندون کے قرض کے بارے مین آپ سے سوال کر رہا ہون بولے میرے رب نے اس کا حکم مجھے نہین دیا ہے میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے، کہ مین تنہا اسی کو رب سمجھوں اور اسی کی اطاعت کرون، پھر قرآن کی یہ آیت پڑھی، وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون، ما ارید منھم من رزق

وما ارید ان یطعمون ان اللہ ھو الرزاق ذو القوۃ المتین، ہارون نے کہا کہ یہ ایک ہزار دینار (۱۰ ہزار روپیہ سے زیادہ) حاضر ہین، اسے قبول کیجئے، اور اپنے اہل وعیال پر صرف کیجئے بولے سبحان اللہ! مین تو آپ کو نجات کا راستہ بتاتا ہون، اور آپ اس شکل مین بدلہ دینے کی کوشش کرتے ہیں، یہ فرمانے کے بعد بالکل خاموش ہو گئے، ہارون اپنے قافلہ کے ساتھ وہان سے واپس ہوا، اور باہر نکل کر فضل سے کہا کہ آیندہ اگر کسی کے پاس لے چلنا تو انھی جیسے آدمی کے پاس لے چلنا، یہ واقعہ سید المسلمین ہین[1] اس گفتگو سے حسب ذیل باتین معلوم ہوئین۔

(۱) ایک یہ کہ حکومت کی ذمہ داری کو عیش وطرب کا ذریعہ نہین بنانا چاہئے، بلکہ اسے ایک آزمایش سمجھکر اس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرنی چاہئیے (۲) دوسری بات یہ کہ اسلامی حکومت کے حکمرانون کی زندگی آخرت کی بازپرس اور احساس ذمہ داری سے خالی نہ ہونا چاہیئے، اگر اس سے ان کی زندگی خالی ہوگی تو وہ کبھی عدل وانصاف نہ کرسکین گے (۳) تیسری بات یہ کہ انھون نے اس مین مثال زیادہ تر عمر بن عبدالعزیزؓ کی دی جو اموی خلیفہ تھے، جن کے بارے مین عباسی حکمران بدگمان بھی رہا کرتے تھے، اور ان سے اپنے کو برتر بھی سمجھا کرتے تھے، ابن عیاض نے مثالین دے کر ان کے اس پندار کو توڑنے کی کوشش کی، اس سے ان کی حد سے بڑھی ہوئی جرات کا پتہ بھی چلتا ہے اور حکومت وقت سے ان کی ناراضگی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

(۴) چوتھی بات یہ کہ حضرت عباسؓ کو امارت کے قریب جانے سے آپ نے اس لیے منع فرمایا کہ یہ کوئی موروثی چیز نہین ہے، اگر ایسا ہوتا تو آپ ان کو یہ ذمہ داری ضرور سونپ دیتے، لیکن چونکہ اس کا مدار اہلیت وصلاحیت پر ہے، اس لیے آپ نے اس سے ان کو روک دیا،

حلال ذریعۂ رزق، | وہ اکل حلال کے سلسلہ مین حد درجہ محتاط تھے، یہی وجہ تھی کہ انھون نے

---

[1] صفوۃ الصفوۃ۔

نہ تو امراء و خلفاء کی مدد قبول کی اور نہ عوام کی، اپنے ہاتھ کی کمائی سے جو کچھ مل جاتا تھا۔ وہ کھا لیتے تھے، امام شعرانی کے الفاظ ہیں۔

یسعی علی الدواء وینفق من ذالک علی نفسہ وعیالہ (ص ۵۶)

ہمیشہ بہشتی کا کام کرتے تھے، اور اسی سے اپنا اور اپنے اہل وعیال کا خرچ چلاتے تھے۔

ذکر الٰہی اور قرآن سے شغف، قرآن کے ساتھ ان کو عشق تھا، اوپر ذکر آچکا ہے، ہارون جب ان کے پاس گیا تو وہ قرآن کی ایک آیت دہرا رہے تھے، خادم خاص ابراہیم بن اشعث کہتے ہیں کہ فضیل کے دل میں خدا کی جس قدر عظمت تھی اتنی میں نے کسی کے دل میں نہیں دیکھی، ان کے سامنے جب خدا کا ذکر آجاتا یا وہ قرآن کی کوئی آیت سن لیتے تھے تو

ظہر بہ الخوف والحزن وفاضت عیناہ فبکی حتی یرحمہ من بحضرتہ

ان پر خوف وغم کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور اس طرح روتے تھے کہ دیکھنے والوں کو رحم آنے لگتا تھا

احمد بن حنبل کا بیان ہے کہ ایک بار ہم لوگ فضیل بن عیاض کے پاس گئے، اور ان سے اندر آنے کی اجازت چاہی، تو اجازت نہیں ملی، کسی نے کہا کہ وہ اگر قرآن کی آواز سن لیں تو نکل آئیں گے ہمارے ساتھ ایک بلند آواز آدمی تھا۔ ہم نے اس سے کہا کہ قرآن کی کوئی آیت پڑھو اس نے بلند آواز سے سورۃ تکاثر پڑھنی شروع کر دی، وہ فوراً نکل آئے، اس وقت ان کا حال یہ تھا کہ داڑھی آنسوؤں سے تر تھی وہ خود قرآن پڑھتے تو ان کی آواز نہایت غمگین اور پسندیدہ ہوتی، اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی انسان کو مخاطب کر رہے ہیں۔[۱]

وفات محرم ۱۸۷ھ میں ان کی وفات ہوئی، عمر ۸۰ سے متجاوز تھی۔

اہل وعیال ان کے اہل وعیال کے بارے میں زیادہ تفصیل نہیں ملتی، بعض واقعات سے اتنا پتہ

---

[۱] تہذیب التہذیب سے صفوۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۳۵۔

چلتا ہے، کہ شادی ہوئی تھی، اور ایک اولاد بھی تھی، جن کا نام علی تھا، یہ عادات وخصائل میں ان کے
مثنی تھے، مگر عین عالم شباب میں ان کا انتقال ہوگیا، ابن خلکان کا بیان ہے۔

کان ولدہ شابا سریا من کبار	ان کے یہ صاحبزادے موت کے وقت
الصالحین وھو معدود فی جملۃ	جوان، ممتاز اور کبار صالحین میں تھے۔
من قتلہ محبۃ الباری سبحانہ	ان کا شمار ان لوگوں کے زمرہ میں ہوتا ہے'
	جن کی موت کا سبب خدا کی محبت ہوتی ہے'

لیکن صبر وشکر کا عالم یہ تھا کہ نوجوان صالح اولاد کے انتقال پر بھی وہ بے قابو نہیں ہوے۔
بلکہ ایک غم آمیز تبسم سے فرمایا، خدانے جو پسند کیا میں بھی اس پر راضی ہوں (ابن خلکان ص ۱۵۰)

زرین اقوال اوپر کی تفصیل سے زہد وانقا سے بھرپور زندگی کا ایک خاکہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے
مگر ان کے سوانح حیات کے پورے خط وخال دیکھنے کیلئے ان کے ان گران مایہ اقوال پر بھی ایک نظر
ڈال لینا ضروری ہے، جو ان کی پرحکمت زبان سے گاہ بگاہ صادر ہوتے رہے ہیں۔

فرماتے تھے کہ ہماری صحبت میں اس نے کچھ نہیں پایا جس نے نماز اور روزہ کی کثرت سیکھی۔
بلکہ اس کے لیے طبیعت کی سخاوت قلب کی سلامت اور امت کی خیر خواہی کی ضرورت ہے۔

جس نے انسانوں کو پہچان لیا وہ راحت پاگیا (مقصد یہ ہے کہ یہ حقیقت جس نے پالی کہ
کوئی انسان کچھ بنا بگاڑ نہیں سکتا تو پھر ان سے بالکل بے پرواہ ہو جائے گا۔ اور اپنی ساری توجہ خدا کی
طرف مبذول کر دے گا۔)

فرماتے تھے کہ جب کبھی خدا کی کوئی نافرمانی کر بیٹھتا ہوں تو میں اپنے گدھے' اپنے خادم، اور اپنی
بیوی میں اس کا اثر محسوس کرتا ہوں، یعنی یہ سب میرے نافرمان ہو جاتے ہیں۔

سلہ تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۵۲۔

جب خدا تعالٰی کسی بندے سے محبت کرتا ہے۔ تو اس کو رنج وغم زیادہ دیتا ہے۔ اور جب کسی سے خوش نا ہوتا ہے تو اس پر دنیا کو وسیع کر دیتا ہے۔

فرماتے تھے کہ اگر دنیا اپنی ساری آسائشوں اور زینتوں کے ساتھ مجھے دی جائے، اور اس کے استعمال میں محاسبہ کا بھی کوئی خوف نہ ہو، جب بھی میں اس سے اسی طرح بچوں گا، جس طرح تم لوگ مردار کھانے سے بچتے ہو۔

فرماتے تھے، اگر مجھے مقبولیت دعا کی سعادت ملتی تو میں صرف امام وقت کے لیے دعا کرتا کیونکہ امام وقت کی صلاح پر رعیت کی صلاح کا مدار ہے، جب یہ صالح ہو جائے گا، تو ملک اور اہل ملک دونوں امن وسلامتی پا جائیں گے۔

اپنے ہم نشینوں سے ملاطفت اور حسن خلق کا برتاؤ کرنا رات بھر نفل نماز پڑھنے اور دن بھر نفلی روزہ رکھنے سے زیادہ ثواب کا کام ہے، ایک بار ہارون رشید نے ان سے کہا کہ آپ کے زہد کا کیا کہنا جواب میں فرمایا آپ تو مجھ سے بھی بڑے زاہد ہیں، کیونکہ میں نے تو دنیا سے بے رغبتی اختیار کی ہے، اور یہ ایک مچھر کے پر سے بھی کم درجہ کی چیز ہے، لیکن آپ نے اس آخرت سے بے نیازی اختیار کی ہے جس میں دنیا کی کوئی قیمت نہ ہوگی تو میں فانی کا زاہد ہوں اور آپ باقی کے زاہد ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ یہ بات آپ نے سلیمان بن عبد الملک سے کہی تھی۔

فرمایا کہ دوسروں کے دکھاوے کے لیے کوئی عمل کرنا شرک ہے اور دوسروں کی وجہ سے کوئی عمل چھوڑ دینا ریا ہے، اور اخلاص یہ ہے کہ اللہ تعالٰی دونوں سے محفوظ رکھے۔[1]

فرماتے تھے کہ جب تم رات کو اٹھ کر نفل پڑھنے اور دن کو روزہ رکھنے پر قادر نہ ہو، تو سمجھ لو کہ محروم ہو، اور تمکو تمھارے گناہوں نے گھیر لیا ہے۔ محمد بن حسان کہتے ہیں، کہ ایک بار میں فضیل کی خدمت میں گیا،

---

[1] یہ تمام اقوال البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۹۹ اور ابن خلکان ج ۲ ص ۱۵۸ سے لیے گیے ہیں۔

وہاں امام ابن عیینہ بھی موجود تھے، وہ امام سے مخاطب ہو کر کہہ رہے تھے، کہ آپ لوگ یعنی علمائے دین زمین کا چراغ تھے، جن سے روشنی لیجا سکتی تھی، مگر آپ لوگ ظلمت کا سبب بن گیے ہیں، آپ لوگ ستارون کے مانند تھے، جن سے گم کردہ راہ راستہ پا سکتے تھے، مگر آپ سراپا حیرت بن گئے ہیں، آپ مین کوئی ایک آدمی بھی، ایسا نہین ہے، جو ان ظالم حکمرانون کا مال لینے اور پھر مسند درس پر بیٹھ کر حدثنا فلان عن فلان کہنے سے شرمائے۔[1]

فرماتے تھے کہ کوئی صاحب فضل وکمال اسی وقت صاحب فضل وکمال ہے جب تک وہ خود اپنے کو صاحب فضل وکمال نہ سمجھے۔

فرماتے تھے، اخیر زمانہ میں قومون اور قبیلون کے سردار منافق قسم کے لوگ ہو جائیں تو اس وقت ان سے بچنے کی ضرورت ہے، اس لیے کہ یہ ایسا مرض ہیں کہ ان کی کوئی دوا نہین ہے، لوگون سے دور بھاگو مگر جماعت ترک نہ ہونے پائے، یہ زمانہ خوشی کا نہین بلکہ رنج وغم کا ہے۔[2]

فرماتے تھے کہ ہر چیز کا ایک دیباچہ ہوتا ہو علماء کا دیباچہ یہ ہو کہ سب سے پہلے غیبت ترک کر دین۔

فرماتے تھے، کہ حامل قرآن کے لیے یہ زیبا نہین ہے، کہ وہ اپنی کوئی ضرورت امراء و اہل دولت کے پاس لیجائے، بلکہ اس کا منصب یہ ہے کہ خلق خدا اپنی حاجتیں اس کے پاس لیجائین۔

دوستی کے بارے میں قیمتی ہدایت۔ فرماتے تھے، رحمان کے بندے وہ لوگ ہیں جن میں خشوع اور تواضع ہوتی ہے، اور دنیا کے بندے وہ ہیں جن میں تکبر اور خود پسندی ہوتی ہے اور وہ عام لوگوں کو ذلیل سمجھتے ہیں، فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص بے عیب دوست تلاش کرتا ہے، وہ بغیر دوست ہی رہے گا ایسے شخص سے دوستی نہ کرو کہ جب تم سے خفا ہو تو تمھارے اوپر بہتان تراشے، وہ تمھا

---

[1] صفوۃ الصفوہ ج ۲ ص ۱۳۵ حضرت فضیل نے غایت تشدد میں ایسی بات کہدی ہے، ورنہ تبع تابعینؒ کی ایک معتد بہ تعداد ایسی تھی جو نہ حکومت سے کوئی مدد لیتی تھی اور نہ ان کو پسند کرتی تھی کتاب میں (بقیہ حاشیہ ص ۵۰۴ پر)

دوست نہین ہے، جس نے تم سے کوئی چیز مانگی، اور تم نے نہین دی تو وہ غضبناک ہوگیا، اب آپس مین وہ اخوت و ہمدردی نہین رہی کہ ایک بھائی ایک دوست اپنے بھائی یا دوست کے مرجانے کے بعد اس کی اولاد کو اپنی نگرانی مین لے لیتا تھا۔ اور بالغ ہونے تک اپنے بچون کی طرح ان کی پرورش کرتا تھا،

علم و زہد کے بارے مین جامع ہدایات، جو شخص قرآن پڑھتا ہے، اس سے اس طرح سوال کیا جائے گا، جس طرح انبیاء سے تبلیغ و رسالت کے بارے مین سوال ہوگا، کیونکہ قرآن پڑھنے والا انبیا کا وارث ہے،

آخرت پسند عالم کا علم پوشیدہ رہتا ہے، اور دنیا پسند عالم[1] کے علم کی نشر و اشاعت ہوتی ہے،

عالم آخرت کی پیروی کرو، اور عالم دنیا کی صحبت سے بچو، کیونکہ یہ اپنی فریب خوردگی اور دنیا دی زیب و زینت کے پھندے مین تمھیں ڈال دے گا، اس کی دعوت بغیر عمل کے ہوتی ہے، اور اس کے عمل میں کوئی صداقت نہین ہوتی، زہد کی ایک علامت یہ ہے کہ جب امراء اور اس کے ہم نشینون کے یہان ان کے جہل کا ذکر کیا جائے، تو وہ خوش ہون۔

اکل حلال، جو شخص یہ جان لے کہ اس کے پیٹ مین کیا جارہا ہے وہ خدا کے یہان صدیق شمار کیا جائے گا تو چاہیے کہ تم یہ دیکھو کہ تمھارا رزق کہان سے اور کس ذریعہ سے آرہا ہے۔[2]

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰۰) ایسے متعدد بزرگون کے حالات آچکے ہیں [2] مقصد یہ ہے کہ دینی زندگی کا جب رواج کم ہوجائے، تو پھر مسلمان رہتے ہوئے خوش رہنا مناسب نہین ہے، بلکہ کم سے کم اس پر افسوس ہی کرنا چاہیے،

[1] یہ اس صورت میں ہے جب اپنے علم کو شہرت کی غرض ہی سے شایع و ذائع کرے، [2] الطبقات الکبریٰ جلد ۱ ص ۵۸ و ۵۹۔

امام سفیان ثوری

جن ائمۂ فقہ و حدیث کو زمرۂ تبع تابعین کا گل سر سبد کہا جا سکتا ہے، ان میں ایک امام سفیان ثوری بھی ہیں، علم و فضل کے لحاظ سے ان کا شمار ان ائمہ مجتہدین میں ہوتا ہے، جو ایک جدا فقہی مسلک کے بانی تھے، گو ائمۂ اربعہ کے مسلک کے سامنے یہ مسلک زیادہ دن تک زندہ نہ رہ سکا۔ مگر اس کے باوجود فقہ و حدیث کی تمام قدیم کتابوں میں ائمۂ اربعہ کے ساتھ سفیان ثوری کی رایوں اور مجتہدات کا ذکر بھی ملتا ہے، حدیث کی مشہور کتاب ترمذی ہی کو اٹھا کر دیکھ لیجئے، قریب قریب ہر باب میں وعلیہ سفیان الثوری وغیرہ کے الفاظ آپ کو ملیں گے۔ اس عہد میں جن بزرگوں کو قرآن اور اس کی تفسیر و تاویل سے خاص شغف تھا۔ اور جنھوں نے اس فن میں اپنی تحریری یادگاریں بھی چھوڑیں ان میں امام موصوف بھی تھے، تذکرہ نگاروں نے امام کو بحیثیت فقیہ اور محدث تو پیش کیا ہے، مگر طبقات المفسرین میں ان کا شمار نہیں کیا گیا حالانکہ اس فن میں ان کا کارنامہ سفیان بن عیینہ، وکیع بن جراح، اسحاق بن راہویہ سے کم نہیں تھا، حیرت ہے کہ ان بزرگوں کو تو مفسرین کی فہرست میں جگہ دی گئی ہے۔ اور سفیان ثوری کو اس شرف سے محروم رکھا گیا۔

علم و فضل کے ساتھ زہد و اتقا میں بھی ضرب المثل تھے، ان کے بارے میں عام تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ دنیا ان کی طرف بڑھی مگر انھوں نے اس سے اپنی نظر پھیر لی ان مجمل اشارات کے بعد مفصل حالات زندگی ملاحظہ ہوں۔

نام ونسب اور ولادت | سفیان نام۔ ابو عبد اللہ کنیت۔ ان کے سلسلہ نسب میں ایک نام

ثور بن مناۃ آتا ہے۔ اسی کی نسبت سے وہ ثوریؒ کہلاتے ہیں۔ باختلاف روایت ان کی ولادت سلیمان ابن عبدالملک کے زمانۂ خلافت مین ۹۶ھ یا ۹۷ھ میں ہوئی۔[۲]

خاندان علم و فضل کے لحاظ سے ان کا خاندان کوفہ کے معروف خاندانون مین تھا، ان کے والد سعید بن مسروق خود صاحب علم و فضل تھے، خاص طور پر حدیث نبویؐ کی تحدیث و روایت مین وہ معروف تھے، عام ارباب تذکرہ و رجال نے ان کی توثیق کی ہے، حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں مستقلاً انکا ترجمہ لکھا ہے، بعض واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی والدہ بھی نہایت عفت مآب، پاکیزہ سیرت اور صاحب علم خاتون تھین، سفیان کہتے ہیں کہ مین نے ایک بار رات کو آسمان پر نگاہ اٹھائی تو معلوم ہوا کہ میرا دل پہلو مین نہین ہے، اس کیفیت کا ذکر مین نے اپنی والدہ سے کیا، تو بولیں معلوم ہوتا ہے کہ تم نے آسمان پر عبرت پذیری اور غور و فکر کی غرض سے نگاہ نہین ڈالی، بلکہ تمھارا مقصد صرف لہو و لعب تھا۔[۳]

والدین کے علاوہ ان کے دو بھائی عمرو مبارک کا بھی شمار اہل علم میں ہوتا ہے، حافظ ابن حجر اور خطیب نے ان کے حالات لکھے ہیں۔ مشہور امام حدیث اعمش مبارک بن سعید سے اپنی مجلس درس مین حد درجہ شگفتہ رہتے تھے، جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ یہ سفیان کے بھائی ہیں۔ تو پھر ان کو اپنے پہلو مین بٹھاتے تھے، ان کو ہذا السید، یہ سردار ہیں کے الفاظ سے یاد کرتے تھے، آخری عمر مین بینائی

---

[۱] تذکرون سے معلوم ہوتا ہے کہ ثور نام کے دو آدمی تھے، ایک کا تعلق مشہور عرب قبیلہ مضر سے اور دوسرے کا مشہور قبیلہ ہمدان سے، امام سفیان ثوری کے بارے میں عام تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ وہ ثور مضر سے ہیں، اور بعض لکھتے ہیں کہ ثور ہمدان سے ہیں۔ [۲] تہذیب ج ۴ ص ۱۱۱ اور تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۹۲، بعض لوگون نے ان کا سنہ ولادت ۹۵ھ لکھا ہے، مگر یہ اس لیے غلط ہے کہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ؤ سلیمان کی خلافت میں پیدا ہوئے تھے اور سلیمان ۹۶ھ میں تخت خلافت پر بیٹھا تھا [۳] الطبقات الکبریٰ ج ۱ ص ۴۳

جاتی رہی تھی[1]، دوسرے بھائی عمر بن سعید بھی صاحب علم تھے[2] عمر کے ایک صاحبزادے حفص بھی علم وفضل میں باپ کے جانشین تھے[3]

تعلیم وتربیت امام سفیان نے کوفہ میں آنکھ کھولی جو حرمین کے بعد علوم دینیہ کا سب سے بڑا مرکز تھا، خاص طور پر فقہ وحدیث کے تو بیشمار حلقہاے درس قائم تھے، ماشاء اللہ گھر کا ماحول بھی قال اللہ اور قال الرسول کی صدا سے پرشور تھا، اسی علم افزا اور روح پرور ماحول میں ان کی تعلیم وتربیت شروع ہوئی، تذکرہ میں ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ مگر ان کے والد کے تلامذہ کی جو فہرست رجال کی کتابوں میں ملتی ہے، اس میں ان کا نام بھی ملتا۔ ہے، بعض واقعات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے، کہ گھر کی معاشی حالت اچھی نہیں تھی، جو ان کے حصول علم کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہو رہی تھی، مگر ان کی والدہ کے جذبۂ دینی اور ہمت مردانہ نے اس کو دور کر دیا، ایک دن انھوں نے سفیان کو حصول علم کی ترغیب دیتے ہوے فرمایا۔

یا بنی اطلب العلم وانا اکفیک بمغذلی[3]	اے نور نظر تم حصول علم میں لگے رہو، میں چرخہ کات کر تمھارے اخراجات پورے کروں گی

نیک بخت ماں نے ان کو محض حصول علم کی ترغیب ہی نہیں دی، بلکہ ان کو یہ نصیحت بھی کی کہ یہ علم ان کے اخلاق وکردار کے سنوارنے کا سبب ہو، ان کے بگاڑنے کا سبب نہ ہو، وہ عبادت ہو، تجارت نہ ہو، ان کا یار ہو مار نہ ہو۔

علم را بر دل زنی یارے بود

چنانچہ ایک بار بڑی دلسوزی کے ساتھ نصیحت کی کہ

بیٹے جب تم دس حرف لکھ چکو تو دیکھو کہ تمھاری چال ڈھال اور حلم ووقار میں کوئی

---

[1] تہذیب ج ۱۰ [2] تہذیب ج ۷ - [3] صفوۃ الصفوہ ج ۳ ص ۱۱۶ -

اضافہ ہوا یا نہیں، اگر اس سے کوئی اضافہ نہیں ہوا تو سمجھ لو کہ علم نے تم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا[1]

والدہ کی اس نصیحت کو انھوں نے زندگی بھر حرز جان بنائے رکھا جس کی شہادت ان کی پوری زندگی سے ملتی ہے۔

والدین کی تعلیم و تربیت کے علاوہ کوفہ کے تمام ممتاز شیوخ حدیث وفقہ سے انھوں نے استفادہ کیا تھا، کوفہ میں اس وقت جن تابعین کی مجلس درس وافتا کو امتیاز حاصل تھا۔ ان میں امام اعمشؒ اور ابو اسحٰق سبیعی سرفہرست تھے، ان دونوں بزرگوں سے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ خاص طور پر امام اعمش کی روایات کے وہ بہت بڑے امین تھے، امام وقت یحییٰ بن معین فرماتے تھے۔

سفیان الثوری اعلم الناس بحدیث الاعمش[2] — سفیان ثوری اعمش کی روایتوں کے سب سے بڑے جاننے والے تھے۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ اس عہد میں حدیث کا دفتر سفینوں سے زیادہ سینوں میں تھا، اس لیے حدیث کے طالب علموں کو ان جواہر ریزوں کی تلاش میں دور دور کی خاک چھاننی پڑتی تھی، اور جو ریزہ جہاں بھی ملتا تھا، اسے اپنے سفینوں میں جمع کر جاتے تھے، برسوں کی اس محنت شاقہ کے بعد کہیں جاکر کوئی شخص تحدیث وروایت کے قابل سمجھا جاتا تھا، امام سفیان ثوری بھی ان ہی بزرگوں میں تھے، جن کو حدیث نبوی سننے کے لیے سیکڑوں میل کا سفر کرنا پڑا، پہلے انھوں نے کوفہ کے تمام ممتاز شیوخ حدیث سے استفادہ کیا اور پھر بصرہ اور حجاز کے مختلف مقامات کے شیوخ حدیث کی خدمت میں پہنچے اور ان سے سماع حدیث کیا، حافظ ابن حجر کوفہ، بصرہ، اور حجاز کے بعض ممتاز شیوخ کا نام لے کر لکھتے ہیں:۔

وخلق من اھل الکوفة وجماعة — اہل کوفہ کی ایک بڑی تعداد سے استفادہ

---

[1] صفوة ج ۳ ص ۱۱۶ [2] تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۶۱

من اھل البصرۃ واطوائف — کیا اسی طرح بصرہ کی ایک بڑی جماعت سے

من اھل الحجاز (تہذیب ج ۴ ص ۱۱۲) — فیض اٹھایا اور حجاز کے مختلف حلقہائے

درس سے بہرہ مند ہوئے۔

وثوق علم اپنے علم وفن پر وثوق واعتماد ہر علم وفن کے لیے ضروری ہے، خاص طور پر تحدیث روایت میں تو اور بھی زیادہ ضروری ہے، اگر ریب وشک سے کوئی شخص حدیث نبوی کی روایت کرے گا، تو وہ اس روایت میں بھی شک پیدا کرے گا، اور اس سے دوسروں کے دل میں بھی بے اعتمادی پیدا ہوگی، عام طور پر محدثین کو اپنی یادداشت اور اخذ روایت پر اعتماد ہوتا تھا۔ مگر امام سفیان ثوری اس میں خاص طور پر ممتاز تھے۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ امام اعمش کے تلامذہ میں سفیان ثوری ان کی روایتوں کے سب سے بڑے امین تھے، انھوں نے ان سے جو روایتیں کی تھیں ان پر اتنا وثوق تھا۔ کہ اس سلسلہ میں استاد سے تسامح ہو جاتا تھا۔ مگر ان سے نہیں ہوتا تھا۔ مشہور محدث زائدہ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت اعمش کی خدمت سے حدیث لکھ کر واپس ہوتے تھے، تو ان مکتوبہ روایتوں کو امام سفیان کی خدمت میں پیش کرتے تھے، وہ دیکھ کر بعض روایتوں کے بارے میں فرماتے تھے۔ کہ فلاں فلاں روایت تو حضرت اعمش کی بیان کردہ نہیں ہیں، ہم کہتے کہ انھوں نے ابھی ہم سے ان کی تحدیث کی ہے، فرماتے کہ جاؤ اور ان سے یہ بات کہو چنانچہ ہم لوگ جاتے اور ان سے کہتے تو وہ غور کر کے فرماتے کہ صدق سفیان سفیان نے ٹھیک کہا ہے، اور پھر اپنے صحیفہ سے[1] اس کو مٹا دیتے تھے۔

---

[1] یعنی اس کے حدیث نبوی ہونے میں شبہہ نہیں تھا، اور نہ امام سفیان کو اس پر اعتراض تھا، بلکہ ان کے اعتراض کا مطلب یہ تھا کہ اس روایت کو ان روایتوں میں شامل نہ کیا جائے، جو امام اعمش نے اپنے شیوخ سے براہ راست سنی ہیں" اندازہ کیجئے کہ تدوین حدیث میں محدثین نے کتنی دیدہ ریزی کی ہے، تاریخ بغداد ج ۹۔

عبد الرحمٰن بن مہدی جو خود امام حدیث ہیں، فرماتے تھے۔

ما رایت صاحب الحدیث احفظ من سفیان الثوری۔[1] — میں نے سفیان ثوری سے زیادہ حدیثیں یاد رکھنے والا نہیں دیکھا۔

یہ کہنے کے بعد انھوں نے یہ واقعہ بیان کیا کہ ایک بار انھوں نے حماد بن ابی سلیمان عن عمرو بن عطیہ عن سلمان الفارسیؓ کے واسطہ سے ایک روایت بیان کی۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ ابو عبد اللہ! اس میں آپ سے غلطی ہوئی ہے، پوچھا کیسے، کسی اور واسطہ سے روایت منقول ہے، میں نے کہا ہاں حماد سے ربعی نے، ربعی نے سلیمان فارسیؓ سے روایت کی ہے، فرمایا کس نے اس واسطہ سے روایت بیان کی ہے۔ میں نے امام شعبہ نے فرمایا امام شعبہ سے غلطی ہوئی ہے، پھر کچھ دیر خاموش ہو کر سوچتے رہے، پھر پوچھا کہ اچھا اس روایت میں امام شعبہ کی کسی اور نے بھی تائید کی ہے، میں نے ہشام الدستوائی۔ سعید بن عروبہ اور حماد بن زید کا نام لیا، فرمایا کہ حماد سے غلطی ہوئی ہے، ان ہی نے مجھ سے عمرو بن عطیہ کے واسطہ سے یہ روایت بیان کی ہے، ابن مہدی کہتے ہیں کہ میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ جب چار آدمی ایک بات پر متفق ہیں، تو وہی صحیح ہوگی، لیکن ایک سال بعد یعنی ۱۸۱ھ میں شیخ غندر کے پاس گیا تو انھوں نے امام شعبہ کا مرتب کردہ صحیفۂ حدیث مجھ کو دکھایا۔ اس میں یہ روایت عن حماد عن ربعی کے الفاظ میں موجود تھی، امام شعبہ نے یہ بھی لکھا تھا کہ حماد کبھی اسے عمرو بن عطیہ سے بھی روایت کرتے تھے، اور کبھی ربعی سے) یہ دیکھ کر ابن مہدی کی زبان سے بے اختیار نکلا ابو عبد اللہ! آپ پر خدا رحم کرے، آپ جب کوئی حدیث یاد کر لیتے ہیں تو پھر یہ پروا نہیں کرتے کہ کون آپ کی مخالفت

[1] یعنی اس کے حدیث نبوی ہونے میں شبہ نہیں تھا، اور نہ امام سفیان کو اس پر اعتراض تھا۔ بلکہ ان کے اعتراض کا مطلب یہ تھا کہ اس روایت کو ان روایتوں میں شامل نہ کیا جائے، جو امام اعمش نے اپنے شیوخ سے براہ راست سنی ہیں، اندازہ کیجئے کہ تدوین حدیث میں محدثین نے کتنا دیدہ ریزی کی ہے۔ تاریخ بغداد ج ۹۔

کرتا ہے۔[1]

اسی بنا پر یحییٰ بن معین فرماتے تھے جو بھی امام سفیان کی مخالفت کرے، بات ان ہی کی صحیح ہوتی ہے۔[2]

امام سفیان اور امام شعبہ۔ امام سفیان اور امام شعبہ تقریباً ہم عصر ہیں، اور دونوں بزرگوں کو امامت فی الحدیث کا درجہ حاصل ہے، مگر ان دونوں کی کچھ جدا جدا خصوصیتیں ہیں، اسی لیے خطیب نے امام شعبہ اور امام سفیان کی امتیازی خصوصیات کے ذکر کے لیے ایک الگ باب باندھا ہے، امام شعبہ کی خصوصیات کا ذکر اوپر آچکا ہے، یہاں امام سفیان کی خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ابن قطان کہتے تھے کہ میری نظر میں امام شعبہ سے بڑا اور محبوب آدمی دوسرا نہیں ہے، لیکن جب امام سفیان اور ان میں اختلاف ہوتا ہے، تو میں امام سفیان کی روایت کو لیتا ہوں، یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ سفیان شعبہ سے زیادہ اثبت ہیں، اور رجال کے عالم ہیں۔

روایات کے مشہور زمانہ ناقد یحییٰ بن معین فرماتے تھے کہ روایات میں سفیان کی جو بھی مخالفت کرے ان ہی کی روایت قابل ترجیح ہوگی، کسی نے کہا کہ شعبہ بھی ان کے مخالف روایت کریں جب بھی فرمایا، ہاں! پھر کسی نے کہا کہ اگر بصریوں کی روایات میں شعبہ ان کی مخالفت کریں، تو کس کو ترجیح ہوگی فرمایا یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ امام شعبہ بصریین کی روایات میں ان کی مخالفت کریں۔[3]

امام ابو حنیفہ اور بعض دوسرے اہل علم کا اعتراف امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ان کے فضل و کمال کے حد درجہ معترف تھے، ایک بار فرمایا کہ اگر وہ تابعین کے عہد میں بھی ہوتے، تو بھی ان کا ایک خاص مقام ہوتا؛ ایک دفعہ امام کے پاس ایک شخص آیا اور بولا کہ آپ نے سنا نہیں کہ سفیان ثوری نے کیا روایت کی ہے، امام ابو حنیفہ نے فرمایا کیا تم چاہتے ہو کہ میں یہ کہوں کہ سفیان حدیث کی روایت میں غلطی کرتے ہیں، اگر سفیان ابراہیم نخعی (امام ابو حنیفہ کے استاذ الاساتذہ ہیں) کے زمانہ میں ہوتے

---

[1] تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۶۰، [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۱۶۹۔

تو بھی لوگ حدیث میں ان کے محتاج ہوتے، ایک روایت مین ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر ابراہیم کے زمانہ مین بھی سفیان کی موت ہوتی تو لوگون کو ان کی عدم موجودگی محسوس ہوتی [1]

اسی طرح امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کے علم و فضل کا بڑی وسعت قلب کے ساتھ اعتراف کیا ہے، کسی نے پوچھا کہ سفیان ثوری احفظ تھے، یا سفیان بن عیینہ، بولے سفیان ثوری احفظ تھے، اور بہت کم غلطی کرتے تھے، اور سفیان بن عیینہ حافظ تھے [2]

ابن مہدی فرماتے تھے کہ مین نے امام مالک سے عاقل، عبد اللہ بن مبارک سے زیادہ امت کا خیر خواہ، امام شعبہ سے زیادہ متقشف اور امام سفیان ثوری سے زیادہ حدیث کا جاننے والا نہین دیکھا [3]

امام نسائی کہا کرتے تھے کہ وہ اس سے زیادہ بلند تھے کہ ان کی توثیق کیجائے، امام مالک فرماتے تھے کہ عراق ہم پر درہم و دینار کی بارش کرتا تھا۔ اس نے سفیان کے بعد علم کی بارش شروع کر دی [4]

ابن خلکان نے لکھا ہے کہ یہ بات زبانون پر ہے کہ امیر المومنین عمر بن الخطابؓ اپنے زمانہ مین راس الناس تھے، اور ان کے بعد ابن عباسؓ راس الناس ہوئے اور ان کے بعد امام شعبی (تابعین مین) اور امام سفیان (تبع تابعین) میں راس الناس، قرار پائے۔

مرویات کی تعداد دوسری صدی کے بعد جب حدیث کا منتشر ذخیرہ بڑی حد تک جمع ہوگیا تو محدثین کے لیے لاکھون کی تعداد میں روایات اور ان کے سلسلہ اسناد کا یاد رکھنا آسان ہوگیا لیکن جب یہ ذخیرہ منتشر تھا تو پھر دو چار ہزار حدیثون کا بھی سینون اور سفینون مین محفوظ رکھنا مشکل تھا، اس لیے تبع تابعین کے عہد مین دس ہزار سے زیادہ کسی امام حدیث کو حدیثین مشکل سے یاد تھین لیکن امام سفیان کو اس حیثیت سے بھی امتیاز حاصل تھا کہ ان کی مرویات کی تعداد جو ان کے سینہ مین ہر وقت محفوظ رہتی تھین، تیس ہزار تھی [5]

---

[1] تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۶۵ [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۱۷۰ [4] ایضاً [5] تہذیب ج ۴ ص ۱۱۴۔

درس وافتا | اس غیر معمولی علم وفضل اور تحدیث روایات مین وثوق کی وجہ سے بہت ہی کم سنی مین مسند درس وافتا پر متمکن کر دیئے گئے۔ ولید بن مسلم کہتے ہیں کہ ابھی سبزۂ خط بھی نہین نکلا تھا کہ مکہ مین ان سے فتوی پوچھا جاتا تھا[1]۔ خطیب کا بیان ہے کہ ان کے درس کی سب سے پہلی مجلس بخارا (خراسان) میں برپائی، اس وقت ان کی عمر کل ۱۰ سال کی تھی[2]۔

جن لوگون نے ان سے استفادہ کیا تھا انکی تعداد کا حصر تو ممکن نہین، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:۔

روی عنہ خلق لا یحصون — ان سے اتنے بیشمار لوگون نے روایت کی ہے کہ ان کا شمار نہین کیا جا سکتا

تمام ممتاز تبع تابعین نے یا تو ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ یا ان سے فائدہ اٹھایا تھا۔ مثلاً عبداللہ بن مبارک امام اوزاعی، امام مالک جیسے ائمۂ روزگار نے ان سے سماع کیا تھا، ابن مبارک فرماتے ہیں کہ مین نے گیارہ سو شیوخ سے حدیثین لکھی تھین، ان مین سب سے افضل سفیان ثوری کو پایا، کسی نے پوچھا کہ آپ نے تو مشہور تابعی سعید بن جبیر وغیرہ کا زمانہ پایا ہے، فرمایا ہان، جو مین کہتا ہوں وہ صحیح ہے۔

امام اوزاعی ان کے ہم عصر اور درجۂ اجتہاد مین ان کے ہم پلہ سمجھے جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہین کہ نماز مین ہنسنے والے کے بارے میں نقض صلوٰۃ کا فتوی تو دیتا تھا۔ مگر اس کی دلیل نہین جانتا تھا۔ لیکن جب سفیان سے ملا، تو ان سے اس مسئلہ مین تسکین ہوگی، اور مین نے اسی رائے کو اختیار کر لیا[3]۔

امام احمد بن حنبل گو ان کے زمانہ میں موجود تھے، مگر براہ راست ان سے سماع نہین کر سکے تھے، لیکن ان کے تلامذہ کے ذریعہ سے ان کے علم وفضل ہی کو نہین۔ ان کی سیرت وکردار کو بھی

---

[1] تہذیب ج ۴ ص ۱۱۱ [2] تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۶۱ [3] تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۶۲۔

اپنالیا تھا۔ اور ان کے متبنی ہو گئے تھے، اور صوری ملاقات نہ ہونے کے باوجود، امام احمد کی سیرت پر ان کا بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ اسی وجہ سے وہ احمد فرمایا کرتے تھے۔ میرے دل میں امام سفیان ثوری سے زیادہ کسی کی منزلت نہیں ہے، امام احمد صرف امام سفیان ہی کو "امام" کے لفظ سے یاد کرتے تھے، ایک بار کسی شاگرد سے فرمایا جانتے ہو امام کون ہے، امام ایک ہی ہیں، اور وہ سفیان ثوری ہیں[1]

فقہی مسلک | انکے علمی فضائل صرف درس و تدریس ہی تک محدود نہیں تھے، اور نہ وہ محض قرآن و حدیث کے ناقل تھے، بلکہ قرآن و حدیث پر ان کی نظر مجتہدانہ تھی، ان کا شمار ان چھ سات ائمۂ مجتہدین میں ہوتا ہے، جو تبع تابعین میں صاحب مذہب شمار کیے جاتے ہیں، امام نووی لکھتے ہیں۔

هو احد اصحاب المذاهب الستة المتبوعة (تہذیب الاسماء ج ۲۲۳)

ان کا شمار ان چھ صاحب مذہب ائمہ میں ہوتا ہے جو متبوع خلائق ہیں۔

ان کے مجتہدات کا کوئی الگ مجموعہ ہوتا تو ان کے درجۂ اجتہاد کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ ان کی تفسیر کے چند اجزاء کے علاوہ اور کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ البتہ حدیث کی کتابوں میں اور خاص طور پر ترمذی میں انکے اجتہادات اور رایوں کا کثرت سے ذکر آتا ہے، اگر ان سب کو جمع کر لیا جاتا تو امام اوزاعی کی طرح ان کے تفردات بھی عام لوگوں کے سامنے آجاتے، گو خواص اہل علم ان سے واقف ہیں۔

امام اوزاعی کی طرح ان کا مسلک بھی کئی صدی تک زندہ رہا۔ ابن خلکان کے بیان کے مطابق تیسری صدی تک بعض علماء ان کے مسلک کے مطابق تفقہ حاصل کرتے تھے، چنانچہ شیخ جنید بغدادی متوفی ۲۹۷ھ کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے انہی کے مسلک کے مطابق تفقہ کیا تھا۔ ابن رجب کے بیان کے مطابق چوتھی صدی تک یہ مسلک زندہ رہا۔ ابن عماد نے ابن رجب کی یہ رائے نقل کی ہے کہ

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۱۳۴۔

وجد في اخر القرن الرابع سفیانیون (شذرات ج ۳ ص ۲۵۱)

چوتھی صدی کے آخر تک سفیان ثوری کے متبعین موجود تھے۔

آگے ذکر آئے گا کہ تیرہوین صدی تک ان کی بعض فقہی کتابیں خواص اہل علم میں پڑھی پڑھائی جاتی تھیں

سیرت وکردار | امام سفیان ثوری کی ذات علم وعمل دونوں کا مجموعہ تھی، ان کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے، کہ ان کا مرتبہ علم وفضل کے لحاظ سے زیادہ بلند تھا۔ یا سیرت وکردار کے اعتبار سے جس طرح ان کا علم وفضل تبع تابعین میں ہر کہ ومہ کے نزدیک مسلّم تھا، اسی طرح ان کے سیرت وکردار کا نقش بھی ہر دل پر بیٹھا ہوا تھا، اور اس میں ان کی فطری سلامت روی کے ساتھ ان کی والدہ کی تربیت کو بھی بڑا دخل تھا۔ جیساکہ ابتدا میں انھوں نے ان کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھاکہ بیٹا علم کے ذریعہ تمھاری سیرت سنورنی چاہئے۔ ان کے سیرت وکردار کی ایک جھلک اس خط سے ملتی ہے، جو انھوں نے اپنے ایک شاگرد کے نام لکھا تھا۔ اس خط کا خلاصہ ہم یہاں نقل کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں۔

"تم جس زمانہ میں ہو یہ وہ زمانہ ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ پناہ مانگتے تھے کہ وہ یہ زمانہ پائیں، اور قدامت کیوجہ سے انھیں وہ کچھ حاصل تھا، جو ہمیں حاصل نہیں ہے، پھر ہم خیر میں قلت علم قلت صبر اور قلت اعوان، لوگوں کی فساد انگیزی اور دنیا کی گندگی ونا پاکی کے باوجود ہم نے جس زمانہ کو پایا ہے، اس سے کیونکر علحدہ ہو سکتے ہیں، پس تم پر واجب ہے کہ گمنامی کی زندگی بسر کرو کہ یہ زمانہ گمنامی ہی کے لیے موزوں ہے۔ تم پر لازم ہے کہ گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کرو، اور لوگوں سے ملنا جلنا کم رکھو، پہلے زمانہ میں لوگ ملتے تھے، تو ایک دوسرے کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتے تھے، لیکن اب وہ صورت نہیں رہی، بس راہ نجات یہی ہے، کہ ترک تعلق کے اصول پر عمل کیا جائے، اور ہاں خبردار امراء کا قرب نہ اختیار کرنا، نہ اون سے کسی معاملہ میں اختلاط رکھنا، خبردار مبتلائے فریب نہ ہونا، تم سے کہا جائیگا،

کہ اس شخص کی سفارش کر دیجئے، مظلوم کی دستگیری کیجئے، ظلم کے مٹانے کی سعی کیجئے" یاد رکھو

یہ سب باتیں ابلیس کی فریب کاریاں ہیں۔ وقت کے تاجرون نے اپنی سربلندی کے لیے ان

باتون کو سیڑھی بنالیا ہے[1]، اور ہان خبردار! تم اس آدمی کی طرح نہ ہو جانا جو یہ چاہتا ہے، کہ

اس کے قول پر عمل کیا جائے۔ اس کی باتون کی اشاعت کی جائے، اور اس کا کلام سنا جائے

خبردار حکومت اور ریاست کی محبت سے بچنا کیونکہ لوگ اقتدار کو سونے اور چاندی

سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔[2]

زہد وتقویٰ | زہد وتقویٰ جیسا کہ مذکورہ خط سے بھی معلوم ہوتا ہے، ان کا خاص وصف تھا۔ ایک

شاگرد نے ان سے ایک دن کہا کہ لوگون میں آپ کا اتنا چرچا ہے، اور آپ رات کو سوتے رہتے ہیں۔

بولے چپ رہو، اصل[3] چیز دل کا تقویٰ ہے۔ (عبادت وریاضت کی کثرت نہین۔)

انھون نے دنیا حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہین کی، بلکہ حصول دنیا کے جتنے ذرائع تھے، انھون

نے اپنے اوپر مسدود کر لیے تھے، خراسان میں ان کو اپنے چچا کی کچھ جائداد ملی تھی، اسی پر ان کا گذر اوقات

تھا،[4] دنیا سے بے رغبتی کا حال یہ تھا کہ عمر بھر گھر کے اوپر ایک حبہ صرف نہیں کیا، فرماتے ہیں۔

ما انفقت درھما قط فی بناء[5] | مین نے ایک درہم بھی مکان کے بنانے میں

صرف نہین کیا۔

امام شعرانی کا بیان ہے کہ انھون نے اپنے اوپر تین باتیں لازم کر لی تھیں، ایک یہ کہ وہ کسی سے

خدمت نہ لیں گے اور نہ ان کا کپڑا کوئی درست کرے گا، اور نہ وہ اینٹ پر اینٹ رکھیں گے (ص ۲۴)

---

[1] مقصد یہ ہے کہ ظلم کے مٹانے اور خدمت خلق کے نام پر اقتدار پرست لوگ تمھیں آلۂ کار نہ بنالیں۔ [2] طبقات الکبریٰ جلد ا صفحہ ۴۲ و حلیۃ الاولیاء جلد ۶ ص ۳۷۷ [3] صفوۃ الصفوہ۔ [4] تاریخ بغداد جلد ۹ ۔ [5] ایضاً صفحہ ۱۲۴۔

وہ چاہتے تو دنیا میں مال و دولت اقتدار سب کچھ حاصل کر سکتے تھے، مگر یحییٰ بن یمان بیان ہے۔

اقبلت الدنیا علیہ فصرف — دنیا ان کی طرف بڑھی مگر انھوں نے اس سے

وجھہ عنھا (تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۵۶) — منہ پھیر لیا۔

امراء و سلاطین کا ذکر کیا اپنے خاص خاص دوستوں تک کے ہدایا قبول نہیں کرتے تھے، ان کے بھائی مبارک کہتے ہیں کہ امام سفیان کے ایک دوست تھے، جن کے یہاں اکثر ان کی آمد و رفت رہتی تھی، اور ان کے یہاں ٹھہرا بھی کرتے تھے، ان کا ایک لڑکا ایک مرتبہ درہموں سے بھری ہوئی ایک یا دو تھیلی لیکر ان کی خدمت میں آیا، وہ مزاج شناس تھا، بولا کہ میرے والد کی طرف سے آپ کو کوئی شکایت تو نہین ہے، فرمایا کہ نہین خدا ان پر رحم کرے، وہ بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں، پھر اس نے کہا کہ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ دولت ہمارے پاس کن ذرائع سے آئی ہے؟ اس لیے میری خواہش ہے، کہ یہ رقم جو میں لیکر آیا ہوں آپ اسے قبول کرلیں، اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کرین، انھوں نے تھیلی اپنے ہاتھ میں لے کر رکھ لی جب وہ ان سے رخصت ہوکر باہر چلا گیا تو مبارک کو بلایا اور فرمایا باہر لیجاکر رقم اسے لوٹا دو، مبارک کہتے ہیں کہ میں اس سے ملا اور وہ رقم لوٹا دی، وہ پھر واپس آیا اور اس نے اصرار کیا کہ وہ دوبارہ اس رقم کو واپس لے لیں، فرمایا کہ مین نے ہاتھ میں لے تو لی تھی، اب پھر تم اسکو واپس لیجاؤ، اس نے کہا کہ کوئی ناراضگی تو نہین ہے۔ فرمایا نہین وہ بار بار رقم کے لینے پر اصرار کرتا رہا، اور یہ واپسی کے لیے بضد تھے، یہان تک کہ وہ شخص واپس چلا گیا، جب تنہائی ہوئی تو ان کے بھائی مبارک ان کے پاس آئے، اور بولے بھائی آپ کا دل بالکل پتھر ہو گیا ہے، آپ کے اگر اہل وعیال نہین ہیں، تو ہم پر تو آپ رحم کرتے، آپ کو اپنے بھائیوں اور ان کے بچوں پر بھی رحم نہین آیا کہتے ہیں کہ مین نے اسی طرح ان کو بہت کچھ سنایا جب یہ سب کچھ کہہ چکا تو فرمایا کہ

یا مبارک تاکلہا انت ھنیاً مریئاً — مبارک تم تو قہین لے لے کر مزے سے کھاؤ پیو،

واسئال عنها لا تكون هذا ابدا — اور اس کے بارے میں میری باز پرس ہو

(تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۶۱) — ایسا قطعی نہیں ہو سکتا۔

ہدیہ کی طرح قرض لینے سے بھی سخت گریز کرتے تھے، حالانکہ بسا اوقات فاقہ کی نوبت آجاتی تھی، اور ہدیہ نہ قبول کرنے اور قرض نہ لینے کی وجہ یہ بیان کرتے تھے کہ لوگ مجھ کو عطیہ و ہدیہ دیکر اگر فخر محسوس نہ کرتے تو میں ضرور ان کے ہدایا قبول کر لیتا اور جس سے میں قرض لوں گا وہ غایت خوشی میں اسے چھپانے کے بجائے لوگوں سے فخریہ یہ کہے گا کہ کل سفیان ثوری مجھ سے قرض لینے آئے تھے (طبقات ج ۱ ص ۷۴)

انکے اسی زہد و ورع کی بنا پر لوگ کہا کرتے تھے کہ

لولا السفیان لمات الورع — اگر سفیان نہ ہوتے تو زہد و ورع کا خاتمہ

(بغداد ج ۹ ص ۱۶۰) — ہو جاتا۔

رقت قلب اور فکر آخرت نہایت ہی رقیق اور فکر آخرت میں ڈوبا ہوا دل پایا تھا، خوف آخرت سے ہر وقت لرزاں اور ترساں رہا کرتے تھے، خود فرماتے ہیں، کہ میں رات کو سوتا ہوں اور اچانک کوئی کوئی آواز آجاتی ہے، تو یہ تصور کرکے چونک پڑتا ہوں کہ ہم پر عذاب نہ آگیا ہو۔[1]

ایک بار زوال سے پہلے نفل پڑھ رہے تھے، جب قرآن کی اس آیت

فاذا نقر فی الناقور فذالك یومئذ — جس دن صور پھونکا جائے گا وہ دن بڑا

عسیر (المدثر) — ہی سخت ہوگا

پر پہنچے تو چیختے ہوئے سخت دھوپ میں باہر نکل پڑے، یہانتک کہ لوگوں نے دھوپ سے ان کو واپس کیا۔[2]

ایک بار عشا کی نماز پڑھ کر ایک شاگرد یوسف سے طہارت کا برتن مانگا، شاگرد نے ان کو

---

[1] صفوۃ الصفوہ ج ۳ ص ۸۴ [2] ایضاً۔

دیدیا، برتن کو داہنے ہاتھ میں لے لیا اور اسی حالت میں پوری رات گذار دی اور اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی، صبح کو شاگرد نے کہا کہ ابو عبداللہ صبح ہوگئی۔ فرمایا کہ جب سے تم نے یہ برتن دیا اسی وقت سے آخرت کے انجام پر غور کرتا رہ گیا، یہی شاگرد کہتے ہیں کہ جب سفیان ثوری سوچنے لگتے تھے، تو ان کو خون کا پیشاب ہونے لگتا تھا۔[۵]

ان کے شاگرد ابو اسامہ کہتے ہیں۔ایک بار بیمار پڑے، میں ان کا قارورہ لیکر کسی طبیب کے پاس گیا، تو طبیب نے قارورہ دیکھ کر کہا کہ یہ کسی راہب کا قارورہ معلوم ہوتا ہے، غم نے اس شخص کا جگر شق کر دیا ہے، اس کے لیے کوئی علاج کارگر نہیں ہے۔[۶]

عبدالرحمٰن بن مہدی کہتے تھے کہ ان سے زیادہ رقیق القلب آدمی سے میرا سابقہ نہیں پڑا یکے بعد دیگرے کئی رات ان کو دیکھتا رہا۔ وہ رات کے پہلے حصہ میں سو جاتے تھے، پھر یکایک گھبرا کر "دوزخ دوزخ" چیختے ہوئے اٹھ جاتے، فرماتے کہ دوزخ کی یاد نے مجھے نیند اور خواہش نفس سے دور کر دیا ہے، پھر وضو کرنے اور وضو کے بعد یہ دعا کرتے کہ "اے اللہ! تو بغیر بتائے ہوئے میری حاجت سے واقف ہے، میں تجھ سے عذاب دوزخ سے نجات کے علاوہ کچھ نہیں مانگتا اے اللہ! فکر آخرت کی گھبراہٹ ہی نے مجھے رقیق القلب بنا دیا ہے، اور یہ میرے اوپر تیرا بڑا انعام ہے، اے اللہ! اگر گوشہ گیری کے لیے[۷] کوئی عذر میرے پاس ہوتا تو میں ایک لمحہ بھی لوگوں میں نہ رہتا۔ اس دعا کے بعد نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے، نماز میں گریہ و بکا کی وجہ سے قرات نہیں کر پاتے تھے، میں شرم اور ان کی ہیبت کی وجہ سے ان کی طرف دیکھ تو نہیں پاتا تھا مگر کوشش کے باوجود ان کی قرأت صاف سنائی نہیں دیتی تھی۔[۸]

ایک بار مجلس میں آپ نے ایک ایک شخص سے سوال کیا کہ تم رات میں کیا کرتے ہو، سب نے اپنے

---

۵ صفوۃ الصفوۃ ج ۳ ص ۱۴۸ ۶ تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۵۸ ۷ ان کے بعض اقوال سے گوشہ گیری کی ترغیب معلوم ہوتی ہے ان اقوال کی نسبت یا تو ان کی طرف صحیح نہیں ہے یا پھر وہ کسی خاص موقع و محل کیلئے کہے گئے ہیں ۸ صفوۃ الصفوۃ ج ۳ ص ۸۵

معمولات بتائے، جب سب لوگ بتا چکے توکسی نے امام سے پوچھا کہ آپ بھی تو اپنے معمولات سے مطلع فرمائیے

فرمایا کہ میں پہلے حصہ میں بھرپور نیند سے سو جاتا ہوں، پھر جب اٹھتا ہوں تو دوبارہ ٹیک نہیں لگاتا۔

موت کی یاد آخرت کی یاد ہی کا ایک جز، موت کی یاد ہے، موت کی یاد آدمی کی آنکھوں سے غفلت کے بہت سے پردے اٹھا دیتی ہے، اور اس کو دنیا میں غرق ہونے سے بچاتی ہے، اسی لیے حدیث میں آیا ہے، واکثروا ذکر ہادم اللذات لذتوں کو ختم کرنے والی یعنی موت کو کثرت سے یاد رکھو، امام سفیان کے دل میں اس ہادم اللذات کی یاد کی اتنی سوزش رہتی تھی کہ ان کے پاس بیٹھنے والے ابھی اس کی تپش محسوس کرتے تھے۔ قبیصہ بیان کرتے ہیں کہ میں جب بھی امام سفیان کے پاس بیٹھتا تھا تو موت کی یاد تازہ ہو جاتی تھی، ان سے زیادہ میں نے کسی کو موت کی یاد رکھنے والا نہیں دیکھا۔ (تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۵۰)

علم کی ذمہ داری کا احساس علم دین کا حصول اتنا مشکل کام نہیں ہے۔ جتنا مشکل اس کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ہے، امام سفیان نے علم و فضل جس جد و جہد سے حاصل کیا تھا، اسی اعتبار سے اس کی ذمہ داری کو بھی انھوں نے ادا کیا۔ انھوں نے اپنے علم کو منفعت کا نہیں خلق خدا کی ہدایت کا ذریعہ بنایا۔ وہ اس ذمہ داری سے ہر وقت گران بار رہتے تھے۔ فرماتے تھے کہ اگر میں کچھ نہ جانتا تو میرا غم کچھ کم ہوتا[1]، ان کی والدہ نے ابتداء عمر ہی میں یہ نصیحت کی تھی۔ کہ تمھارا علم تمھاری سیرت و کردار کے سنوارنے کا سبب ہو، چنانچہ انھوں نے اس کا پورا حق ادا کیا۔ علم کی ذمہ داری کا احساس دلاتے ہوئے ایک شاگرد کو لکھتے ہیں۔

> علم حاصل کرو، اور جب علم حاصل کر چکو تو اس کی رکھوالی کرو، اسے ہنسی مذاق اور کھیل کود سے مخلوط نہ کرو، کیونکہ اس طرح دل کی دنیا سونی ہو جاتی ہے[2]

فرماتے تھے کہ علم حدیث کا حصول سب سے افضل کام ہے، بشرطیکہ نیت درست ہو، دوسری

---

[1] صفوۃ الصفوہ ج ۳ ص ۸۸ [2] حلیۃ الاولیاء ج ۶ ص ۳۶۸۔

روایت ہے کہ لوگوں کے لیے حدیث سے زیادہ کوئی علم مفید نہیں ہے۔[1] فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں علم کی ذمہ داری سے اس صورت میں بھی نجات پا جاؤں کہ نہ وہ میرے خلاف حجت بنے اور نہ میرے لیے شفیع تو میں اسے پسند کروں گا، مجھے کسی عمل سے اتنا خوف نہیں جتنا کہ حدیث (کی روایت) سے (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۴)

قناعت وسادگی | نہایت سادہ متواضع اور قناعت پسندانہ زندگی گذارتے تھے، اوپر ذکر آچکا ہے کہ ان کا ذریعۂ معاش صرف ان کے چچا کی ایک جائداد تھی، انھوں نے زندگی بھر گھر کے اوپر ایک پیسہ خرچ نہیں کیا، لباس بھی نہایت سادہ پہنتے تھے، علی بن ثابت کہتے ہیں، کہ ایک مرتبہ مکہ کے راستہ میں مجھ سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان کی ہر چیز کی قیمت کا اندازہ لگایا تو دو تین درہم سے زیادہ نہیں تھی،[2] وہ مجلس میں بیٹھتے تھے، تو صدر نشین بن کر نہیں بلکہ غایت تواضع میں دیوار کے ایک کنارے سے ٹیک لگا کر اکڑوں بیٹھتے تھے،[3] خود بھی فقر و فاقہ کی زندگی گذارتے تھے، اور ان کی مجلس میں اہل فقر ہی کی عزت تھی، ارباب دولت کی ان کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں تھی، محمد بن عبدالوہاب کہتے ہیں کہ

ما رایت الفقر قط اعز و لا ارفع منہ فی مجلس سفیان و لا رایت الغنی اذل منہ فی مجلس سفیان۔[4]	میں نے فقر کو امام سفیان کی مجلس سے زیادہ معزز اور بلند نہیں دیکھا اور غنا یعنی دولت و خوشحالی کو ان کی مجلس سے زیادہ کہیں ذلیل نہیں دیکھا۔

ان کے ان ہی علمی و عملی اوصاف کی بنا پر امام شعبہ جیسے امام وقت فرماتے تھے کہ

ان سفیان ساد الناس بالعلم و الورع۔[5]	سفیان نے اپنے علم و زہد کے ذریعہ لوگوں پر سیادت کی۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۴۔ [2] تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۶۲ [3] صفوۃ الصفوۃ ج ۳ ص ۸۳۔
[4] تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۶۲ [5] ایضاً۔

حق گوئی اور امراء و سلاطین سے بے تعلقی

خلفاء اور امراء سے ہمیشہ بے تعلق رہے، ان کے سامنے عہدۂ قضا بھی پیش کیا گیا، مگر انھون نے قبول نہین کیا، حق کے اظہار کا جب بھی موقع آیا تو اس سے باز نہین رہے، وہ نہ صرف یہ کہ خود امراء و سلاطین سے دور رہتے تھے۔ بلکہ اپنے تعلق کے لوگون کو بھی اس سے روکتے تھے، ایک شاگرد کو انھون نے ایک نصیحت آمیز خط لکھا، جس مین بہت سی باتون کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا،

میرے بھائی! امراء سے قرب اور ان سے میل جول نہ رکھنا، تم سے کہا جائے گا کہ لوگون کی سفارش کیجیے، مظلوم کی دادرسی اور ظلم کو ہٹانے کے لیے ایسا کرنا چاہیئے تو یہ ابلیس کا فریب ہے، ان باتون کو علماء نے ان کے قرب اور دنیا کمانے کا زینہ بنا لیا ہے، فرماتے تھے کہ اگر تم دیکھو کہ کوئی کسی بادشاہ سے چمٹا ہے، تو سمجھ لو کہ وہ چور ہے اور اگر دیکھو کہ امیرون کے دروازہ کا چکر کاٹتا ہے، تو وہ ریاکار ہے[1]

ایک بار ایک شخص کو امراء سے خلاملا رکھنے پر تنبیہ کی تو وہ بولا کہ مین بچون کی وجہ سے مجبور ہون، فرمایا کہ ذرا اس شخص کو دیکھو، یہ کہتا ہے کہ جب وہ خدا کی نافرمانی کرے گا تو خدا اس کے بال بچون کو رزق دے گا۔ اور جب اس کی اطاعت کرے گا تو وہ اسکے بال بچوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دے گا،

(طبقات جلد ۶ صفحہ ۲۶۱)

یہ ان کا قال ہی نہین تھا۔ بلکہ حال بھی تھا کبھی اپنی ضرورت کے لیے کسی خلیفہ یا امیر سے ملنے نہین گئے، اور نہ اون کا غیر معمولی اعزاز و اکرام کیا، ایک بار منصور سے مسجد حرام مین مڈبھیڑ ہو گئی، اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اور کعبہ کی طرف ان کا رخ کر کے کہا کہ

قسم ہے، اس عمارت (کعبہ) کی مجھے آپ نے کیسا آدمی پایا۔

---

[1] طبقات الکبریٰ شعرانی ج ۱ ص ۲۲ ۔

یہ وقت بڑا نازک تھا۔ مگر امام نے بڑی جرأت سے اپنے دل کی بات کہہ دی فرمایا کہ۔

کعبہ کے رب کی قسم، میں نے تجھ سے بدترین آدمی نہیں پایا۔

غالباً اسی حج کے موقع کا واقعہ ہے کہ انھوں نے سلیمان خواص سے کہا کہ چلو منصور کو نصیحت کریں، اگر وہ ہماری باتیں مان گیا تو اس سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچے گا، منصور اس وقت منیٰ میں تھا امام سفیان جب پہنچے تو اس نے اپنے قریب بلا کر بٹھانا چاہا مگر قریب جانے کے بجائے فرمایا کہ میں اس چیز پر کیسے قدم رکھ سکتا ہوں جو نہ میری ملکیت ہے، اور نہ آپ کی، منصور نے غلام کو حکم دیا کہ قالین و فرش اٹھا دے، سفیان آگے بڑھے اور منصور کے روبرو زمین پر بیٹھ گئے، اور بیٹھتے ہوئے یہ آیت پڑھی مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ (اسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی میں پھر واپس کریں گے۔ اور پھر اسی سے دوبارہ اٹھائیں گے۔) یہ آیت سن کر منصور کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں، سفیان نے بغیر اجازت طلب کیے ہوئے اس کو مزید نصیحت شروع فرما دی، اور لہجہ اس قدر تیز ہو گیا کہ منصور کے حاجب نے کہا کہ اے شخص! تیری جان کی خیر نہیں ہے مگر انھوں نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی اور اپنی گفتگو جاری رکھی[1]۔

عباسی خلفاء میں منصور کی خود رائی اور جبروتشدد ضرب المثل ہے وہ اپنے مزاج اور رائے کے خلاف کوئی بات سننا پسند نہیں کر سکتا تھا اسی جرم میں اس نے امام ابو حنیفہ اور امام مالک جیسے برگزیدہ لوگوں کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا جو معمولی انسانوں کے ساتھ بھی ہم روا نہیں رکھ سکتے، یہ واقعات ان ائمہ کے سامنے تھے، مگر اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ امام اوزاعی اور امام سفیان ثوری اسکو نصیحت ہی نہیں بلکہ اس کے اوپر سخت سے سخت تنقید کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا ملاقاتوں کا ذکر مختلف مورخین اور تذکرہ نویسوں نے کیا ہے، لیکن ان سے یہ اندازہ ہوتا

---

[1] اس کے آگے کی گفتگو، راقم مہدی سے متعلق سمجھتا ہے، اسی لیے اس کا ذکر مہدی سے ان کے تعلقات کے ضمن میں کیا جا

نہیں ہوتا کہ منصور ان سے کچھ ناراض ہوا، مگر بعض دوسرے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ منصور ناراض ہوگیا تھا اور جب وہ آخری حج کے لیے بغداد سے روانہ ہوا تو مکہ پہنچنے سے پہلے ہی یہ حکم جاری کر دیا تھا کہ ان کو پھانسی دیدی جائے، مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا، چونکہ ان واقعات کا ذکر اہل تذکرہ نے بالکل ہی غیر مرتب اور بغیر کسی تاریخی ترتیب کے کیا ہے، اس لیے ان میں تاریخی ترتیب قائم کرنا مشکل ہے۔ تاہم راقم ان واقعات سے جو ترتیب قائم کر سکا ہے، وہ پیش کر رہا ہے۔

ابتدا میں منصور، امام سفیان کی نصیحتوں اور تنقیدوں کو یا تو اس لیے برداشت کرتا رہا، کہ شاید اس طرح اس کی طرف کچھ مائل ہو جائیں گے، لیکن جب وہ اس طرف سے مایوس ہو گیا ہو تو اس نے سختی شروع کی ہو[1]،

اس بات کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے۔

مفضل بن مہلب بیان کرتے ہیں، کہ میں امام سفیان کے ساتھ حج کے لیے گیا۔ جب ہم لوگ مکہ پہنچے تو وہاں امام اوزاعی سے ملاقات ہوئی، ہم سب لوگ گھر میں بیٹھے تھے، کہ عبد الصمد بن علی الہاشمی نے جو اس سال حج کے موسم میں منصور کی طرف سے امیر بنا کر بھیجا گیا تھا، دروازہ کھٹکھٹایا، ہم نے پوچھا کون؟ بولا امیر حج، یہ سن کر امام سفیان تو اٹھ کر الگ چلے گیے، اور امام اوزاعی نے اس کا استقبال کیا، اس نے پہلے امام اوزاعی کا نام پوچھا تو انھوں نے فرمایا مجھے ابو عمرو الاوزاعی کہتے ہیں، اس نے کہا اللہ تعالیٰ آپ کو صحیح سلامت رکھے، آپکے جو خطوط بھی ہمارے پاس آتے ہیں ہم ان کی تعمیل کرتے ہیں، پھر اس نے امام سفیان کے بارے میں پوچھا تو فرمایا، وہ اندر چلے گیے ہیں پھر امام اوزاعی ان کے پاس گیے اور فرمایا کہ یہ شخص صرف آپ ہی سے ملنے آیا ہے، امام سفیان باہر نکلے، اور سلام کیا اور مزاج پوچھا عبد الصمد بولا ابو عبد اللہ! میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ سے مناسک حج کے مسائل

---

[1] جیساکہ وہ امام ابو حنیفہ اور امام مالک کے ساتھ کر چکا تھا۔

لکھ لوں، فرمایا کہ میں اس سے زیادہ مفید بات تم کو کیوں نہ بتاؤں، بولا وہ کیا فرمایا تم اس عہدہ سے دست بردار ہو جاؤ، بولا امیر المومنین کے ساتھ میں یہ معاملہ کیسے کرسکتا ہوں، میری ہمت نہیں پڑتی، فرمایا اگر تم خدا کے لیے ایسا کرو گے تو خدا تعالے منصور سے تمھاری حفاظت کرے گا، امام اوزاعی نے بات کاٹتے ہوئے فرمایا کہ ابو عبد اللہ یہ قریشی لوگ ہیں، یہ ہم سے اوسی وقت راضی ہو سکتے ہیں، جب ان کے حسب حیثیت ان کا اعزاز واکرام کیا جائے۔ امام سفیان نے فرمایا کہ ابو عمرو ہم ان کو سزا دے کر یا مار پیٹ کر درست کرنے کی تو طاقت نہیں رکھتے اس لیے اس طریقہ سے ہم ان کی تنبیہ وتادیب کرتے ہیں، مفضل کہتے ہیں کہ امام اوزاعی نے فرمایا کہ اب ہم کو یہاں سے چل دینا چاہیے، مجھے خطرہ ہے کہ یہ ابھی اپنے کارندوں کو بھیجکر ہماری گردنوں میں رسی ڈالدے گا، اور امام سفیان کو اس کی کوئی پروا نہیں ہے[1]۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ منصور ابھی تک ان سے اتنا ناراض نہیں ہوا تھا کہ ان کی گرفتاری اور قتل کا حکم دیتا ورنہ عبد الصمد ان سے علی الاعلان اس نیازمندی کے ساتھ نہ ملتا، البتہ اس گفتگو کے بعد جیسا کہ امام اوزاعی نے فرمایا یہ اندازہ ہو گیا تھا۔ کہ اب ان کی جان کی خیر نہیں ہے۔

یہ واقعہ غالبا ۱۵۸ھ سے پہلے کا ہے اس لئے کہ ابن سعد اور طبری کا بیان ہے کہ ۱۵۸ھ میں منصور نے انکو گرفتار اور قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور یہ بھی تمام تذکروں ہے کہ جس سال اس نے ان کو قتل کرنے کا حکم دیا، اسی سال اس کا انتقال ہوا، اور اس کے انتقال کا سنہ بھی ۱۵۸ھ ہی ہے کیونکہ جس سال انکے قتل کا اس نے حکم دیا تھا، وہ خود مکہ آنے والا تھا، جب وہ آنے والا تھا تو دوسرے کو امیر حج کیوں مقرر کرتا۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ امیر عبد الصمد کی گفتگو کے بعد جب وہ ان کی معاونت سے بالکل مایوس ہو چکا ہے۔ تب اس نے یہ قدم اٹھایا، گرفتاری اور ارادۂ قتل کی تفصیل یہ ہے۔

---

[1] یہ پورا بیان خطیب بغدادی کا ہے، ممکن ہے، امام اوزاعی نے کسی خاص وجہ سے ایسا فرمایا ہو۔ ورنہ ان کی زندگی خود اس طرح کے جرأت آمیز خطر واقعات سے پر ہے۔

ابن سعد کا بیان ہے کہ ۱۵۸ھ میں منصور نے مکہ کے امیر کو لکھا کہ سفیان اور چند دیگر اصحاب کو گرفتار کرکے دربار خلافت میں بھیج دیا جائے، ابراہیم نے امام سفیان کو بلاکر دریافت کیا کہ وہ بغداد جانا چاہتے ہیں یا نہیں۔ انھوں نے صاف انکار کیا، ابراہیم کو غالباً ان سے کچھ تعلق خاطر تھا، اس لیے ان کو روپوش ہوجانے کا مشورہ دیا۔ وہ روپوش ہوگئے، اور اس نے دکھانے کے لئے ان کی روپوشی کا ڈھنڈورا پیٹ دیا، اور گرفتاری پر انعام بھی مقرر کردیا۔ طبری نے بھی یہ واقعہ لکھا ہے، مگر اس نے یہ لکھا ہے کہ اس نے انھیں گرفتار کرکے چھوڑ دیا جس سے منصور ابراہیم سے ناراض ہوگیا۔

غالباً منصور کو یہ علم ہوگیا ہوگا کہ امام سفیان مکہ ہی میں ہیں، اس نے جب وہ اسی سال حج کے ارادہ سے چلا تو یہ حکم بھی جاری کردیا کہ امام سفیان جہاں ملیں انکو اسکے مکہ پہنچنے سے پہلے پھانسی دے دی جائے،

خطیب کا بیان ہے کہ منصور جس وقت بغداد سے چلا اسی وقت یہ حکم دے دیا کہ سفیان جہاں ملیں ان کو گرفتار کرکے پھانسی دے دی جائے، چنانچہ یہاں ان کی پھانسی کی پوری تیاری مکمل ہوگئی۔ فضیل بن عیاض اور ابن عیینہ جو اس وقت ان کے پاس موجود تھے، ان کو جب خبر ملی تو انھوں نے امام سے کہا ابوعبداللہ! ایسا نہ ہو کہ دشمن ہم پر شماتت کریں اور ہنسیں، چنانچہ امام اسی وقت کعبہ میں پہنچے اور کعبہ کا پردہ پکڑ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ منصور کعبہ میں داخل نہ ہونے پائے، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کرلی اور وہ مکہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی بیر میمون پہنچکر انتقال کرگیا، جب امام سفیان کو لوگوں نے یہ خبر پہنچائی تو وہ کچھ نہیں بولے۔[۲]

تعجب ہے کہ اس اہم واقعہ کا ذکر تمام تذکرہ نگار کرتے ہیں مگر اس کے کسی متعین سبب پر

---

[۱] خطیب کے علاوہ بھی دوسرے تذکرہ نگاروں نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، [۲] یہ واقعہ خطیب اور ابن عماد دونوں کے بیان کو سامنے رکھ کر نقل کیا ہے،

کلام نہین کرتے کہ اتنا بڑا قدم منصور نے کیون اٹھایا، جب کہ اس طرح کا قدم اس نے امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے خلاف بھی نہین اٹھایا تھا حالانکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے علی الاعلان زید ابن علی وغیرہ کی حمایت کی تھی، اور امام مالک بھی طلاق مکرہ کے پردہ مین جبریہ بیعت خلافت کی تردید کرچکے تھے، اس سلسلہ مین ابن عماد نے صرف اتنا لکھا ہے کہ

کان سفیان کثیر الحط علی المنصور لظلمہ فھم بہ دار قتلہ فما امھلہ اللہ [1]	امام سفیان منصور کے اس کے ظلم و تشدد کی وجہ سے اس پر بہت سخت تنقید کیا کرتے تھے، اس لئے وہ ان سے ناراض ہوگیا اور ان کے قتل کا ارادہ کر لیا، مگر خدا نے اسے اس کا موقع نہین دیا۔

مہدی اور امام سفیان منصور کے بعد مہدی تخت نشین ہوا، امام سفیان نے ابتدا میں اسکے ساتھ بھی اپنا وہی طرز عمل رکھا جو منصور کے ساتھ تھا۔ اور مہدی بھی ان کی تمام تنقیدون اور نصیحتون کو انگیز کرتا رہا لیکن آخر مین وہ بھی منصور کے نقش قدم پر چل پڑا،

مہدی سے ان کی ملاقات اور اس کی ناراضگی کے سلسلہ مین دو واقعے تذکرون مین منقول ہیں، ایک یہ کہ مہدی خلیفہ ہوا تو امام سفیان اس کے دربار میں گیے، اور آداب شاہی کا لحاظ کرتے ہوے عام مسلمانون کی طرح اس کو بھی سلام کیا، مہدی نے بڑی خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا، اور کہا کہ آپ ہم سے ادھر ادھر بھاگتے پھرتے ہیں، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم آپ کو کوئی گزند پہنچانا چاہین تو نہین پہنچا سکتے، آپ کو اس بات سے ڈرنا چاہیے، کہ ہم آپ کے خلاف کوئی قدم خواہش نفس سے مغلوب ہوکر نہ اٹھا ڈالین، امام سفیان نے انتہائی بے نیازی اور جرائت سے فرمایا کہ

---

[1] شذرات ج ۱ ص ۲۵۰۔

ہان اگر آپ اس وقت میرے خلاف کوئی قدم اٹھا سکتے ہیں تو آپ کے اوپر بھی ایک عادل اور مالک قدیر ہے، جو حق وباطل کے درمیان فیصلہ کر کے رہے گا۔

ربیع حاجب جو اس وقت مہدی کی پشت پر تلوار لیے کھڑا تھا، اور جس کو ان کے عامیانہ آداب اور گفتگو سخت ناپسند ہو رہی تھی۔ فوراً بولا میرے آقا! اس جاہل یہ کو یہ مجال کہ آپ کے ساتھ اس طرح پیش آئے، اگر آپ حکم دیں تو اس کی گردن ماردوں، مہدی نے ربیع کو ڈانٹتے ہوئے کہا کہ کم بخت یہ اور ان کے جیسے حضرات لوگ تو یہی چاہتے ہیں کہ ہم ان کو قتل کر کے سعادت سے محروم ہو جائیں اور اپنا دامن شقاوت و کم بختی سے بھر لیں۔ اس کے بعد مہدی نے کہا کہ ان کو کوفہ کے عہدۂ قضا کا پروانہ عطا کرو، اور پروانہ میں یہ بھی لکھ دو کہ ان کے فیصلہ کی اپیل نہیں ہو سکتی، چنانچہ ان کو پورے اختیارات ساتھ پروانہ دیدیا گیا۔ وہ پروانہ لے کر باہر نکلے اور نکلتے ہی اس کو دجلہ کے نذر کر دیا، اور روپوش ہو گیے، اس نے تمام ممالک اسلامیہ میں ان کی تلاش کرائی، مگر جب وہ بالکل مایوس ہو گیا تو ان کی جگہ شریک بن عبداللہ کو قاضی مقرر کر دیا، اسی واقعہ کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا گیا ہے۔

تحرز سفیان وفر بدینہ امسی شریک مرصدا للدراھم

سفیان نے اس سے گریز کیا اور اپنا دین بچا کر بھاگ نکلے، اور شریک روپیوں کی کمین گاہ بن گئے۔

اس واقعہ سے ان لوگوں کے بیان کی تردید ہو جاتی ہے جو یہ لکھتے ہیں کہ امام سفیان نے آخری بار کوفہ کو ۱۵۵ھ میں یا اس سے پہلے چھوڑا اس لیے کہ مہدی ۱۵۸ھ میں تخت نشین ہوا، اور اس کی امام سفیان سے یہ ملاقات بغداد ہی میں ہوئی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ ۱۵۸ھ کے بعد انھوں نے کوفہ چھوڑا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عہدۂ قضا قبول کرنے کے لیے وہ مصر تو تھا، مگر ان کے روپوش ہو جانے پر اتنا ناراض نہیں ہوا تھا

---

[1] اس واقعہ کا ذکر ابن خلکان اور شذرات الذہب نے کیا ہے، اور بعض لوگ اس کو منصور کے زمانہ کا واقعہ لکھتے ہیں، مگر راقم کے نزدیک یہی زیادہ صحیح ہے،

کہ ان کی جان کے پیچھے پڑجاتا۔ اس لیے کہ اس کے کسی لفظ سے شدید ناراضگی کا پتہ نہین چلتا، اور یہ بات اس لیے بھی قرین قیاس ہے کہ مہدی سے انکی دو ایک اور ملاقاتون کا ذکر تذکرون مین ملتا ہے، شعرانی نے طبقات الکبری مین لکھا ہے، کہ وہ مہدی کے سامنے بارہا کہہ چکے تھے کہ اپنے ان حاشیہ نشینون اور جو لوگ اپنی ضرورتیں لے کر آپ کے پاس آتے ہیں، ان سے ہوشیار رہیے، کیونکہ انہی کے ہاتھون آپ کی تباہی ہے۔ یہ آپ کا کھاتے ہیں، آپ سے پیسہ وصول کرتے ہیں، اور آپ کو فریب دیتے ہیں، اور منہ پر آپ کے وہ اوصاف بیان کرتے ہیں، جو آپ میں نہین ہیں۔[1]

مہدی سے اپنی آخری ملاقات کا ذکر انھون نے خود کیا ہے، فرماتے ہیں کہ میں ایک بار مہدی کے پاس گیا، سلام کے بعد اس نے مزاج پرسی کی، مین نے بیٹھتے ہی اس سے کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی نے حج کیا تو صرف ۱۶[2] دینار صرف کیے اور آپ نے پورا بیت المال خالی کر دیا۔ مہدی نے کہا کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی طرح ہو جاؤن، فرمایا کہ ہاں مجھ سے کچھ بلند (معیار) رہیے مگر اپنی موجودہ (فضول خرچی کی) حالت سے کچھ نیچے بھی اترنا چاہیے، اسی درمیان مین اس کے وزیر عبد اللہ نے کہا کہ ابو عبد اللہ! آپ کے جو خطوط ہمارے پاس آتے ہیں، ہم ان کی فوراً تعمیل کرتے ہیں[3]، امام سفیان نے پوچھا کہ یہ کون ہیں۔ مہدی نے کہا میرے وزیر ہیں۔ امام نے کہا کہ اس سے بچیے یہ نہایت جھوٹا آدمی ہے، پھر اس سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں نے تمھین کب کوئی خط لکھا ہے؟ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے، مہدی نے کہا ابو عبد اللہ! اتنی جلدی کیا ہے، بولے

---

[1] طبقات جلد ا صفحہ ۴۱) [2] تذکرۃ الحفاظ مین ۱۲ دینار ہے، [3] غالباً اس نے یہ ظاہر کرنے کے لئے یہ بات کہی تھی، . . . .

. . . . اپنی ضروریات مین تو ہم سے مدد لیتے ہیں۔ اور پھر اعتراض کرتے ہیں۔

ابھی آتا ہون، انھون نے چلتے وقت اپنے جوتے چھوڑ دیئے تھے، تھوڑی دیر کے بعد واپس آئے، اور جوتے پہن کر باہر ہی سے واپس چلے گئے (غالباً جب دیر ہوئی تو) مہدی نے پوچھا کہ واپس آنے کو کہہ گئے تھے، آئے نہین، لوگون نے بتایا کہ ہان واپس تو آئے تھے، مگر اپنے جوتے پہن کر رخصت ہوگئے، ان کی اس بے نیازی کو اس نے اپنی توہین سمجھی اور سخت ناراض ہوا، اور یہ اعلان کر دیا کہ

قد آمن الناس الا سفیان   سفیان کے علاوہ ہر شخص مامون ہے۔

اس کے بعد وہ روپوش ہوگئے، کچھ دن تو مکہ مین رہے، پھر بصرہ چلے گئے، اور وہیں وفات پائی۔[1]

غرض یہ کہ امام سفیان خلفا کی طلب پر یا کسی دینی ضرورت سے خلفاء سے کبھی کبھار مل لیتے تھے، مگر نہ تو انھون نے کوئی عہدہ قبول کیا۔ اور نہ کبھی اپنی کوئی ذاتی غرض ان کے پاس لے گیے، بلکہ جب بھی ان سے ملے تو ان کو نصیحت کی، ان کی خواہش یہ بھی تھی، کہ دوسرے لوگ بھی خلفاء سے اسی حیثیت سے ملیں، کسی نے ایک بار ان سے کہا کہ فلان شخص مہدی کے پاس جاتا ہے، مگر اس کا دعویٰ ہے کہ وہ اس کی کمزوریوں اور برائیون سے دور رہتا ہے، فرمایا کہ وہ جھوٹ کہتا ہے۔ مہدی اپنے لباس، کھانے پینے، خدم وحشم . . . . . سواریون میں اسراف اور فضول خرچی کرتا ہے، کیا اس نے ایک دن بھی مہدی کو اس پر ٹوکا، کہ مسلمانون کے بیت المال مین اس طرح کا اسراف اس کے لیے صحیح نہین ہے۔[2]

شہرت سے نفرت | بااین ہمہ علم وفضل شہرت اور نیازمندی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ فرماتے تھے، مین چاہتا ہون کہ ایسی جگہ چلا جاؤن جہان مجھے کوئی پہچانتا نہ ہو۔[3]

---

[1] تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۶۰ اس واقعہ کے پہلے ٹکڑے کو بعض لوگون نے منصور کے زمانہ کا واقعہ بتایا ہے مگر دونون واقعون کی تفصیلات میں بڑا فرق ہے، اس لیے ممکن ہے کہ دونون واقعے صحیح ہون، [2] طبقات الکبریٰ ج ۱ ص ۴۱ [3] ایضاً ص ۴۲۔

اوپر اون کی سیرت و کردار کی جو تفصیل کی گئی ہے، اس مین ان کے پورے مثنی ان کے معنوی شاگرد امام احمد بن حنبل تھے، انشاء اللہ ان کی زندگی کے خط و خال دوسرے حصہ میں پیش کیے جائیں گے۔

وفات | اوپر ذکر آچکا ہے، کہ مہدی کی ناراضگی کے بعد وہ مصر چلے گیے تھے، بصرہ مین ان کا قیام زیادہ تر یحییٰ بن سعید اور الہیثم بن منصور کے یہان تھا، مگر آخر میں وہ مشہور محدث عبدالرحمٰن بن مہدی کے مکان مین چلے آئے تھے، اسی غربت کدہ میں اس پیکر علم وعمل نے سنہ ۱۶۱ھ مین وفات پائی، امام ذہبی لکھتے ہیں۔

مات فی البصرۃ فی الاختفاء	ان کا انتقال بصرہ مین مہدی سے روپوشی
من المہدی فانہ کان قوالا	کی حالت مین ہوا، روپوشی کی وجہ یہ ہوئی کہ
بالحق شدید الانکار علیہ[1]،	وہ غیر معمولی طور پر حق گو واقع ہوئے تھے، اور اس کے اوپر تنقید کرتے تھے، (اور وہ ناراض ہوگیا تھا)

ابن مہدی ان کی وفات کا حال بیان کرتے ہیں، کہ جس رات ان کی وفات ہوئی، اس رات انھون نے نماز کے لیے کئی بار وضو کیا، جب صبح ہونے لگی تو مجھ سے کہا کہ، ابن مہدی میرا چہرہ زمین پر رکھدو، اب میں کچھ دیر کا مہمان ہون، یہ جملہ بھی بار بار زبان پر تھا کہ موت کی تکلیف کس قدر سخت ہوتی ہے، ابن مہدی لپکے ہوئے حماد بن زید کو اطلاع کرنے گیے، کہ راستہ مین ان سے ملاقات ہوگئی، وہ اپنے اصحاب کے ساتھ خود ہی آرہے تھے، ابو سلمہ اور حماد ان کے سرہانے کھڑے تھے، حماد نے کہا کہ آپ کو خوشخبری ہو کہ آپ جس بات سے ڈرتے تھے، اس سے نجات پاگئے، غالباً گرفتاری وقتل کی طرف اشارہ ہے، اور اب اپنے رب غفور کے حضور مین جارہے ہیں، ابو سلمہ سے مخاطب

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۶۔

ہو کر فرمایا کیا تم کو امید ہے کہ مجھ جیسے آدمی کی مغفرت ہو جائے گی، ابو سلمہ نے کہا ہاں کیا تعجب ہے، اس سے ان پر ایک بشاشت طاری ہوگئی، غالباً اس کے بعد ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے[1]

وفات سے کچھ دیر پہلے آپ نے دریافت فرمایا تھا کہ یہاں میرے وطن کے بھی کچھ لوگ موجود ہیں لوگوں نے نگاہ دوڑائی تو دو ممتاز آدمی نظر پڑے ایک عبد الرحمٰن بن ملک، دوسرے حسن بن عیاش، چنانچہ عیاش کے سپرد اپنا ترکہ کیا اور عبد الرحمٰن بن عبد الملک کو نماز جنازہ پڑھانے کی وصیت کی جب جنازہ رکھا گیا، اور معلوم ہوا کہ نماز جنازہ عبد الرحمٰن بن عبد الملک پڑھائیں گے، تو بعض لوگوں نے اس پر سے اعتراض کیا کہ ان کا سفیان کے خانوادہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن جب معلوم ہوا کہ ان کی وصیت ہے، تو سب لوگوں نے بخوشی نماز پڑھانے کی ان کو اجازت دی[2]

سمعانی کے بیان کے مطابق ان کو قبرستان بنو کلیب میں عشا کے وقت دفن کیا گیا، (ان کا انتقال صبح ہی کو ہو چکا تھا۔ غالباً حکومت کے خوف سے رات میں ان کو دفن کیا گیا)

اولاد ابن خلکان نے لکھا ہے کہ ولم یعقب کوئی اولاد نہیں چھوڑی، ابن سعد وغیرہ کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے ایک صاحبزادے تھے، جس سے وہ بیحد مانوس تھے، لیکن وہ ان کی زندگی ہی میں انتقال کر گئے[3] جس کا ان کو شدید رنج ہوا۔

تصنیفات اپنی کوئی مادی یادگار تو نہیں چھوڑی مگر تحریری صورت میں اپنی معنوی یادگاریں بہت سی چھوڑ گئے، خطیب بغدادی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی کتابیں اپنی زندگی ہی میں دریا برد کر دی تھیں، اور ایک روایت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کوفہ سے نکلے تو اپنی تمام کتابیں چھوڑ گئے، بصرہ پہنچکر انھوں نے اپنے بعض اصحاب سے فرمائش کی، کہ وہ کوفہ جاکر ان کی کتابیں لے آئیں، مگر خلیفہ کے خوف سے کسی نے ہمت نہیں کی، چنانچہ انھوں نے اپنے ایک شاگرد سے جب یہ فرمائش کی، تو

---

[1] صفوۃ الصفوہ ج ۳ ص ۸۸ [2] تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۷۰ [3] ابن سعد ج ۶ ص ۲۵۔

بولے کہ میں آپ کے پاس اپنی آمد و رفت کی وجہ سے اپنی جان کو ڈرتا رہتا ہوں یہ کیسے ممکن ہے کہ میں کوفہ جاکر آپ کی کتابیں لاؤں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ انھوں نے خوف سے اپنی کتابیں پھینک دی تھیں، لیکن بصرہ پہنچکر ان کو اطمینان ہوا، تو منگوالیں، اور پھر ان کی تحدیث کی، ان کتابوں کی ضخامت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ عبداللہ بن عبداللہ اور یزید بن توبہ کا جنھوں نے یہ ذخیرہ جمع کیا تھا۔ بیان ہے۔

فاخرجنا تسع قمطرات کل واحد الی ھنا واشار الی اسفل من صدرہ

(تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۶۱)

ہم نے ان کتابوں کو اکھٹا کیا تو وہ نو بکس نہیں، اور ہر بکس سینہ کے قریب قریب اونچا تھا۔

اس سے ابن قتیبہ کے اس بیان کی تردید ہو جاتی ہے کہ انھوں نے موت کے وقت اپنی تمام کتابیں نذر آتش کردی تھیں۔

مگر افسوس ہے کہ اس ذخیرہ میں سے صرف دو چار مختصر کتابوں کے علاوہ اس وقت ان کے موجود ہونے کا علم نہیں ہے، مگر جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ چوتھی صدی تک مبتعین موجود تھے، اس لئے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ چوتھی صدی تک کم از کم انکی فقہی کتابیں ضرور متداول رہی ہوں گی،

مولانا امتیاز علی صاحب عرشی نے ان کی تصنیفات کی جو تفصیل اپنے مضمون مطبوعہ معارف ۱۹۳۵ء میں دی ہے اسکو ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

(۱) الجامع الکبیر فی الفقہ

یہ کتاب ابو بکر محمد بن ابی الخیر الاموی نے چوتھی صدی ہجری میں اور علامہ محمد عابد بن احمد علی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لے ابن ندیم ص ۲۲۵

سندی نے تیرہوین صدی ہجری کے نصف اول میں پڑھی تھی[۱]۔

۲۔ الجامع الصغیر۔

۳۔ الکتاب الفرائض، یہ کتاب بھی محمد بن عابد سندی نے پڑھی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ کتاب بھی ۱۳ وین صدی تک موجود تھی۔

۴۔ کتاب التفسیر یہ کتاب بھی محمد عابد سندی نے پڑھی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب بھی ۱۳ وین صدی تک اہل علم میں متداول رہی ہے، اس تفسیر کا ایک حصہ جو مخطوطہ کتب خانہ رام پور میں موجود ہے، جسے غالباً مولانا امتیاز علی صاحب عرشی نے طبع بھی کرادیا ہے، راقم کی نظر سے یہ درمکنون نہین گذرا ہے۔

عقیدہ: پہلی صدی ہجری میں بعض سیاسی اختلافات کی بنا پر شیعیت و خارجیت پیدا ہوئی، لیکن پہلی صدی کے آخر اور دوسری صدی کے شروع میں فلسفہ، شیعیت اور خارجیت کے بطن سے بعض اور فرقے بھی پیدا ہوئے، جن میں معتزلہ، جہمیہ، قدریہ، مرجیہ وغیرہ بہت زیادہ مشہور ہوئے، ان فرقون کی اصل گمراہی یہ تھی کہ انھون نے ذات وصفات کے بارے میں بیجا موشگافیان شروع کردی تھیں، اور مسئلہ کے ایک ہی پہلو پر ان میں اصرار اور غلو پیدا ہوگیا تھا جس کی وجہ سے شریعت کی سادہ تعلیم اور اس کا دامن اعتدال داغدار ہو رہا تھا۔ اس بنا پر علمائے اہل حق نے ان خیالات کی تردید کی، اور ان کی اس گمراہی پر انھین متنبہ تو کیا، مگر کسی نے ان کی قطعی تکفیر نہین کی، ان فرقون اور ان کے پیدا کردہ مسائل کا چرچا زیادہ تر کوفہ اور بصرہ میں رہتا تھا۔ گو اس سے ممالک اسلامیہ کے دوسرے مقامات کے علما بھی متاثر ہوتے تھے، مگر ان کا سب سے زیادہ مقابلہ کوفہ، بغداد اور بصرہ کے علماء کو کرنا پڑتا تھا امام سفیان بھی چونکہ یہین کے باشندے تھے اور یہین ان کی

---

[۱] حصر الشارد مخطوطہ حرف میم تصنیف ۱۲۴۰ھ

مجلس درس تھی، اس لیے ان سے بھی ان فرقوں کے خیالات کے بارے میں سوال کیے جاتے تھے۔ خاص طور پر جن مسائل کے بارے میں ان سے سوال کیے گیے وہ یہ ہیں خلق قرآن، ایمان کی زیادتی و کمی ایمان صرف یقین کا نام ہے، یا اس میں عمل بھی شامل ہے، وغیرہ، چنانچہ ان تمام مسائل کے بارے میں اپنی رائے انھوں نے اپنے ایک شاگرد جریر بن شعیب کو لکھا دی تھی۔ انکی اس تحریر کا خلاصہ یہ ہے،

بسم اللہ الرحمن الرحیم، قرآن خدا کا کلام ہے، اور غیر مخلوق ہے۔ خدا کی ذات ہی اس کا مبدا اور معاد ہے، جو اس کے خلاف کہتا ہے، وہ کفر کی بات کہتا ہے۔

ایمان، قول عمل اور نیت کے مجموعے کا نام ہے، اور اس میں کمی وزیادتی بھی ہوتی ہے، اور دیکھو شیخین یعنی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو مقدم رکھنا، اس کے بعد فرمایا کہ شعیب! میں نے جو کچھ لکھایا ہے، وہ تمھیں اسی وقت فائدہ پہنچائے گا جب تم ان باتوں کو بھی صحیح سمجھو وہ باتیں یہ ہیں:-

(۱) موزوں پر مسح کرنا (۲) بسم اللہ الرحمن الرحیم کو بلند آواز سے پڑھنے کے مقابلہ میں آہستہ پڑھنا زیادہ بہتر ہے (۳) تقدیر پر ایمان رکھنا (۴) ہر نیک و بد کے پیچھے نماز پڑھ لینا (۵) جہاد قیامت تک جاری رہے گا (۶) حکومت کے جھنڈے کے نیچے رہنا خواہ حکومت ظالمانہ ہو یا عادلانہ، شعیب نے یہاں سوال کیا کہ کیا تمام نمازیں ہم ان کے پیچھے پڑھ لیا کریں فرمایا نہیں صرف جمعہ اور عیدین جن کے پیچھے بھی مل جائیں پڑھ لو مگر دوسری نمازوں میں تمھیں اختیار ہے، کہ جس پر پورا اعتماد ہو اور اس کے بارے میں تم کو علم ہو کہ یہ اہل سنت میں ہے، اسی کے پیچھے پڑھو، جب تم قیامت میں خدا کے روبرو حاضر ہونا اور تم سے سوال ہو تو عرض کر دینا کہ مجھے یہ باتیں سفیان نے بتائی ہیں۔ اور تم میرا معاملہ خدا پر چھوڑ دینا[1]

---

[1] تذکرۃ الحفاظ۔

عام محدثین صفات باری کے سلسلہ میں کسی قسم کی تاویل وتدقیق کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، مثلاً استوا، علی العرش، ید اللہ وجہ اللہ وغیرہ کی کیفیت معلوم کرنے اور ان کی مادی تحدید یا تردید کرنے کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، چنانچہ امام مالک کا جملہ ضرب المثل بن گیا ہے کہ استوا، علی العرش معلوم ہے، اور اسکی کیفیت مجہول ہے، اس پر ایمان واجب ہے، اور اس کے بارے میں سوال اور بحث ومباحثہ بدعت ہے، شہرستانی نے لکھا ہے کہ صفات باری کے بارے میں یہی روش امام سفیان، امام داؤد اور امام احمد بن حنبل وغیرہ کی بھی تھی،

اس نے لکھا ہے کہ چونکہ تمام سلف صالحین صفات الٰہی کو صفات خبریہ کہتے ہیں اور اسمین کوئی تاویل نہیں کرتے۔ اور معتزلہ بالکل ہی اس کی نفی کرتے ہیں، اس لیے سلف کو ہم صفاتیہ اور معتزلہ کو معطلہ کہتے ہیں۔ (جلد اصفحہ ۶۶ ترجمہ فارسی)

سفیان فرقہ مرجیہ کے سخت مخالف تھے، حتیٰ کہ ان کی نماز جنازہ تک نہین پڑھتے تھے، اسی طرح اہل نجوم کو بھی بری نظر سے دیکھتے تھے، اس وقت بغداد میں ایک مشہور منجم ماشاء اللہ نامی تھا، ایک بار اس سے ملاقات ہوئی تو فرمایا کہ ماشاء اللہ! تم زحل سے ڈرتے اور مشتری سے امید باندھتے ہو، اور مین زحل کے رب سے خوف کھاتا اور مشتری کے خالق سے آس لگاتا ہون، تم روزانہ صبح کو نچھتر دیکھتے ہو اور مین خدا سے استخارہ کرتا ہون، دیکھو ہم دونون میں کس قدر فرق ہے۔ ماشاء اللہ نے اعتراف کیا کہ سفیان کا عقیدہ اس کے عقیدہ سے بہتر ہے۔

زرین اقوال | امام سفیان کا حال اور قال دونون یکسان تھا۔ حال کی کچھ تفصیل آپ نے اوپر پڑھ لی، اب کچھ قال کے نمونے بھی ملاحظہ فرمائیے۔

علماء کا بگاڑ | فرمایا کہ جب علماء میں فساد اور بگاڑ پیدا ہو جائے تو ان کی اصلاح کون کر سکتا ہے

ل قفطی ص ۲۱۴۔

ان کا بگاڑ دنیا کی طرف ان کا میلان ہے، وہ دین کے طبیب ہیں، اور روپیہ پیسہ مرض ہے، تو جب طبیب خود ہی مرض کو پال لینے پر تل جائے تو اس کا علاج کون کر سکتا ہے۔

اگر مین جانتا کہ لوگ علم رضائے الٰہی کیلئے طلب کرتے ہیں تو خود انکے گھر جا کر انکو تعلیم دیتا لیکن لوگ اسلیے علم حاصل کرتے ہیں، کہ ان کو لوگوں مین مقبولیت حاصل ہو، اور حدثنا سفیان کہہ کر اپنی مجلس مین رونق پیدا کرین

اہل علم کی فضیلت | فرمایا کہ جب کوئی خدا سے تقویٰ اختیار کرنے کیلئے علم حاصل کرتا ہے تو اس جذبہ ہی کی وجہ سے دوسرون پر اس کو فضیلت ہوتی ہے علماء تین طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ عالم جو اللہ کو پہچانتا ہے، اور اس کے احکام و اوامر کو بھی، اسکی علامت یہ ہے کہ وہ خدا سے ڈرتا رہے اور اسکے اوامر اور حدود کا لحاظ کرتا ہو دوسرے عالم جو اللہ کو پہچانتا ہو مگر اسکے اوامر سے ناواقف ہو اس کی علامت یہ ہے کہ خدا سے ڈرتا تو ہو مگر اسکے اوامر کی اچھی طرح پروا نہ کرتا ہو تیسرے وہ عالم جو اوامر الٰہی سے تو واقف ہو مگر خدا کا علم اسے نہ ہو اسکی پہچان یہ ہے کہ وہ نہ خدا سے ڈرتا ہو اور نہ اسکے اوامر کی پرواہ کرتا ہو۔

زمانہ کی خرابی | فرمایا کہ مجھے گمان ہے کہ مین اس برے وقت زندہ نہین رہون گا، کہ جب زندون کا ذکر کیا جائے تو قلب مردہ ہو جائے، اور جب مردون کا ذکر کیا جائے تو قلب میں زندگی پیدا ہو جائے مقصد یہ تھا، کہ مسلمانان در گور او مسلمانی در کتاب کا زمانہ آنے سے پہلے ہی میری موت آجائے تو اچھا ہے

نصیحت پذیری | بڑے افسوس کے لہجہ مین فرماتے تھے کہ اے اللہ! جانورون کو جب چروا ہا ڈانٹتا ہے، تو اس ڈانٹ کا اس پر اثر پڑتا ہے، اور فوراً اپنی خواہش سے باز آجاتا ہے، لیکن میں تیری کتاب کی ہدایتون اور وعیدون کا اپنی خواہش نفس پر کوئی اثر نہیں دیکھتا۔

طالب علم | فرمایا کہ میں پسند کرتا ہون کہ علم دین کے طلب کرنے والے اچھے حال میں رہیں، اسلیے کہ اگر وہ محتاج اور ذلیل ہون گے تو ان کو آفتون اور لوگون کی زبان درازیون کا سب سے زیادہ سابقہ پڑیگا،

حلال کمائی | فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کسی نے نصیحت کی خواہش کی، تو فرمایا کہ انظر خبزک من این ہو، اس پر نظر رکھو کہ تمھاری روٹی کہان سے آتی ہے۔

شکایت | مریض کا اپنے کسی بھائی سے اپنا حال کہنا خدا کا شکوہ نہیں ہے۔

ائمۂ عدل، | فرمایا کہ ائمۂ عدل پانچ ہیں، خلفائے راشدین حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، اور عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہم اجمعین، اگر کوئی شخص ان کے علاوہ کسی کو اس فہرست میں داخل کرتا ہے تو وہ زیادتی کرتا ہے۔

دعوت، | فرمایا کہ اپنے اسی بھائی کی دعوت قبول کرو جس کا کھانا کھانے کے بعد تمھارے دل میں صلاح پیدا ہونے کی امید ہو،

رازق خدا ہے، | ایک دن امراء کے کسی درباری کو نصیحت کی اس نے کہا کیا کروں، اپنے بال بچوں کی وجہ سے ایسا کرتا ہوں، لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ذرہ اس شخص کو دیکھو اس کا گمان ہے کہ اگر وہ خدا کی نافرمانی کرے گا تو وہ اس کے اہل وعیال کو روزی دے گا، اور اگر اطاعت کرے گا تو وہ ان کو بے یار ومددگار چھوڑ دے گا۔

فرمایا کہ اہل وعیال والے بہت کم حرام اور مشتبہات سے بچتے ہیں اس پر ان کا عذر یہ ہوتا ہے کہ ہم اہل وعیال رکھتے ہیں۔

دنیا کی محبت | فرمایا کہ اگر کوئی بندہ تمام ماموارت کے ساتھ خدا کی عبادت کرے، مگر دنیا کی محبت میں بھی سرشار ہو، تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ علی رؤس الاشہاد فرمائے گا کہ فلاں بن فلاں نے ایسی چیز سے محبت کی، جو اللہ کو ناپسند تھی، تو یہ سن کر اس پر شدید شرمندگی کی کیفیت طاری ہو جائے گی۔

دولت سے بچنے کے لیے مال | فرمایا کہ میں دس ہزار درہم چھوڑ جاؤں اور اس پر میرا محاسبہ ہو، یہ چیز میرے لیے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں فقیر ہو کر لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کروں، اس لیے کہ اس سے پہلے مال کو ناپسند کیا جاتا تھا، مگر اب یہ مومن کی ڈھال ہے جو اس کو امراء و اہل دولت سے سوال کرنے کی ذلت سے محفوظ رکھتا ہے۔ (مشکوٰۃ)

عطیہ | وہ لوگوں کے عطیات واپس کر دیا کرتے تھے، اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں جان جاؤں کہ مجھ کو دے کر لوگ اس پر فخر نہ محسوس کریں گے تو میں ضرور ان کے عطیات لے لوں، اسی وجہ سے وہ بھوکے رہ جاتے تھے، مگر کبھی قرض نہیں لیتے تھے، فرماتے کہ لوگ اس کو چھپا نہیں پاتے اور خوش ہو کر کہنے لگتے ہیں کہ سفیان ثوری کل میرے یہاں قرض کے لیے آئے تھے۔

کلمۂ حق کا بلند کرنا سب سے افضل ہے | فرمایا کہ خراسان میں اذان دینا، مکہ کی مجاورت سے زیادہ افضل ہے۔

زہد کی حقیقت | فرماتے تھے کہ زہد فی الدنیا خواہش و تمنا کو کم کرنے کا نام ہے، موٹا جھوٹا پہننے، روکھا سوکھا کھانے یا عبا پوشی کا نام زہد نہیں ہے، فرمایا کہ بہت لوگ مال رکھتے ہوئے بھی زاہد ہوتے ہیں، اور بعض خالی ہاتھ اس کی محبت میں پڑے رہتے ہیں یعنی وہ ظاہر تو کرتے ہیں کہ وہ زاہد ہیں مگر ان کا دل دنیا میں پٹا ہوتا ہے۔

اپنی حقیقت | فرمایا کہ جب آدمی اپنے نفس کی حقیقت جان لے تو پھر اسکو کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

سفر کی رفاقت | فرمایا کہ تم اپنے سے زیادہ دولت مند اور بلند آدمی کے ساتھ سفر نہ کرو، کیونکہ اگر تم اسکے برابر خرچ کرو گے تو اس سے تم کو نقصان ہوگا، اور اگر وہ زیادہ خرچ کرے گا، تو تم کو اپنا غلام بنالے گا'

اہل علم کا حال | میں نے جب کسی اہل علم کی مخالفت کی تو جان کا خطرہ محسوس کیا، جب تم کو کسی اہل علم سے کوئی ضرورت ہو تو اس کا ذکر دوسرے اہل علم سے نہ کرو ورنہ وہ اس میں حارج ہوگا۔

فرمایا کہ پہلے علم کی طلب ہونی چاہئے پھر اس پر عمل ہونا چاہئے پھر خاموشی اختیار کرنی چاہئے پھر اس میں غور و فکر کرنا چاہیے۔ فرمایا کہ جو شخص اپنے علم و عمل کو اپنے دوسرے بھائی سے بہتر سمجھنے لگے تو اس نے اپنے علم و عمل دونوں کا اجر ضائع کر دیا، کیا عجب ہے کہ اس کا بھائی اس سے زیادہ متورع اور متقی ہو۔

کاش لوگ علم کے مطابق عمل کرنے میں اخلاص برتتے تو یہ بہت افضل تھا۔

دوستوں کی کثرت۔ | فرماتے تھے کہ دوستوں کی کثرت دین کی کمزوری کی علامت ہے۔

گم نامی | فرمایاکہ یہ وہ زمانہ ہے جس میں گم نام آدمی بھی (برائی سے) مامون نہین ہے، توپھر مشہور آدمی کیسے مامون ہوسکتا ہے۔

بدعت | فرمایاکہ جب تم کسی بدعت کا ذکر وچرچا سنو تو اس کو نہ تو دوسرے سے بیان کرو، اور نہ اپنے دل میں اس کو جگہ دو،

امراء کی صحبت | کسی نے کہاکہ آپ امراء اور والیون سے کیون نہ خلا ملا رکھیں، تاکہ آپ بھی محفوظ رہیں، اورنکو نصیحت کرکے ان کی برائیون پر ٹوکنے کا موقع بھی ہاتھ آجائے۔ فرمایاکہ تم لوگ چاہتے ہوکہ میں دریا میں تیرون بھی اور میرے پیر بھی بھیگنے نہ پائیں، میں ان کے یہان جانے سے اس لیے ڈرتا ہون کہ وہ لوگ میری آؤبھگت کرنے لگے، تو میں ان کی طرف مائل نہ ہوجاؤن، اور میرے سارے اعمال خیر ضائع ہوجائیں۔

ایک بار فرمایاکہ اگر کسی سپاہی کو دیکھو کہ نماز کے وقت سورہا ہے تو اس کو جگاؤ نہین، اس لیے کہ اٹھے گا تو خلق خدا کو تکلیف پہنچائیگا تو اس کا سونا ہی بہتر ہے، مقصد یہ تھاکہ خلق خدا کو ایذا پہنچانا ایک وقت کی نماز چھوڑنے سے بھی زیادہ برا کام ہے۔

بال بچون کی پرورش کی ذمہ داری | کسی نے پوچھاکہ ایک شخص اپنے بال بچون کے لیے محنت مزدوری کرکے کماتا ہے، اگر وہ نماز باجماعت کا انتظار کرتا ہے، تو اس سے اس مین رخنہ پڑتا ہے، تو وہ کیا کرے فرمایاکہ اپنے بال بچون کی روزی حاصل کرے اور تنہا نماز پڑھ لے۔

یحییٰ بن آدم

خراج اسلامی حکومت کی آمدنی کا ایک شعبہ ہے، اس کا قیام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں ہو چکا تھا، حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں اس میں کوئی خاص تغیر نہیں ہوا، حضرت عمرؓ نے البتہ حکومت کے دوسرے شعبوں کی طرح اس کو ایک حد تک منظم کیا، اور اس کے انتظام میں بہت سے تغیرات کئے، اس کے بعد سے برابر اس شعبہ میں اصلاح و ترقی ہوتی رہی، لیکن ڈیڑھ صدی تک اس کا کوئی مکمل تحریری دستور مرتب نہیں ہوا، ۱۷۰ھ میں جب ہارون خلیفہ ہوا، تو اس نے اس کام کی طرف توجہ کی، اور قاضی ابو یوسف سے اس موضوع پر ایک خاص کتاب لکھنے کی درخواست کی، انھوں نے اس مبارک کام کو اپنے ذمہ لیا، اور کتاب الخراج کے نام سے ایک کتاب لکھ کر ہارون کے سامنے پیش کی۔ کتاب کے نام سے معلوم ہوتا ہو کہ یہ کتاب صرف خراج یعنی اسلامی زرعی ٹیکس سے متعلق ہوگی، لیکن ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ کتاب اسلامی حکومت کی مالی آمدنی اور خراج کا ایک مکمل دستور ہے۔

امام ابو یوسف ہی کے زمانہ یا اس کے قریب قریب اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی گئیں، جن میں یحییٰ بن آدم کی کتاب الخراج اور ابو عبیدہ کی کتاب الاموال زیادہ مشہور ہیں۔

اول الذکر یعنی امام ابو یوسف اور ان کی کتاب کا ذکر کتاب کے شروع میں آچکا ہو اور اس کتاب کا خاتمہ ثانی الذکر کے سوانح حیات اور ان کی کتاب کے تعارف پر کیا جاتا ہے۔ انشاءاللہ تعالیٰ ثالث الذکر کا تذکرہ کتاب کے دوسرے حصہ میں آئے گا۔

یحییٰ بن آدم | یحییٰ نام ابو زکریا کنیت۔ پورا سلسلۂ نسب یہ ہے، یحییٰ بن آدم[1] بن سلیمان الاموی[2] یحییٰ کے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۱ص ۱۷۵، امام نووی نے آدم اور سلیمان کے درمیان علی کے نام کا ایک

دادا سلیمان کا کوئی تذکرہ رجال کی کتابون میں نہیں ملتا، ان کے والد آدم البتہ حدیث کے ثقہ راویون مین ہین، ابن سعد اور تہذیب میں ان کا تذکرہ موجود ہے[۱]، صحیح مسلم میں وکیع کی سند سے ان کی ایک روایت بھی موجود ہے،

سنہ ولادت | اہل تذکرہ نے یحییٰ کے سن ولادت کی کوئی تصریح نہین کی ہے، لیکن بعض قوی قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۴۰ھ یا اس کے کچھ قبل یا بعد ان کی ولادت ہوئی، وہ قرائن یہ ہیں۔

۱۔ تمام اہل تذکرہ متفق ہیں کہ ان کی وفات ۲۰۳ھ میں ہوئی۔

۲۔ ان کے قدیم شیوخ میں مسعر بن کدام متوفی ۱۵۵ھ یا ۱۵۳ھ اور فطر بن خلیفہ متوفی ۱۵۵ھ ہیں، اس حساب سے ان کے اور یحییٰ کے سنہ وفات میں تقریباً ۵۰ برس کا فرق ہے۔

۳۔ یہ بھی معلوم ہے کہ اس وقت تک بالکل چھوٹے بچون کو سماع حدیث (حدیث سنانے) کا دستور نہین شروع ہوا تھا۔ بلکہ جب وہ سن شعور کو پہونچ جاتے تھے، تب شیوخ انھین اپنے حلقۂ درس مین لیتے تھے، اس لئے ظاہر ہے کہ مسعر بن کدام (م ۱۵۵ھ یا ۱۵۳ھ) وغیرہ سے سماع کے وقت کم از کم ان کی عمر ۱۵ برس کی رہی ہوگی۔

(بقیہ حاشیہ ص ۴۶۲) اضافہ کیا ہے، جو عام تذکروں کے بیان کے خلاف ہے۔ [۲] اموی نسبت ولائی ہے، نسبی نہیں یعنی ان کے والد آدم خالد بن خالد اموی کے غلام تھے، اس وقت یہ عام دستور تھا کہ غلام اپنے آقا کی نسبت کے ساتھ منسوب ہوتے تھے، اس طرح یحییٰ بھی غلامانِ اسلام کی فہرست میں داخل ہین، لیکن خود خالد اور اس کے باپ اور دادا کے متعلق اہل تذکرہ خاموش ہیں، خالد کا جد علیٰ عقبہ بن معیط جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی میں مشہور تھا۔ بدر کے روز گرفتار ہوا اور قتل کیا گیا۔ البتہ اس کے لڑکے ولید نے فتح مکہ کے روز اسلام قبول کیا۔ خالد کا مختصر تذکرہ ابن سعد نے کیا ہے۔ (ج ۶ صفحہ ۲۴۳)

[۱] تہذیب جلد اول ص ۱۹۶)

اس اعتبار سے اگر مسعر بن کدام کا سنہ وفات ۱۵۲ قرار دیا جائے تو وفات کے وقت یحیٰ کی عمر ۲۰ سال اور اگر ۱۵۳ھ قرار دیا جائے تو ۲۰ برس کی تھی، اس لیے ظاہر ہے کہ انکا سنہ ولادت ۱۳۱ھ یا ۱۳۲ھ قرار دینا پڑے گا۔ واللہ اعلم بالصواب،

تعلیم و تربیت | تذکروں سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان کی تعلیم و تربیت کہاں اور کس کی نگرانی میں ہوئی، اور انھوں نے کیا کیا علوم حاصل کئے، لیکن ان کے شیوخ کی فہرست اور ان کی کتاب کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے خالص دینی علوم کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھی تھی۔ اور اس کے حصول کے لئے تقریباً تمام علمی مراکز مثلاً مکہ، مدینہ، کوفہ، حمص وغیرہ میں پہنچے، اور خصوصیت سے قرآن، حدیث کسی حد تک فقہ میں بھی دسترس بہم پہنچائی۔

انکے شیوخ کی فہرست میں حمزہ بن حبیب الزیات بھی ہیں، جو علم قرأت کے امام ہیں، ان کے تلمذ کی وجہ سے قیاس ہوتا ہے، کہ شاید انھوں نے علم قرأت میں بھی کچھ دستگاہ بہم پہنچائی ہو۔

شیوخ کی فہرست | ان کے شیوخ کے جو نام مل سکے ہیں، ان کی تعداد ۹۰ ہے، جن میں سے ۴۰ سو انھوں نے کتاب الخراج میں اور باقی، اسے دوسری کتابوں میں روایت کی ہے، ان کے نام ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

ابراہیم بن، حمید بن عبدالرحمٰن الرؤاسی، ابراہیم بن حمید الزبرقانی التیمی، ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ الاسلمی، اسرائیل بن یونس بن ابی اسحاق السبیعی، اسماعیل بن ابراہیم بن مقسم بن علیہ، اسماعیل بن عیاش ابن سلم العنصی الحمصی، ابوایاس (عبدالملک بن جویہ) ایوب بن جابر بن سیار الحنفی السحیمی الیمامی۔ ابوبکر ابن عیاش بن سالم الاسدی، ابوبکر بن النہشلی الکوفی، جریر بن عبدالحمید الضبی، جعفر بن زیاد الاحمر۔ حاتم بن اسماعیل المدنی الحارثی۔ حبان بن علی العنزی الکوفی، حسن بن ثابت الثعلبی الاحول، الحسن ابن صالح بن صالح بن حی، ابو عبداللہ الثوری الکوفی، الحسن بن عیاش بن سالم الاسدی الکوفی، حسین بن

زید بن علی بن الحسین۔ حفص بن غیاث بن طلق القاضی۔ حماد بن زید بن درہم، حماد بن سلمہ بن دینار ابوسلمہ حمید بن
عبدالرحمٰن بن حمید الرواسی، زہیر بن معاویۃ الجعفی الکوفی۔ زیاد بن عبداللہ بن الطفیل البکائی۔ سعید بن سالم بن
ابی الہیفاء، سعد بن عبدالجبار الزبیدی الحمصی، سفیان بن سعید بن مسروق الثوری الامام، سفیان بن عینیہ
بن ابی عمران الہلالی۔ سلام بن سلیم ابوالاحوص الحنفی الکوفی۔ سنان بن ہارون البرجمی۔ شریک بن عبداللہ
ابن ابی شریک القاضی النخعی الصلت بن عبدالرحمٰن الزبیدی۔ عباد بن العوام بن عمر، عبثر بن القاسم الزبیدی
ابوزبید، عبداللہ بن ادریس بن یزید الاودی، عبداللہ بن المبارک، عبد ربہ بن نافع الکنانی ابوشہاب
الحناط الاصغر۔ عبدالرحمٰن بن حمید بن عبدالرحمٰن الرواسی، عبدالرحمٰن بن ابی الزناد۔ عبدالرحمٰن القاری،
عبدالرحیم بن سلیمان المروزی الاشل۔ عبدالسلام بن حرب بن سلم الکوفی، عبدالملک بن جویۃ ابوایاس،
عبدۃ بن سلیمان الکلابی۔ عبداللہ بن عبیدالرحمٰن الاشجعی۔ عتاب بن بشیر الجزری۔ عثمان بن مقسم البری،
علی بن ہاشم بن البرید۔ عمار بن رزیق الضبی ابوالاحوص الکوفی، عمر بن ہارون الخراسانی البلخی۔ عمرو بن ثابت
ابن ہرمز بن ابی المقدام، فضیل بن عیاض بن مسعود بن بشر التیمی۔ قران بن تمام الاسدی الوالبی قیس بن
الربیع الاسدی، مبارک بن فضالہ۔ محمد بن الحسن بن فرقد الشیبانی صاحب ابی حنیفہ، محمد بن خازم
التیمی ابومعاویۃ الضریر۔ محمد بن طلحہ بن طلحہ بن مصرف الیامی۔ محمد بن فضیل بن غزوان الضبی۔ مسعود بن
سعد الجعفی الکوفی، مفضل بن صدقہ الکوفی ابو حماد الحنفی۔ مفضل بن مہلہل السعدی ابوعبدالرحمٰن، مندل
بن علی العنزی الکوفی۔ ہیثم بن بشر بن القاسم السلمی ابومعاویہ۔ ابن واقد المدنی۔ ورقاء بن عمر بن
کلیب الیشکری، ابن مبارک کے شیخ ہیں۔ وضاح بن عبداللہ الیشکری ابوعوانہ۔ وکیع بن الجراح
ابن ملیح الرواسی، وہیب بن خالد بن عجلان الباہلی۔ یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ، یزید بن ابراہیم التستری
ابوسعید، یزید بن عبدالعزیز بن سیاہ الاسدی الحمانی، یونس بن یزید بن ابی النجاد الایلی۔

یہ ان شیوخ کی فہرست تھی، جن سے انھوں نے کتاب الخراج میں روایت کی ہے،

کتاب الخراج کے علاوہ جن شیوخ سے روایت کی ہے، ان کے نام یہ ہیں۔

ابراہیم بن سعد بن ابراہیم الزہری، بشر بن السری ابو عمرو الافوہ۔ جریر بن حازم بن عبداللہ الازدی، حسین بن علی بن الولید الجعفی، حمزہ بن حبیب الزیات، سعید بن سالم القداح ابو عثمان المکی، عبداللہ ابن عثمان البصری، عبدالعزیز بن سیاہ الاسدی الحمانی۔ عیسیٰ بن طہمان فضیل بن مرزوق الاغر، قطر بن خلیفہ المخزومی الحناط۔ قطبہ بن عبدالعزیز بن سیاہ، مالک بن مغول بن عاصم البجلی، محمد بن اسماعیل بن رجاء الزبیدی الکوفی، مسعر بن الکدام بن ظہیر العامری۔ موسیٰ بن قیس الحضرمی الفراء عصفور الجنۃ۔ یونس بن ابی اسحٰق السبیعی۔

ان شیوخ میں بعض ایسے لوگوں کے نام بھی ہیں جو ان کے اصحاب واحباب میں شمار ہوتے ہیں۔ مثلاً حسن بن صالح جن سے انھوں نے تقریباً پچاس سے زاید جگہ روایت کی ہے۔ لیکن ابن حزم نے ان کو یحییٰ کے اصحاب میں شمار کیا ہے۔

محدثین کے دستور کے مطابق انھوں نے اپنے ہمعصروںؔ اور چھوٹوں سے بھی روایتیں کی ہیں۔ اور بعض جگہ تو باپ اور بیٹے دونوں سے روایت کرتے ہیں، مثلاً عبدالرحمٰن بن حمید الرواسی سے بھی روایت کی ہے، اور ان کے لڑکے حمید سے بھی، اسی طرح عبدالعزیز بن سیارہ اور ان کے دونوں لڑکے یزید اور قطبہ سے روایتیں کی ہیں۔

تلامذہ | یحییٰ کی روایت اور ان تلامذہ کی کثرت سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا حلقۂ درس وسیع رہا ہوگا، لیکن اہل تذکرہ میں سے کسی نے بھی ان کے درس وتدریس کے متعلق کوئی تصریح نہیں کی ہے، ان کے تلامذہ کی فہرست میں بعض بڑے بڑے ائمہ حدیث مثلاً اسحٰق بن راہویہ، یحییٰ بن معین بھی شامل ہیں۔ تلامذہ کی فہرست بہت لمبی ہے۔ ان میں سے چند نام درج کیے جاتے ہیں، جن سے صحاح میں

سنہ محدثین کو اگر اپنے اصاغر سے بھی روایتیں مل جاتی تھیں۔ تو وہ روایت کر لیتے تھے۔

روایت موجود ہے۔

احمد بن ابی رجا عبداللہ الہروی، احمد بن سلیمان الرہاوی۔ احمد بن عمر الواقدی۔ احمد بن محمد بن حنبل، اسحٰق بن ابراہیم البخاری۔ اسحٰق بن راہویہ۔ مشہور امام حدیث، بشر بن خالد العسکری، حسن ابن علی بن عفان العامری۔ الحسن بن علی الخلال حافظ حدیث، الحسین بن علی بن الاسود العجلی، حفص ابن عمر المہرقانی یہ ابوحاتم اور ابوزرعہ کے شیخ ہیں۔ سفیان بن وکیع بن الجراح۔ عباس بن حسین القنطری۔ ابوبکر عبداللہ بن شیبہ۔ عبداللہ بن محمد المسندی۔ عبدالاعلیٰ بن واصل الاسدی۔ عبدالرحمٰن ابن صالح الازدی۔ عبد بن حمید۔ عبدہ بن عبداللہ الخزاعی الصفار۔ عبید بن یعیش المحاملی، عثمان بن ابی شیبہ، عصمۃ ابن الفضل النیشاپوری۔ علی بن عبداللہ بن المدینی۔ علی بن محمد الطنافسی۔ محمد بن اسماعیل، ابوبکر بن علیہ۔ محمد بن عبداللہ بن المبارک المخرمی۔ محمد بن رافع النیشاپوری، ابوکریب محمد بن العلا الہمدانی، محمد بن عمر بن الولید الکندی، محمد بن الولید بن ابی ولید الفحام، محمود بن غیلان المروزی، موسیٰ بن خرام مشہور فقیہ تھے۔ موسیٰ بن عبدالرحمٰن المسروقی۔ ہارون بن عبداللہ الحمال حافظ حدیث تھے۔ واصل بن عبدالاعلیٰ ابن ہلال الاسدی۔ یحییٰ بن معین۔ جرح و تعدیل کے امام تھے۔

دربار سے بے تعلقی | یحییٰ نے تقریباً، خلفاء منصور، ہادی۔ مہدی۔ ہارون۔ امین، مامون کا زمانہ پایا، لیکن ان میں سے کسی خلیفہ کے دربار سے انھوں نے اپنا تعلق نہیں قائم کیا۔ اور نہ حکومت کا کوئی عہدہ قبول کیا۔

علم و فضل | علم و فضل کے لحاظ سے یحییٰ ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں انکو طبقہ سابعہ میں شمار کیا ہے۔ جس میں امام شافعی، عبدالرحمٰن بن مہدی، ابوداؤد طیالسی وغیرہ ہیں۔ امام ذہبی نے علی بن المدینی سے جو ائمۂ حدیث میں سے ہیں۔ روایت کی ہے کہ حدیث کی سند کا

مدار زیادہ تر چھ آدمیوں پر ہے - اہل مدینہ میں ابن شہاب زہری، اہل مکہ میں عمرو بن دینار، اہل بصرہ میں قتادہ اور یحییٰ بن ابی کثیر، اہل کوفہ میں ابواسحٰق اور اعمش، پھر ان چھ کا علم ان بارہ آدمیوں میں پھیلا، اہل مدینہ میں امام مالک اور ابن اسحاق اور اہل مکہ میں ابن جریج اور ابن عیینہ اور اہل بصرہ میں سعید بن ابی عروبہ وحماد بن سلمہ وابوعوانہ وشعبہ ومعمر اور اہل کوفہ میں سفیان ثوری، اور اہل شام میں امام اوزاعی اور واسط میں ہشیم، پھر ان ائمہ کا علم تین آدمیوں یحییٰ القطان، یحییٰ بن زکریا - اور وکیع بن جراح میں سمٹ آیا - اور پھر ان تینوں سے یہ امانت عبداللہ بن مبارک، عبدالرحمٰن بن مہدی اور یحییٰ بن آدم کی طرف منتقل ہوئی -[1]

یعقوب بن شیبہ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ، کثیر الحدیث اور بہت بڑے فقیہ تھے، حالانکہ ان کا سن بہت زیادہ نہیں تھا، علی بن مدینی فرمایا کرتے تھے کہ ان کے پاس علم تھا - ابواسامہ فرماتے ہیں کہ میں جب یحییٰ بن آدم کو دیکھتا ہوں تو امام شعبی یاد آجاتے ہیں، یعنی وہ امام شعبی کی طرح جامع العلوم تھے، ابن سعد، یحییٰ بن معین، ابوحاتم، ابن حبان وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے، یحییٰ بن ابی شیبہ کے الفاظ یہ ہیں کہ

ثقہ، صدوق، ثبت، حجۃ،[2] یحییٰ قابل اعتماد اور حجۃ تھے، ان کے علم وفضل کے متعلق ان ائمہ کی رائے سب سے بڑی سند ہے -

مسلک | ان کے زمانہ تک تحزب اور عامیانہ تقلید کا دور شروع نہیں ہوا تھا، اور نہ اس وقت محدثین اور فقہاء اپنے لیے اس لقب کو پسند کرتے تھے، بلکہ علماء قرآن وحدیث وآثار کی روشنی میں اپنی بصیرت کے مطابق فتوی دیتے تھے - اگر کسی مسئلہ میں وہ خود رائے قائم نہیں کر پاتے تھے تو ائمہ میں سے جن کی رائے انھیں پسند ہوتی اس کو اختیار کر لیتے تھے، اس کی سب سے بڑی وجہ

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۰۳ [2] الخلاصہ ص ۳۶۳، تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۱۷۵ -

یہ تھی کہ اس زمانہ میں تشنگان علم بغیر کسی عصبیت اور تحزب و تعصب کے مختلف شیوخ سے سماع حدیث اور مختلف الخیال فقہا کی خدمت میں جاکر تحصیل فقہ کرتے تھے، اس لیے ان میں کورانہ تقلید اور تنگ نظری پیدا نہین ہونے پاتی تھی، امام محمد حدیث میں امام مالک کے شاگرد تھے۔ اسد بن فرات اور امام شافعی نے امام محمد سے فقہ کی تحصیل کی تھی۔ خود امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے درمیان علمی مذاکرے ہوتے رہتے تھے، امام احمد بن حنبل امام ابویوسف کے شاگرد تھے، ایسی بہت مثالین پیش کی جاسکتی ہیں۔

یحیی بن آدم نے بھی مختلف الخیال محدثین اور فقہاء سے تحصیل علم کی تھی، ایک طرف وہ امام محمد سے روایت کرتے ہیں، دوسری طرف حسن بن صالح کے جن کو امام محمد سے شدید اختلاف تھا، خاص تلامذہ مین تھے، شاید یہی وجہ تھی کہ وہ کسی خاص امام[1] کے مسلک کے پابند نہین ہوسکے، اور نہ انھون نے اپنی کتاب کو کسی خاص مسلک تک محدود رکھا۔ ان کے مسلک کے متعلق یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ان کا تعلق محدثین کی جماعت سے تھا، چنانچہ کتاب مین جہان جہان عندنا یا عند اصحابنا جماعۃ عن اصحابنا وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ مسائل مین ان کا نقطۂ نظر محدثانہ تھا۔

تصانیف | امام نووی نے یحیی کی تصنیفات مین صرف کتاب الخراج کا تذکرہ کیا ہے، امام ذہبی نے لکھا ہے، کہ ھو صاحب التصانیف "وہ صاحب تصانیف ہیں"، لیکن انھون نے بھی کتاب الخراج کے علاوہ کسی دوسری کتاب کا تذکرہ[2] نہین کیا ہے، ابن ندیم نے کتاب الخراج کے علاوہ دو اور کتابون کا بھی تذکرہ کیا ہے، کتاب الزوال اور کتاب الفرائض، اس کے متعلق لکھا ہے کہ یہ بہت بڑی

---

[1] اس وقت تک دو مسلک حنفی اور مالکی رواج پاچکے تھے، یحیی اپنی کتاب میں دونون مین سے ہر ایک کی کسی جگہ موافقت اور کسی جگہ مخالفت کرتے ہیں [2] ص ۱۶، ص ۵۸، اور ص ۸۸ مین اس کی تصریح موجود ہے۔ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۴۰ [4] ڈاکٹر جیونبول اور ابوالاشبال دونون مصححین مین سے کسی کی نظر ابن ندیم پر نہیں (بقیہ حاشیہ)

کتاب ہے، مگر ان مین کتاب الخراج کے علاوہ کسی اور کتاب کے موجود ہونے کا کوئی علم نہین ہے۔

کتاب الخراج بھی اب تک ناپید تھی، لیکن ایک فرانسیسی مستشرق ڈاکٹر جانبول (m. Juy n ball) کے ذریعہ چند سال ہوئے کہ سامنے آئی ہے۔

ڈاکٹر جانبول کو کتاب الخراج کا ایک قدیم نسخہ ایم شارل سیفر (m. chas boschefao) کے یہان جو پیرس مین علوم مشرقیہ کے صدر ہین ملا۔ انھون نے بڑی دیدہ ریزی سے اس کی تصحیح کی اور اس پر فرنچ مین ایک مقدمہ لکھکر ۱۸۹۸ء مین مطبعہ بریل، لیڈن سے شایع کیا، یہ نسخہ پانچوین صدی کے آخر کا لکھا ہوا ہے، اور اسکی ضخامت ۹۵ صفحات ہے۔

کتاب سے صاحب نسخہ کے نام کا پتہ نہین چلتا، لیکن کتاب کی پشت پر انھون نے اپنے شیخ اور اپنے معاصرین کے سماع کی جو یادداشت لکھی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب نسخہ نے ابو عبد الرحمن بن علی البلری سے جو کتاب کے مرتب اور جن پر اس کتاب کی تمام سندین منتہی ہوتی ہین۔ براہ راست سماع کیا ہے، شیخ بسری کے سماع کی یادداشت یہ ہے۔

سمعت بقرائة محمد بن علي	مین نے محمد بن علی کی قرأت سے اس کتاب
ابن حنظلة الى آخره وسمع ذلك	کو آخر تک سنا ہے، اور میرے علاوہ ابو القاسم
ابو القاسم علي بن محمد بن البسري	شیخ بسری کے پوتے، اور ان کے لڑکے
النقيب اعزه وولده ابو عبد الله	ابو عبد اللہ اور نوفل وغیرہ نے بھی سماع کیا ہے
الحسين ونوفل بن علي محمد بن علي	اور یہ سماع محرم ۱۶ھ مین ہوا۔

(بقیہ حاشیہ ص ۴۴۹) نہین تھی، اسی لیے انھون نے تصنیفات مین صرف کتاب الخراج کا تذکرہ کیا ہے۔ ۵ھ ابن ندیم مین کتاب الفرائض کے بعد ڈیش ہے، اس کے بعد کبیر الگ، ڈیش کے ساتھ لکھا ہوا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو کتابین ہین، لیکن مین نے اس کو طباعت کی غلطی سمجھ کر کبیر کو کتاب الفرائض کی صفت قرار دے دیا ہے۔

الاسائی فی المحرم سنۃ ست عشرۃ

وادبعمائۃ۔

دوسری یادداشت مین کچھ اپنے ہم عصر سامعین کے نام بھی لکھے ہیں، ان کے نام کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں کہ ان لوگون نے جمادی الاولیٰ ۴۸۲ھ میں سماع کیا ہے، غالبًا یہ اختتام سماع کی تاریخ ہے لیکن کہیں بھی اپنے سماع کی تاریخ نہین لکھی ہے، کتاب کے ہر حصہ کے شروع مین

أخبرنا الشیخ ابوعبد اللہ البسری — شیخ بسری نے ہم سے بیان کیا۔

کے الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا سماع شیخ بسری سے براہِ راست ہے، اور چونکہ ۴۸۴ھ سے پہلے انھون اپنے یا کسی دوسرے کے سماع کی تاریخ نہین لکھی ہے۔ اسلئے قیاس ہوتا ہے کہ ۴۸۲ھ ہی ان کے سماع کی تاریخ ہوگی۔

بسری[2] نے اس کتاب کا سماع اپنے شیخ ابوعبد اللہ بن یحیی السکری سے ۴۱۶ھ مین کیا تھا سماع کے وقت ان کی عمر ۷-۸ برس سے زاید نہین تھی۔ ظاہر ہے کہ اس عمر کی روایات پر پورے طور پر اعتماد نہین کیا جاسکتا، لیکن بسری کی مرویات کو اس درجہ قبولیت حاصل ہوئی کہ ان کی کم عمری اعتماد واعتبار کے لیے مانع نہین رہی۔

ڈاکٹر جانیبول نے کتاب کی تصحیح وتحشیہ مین کافی محنت کی تھی، لیکن پھر بھی اس مین کچھ نہ کچھ خامیان رہ گئی تھین، اس لیے قاضی ابوالاشبال احمد شاکر مصری نے دوبارہ اس کی تصحیح کی، جہان جہان ڈاکٹر صاحب کی تصحیح مین غلطی تھی، اس کی نشاندہی[3] کی اور دوسرے ماخذون سے ہر مسئلہ کی

---

[1] اصل مین اس طرح لکھا ہوا ہے کسی مصحح نے اس کے متعلق کچھ کہا بھی نہین ہے لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ یہ اسنائی ہے۔

[2] بسری بغداد کے مشہور محدثین میں ہیں ۴۰۹ھ یا ۴۱۰ھ مین ان کی ولادت ہوئی تھی، اور ۴۹۴ھ مین وفات پائی سمعانی نے انکا تذکرہ کیا ہے (ج ۱، [illegible])[3] مثلاً ج ۳ ص ۲۰، ۱۲۱، و ص ۱۲۲ مین اس کی تفصیل موجود ہے۔

مراجعت کرکے اس کی تخریج کی اور یحییٰ بن آدم کے سوانح حیات اور ان کے شیوخ تلامذہ کی فہرست کے ساتھ ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۸ء مین دوبارہ مطبعہ سلفیہ قاہرہ سے شائع کیا، فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

قاضی صاحب نے اس سلسلہ مین سب سے بڑا کام یہ کیا ہے کہ کتاب کے رجال کی پوری تحقیق کی ہے اور ان کی تعدیل وجرح کے سلسلہ میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس کو نقل کردیا ہے، علاوہ برین جو مسائل امام ابو یوسف اور یحییٰ کی کتابون مین مشترک ہین حاشیہ میں ان کی بھی تصریح کردی ہے۔ یہ حاشیہ اپنی افادیت کے لحاظ سے کتاب کی ایک مختصر شرح ہے۔ لیکن انھون نے یہ نہین لکھا کہ اس کتاب کا کیا درجہ ہے؟ اس کی خصوصیات کیا ہیں، اور امام ابو یوسف اور یحییٰ کی کتابون میں ...... جو ایک ہی موضوع سے متعلق ہیں کیا فرق ہے۔ آیندہ سطور مین اسی کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔

پوری کتاب چار حصون میں ہے جن میں ۲۳ ابواب اور ۶۴۰ مسئلے ہیں۔ مؤلف نے صرف دو آخری حصون کی تبویب کی تھی، باقی دو حصون کی تبویب مصحح نے کی ہے۔ اور اوپر حاشیہ مین عنوانات کی سرخیاں قائم کردی ہیں۔

یحییٰ کی روایات اور ان کے اقوال عام طور سے مشہور ہیں۔ اور تمام متقدم اور متاخر محدثین نے اپنی اپنی کتابون میں ان کو جگہ دی ہے، لیکن بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرون اولی مین انکی کتاب الخراج کے ساتھ زیادہ اعتنا نہین کیا گیا، اور اس کے نسخے زیادہ مروج تھے، چنانچہ امام مسلم، ابو داؤد، ابن ماجہ، امام نووی، حافظ ابن حجر، بلاذری، وغیرہ نے متعدد جگہ ان کی روایات اور ان کے اقوال اپنی اپنی کتابون مین نقل کئے ہیں، لیکن ان میں سے کسی نے بھی کتاب الخراج کا ذکر نہین کیا ہے، اور نہ کہین اس کا حوالہ دیا ہے۔

کتاب کی خصوصیت اور امام ابو یوسفؒ کی کتاب مین فرق

(۱) اسلامی مالیات کے جن شعبون کے متعلق قرآن پاک کی آیات مین اشارات موجود ہیں، یحییٰ بن آدم نے ہر عنوان کے تحت آن آیات

کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد حدیث و آثار سے استدلال کرتا ہے۔ مثلاً فئی، غنیمت، تجارت، زراعت[1]
صدقات، ما یکرہ فی الصدقۃ جذ اذو حصاد وغیرہ کے سلسلہ مین اس کی تفصیل مل سکتی ہے۔
(۲) طریقۂ تصنیف محدثانہ ہے۔ یعنی ہر مسئلہ میں انھون نے اپنے شیوخ یا تابعین کے اقوال یا پھر صحابہ کے آثار یا احادیث نبوی کا تذکرہ کیا ہے۔ اور خود اپنی رائے پوری کتاب مین مشکل سے دو چار جگہ دی ہے۔
(۳) فقہ مین کسی خاص مسلک کے پابند نہین تھے، لیکن پھر بھی انھون نے متعدد جگہ امام ابو حنیفہ اور امام مالک کی رائے سے اختلاف کیا ہے۔ اور اس کے بعد محدثین کی رائے کو پیش کر کے اس کو ترجیح دی ہے، مگر جہان بھی اختلاف کیا ہے۔ وہان امام صاحب کا نام نہین لیا ہے، بلکہ بعض وغیرہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔
مثلاً اس مسئلہ مین کہ اگر کوئی پرتی زمین کو آباد کرنا چاہے، تو وہ کر سکتا ہے یا نہین، دوسرے ائمہ کی رائے ہے کہ اس کو اختیار ہے کہ وہ آباد کرلے اور وہ اس زمین کا مالک ہوگا، خود امام ابو یوسف اور امام محمد کی رائے بھی یہی ہے، لیکن امام صاحب کے نزدیک اس مین امام کی اجازت کی ضرورت ہے، طرفین کے اقوال ذکر کرنے کے بعد یحیی نے دوسرے ائمہ کے اقوال کی تائید مین یہ حدیث ذکر کی ہے،

من احیا ارضاً میتۃ فی غیر حق مسلم ولا معاھد فھی لہ (ص ۸۰)	جو کسی ایسی پرتی زمین کو آباد کرے جو کسی مسلم یا مجاہد کی نہ ہو تو وہ زمین اس کی ہے۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ حدیث مین امام سے اجازت کا ذکر نہین ہے، جس سے معلوم ہوا کہ امام صاحب کی رائے ان کے نزدیک صحیح نہین ہے۔

---

[1] زراعت کے سلسلہ مین آج کل اس قسم کے قوانین روزانہ بنتے رہتے ہیں لیکن اسلام نے آج سے تیرہ سو برس پہلے یہ قانون دنیا کے سامنے پیش کر دیا تھا، لیکن برا ہو تعصب کا کہ اس نے دنیا کو اندھا کر دیا ہے۔

بعض جگہ وہ دوسرے ائمہ کی بھی مخالفت کرتے ہین، مثلاً اس مسئلہ میں کہ خراج کی زمین پر دوسرے محاصل عائد کئے جا سکتے ہیں یا نہین، ائمہ ثلاثہ کی راے ہے کہ دوسرے محاصل عشر وغیرہ اس مین لیے جا سکتے ہیں، امام صاحب کی راے ہے کہ خراجی زمین مین خراج کے علاوہ اور کوئی چیز نہین لی جا سکتی، اس مسئلہ مین یحییٰ، امام صاحب کے ساتھ ہیں، اور فریقین کے استدلالات ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

قال جماعة من اصحابنا ليس	ہمارے صحاب میں سے بعض لوگون نے کہا ہے،
على الارض الخراج عشر انما	کہ خراجی زمین پر عشر نہین ہے، اس پر صرف
على الارض الخراج وليس في	خراج ہے، اور اس زمین کی زراعت اور
زرعها ولا في ثمارها شيئ	اس کے پھل میں کوئی محصول نہین ہے،
لمسلم اولغيره (صفحہ ١٦٧)	وہ زمین مسلمان کی ہو یا غیر مسلم کی۔

دوسری جگہ اس مسلک کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میرے بعض بصری اصحاب کی بھی یہی راے ہے" (ص ۱۶۷)

زکوٰۃ کے سلسلہ میں یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ اگر مختلف قسم کے غلے اتنی تھوڑی مقدار میں پیدا ہون کہ نصاب زکوٰۃ تک نہ پہنچتے ہون، لیکن اگر ان سب کو یا ان کی قیمت کو ملا دیا جائے تو وہ نصاب تک پہنچ جاتے ہون تو ایسا کرنا چاہئے یا نہین، امام صاحب تو غلہ میں سرے سے نصاب کے قائل ہی نہین ہیں، ان کے نزدیک غلہ کی جتنی مقدار بھی ہو اس میں عشر یا نصف عشر دینا چاہئے، بقیہ ائمہ غلہ کا نصاب پانچ وسق مقرر کرتے ہین اس لئے ان کے یہان یہ سوال اہمیت رکھتا ہے، امام شافعی ایک غلہ کو دوسرے غلہ سے یا اس کی قیمت کو ملا کر عشر ادا کرنے کو جائز نہین سمجھتے، امام احمد کا خیال ہے کہ ایک دوسرے کو ملا کر زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے، امام مالک صرف جو اور گیہون کو ایک دوسرے سے ملانے کے قائل ہیں یحییٰ چونکہ مطلق ایک دوسرے کے ساتھ ملانے کے قائل نہین ہیں، اس لئے انھون نے امام مالک کے مسلک کو بھی پسند نہین کیا۔

چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ اصحاب امام مالک نے جو اور گیہون کو یکسان سمجھا ہے، لیکن یہ بھی ناجائز نہین ہے یہی مسلک امام شافعیؒ نے اختیار کیا۔ اور بعد مین یہ انھی کی طرف منسوب ہوگیا،

۴۔ کتاب مین بعض ایسی روایتیں بھی ہیں، جن مین مصنف منفرد ہیں مثلاً یہ روایت

من احیا ارضاً میتۃً فھی لہ جو پرتی زمین کو آباد کرے، وہ اس کی ہے

لیس لعرق ظالم حق (صفحہ ۵۸)

ان الفاظ کے ساتھ کسی نے بھی یہ روایت نہین کی ہے، ابن حجر نے فتح الباری جلد ۵ صفحہ ۱۳ مین یحییٰ کی اس روایت کو نقل کیا ہے، لیکن انھون نے بھی یحییٰ کے علاوہ کسی دوسرے سلسلۂ سند کا ذکر نہین کیا ہے۔

اسی طرح "بعل والعشری والنعذری" والی حدیث مین بھی غالباً صاحب کتاب منفرد ہیں، ابن ماجہ نے اس روایت کو اپنی کتاب میں نقل کیا ہے، لیکن ان کا سلسلۂ سند بھی یحییٰ ہی پر ختم ہوتا ہے (ص ۱۲۳)

امام ابویوسف اور یحییٰ کی کتاب مین چند ظاہری اور معنوی فرق یہ ہیں۔

(۱) اوپر لکھا جاچکا ہے کہ یحییٰ کی کتاب الخراج کی طرف علمائے نے بہت کم اعتنا کیا ہے، بخلاف اس کے ابویوسف کی کتاب الخراج کو تمام متقدمین ومتاخرین ائمہ کے نزدیک ایک خاص درجہ حاصل رہا ہے۔ اور مشکل سے حدیث وفقہ کی کوئی کتاب اس کتاب کے ذکر سے خالی ہوگی،

(۲) امام ابویوسف کی کتاب مین ۳۰ ابواب اور یحییٰ کی کتاب مین کل ۳۲ ابواب ہیں، اس ظاہری فرق کے علاوہ معنوی حیثیت سے بھی امام ابویوسف کی کتاب بہت بلند ہے، اس مین ہر عنوان کے تحت جزئیات اور بہت سے مجتہدانہ نکات اور متنوع مسائل ملتے ہیں۔

(۳) امام ابویوسف کی کتاب مین بعض مباحث ضمناً آگئے ہیں، لیکن یحییٰ نے ان کے مستقل ابواب قائم کئے ہیں، مثلاً تحجر، شراب کی تجارت پر ذمیون سے ٹیکس لینے جذاذ و حصاد بابسر

ہیں زکوٰۃ وغیرہ کے مباحث کو امام ابو یوسف نے ضمناً ذکر کیا ہے، لیکن یحییٰ نے ان کے لئے الگ الگ باب قائم کئے ہیں۔

(۴) امام ابو یوسف کی کتاب میں گو جزئیات اور متنوع مسائل زیادہ ہیں، لیکن پوری کتاب تقریباً تمام تر حنفی مسلک کے مسائل تک محدود ہے، اس کے مقابلہ میں یحییٰ کا طریقہ تصنیف محدثانہ ہے، اور وہ ہر عنوان کے تحت مختلف احادیث، آثار، اور اقوال نقل کر دیتے ہیں اور خود اس کا فیصلہ بہت کم کرتے ہیں، اس سے یہ فائدہ ہے کہ پڑھنے والے کو ہر موضوع پر خود سوچ کر کسی امام کی رائے کو راجح یا مرجوح قرار دینے کا موقع ملتا ہے۔

علمی حیثیت سے کتاب میں بعض تسامحات بھی ہیں مثلاً

زکواۃ پر بحث کی ہے، لیکن زکوٰۃ کے مصرف کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے، یا دریا سے حاصل کی ہوئی اشیاء کے بارے میں کوئی بحث نہیں ہے۔

(۲) ان کے شیوخ اور سلسلۂ سند کے رواۃ میں بہت سے ضعیف اور بعض مجہول اشخاص بھی ہیں۔ مثلاً شیوخ میں محمد بن ابی یحییٰ الاسلمی، ایوب بن جابر بن سیار، عبدالجبار بن زبیدی کو کاذب تک کہا گیا ہے، سنان بن ہارون، الصلت بن عبدالرحمٰن، عثمان بن مقسم، عمر بن ہارون، عمرو بن ثابت بن ہرمز، قیس بن الربیع، مفضل بن صدقہ وغیرہ، عام رواۃ میں مغلس (ص ۲۵) جن کا تذکرہ رجال کی کسی کتاب میں نہیں ملتا، عبدالرحمٰن القاری (ص ۱۸) کا تذکرہ بھی کسی کتاب میں نہیں ہے، اسی طرح محمد بن مساور، عبادہ بن نعمان، ابو علی الصفار، وغیرہ کا تذکرہ بھی متداول کتابوں میں موجود نہیں ہے، اسی طرح ابراہیم بن محمد (ص ۳)، عبدالرحمٰن بن معاویہ (ص ۲۳) اسماعیل بن ابی سعید (ص ۱۰۰) ابو حماد (ص ۱۰۵) وغیرہ کو علماء نے ضعیف اور ان میں سے بعض کو وضاعِ حدیث تک لکھا ہے۔

پوری کتاب مین سیکڑوں لغات اور فقرے ایسے ہیں، جن کی مکمل تشریح کی ضرورت تھی۔ ان کے حل کئے بغیر عبارت کا مفہوم واضح نہین ہوتا۔ ضرورت تھی کہ کتاب کے ساتھ ایسے الفاظ کی ایک فہرست بھی منسلک ہوتی، مثلاً اس اثر

لیس علی عربی ملك	یعنی عربی النسل پر کسی کی ملکیت نہین ہے۔

کے نقل کرنے کے بعد یہ جملہ ہے۔

ولکنا نقوم همہ الملة خمیس من الابل کا مطلب بالکل واضح نہین ہوتا، مصنف سے اس آیت "قری ظاہرۃ" کی تشریح کے سلسلہ مین بھی فروگذاشت ہو گئی ہے، گو عام ائمہ تفسیر کی طرح انھون نے بھی اس کی تشریح قری عربیہ" کے لفظ سے کی ہے، مگر انھون نے اس سے ایک خاص سرزمین مراد کی ہے، جو صحیح نہین ہے۔

تفسیر ابن کثیر مین ابن عباسؓ کی یہ روایت موجود ہے کہ

ھی قری عربیة بین المدینة	مدینہ اور شام کے درمیان جو آبادیان ہین
والشام قری ظاھرۃ ای بینة	وہی قری عربیہ ہیں، اس کو ظاہرہ اس لئے
واضحة یعرفھا المسافرون	کہا گیا ہے کہ ان کو مسافرین عام طور پر
	جانتے ہیں۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی مخصوص خطہ کا نام نہین ہے، بلکہ مدینہ و شام کے درمیان کی آبادیون کو قری ظاہرہ کہتے ہیں، پھر معجم البلدان اور کتب لغت تاریخ وغیرہ میں کوئی مقام اس نام کا نہین ملتا، اس لئے ظاہر ہے کہ مصنف کو اس مین سہو ہو گیا ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین ربنا تقبل منا انك انت السمیع العلیم

سلسلہ تابعین وتبع تابعینؒ

اہلِ کتاب صحابہؓ و تابعینؒ

شروع میں عرب کے یہود و نصاریٰ کی قدیم تاریخ اور اُن کے تمدنی وسیاسی اثرات اور اُن کی دینی واخلاقی حالت کی تفصیل اور اُس کے بعد حروفِ تہجی کے اعتبار سے (۹۳) اہلِ کتاب صحابہ اور تابعین اور اُن کے بعد صحابیات اور تابعات کا تذکرہ قلم بند کیا گیا ہے، مرتبہ مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی

ضخامت ۲۶۵ صفحے قیمت: للعہ

تابعین رضی اللہ عنہم اجمعین

اس میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ، حسن بصریؒ، اویسؒ قرنی، امام زین العابدینؒ، سعید بن مسیبؒ، محمد بن سیرینؒ، ابن شہاب زہری، اور قاضی شریح وغیرہ ۹۶ اکابر تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے سوانح اُن کے علمی، مذہبی، اخلاقی، اور علمی مجاہدات و کارناموں کی تفصیل ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی

طبع دوم ضخامت ۵۵۶ صفحے قیمت: صر

(دار المصنفین کی نئی کتاب)

ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایک ایک جھلک

یہ تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کے دور کی سیاسی، تمدنی، اور معاشرتی تاریخ ہے، اس میں اس عہد کے ہندو مسلمان مورخین کی کتابوں اور مضامین کے وہ تمام اقتباسات جمع کر دیئے گئے ہیں جن سے اس عہد کے سیاسی، اقتصادی، تجارتی، اور معاشرتی، حالات معلوم ہوتے ہیں، اور پھر مسلمانوں کی تاریخ کے روشن پہلو ہندو مورخوں کی زبان سے اور ہندوؤں کے علمی کارنامے مسلمان مورخوں کے قلم سے نقل کئے گئے ہیں جس کو مربوط طور پر پہلی مرتبہ اردو میں پیش کیا گیا ہے،

ضخامت: ۵۰۶ صفحے قیمت: ہے ر

مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم اے

(طابع و ناشر صدیق احمد)